اکتوبر 2023

دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

بانی

معراج رسول

صفحات 290

قیمت 100 روپے

www.pklibrary.com

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی 06

قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

زویا صفوان

سزائے دوراں 12

نفس کی سحر انگیز..... سود و زیاں سے بے نیاز
بے طرح لذت آمیز مسافت کی فتح و شکست

جمال دستی

مفید مصیبت 58

سوچ و زندگی کا دھارا بدل دینے
والی مفید مصیبت کا کمال

عکس فاطمہ

مجرم ذہن 67

گھریلو ملازمے کے مجرمانہ ذہن میں گھومتی
منفی سوچ کا چونکا دینے والا انجام

حسام بٹ

دہر 76

عروس البلاد کراچی سے شہر ظلمات "نی یوم" تک
دراز ایک سنسنی خیز اور تحیر آمیز ناقابل فراموش سلسلہ

علی عباس

موت کا رقص 105

ایک صحافی کی ڈائری
کے خون آلود ورق.....

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

مارکیٹنگ و
سرکولیشن مینجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789

pklibrary.com

ابراہیم عبدالہادی

دوست 119

آگہی کا عذاب جھیلنے والے
ایک دردمند کا ملال.....

روبینہ رشید

شعلہ زن 126

ایک سادہ و معصوم نازک اندام
دوشیزہ کی سنسنی خیز داستان

عبدالرب بھٹی

حسابی قتل 157

دلچسپ پیرائے میں اختتام کی
جانب گامزن تفتیش کی انوکھی روداد

ایشا گل

زہریلا پھول 167

مغربی معاشرے میں پھیلے جرائم
میں سے ایک جرم کا انکشاف

یعقوب بھٹی

دھندلی تصویر 173

وصل و انتظار کے لمحوں میں قید
ایک سیاہ بخت کی چاہتیں

ایما اقبال

سودائے زر 198

آنکھ میں بکھرے خوابوں کا
سودا کرنے والے زرگزیدوں کا جنون

pklibrary.com

چینی نامہ چینی

عزیزانِ من..... السلامُ علیکم!

ماہ اکتوبر کا شمارہ پیشِ خدمت ہے..... اسلامی ہجری سال کا تیسرا بابرکت مہینہ ربیع الاول ہے۔ یہ مہینہ آقائے دوجہاں ﷺ کی ولادت باسعادت سے منسوب ہے۔ خصوصاً 12 ربیع الاول کو آقائے دوجہاں محمد مصطفیٰ ﷺ کی ولادت باسعادت کی خوشی میں پورے عالم میں محافلِ میلاد منعقد کی جاتی ہیں اور عید میلاد النبی ﷺ کی خوشی منائی جاتی ہے۔ آپ سب کو بھی یہ خوشی بہت بہت مبارک ہو۔ پاکیزہ معاشرہ اور اچھی صحبت انسان کو نیک بننے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ نیک بننے پر آمادہ کرتی ہے جبکہ بگڑا ہوا معاشرہ اور بری صحبت انسان کو بگاڑ کی طرف لے جاتی ہے۔ اسی لیے ہمارے پیارے نبی ﷺ نے فرمایا:

''انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لیے تم میں سے ہر ایک کو غور کرنا چاہیے کہ اس کی دوستی کس سے ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کی اصلاح و تربیت کے سلسلے میں عام سماجی رابطہ قائم رکھا۔ آپ ﷺ نے اپنے تعلقات کو صرف ضابطے کی حد تک نہ رکھا بلکہ تمام انسانوں سے عموماً اور اپنے اصحاب سے خصوصاً بہت قریبی ربط و ضبط رکھا۔ غرض یہ کہ حضور اکرم ﷺ کا یہ عملی کردار تھا جو اپنے اصحاب کی ہمہ جہت تربیت کر رہا تھا۔ آپ ﷺ کا کردار سب سے بڑا داعی اور مربی تھا۔ آپ ﷺ کی ذات حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق کا سرچشمہ تھی۔ ایسی ہی بلند کرداری اور صحابہ کرامؓ کی سیرتیں جو آپ ﷺ کے اعلیٰ کردار سے فیض یاب ہو رہی تھیں..... آج ان دونوں عناصر کی ہمارے حکمرانوں میں سب سے زیادہ کمی ہے..... ماضی و حال کی سیاست پر نظر ڈالی جائے تو ہنوز گرما گرمی اور ہلچل کی کیفیت ہے..... ایشیائی ترقیاتی بینک کی رپورٹ کے مطابق عالمی سطح پر وبائی امراض کے پھیلاؤ..... موسمیاتی تبدیلیوں اور تنازعات کے بحران نے ترقی پذیر ممالک کی معیشت کو تباہ کر دیا ہے۔ خصوصاً وطنِ عزیز کے حالات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے پیش گوئی کی ہے کہ سیاسی عدم استحکام، ناگہانی آفات اور عالمی سطح پر قیمتوں میں اضافے سے پاکستان شدید مشکلات سے دوچار ہے۔ امید ہے کہ 2024ء کے عام انتخابات قوم کے اعتماد میں اضافے کا باعث بنیں گے۔ سرمایہ کاری بڑھے گی جس سے ہماری ملکی معیشت میں بہتری ممکن ہو سکے گی..... ان خوب صورت امیدوں اور آس کے بند باندھتے ہوئے اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں..... وہاں بھی کئی امیدوار اپنے خوابوں کی تعبیر کے انتظار میں ہیں.....

بہاولپور سے سلمان سلیم کی بھولی بسری باتیں اور یادیں ''ستمبر کا شمارہ اس بار پچھلی دفعہ سے ذرا جلدی مل گیا ہے تو سوچا کہ کیوں نا اس بار ہم بھی تبصرہ محفل میں شریک ہونے کا شرف حاصل کریں۔ (خوش آمدید، اچھا سوچا) سب سے پہلے ٹائٹل کی بات کی جائے تو اس بار ٹائٹل بہت پیارا بنایا گیا ہے۔ خاص طور پر امجد رئیس صاحب کے سرد جہنم کے رنگ لیے ہوئے بہت پیارا لگ رہا تھا۔ اس کے بعد تبصروں پر مشتمل محفل میں جنید علی فرام ملتان ہمیشہ کی طرح اپنا رنگ جمائے ہوئے نظر آئے۔ ان کے تبصروں کو پڑھ کر مجھے بھی شوق ہو رہا ہے کہ میں بھی تھوڑا سا لکھ کر بھیج دیا کروں آج کل کے حالات اور مصروفیات نے انسان کو مشین بنا دیا ہے۔ کام زیادہ اور تفریح نہ ہونے کے برابر ہے لیکن اس سب میں جب تھکے ماندے رات کو سونے سے قبل اپنے پسندیدہ ڈائجسٹوں اور ان کے رائٹرز کو پڑھتے ہیں تو یقین مانیں دن بھر کی تھکن اتر جاتی ہے جیسے کسی نشے کے عادی کو نشہ ملے تو وہ پُرسکون ہو جاتا ہے اسی طرح مطالعہ ہمارا نشہ ہے جو بچپن سے ایسا لگا ہے کہ کسی اور نشے کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں گیا یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر اس برائی سے محفوظ رکھا ہے جس سے گھر، خاندان معاشرہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ تو میں شکر گزار ہوں ادارے کا جنہوں نے ہمیشہ بہترین رائٹرز کے ذریعے علمی ادبی معلوماتی تحریروں سے ہمیں نہ صرف بہت کچھ سیکھنے کو ملا بلکہ بہترین تفریح بھی میسر آئی۔ (یہ آپ کی عنایت ہے کہ خود کو مطالعے سے مستقل وابستہ رکھا ہوا ہے) جب بچپن میں ہم شہزادوں جادوگروں ٹارزن اور کولیس کے دور سے گزرے تو ایک دن دیوتا کا ایک حصہ ہاتھ لگا جسے ہم نے ریڈنگ کے نشے کو پورا کرنے کے لیے پڑھنا شروع کیا تو شروع میں کرداروں کا پتا ہی نہیں تھا لیکن جیسے جیسے پڑھتے گئے کردار بھی سمجھ آتے گئے اور ناول بھی دلچسپ لگنے لگا۔ دیوتا ایک ایسی جادوگری تھی، ایک ایسا طلسم ہوش رُبا تھا جس میں ہر طرح کے ملکی غیر ملکی حالات و واقعات، سازشیں، سائنسی ایجادات دوسروں کی سوچ پڑھ لینا ایکشن ایڈونچر جادوئی دنیا، روحانیت، شیطانیت غرض ہر طرح سے ہمیں یہ الگ ہی دنیا میں لے جاتی تھی۔ نواب صاحب کے بعد جنہوں نے متاثر کیا وہ علیم الحق حقی صاحب کا ناول عشق کا عین اور

pklibrary.com

انسان اور شیطان ناول ہیں جنہوں نے ڈائجسٹوں میں دلچسپی لینے اور خریدنے پر مجبور کر دیا بلاشبہ حقی صاحب کے تصوف پر لکھے گئے ناولز آج بھی اللہ کی طرف راغب کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ حقی صاحب کے علاوہ جن رائٹرز نے دیوانہ بنایا، ان میں احمد اقبال صاحب، کاشف زبیر صفِ اول میں شامل ہیں۔ پہلے احمد اقبال صاحب کی بھورے خاں کالے خان جیسے کرداروں پر مشتمل تحریریں تنہائی میں بھی ہنسنے پر مجبور کر دیتی تھیں تو بعد میں کاشف زبیر کی جلیل اور راجا سیریز نے بھی خوب ہنسایا۔ اس کے علاوہ کاشف زبیر مرحوم اللہ تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ ہر بار انوکھے اور جدید موضوعات پر تحریریں لکھتے تھے جو ایک سے بڑھ کر ایک شاندار ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا زرخیز دماغ عطا فرمایا تھا کہ ایک ایک ماہ میں تین سے چار ناول بھی ان کے پڑھنے کو مل جاتے تھے تو کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے JDP نے ہمیشہ معیار کو برقرار رکھا۔ اپنے وقت کے تمام بہترین مشہور رائٹرز کو ہم نے اسی ادارے میں یکجا دیکھا اسی لیے جاسوسی سسپنس سرگزشت سے ہمیں بچپن سے محبت ہے۔ پہلے گھر کے حالات نئے ڈائجسٹ خریدنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لوگوں سے پرانے شمارے مانگ کر پڑھتے تھے یا لائبریری سے لاتے تھے لیکن اب الحمدللہ کئی سالوں سے یہ تینوں ڈائجسٹ لگوائے ہوئے ہیں جو ہر ماہ ٹائم پر مل جاتے ہیں۔ آج کل کے رائٹرز میں بلاشبہ امجد رئیس صاحب بہترین سائنس فکشن لکھتے ہیں ان کی ہر تحریر کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ شیطانی ہتھیار بہترین ناول تھا تو اب سرد جہنم دیکھ کر دلی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ یعقوب بھٹی بھی زخم گزیدہ، سرورق کے پہلے رنگ میں اچھی کہانی لائے۔ احمد سلیم کی آخری کہانی بس صحیح رہی۔ اکثر دولت کی حرص پر گھومتی کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ دہرا اور شعلہ زن سلسلے بھی جاسوسی کے اپنے انداز میں چل رہے ہیں۔ عمران قریشی اچھا لکھتے ہیں مگر اس بار آپ بیتی نما کہانی تھی۔ انگریزی کہانیاں بھی کسی سے کم نہیں ہوتیں جو سسپنس کا تڑکا لگاتی ہیں۔ بہترین ایکشن رائٹر ہیں ان کے علاوہ اسما قادری، روبینہ رشید اور زویا صفوان شامل ہیں باقی رائٹرز بھی بہت اچھے ہیں اللہ تعالیٰ ادارے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور اسی طرح اچھے رائٹرز کی تحریریں ہم تک پہنچانے کا ذریعہ بنے رہیں۔ جاسوسی جیسا تھا ویسا ہی ہے اور ہمیں ایسا ہی پسند ہے۔''

کراچی سے محمد اقبال کے جذبات کی گھن گرج ''ماہ ستمبر کا جاسوسی دیر سے ہی ملا۔ ٹائٹل پر پرپل کلر چھایا ہوا تھا، حسینہ کا ہیئر اسٹائل اچھا تھا، نقش بھی اچھے تھے لیکن ٹائٹل کچھ دھندلا سا لگ رہا تھا۔ نیچے پستول والے صاحب سر سے آخر تک پیلے رنگ میں رنگے ہوئے تھے شاید پستول ہاتھ میں پکڑنے سے ان پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ دوسرے صاحب کو شاید ہماری طرح یہ سب کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ فہرست میں امجد رئیس کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح فکر انگیز تھا۔ معذرت کے ساتھ ہم کب تک 6 ستمبر مناتے رہیں گے۔ 71ء میں پاکستان دولخت ہو گیا۔ اور 2023ء تک دولخت سے نامعلوم کتنے لخت ہو گیا۔ نہ اتحاد نظر آتا ہے نہ اتفاق۔ رسا کشی جاری ہے۔ سیاست دانوں کا گمان ہے کہ ان کی وجہ سے پاکستان بچا ہوا ہے، افواج پاکستان کا گمان ہے کہ ان کی وجہ سے پاکستان قائم ہے۔ قائداعظم فقط ایک سال ہی یہ رسا کشی برداشت کر سکے اور پاکستان کو ان لوگوں کے حوالے کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے جن نادیدہ قوتوں کے ہاتھ میں آج بھی پاکستان کی لگام ہے۔ یہ پاکستان اللہ پاک نے قائم رکھا ہوا ہے اور سب کی رسی دراز کی ہوئی ہے کہ اپنی اصلاح کر لو اور پاکستان کو صحیح اسلامی جمہوریہ پاکستان بنا دو، ورنہ..... محفل میں جنید علی کی باتیں بہت بھلی لگیں۔ ملتان سے ہی محمد حسنین کا مختصر خط بھی اچھا تھا۔ حسنین نے چودہ اگست منانے پر جس طرح خوشی محسوس کی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال پر عوام ہر سطح پر ملک کے کرتا دھرتاؤں سے خوش نہیں ہے جو صرف اپنا پیٹ بھر رہے ہیں اور قرضے کی قسط بھرنے کے لیے عوام پر ٹیکس در ٹیکس لگا رہے ہیں۔ راولپنڈی سے سہانا شیخ کو خوش آمدید۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ سمیت دو چار خواتین اور وقت پر خطوط بھیج دیا کریں تو سب کے طویل خطوط پر قینچی چل جایا کرے گی۔ ملتان والوں کی طرح کوٹری سے بھی دو تبصرہ نگار آفاق احمد اور حمیرا رفیق کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کراچی سے بھی مابدولت کے ساتھ تنویر احمد کی آمد سے تعداد دو بنی۔ مگر جناب تنویر صاحب کے پانچ سطری خط میں کی گئی گزارش کی ہم پرزور حمایت کرتے ہیں، اس پر توجہ دی جائے۔ کہانیوں کی شروعات روبینہ رشید کی شعلہ زن سے کی۔ 26 ویں قسط نے واقعی مزہ دوبالا کر دیا۔ کریم جیسے خرانٹ شخص کی خوشی بہت اچھی لگی۔ سارہ کے ہاتھوں فیروز کی درگت بنتے دیکھنے کی خواہش تھی مگر فیروز کئی بار سارہ پر بھاری پڑا تھا اور کریم کی پوری کوشش کے باوجود ہاتھ نہیں آیا تھا اس لیے فیروز سے اس طرح جان چھڑائی گئی ورنہ کوئی بہت بڑا ایکشن دکھانا پڑتا۔ پہلی بار شمشیر، سونیا، شمع علی، کریم کی محفل میں ہنسی مذاق دکھایا گیا بہت اچھا لگا۔ اب بالآخر سارہ قید سے آزاد ہو ہی گئی، آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ حسام بٹ کی دہر کی یہ قسط شاندار رہی۔ اسٹارٹ سے لے کر اختتام تک سنسنی خیزی برقرار رہی۔ ناجیہ کا دکھ بڑا تھا جسے اس نے حوصلے سے برداشت کیا۔ ایشا راس کی مدد کے لیے موجود ہے۔ جاسم اور کامل نے شعیب چاچا کو عبرت ناک انجام سے دوچار کیا۔ جاسم اور کامل نے مل کر ڈیوڈ کو بھی جھکا دے دیا اب جاسم، فیضی کا شکار کرنے..... فیضی کے فلیٹ پر موجود ہے، آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ یعقوب بھٹی کی تحریر زخم گزیدہ نے خوش کر دیا۔ ایسا لگا جیسے اندر

کہیں حقیقی ٹھنڈ پڑ گئی ہو۔ بہت عمدگی سے مضبوط گرفت کے ساتھ کہانی تحریر کی۔ ہمارے معاشرے کی ناانصافیوں کو اسی طرح ختم کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہمارا سسٹم کبھی صحیح نہیں ہو سکتا، دولت کی چمک نے سسٹم کے کرتا دھرتاؤں کی آنکھیں چندھیا دی ہیں، انہیں ملک سے سروکار ہے نہ یہاں کی عوام سے۔ صرف اپنی تجوریاں بھرنے کی ہوس ہے۔ کاش یہاں بھی کوئی ایسا الزیب ہو جس کی اپنی عدالت ہو۔ عبدالرب بھٹی کی ثبوت مختصر مگر دلچسپ تحریر رہی۔ دیپک شرما کی نرماسے ہلکی پھلکی نوک جھوک اچھی لگی۔ دیپک نے تیزی سے حرکت کی اور کیس حل کر لیا۔ محمد فاروق انجم کی سپاری بھی اچھی تحریر تھی۔ تین دوست جو دولت حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے تھے، ان کا سرغنہ شانی اپنے مشن کی تکمیل کے لیے جس علاقے میں موجود تھا وہاں نئی کہانی شروع ہو گئی۔ آصف خود عیاشیاں کر رہا تھا اور بیوی کو بے وفا سمجھ کر اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ قسمت نے سب کرداروں کو ایک گھر میں جمع کر دیا، سب اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئے۔ عمران قریشی کی پڑتال نے کوئی خاص متاثر نہیں کیا۔ ارسل ایک نفسیاتی کیس نظر آیا۔ ماہرِ نفسیات اریشہ نے اس کے ہاتھ قتل کروائے اور ارسل کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔''

ملتان سے جنید علی کی سفر در سفر تبصرہ نگاری ''گرمیاں کہہ رہی ہیں الوداع، موسم ہے سہانا، ہے یہ دل عاشقانہ مزاج ہے شاہانہ، لفظ سمسٹر کے شاندار رزلٹ کی وجہ سے ہر طرف خوشیوں کا ہے ٹھکانا، ہمیں چاہیے سیر و سیاحت کا بہانہ تو آئیں ذرا ہمارے سنگ آپ بھی ہمارے ٹور کا حصہ بن جائیں جس میں ستمبر کا جاسوسی ہمارے سنگ سنگ ہے۔ سفر شروع کرنے سے پہلے ذرا سرورق پر ایک نظر ڈال ہی لیتے ہیں کہ سرورق کی حسینہ ہمارے دیدار کی کب سے منتظر ہے جو پیچھے مڑ کر ہمیں دیکھ رہی ہے (سہی کہا نا۔ اب ایڈیٹر کہیں گی اف جنید علی کی خوش فہمیاں) ظفر صاحب کو 10/10 نمبر دیے جاتے ہیں اور لسٹ (فہرست) دیکھ لیتے ہیں کہ ہم نے کہاں کہاں سے جانا۔ اچھے مقامات ہیں اور اب ذرا ''چینی نکتہ چینی'' جسے کرنے میں ہم جاسوسی پڑھنے والوں نے پی ایچ ڈی کیا ہے اس سلسلے سے بھی دو دو ہاتھ کر ہی لیتے ہیں جیسے آج کل جاسم و کامل کر رہے ہیں۔ کراچی کے اقبال صاحب کی شکایتیں پسند آئیں۔ ساڑے ویر حسنین بھرادی نکی حاضری نے وی محفل دالطف دوبالا کر دتا۔ سہانا شیخ کا پہلا خط بھی اچھا لگا اور انہیں سیکھنے کی ضرورت نہیں کہ تبصرہ دلچسپ تھا۔ کوٹری سے آفاق احمد اور حمیرا رفیق کی حاضری حسب روایت شاندار تھی جو ہر ماہ ہونی چاہیے تو وہیں سینئر تبصرہ نگار انور یوسف زئی کی کمی محسوس ہوئی۔ جی تو چلیں بس ہے تیار اور سفر کا ہو گیا ہے آغاز۔ مغل بادشاہوں کی یاد دلاتا ہیں ایکٹر پر پھیلا ہوا لاہور کا مشہور تاریخی ''شاہی قلعہ'' جو اپنی مثال آپ ہے جس کی تعمیر ہی شاندار جو سامنے ہے پہلا پڑاؤ ہے جس کے ساتھ اس بار ہماری پسند کو مدِنظر رکھتے ہوئے سائنٹیفک فکشن پر مبنی تحریر کے سنگ امجد صاحب اس بار ہمیں ''سرد جہنم'' میں لے کر جا رہے ہیں۔ کہانی کا نام بہت منفرد تھا۔ بہت دلچسپ تھی جس میں انتو ناگالوکی قابلیت و ذہانت اور پیشہ ورانہ کارکردگی عروج پر تھی۔ شاہی قلعے کے نزدیک واقع دنیا کی خوب صورت ترین بادشاہی مسجد جو مغل بادشاہ... اورنگزیب نے تعمیر کروائی جو تاریخی ورثے کا منہ بولتا ''ثبوت'' ہے اس سے واپسی پر ہی ہم نے بھی بھٹی صاحب کی اس بار کی کہانی ثبوت پڑھی جس میں ایک اہم دستاویز تھی، جس کی وجہ سے وجے اور اس کی والدہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ عکس فاطمہ کی تحریر نکتہ بین میں درست کہا گیا کہ سراغ رسانی ذہانت کا کھیل ہے جو شیرف نے اچھے سے کھیلا یعنی مسز پول جس نے اپنی بیٹی کو صدر بنانے کے لیے اس کا بریسلیٹ کورٹنی کو بدنام کرنے کے لیے اس کے باکس میں رکھا مگر تحریر کے سراغ رساں سے بچ نہیں سکیں اور پکڑی گئیں اور یہ تحریر پڑھتے ہوئے 1960ء میں قرارداد پاکستان کی جاہ مقام پر تعمیر شدہ مینار پاکستان جسے یادگار پاکستان بھی کہتے ہیں، اس کے اردگرد کا دلکش سبزہ زار بھی ہمارے سنگ رہا۔ اور اب بات کرتے ہیں ہمارے ایک پسندیدہ سلسلے یعنی شعلہ زن کی موجودہ قسط کی جس میں سارہ کی خیریت کی خبر کریم اور دیگر کو مل گئی۔ ابراہام کا ایک مہرہ نوم سرد جہنم میں چلا گیا اور فیروز سارہ کے پیچھے جنونی پاگل ہو گیا ہے جس کا انداز فیروز کی ناول میں انٹری سے ہی ہمیں تھا۔ یہ قسط بھی سسپنس میں ختم ہوئی یعنی سارہ خیر سے فرار ہو گئی۔ اس سلسلے کی پسندیدگی کی وجہ سے ہم اپنے شہر ملتان کے شمال مغربی کنارے پر واقع مزار شاہ رکن عالم کا جو شیخ رکن الدین عبدالفتح کا مقبرہ ہے اور سرخ اینٹوں سے بنا ہوا اور شیشم کے شہتیروں سے جکڑا ہوا ہے جو ملتان کی جان ہے، اس کا وزٹ کرنے کو آپ کو کہیں گے۔ عائشہ بصیر کی ہوم بھی ایک حقیقی و غیر حقیقی احساسات پر مبنی ایک دلچسپ تحریر تھی جس میں ایمی کی معصومیت اور اس کی ماں کی خود غرضی تھی۔ یہ کہانی پڑھ کر ملتان کے جنوب کی سمت میں پنجاب کا دوسرا بڑا دریا یعنی دریا چناب کا دل فریب منظر نگاہوں میں سمایا۔ محمد فاروق انجم کی کہانی سپاری جس کا نام منفرد تھا ساتھ کہانی بھی اچھی تھی جس میں تمام واقعات تیزی سے رونما ہوئے اور انجم صاحب کی تحریروں کی یہ ہی پہچان ہے کہ تیزی سے بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ اور یہ تحریر پڑھ کر ہم بہاولپور کے مشہور فورٹ میں پہنچ گئے جس کی دیواریں تیس میٹر اونچی ہیں جو جسل میر اور بہاولپور کے بادشاہ راول دیو راج بھٹی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے تعمیر کیا گیا جو چولستان صحرا کے وسط میں سیاحوں کے لیے اہم مقام ہے۔ اب چلتے

ہیں اپنے دوسرے پسندیدہ سلسلے دہر کی طرف' ارے ارے آپ پڑھنے والے تو حیران ہو رہے ہیں جی ہاں اب سے یہ سلسلہ ہمارا پسندیدہ ہو چکا ہے جس کا انتظار ہمیں بے صبری سے ہر ماہ رہتا ہے۔ اس قسط میں جاسم اور کامل نے چچا شعیب کو پکڑ ہی لیا اور اس کا اچھے سے آپریشن کیا ساتھ دونوں نے بن عرفات کی طبیعت درست کرنے کے بعد فائنل ٹچ دیا اور ساتھ سیکنڈ لاسٹ پیچ پر فیضی بھی جاسم و کامل کے قابو میں آ ہی گیا مگر آخر میں سسپنس پر اینڈ ہوا۔ اس قسط کو پڑھتے ہوئے ہم نے بہاولپور کا آرمی فوج کے انڈر ہوا نور محل کا وزٹ کیا جو اس شہر کی پُرکشش جگہ ہے جس کا تعلق بہاولپور کی سلطنت نوابی سے تھا جس میں نوابوں کی استعمال شدہ چیزیں موجود ہیں جو سیاحوں کے لیے تفریح کا باعث ہیں۔ سفر اپنی منازل طے کر رہا ہے جس کا اختتام کراچی میں ہوگا۔ لیجیے ہم سکھر پہنچ گئے جہاں ہمارے نانا کا گھر بھی ہے اور برطانوی طرز کی عظیم یادگار یعنی لینس ڈان برج جسے آپ اور ہم لینس والا پل بھی کہتے ہیں اور یہ برج روہڑی اور سکھر کے شہروں کو جوڑتا ہے جس کے نیچے پاکستان کا سب سے بڑا دریائے سندھ موجود ہے۔ اس پر ہم سفر کر رہے ہیں اور ساتھ عمران قریشی کی کہانی پڑتال پڑھ چکے ہیں جس میں الجھنوں میں قید اور مضطرب ارسل کی انوکھی کہانی کے پیچ و خم ہیں جو محبت کا مارا ایک مینٹل کیس ہے جو منحہ کے ساتھ رہتے ہوئے اریشہ کو پانے کے لیے بیلا کو ختم کرنا چاہتا ہے اور انسپکٹر کو اگلے جہاں میں پہنچا پر پُرسکون ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خیال میں بیلا کو ختم کر چکا ہوتا ہے۔ اس بار می ڈائجسٹ میں کہانیوں کے درمیان موجود مزاحیہ خاکے اور لطائف سفر میں گوشہ ظرافت کی طرح ہیں۔ لیجیے کراچی آ گیا ہے اور سرورق کی کہانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ارے واہ بہت ہی اچھا مقام کراچی کے لیے منتخب کیا گیا ہے یعنی یعقوب بھٹی کی آمد ہے۔ کہانی میں معاشرے کے بہت سے تلخ پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ دلشاد اختر کا کردار زہر لگا۔ نفیس راجا اور زخم گزیدہ تو تھے ہی قوم کے ہیرز اور ساتھ آخر میں راؤ دل دار بھی ان میں شامل ہو گیا جو ملک و قوم سے برائی و ظلم کے خاتمے کے لیے سرگرداں ہیں۔ کہانی کا پلاٹ جاندار تھا اور انداز ہمیشہ کی طرح آخری صفحات پر شاندار کہانی جس میں برائی کے خلاف آواز اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے مرکزی کردار۔ اس تحریر کو ہم نے بھی محب وطن و بانی پاکستان کے مزار سے واپسی پر پڑھا۔ آخری کہانی یعنی اسیرانِ ہوس احمد سلیم سلیمی کے قلم سے پڑھی جس میں تین دوست لا حاصل دولت و زر کی ہوس میں اندھے ہو چکے تھے اور تینوں نے ایک دوسرے کو دولت کی خاطر غلط راستہ اختیار کرتے ہوئے نقصان پہنچایا مگر آخر میں ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ ایک تو جان سے گیا اور باقی دو کے لیے صرف سزا و پچھتاوا مقدر ٹھہرا۔ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد آخر میں دلکش نظاروں کے سنگ ایک جزیرے یعنی کراچی میں مبارک کورٹ اور کیماڑی ٹاؤن میں واقع چرنا آئی لینڈ جو بحیرہ عرب کے کنارے پر ہے جو پاکستان نیوی لائن آف کنٹرول کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ہم نے وزٹ کیا۔ آخر میں تابوت میں کیل ٹھونکتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ستمبر کا جاسوسی پڑھ کر ہر بار کی طرح یہ لگا جیسے جے ڈی پی آفس جا کر جاسوسی ڈیپارٹمنٹ کی محنتی کارکردگی ملاحظہ کی ہو کہ شمارہ ہر بار کی طرح ان کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کیسا لگا ہمارا سفرنامہ + تبصرہ خطوط میں ضرور بتائیں تو ملتے ہیں اگلے ماہ کہ اب ہم گھوم پھر کر تھک چکے ہیں گڈ بائے۔''

کوثری سے حمیر ارفیق کی تعریفیں ''جاسوسی کا انتظار کرتے کرتے بور ہونے لگی تو اچانک کاشف بھائی نے میری بوریت دور کر دی جاسوسی ہاتھ میں تھما کر۔ ٹائٹل پر میرا پسندیدہ کلر چھایا ہوا تھا۔ حسینہ خوب صورت لگ رہی ہے۔ کان کی بالی، ہیئر اسٹائل اور پوز کیا بات ہے جی۔ صنفِ کرخت ظفر صاحب ایسے کیوں بناتے ہیں بُرے سے۔ فہرست مناسب تھی۔ امجد رئیس کی موجودگی نے چار چاند لگا دیے۔ اداریہ عمدہ تھا مگر ساتھ ہی افسردہ کر دیا۔ ماضی سے نکل کر کب پاکستان آگے بڑھے گا شاید وہ وقت ہم نہ دیکھ سکیں۔ (خبردار، ناامیدی، مایوسی گناہ ہے) خطوط کی محفل میں ملتان سے جنید پہلے نمبر پر موجود ہیں اچھا تبصرہ اور معلومات فراہم کیں۔ حسنین کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ ہمارا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ آفاق احمد۔ تنویر ایم اے کی استدعا بے جا نہیں ہے واقعی یعقوب بھٹی کی تحریروں میں روز بروز نکھار آتا جا رہا ہے۔ یعقوب بھٹی سے ہی کہانیاں پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ زخم گزیدہ بھی واقعی ان کی ایک یادگار تحریر ہے۔ بہت عمدگی سے ترتیب دی گئی۔ اندر ہی اندر میں بھی کسی ایسی ہی ٹیم کے لیے دعا کر رہی ہوں جو ہمارے نظام کو راہ راست پر لا سکے۔ ویلڈن جی۔ دعا تو میں روبینہ رشید کی سلسلہ وار شعلہ زن کی ہیروئن سارہ کے لیے بھی کر رہی ہوں کہ وہ جلد ایکشن میں آ جائے، بس بہت ہو گئی۔ سارہ سے کریم کی گفتگو نے کریم کا حوصلہ بڑھا دیا ہے، اس خبر نے کریم کی پوری ٹیم میں خوشی کی لہر دوڑا دی ہے کہ سارہ زندہ ہے۔ فیروز کا قصہ اتنی آسانی سے مُکا دیا گیا، کچھ ہضم نہیں ہوا۔ ابراہام کے ایجنٹ نوم اور لاوی اتنی آسانی سے معلومات حاصل کرتے ہوئے علی کے اسپتال پہنچ گئے عجیب سے لگا۔ حسام بٹ کی دہر پندرھویں قسط میں داخل ہو گئی ہے۔ تیز ٹیمپو کے ساتھ یہ قسط بہترین ثابت ہوئی۔ پولیس کمشنر قاموس اور جاسم اور کامل کے باہمی تعاون سے شعیب چاچا، جاسم اور کامل کے قبضے میں آ کر اپنے شقی انجام کو پہنچا اور مسٹر برانڈ و قاموس کی تحویل میں۔ کامل اور جاسم نے بن عرفات کی درگت بنا کر ڈیوڈ کو انگاروں پر کھڑا کر دیا ہے۔ اب فیضی کا

کیا بنے گا کالیا، یہ اگلی قسط میں معلوم ہوگا۔ چھوٹی کہانیوں میں محمد فاروق انجم کی سپاری، عائشہ نصیر کی ہوم اور پڑتال عمران قریشی کی پڑھ سکی ہوں، مناسب کہانیاں ہیں۔ احمد سلیم سلیمی بھی بہت اچھی تحریریں جاسوسی ڈائجسٹ کے ذریعے قارئین کو پہنچا رہے ہیں، بہت پسند آئی مجھے۔ آخر میں امجد رئیس کی سرد جہنم پڑھی، ہمیشہ کی طرح ان کی تحریر بہت جاندار رہی۔ ایک ہی فلو میں پڑھنے کا مزہ آجاتا ہے ان کی تعریف میں کیا کہوں سمجھ نہیں آرہا بس سو میں سے سو نمبر دیے۔''

بہاولپور سے بریرہ رسول کی دلچسپ اور محبت بھری باتیں ''میں مسلسل پچیس سال سے دوسرے رسالوں کے ساتھ جاسوسی پڑھتی ہوں اور اب بھی شادی کے بعد جبکہ میرا بیٹا ماشاءاللہ سیکنڈ ایئر اور بیٹی بی ایس کر رہی ہے، ڈائجسٹ سے رشتہ برقرار ہے۔ ہر ماہ جاسوسی باقاعدگی سے ہاکر دے کر جاتا ہے اور میں کچھ گھر کی مصروفیت اور میری طبیعت کی خرابی کی وجہ سے رسالہ جلدی نہیں پڑھ سکتی اس لیے آرام آرام سے پڑھتی ہوں اور تبصرے کا وقت گزر جاتا ہے۔ میرے شوہر کی سپورٹ ہے کہ کبھی میرے شوق پر روک ٹوک نہیں کی۔ اب جنید بیٹے نے کہا کہ آنٹی تبصرہ اس بار تو کر ہی دیں تو لکھ رہی ہوں (بہت نوازش..... آپ کی خاموش محبت بھی ہمارے لیے سرمایہ ہے) بہت مشکل سے لکھ رہی ہوں میں بول رہی ہوں اور یہ گوگل ایپ الفاظ بنا رہی ہے تو تبصرہ بن رہا ہے۔ سرورق اس بار بھی اچھا تھا مگر اتنا زیادہ بھی نہیں کہ ذاکر کی کمی یہ آج کے آرٹسٹ کہاں پوری کریں گے۔ تبصرے تو سب ہی اچھے کرتے ہیں جو ڈائجسٹ میں ہوتے ہیں چاہے کوئی بھی کرے۔ شادی سے پہلے تو دو دن میں ہی رسالہ ٹرخا دیا جاتا تھا اب پورا مہینہ لگ جاتا ہے۔ کاشف زبیر میرے پسندیدہ رائٹر تھے۔ طاہر بھائی کے انگارے اور بھٹی بھائی کی آوارہ گردیاں تو یاد ہی رہیں گی۔ امجد رئیس بھائی ہمیں تو انگریز بنا کر دم لیں گے پھر ہر بار اتنی اچھی کہانیاں لاتے ہیں ہاں مگر اس بار سرد جہنم اتنی اچھی نہیں لگی جتنی شیطانی ہتھیار تھی۔ نام ہی اچھا تھا اتنا ناول نہیں۔ ایک وائرس کی شیشی کو بچایا گیا اور کچھ خاص نہیں تھا۔ سلسلے وار ناولز اچھے ہیں مگر اب ختم ہو جانا چاہیے یہ روبینہ رشید کا ناول ... اب تو تھک گئی ہوں سارہ کی پریشانیاں ہر قسط میں پڑھ پڑھ کر بوریت ہوتی ہے بلاوجہ چل رہا ہے۔ حسام بٹ کا ناول بھی اچھا سا ہے۔ جاسم کے گرد دو لڑکیاں اور ایک جنٹی ہے۔ ٹائٹل کی پہلی کہانی مزے کی تھی جو یعقوب بھٹی نے محنت سے لکھی۔ آخری کہانی کا نام تو لالچ بری بلا ہے، ہونا چاہیے تھا۔ تینوں ہی بہت رذیل سے تھے۔ ایک دنیا سے دفع ہوا اور باقی دو نے ایک دوسرے کو اچھے سے دھوکا دیا۔ عمران قریشی نے ہر بار کی طرح اس بار بھی اچھا لکھا۔ بس اس بار کہانیاں کم تھیں ذرا زیادہ دیا کریں اور عکس فاطمہ کی کہانی کے ہیرو کی نکتہ بینی بھی پسند آئی۔ باقی کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں۔ ہاں تم لوگ اچھا کام کر رہے ہو ہمیشہ سے۔ معراج بھائی کے بعد بھی چلیں جی پھر کبھی ملاقات ہوگی جاسوسی میں خوش رہیں۔''

کوٹری سے آفاق احمد کی خواہشات و منصوبے ''جاسوسی حسبِ معمول دیر سے ملا۔ کوئی بات نہیں جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ ٹائٹل مناسب لگا۔ دو مجہول سے مرد حضرات اور بیچ میں خوب صورت حسینہ۔ فہرست سادہ تھی۔ اس بار پہلی کہانی امجد رئیس صاحب کی ہے۔ بہت عمدہ طریقہ ہے ان کے لکھنے کا۔ اداریے پڑھ کر آپ کی مثبت سوچ کا پتا چلتا ہے خدا سے دعا ہے کہ ملکی حالات جلد اچھے ہوں۔ خط پوسٹ کرنے جا رہا تھا کہ معلوم ہوا پیٹرول کی قیمت میں مزید اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اللہ پاک ہم پر اپنا رحم فرمائے۔ ہم پاکستانی اپنے ماضی کے چند کارناموں پر ہی قناعت کیے ہوئے ہیں اور ہمارا پڑوسی ملک چاند پر پہنچ گیا ہے، بے شمار ڈیم بنا چکا ہے۔ ان کی حکومت مضبوط ہے، ہماری حکومت 76 سال بعد بھی کشکول ہاتھ میں لیے کھڑی ہے۔ سب پریشانیوں کے باوجود اول نمبر پر موجود جنید کے تبصرے سے خوب محظوظ ہوا۔ ان کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ طویل لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کراچی سے محمد اقبال کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ محمد حسنین نے کچھ اختصار سے کام لیا۔ پنڈی سے سہانا شیخ اور حمیرا رفیق کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ تنویر کی فرمائش پر ضرور غور کیا جائے۔ حسام بٹ کی سلسلے وار تحریر دو ہر سے شروعات کیں۔ ناجیہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ جاسم اور ناجیہ کی نوک جھوک اچھی لگتی تھی۔ ایشنار، جاسم کا بھرپور ساتھ دے رہی ہے، ہر قدم پر مدد کے لیے موجود ہوتی ہے۔ جاسم اور کامل نے شعیب چاچا کا بیڑا غرق کر دیا ہے، اب ان کی پیش رفت فیضی کی جانب ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ روبینہ رشید کی شعلہ زن ہر بار سارہ پر ختم ہو رہی ہے مگر اس کو ایکشن میں دیکھنے کی خواہش ہنوز باقی ہے۔ کریم کی ٹیم میں اضافہ تو ہو گیا ہے مگر دشمن پر بھرپور وار نہیں کر پا رہے۔ بہرحال پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ زخم گزیدہ یعقوب بھٹی کی ایک شاندار تحریر رہی۔ ہم موجودہ آرمی چیف میں الزیب کو تلاش کر رہے ہیں کہ شاید وہی کچھ کردار ادا کر سکیں۔ محمد فاروق انجم کی سپاری بھی دولت کے حصول کے گرد گھومتی عمدہ تحریر تھی۔ عمران قریشی اس بار ایک نفسیاتی کردار ارسل کے ذریعے قتل کرواتے رہے، کیا ہو رہا ہے جناب آپ کی تحریروں کو۔ احمد سلیم سلیمی کی اسیرانِ ہوس بہترین کہانی رہی۔ دولت کے پجاری دولت کے پیچھے بھاگتے بھاگتے کہاں پہنچ گئے۔ کیا انجام ہوا۔ واقعی دولت سب کچھ نہیں ہوتی۔ امجد رئیس صاحب کی طویل تحریر کو آخر میں پڑھنا شروع کیا ہے۔ سکون سے پڑھنے والی کہانیاں ہوتی ہیں ان کی اس لیے اس پر

تبصرہ آئندہ شمارے میں کرنے کی کوشش کروں گا۔'' (انتظار رہے گا)

حیدرآباد سے عاتکہ کامران کی قناعت وعنایت ''پچھلے مہینے کی طرح اس ماہ بھی ڈائجسٹ دیر سے ملا جس کی وجہ سے خط بھیجنے میں دیر ہوئی تھی۔ اسی لیے بلیک لسٹ میں جگہ ملی۔ اس بار اور جلدی خط لکھ رہی ہوں شاید محفل میں جگہ بن جائے۔ ڈائجسٹ تو کافی عرصے سے پڑھ رہی ہوں مگر خط لکھنے کے بارے میں کبھی سوچا نہیں، پچھلے ماہ ہمت کی مگر نتیجہ صفر رہا۔ ستم یہ کہ کراچی میں رہتے ہوئے بھی اس بارے میں نہیں سوچا، شادی ہو کر حیدرآباد آئی، مگر ڈائجسٹ سے رشتہ قائم رکھا۔ اب ماشاء اللہ شادی کو چھ سال ہو چکے ہیں اور ہماری زندگی میں عبدالہادی کی صورت اللہ نے بیٹا عطا فرمایا۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ان سب مصروفیات کے باوجود ڈائجسٹ سے رشتہ قائم ہے۔ ملتان سے جنید علی کا اول نمبر پر تبصرہ پڑھ کر حوصلہ ملا اگر جلدی خط پوسٹ کر دیا تو جگہ مل ہی جائے گی سو اب انتظار ہے۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ فہرست اچھی تھی۔ آپ کا مختصر اداریہ تو رُلا دیتا ہے مگر آخر میں امید کی جوت بھی جگا دیتا ہے۔ کہانیوں میں امجد رئیس کی موجودگی میں کوئی دوسری کہانی شروع نہیں کرتی۔ بہت اچھے انداز سے ترجمہ کہانی پیش کرتے ہیں۔ شروع کروں تو اختتام تک ہی پڑھتی چلی جاتی ہوں اس لیے ہمیشہ ان کی کہانیاں رات میں شروع کرتی ہوں۔ ڈائیلاگز بہترین ہوتے ہیں۔ تمام جزئیات پر مضبوط گرفت ہوتی ہے سرد جہنم واقعی بہترین تحریر پیش کی امجد رئیس نے۔ روبینہ رشید کی شعلہ زن اور حسام بٹ کی دہر دونوں ہی بہترین چل رہی ہیں۔ یعقوب بھٹی کی زخم گزیدہ بھی کلاسک تحریر تھی۔ احمد سلیم سلیمی کی اسیرانِ ہوس نے ہوش اُڑا دیے کہ دولت کی ہوس انسان سے کیا سے کیا کرا دیتی ہے۔ اچھے جا رہے ہیں احمد سلیم سلیمی۔ چھوٹی کہانیاں سب مناسب تھیں، کوئی آؤٹ اسٹینڈنگ نہیں تھی۔ مختصر تبصرے پر ہی قناعت کر رہی ہوں وقت کی کمی کی وجہ سے۔''

آزاد کشمیر سے احتشام الحق حقی کا محبت نامہ ''اس سے پہلے بھی جاسوسی میں دو بار ہمارے خط لگ چکے ہیں۔ ستمبر کا شمارہ اس بار بھی لیٹ ملا۔ اس بار جنید بھائی کے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے ہم مختصر ارادہ کر چکے تھے کہ تبصرہ لکھنا ہے۔ جلدی میں سرورق پر نظر دوڑائی۔ سرورق عمدہ ہے جو جاسوسی کے معیار کے مطابق ہے۔ ایک نوجوان اپنے کام میں مصروف اور ایک دوشیزہ کا سائڈ پوز تھا۔ چینی نکتہ چینی کی محفل میں کرسی صدارت پر ملتان سے بھائی جنید علی احسن انداز میں براجمان ہیں۔ کراچی سے محمد اقبال کی حاضری اچھی لگتی ہے اور حسنین صاحب کی حاضری کے بغیر یہ محفل ادھوری ہے۔ آفاق احمد اور حمیرا رفیق کی حاضری بہت مختصر ہوتی ہے مگر چلیں ہوتی تو ہے۔ کہانیوں پر نظر ڈالی تو جیسے جی خوش ہوا۔ ہمارے فیورٹ رائٹر امجد رئیس سرد جہنم کے ساتھ براجمان ہیں، ویلڈن امجد صاحب آپ کی تحریریں بہت عمدہ اور انداز بہت ہی سنسنی خیز سا لگتا ہے۔ اس سال کے شروع میں آپ کی کہانی مجھے بہت پسند آئی تھی جاسوسی والی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ثبوت اوسط درجے کی کہانی تھی، جاسوس دیپک شرما نے وجے کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچایا لیکن وجے کی ماں کی بھی قربانی دینی پڑی۔ سنسنی خیز کہانیوں کے خالق محمد فاروق انجم کی کہانی سپاری دلچسپ رہی۔ آصف اور رابی کی محبت کی دلنواز داستان لیکن آخر میں رابی کا آصف کو معاف کر دینا بالکل اچھا نہیں لگا۔ اسے شانی کی گولی لگنی چاہیے تھی۔ عمران قریشی ہمیشہ ایک منفرد موضوع لے کر آتے ہیں اور اس بار بھی اس روایت کو برقرار رکھا۔ ارسل جو کہ دوہری شخصیت کی بیماری کا شکار تھا منہ کو بلا سمجھ کر مار دیا۔ آخر میں پولیس انسپکٹر کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اریشہ کا وجود تھا یا نہیں یہ خود ایک سوال بن گیا۔ عائشہ نصیر کی کہانی بالکل پسند نہیں آئی اور نہ ہی سمجھ آئی۔ ان کو چاہیے کہ آسان الفاظ میں کہانی لکھیں جب کہانی سمجھ ہی نہیں آئے گی تو پسند نہ پسند بعد کی بات ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی جذبوں اور ہنگاموں کے منظر نگار یعقوب بھٹی زخم گزیدہ کے ساتھ حاضر ہیں جسٹس نفیس راجا اور دلشاد اختر کی ملی بھگت اور پاکستان کے ناقص عدالتی نظام کو بہت عمدگی سے بیان کیا۔ گینگ ریپ کے مجرموں کے قتل پر پہلے شک سرمد پر رہا کہ شاید وہ اس میں شامل ہو لیکن جس طرح بھٹی صاحب نے رخ اچانک الزیب نامی تحریک کی طرف موڑا، وہ قابلِ ستائش ہے۔ بہرحال تمام قاتل اپنے انجام کو پہنچے، کہانی کی اختتامی سطور سے لگتا ہے اس موضوع پر مزید پڑھنے کو ملے گا۔ احمد سلیم سلیمی پچھلے کچھ عرصے سے چھائے ہوئے ہیں بہت زبردست تحریریں لے کر آتے ہیں۔ اسیرانِ ہوس کے معاملے میں بھی موصوف نے مایوس نہیں کیا، بہت عمدہ کہانی تھی۔ شیر باز نے اپنے دوستوں کو خوب چونا لگایا۔ سراج اور جاوید کو جب معلوم تھا کہ شیر باز دو نمبر آدمی ہے تو اس کے ساتھ جرم میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ان سب کی دولت کی ہوس میں شیر باز سمیت بادشاہ خان اور یعقوب بھی راہیِ عدم ہوئے۔ مجموعی طور پر خوب رنگ جمایا۔ دہر اور شعلہ زن پر اگلے ماہ بات کریں گے کہ ابھی پڑھی نہیں۔ اس دعا کے ساتھ اجازت دیں کہ اکتوبر کا شمارہ ہمیں وقت پر مل جائے اور ہم ایک مفصل تبصرہ لکھ سکیں۔'' (ان شاء اللہ)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔
شاہدہ مختار، کراچی۔ شفیع اللہ، پشاور۔ نعمان ندیم، کراچی۔ حسن علی۔ لاہور۔

سزائے دوراں

زویا صفوان

زندگی قدرت کا حسین تحفہ ہے مگر جب زندگی کے کسی ایک پہلو میں غلو کی روش اختیار کی جاتی ہے تو زندگی کے دوسرے پہلو اس سے متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں... قریبی اور بہت سے حقوق اور ذمے داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی بھی ہوتی ہے... کسی نہ کسی کی حق تلفی بھی ہوتی ہے... خود پسندی، خود پرستی میں مبتلا ایک ایسے ہی شخص کے شب و روز... وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی زندگی مسرت... دل لگی اور فرصت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے... ان کی خودفریبی... مزاج کی بے اعتدالی... تندخوئی کبھی کوئی تباہی نہیں لائے گی... انہیں ہمیشہ اپنی شخصیت کے طلسم میں گرفتار نازنینوں کی قربت میسر رہے گی... قربت و فرقت کا فاصلہ عبور کرتی سزائے دوراں کا آغاز...

نفس کی سحر انگیز.....سود و زیاں سے بے نیاز بے طرح لذت آمیز مسافت کی فتح و شکست

اُس کا وجود کسی خلا میں معلق تھا۔

اطراف پُر دھند طاری تھی۔ قلب و روح پر اس قدر تناؤ تھا کہ اعصاب منجمد ہو چکے تھے۔ ایسی کیفیت کا تو زندگی میں تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن یہی زندگی ہے۔ یہ از خود ایسے حالات بنا دیتی ہے کہ انسان ایسے ہی کسی خلا میں معلق ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اُس نے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کر کے اعصاب پر قابو پانے کا آغاز کیا۔ دھیرے دھیرے اس کوشش میں کامیابی ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد اعصاب قابو میں آئے تو حواس قدرے بحال محسوس ہونے لگے۔ اب اطراف کی دُھند چھٹنے لگی تھی۔

اس لمحہ دل میں خوش فہمی پیدا ہوئی کہ حالات میں بہتری در آئے گی۔ مسائل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ زندگی ایک بار پھر سابقہ ڈگر پر لوٹ آئے گی۔ اس کے وجود میں ایک پل کے لیے وہ سب کچھ دوبارہ اپنی دسترس میں لینے کا عزم مچلنے لگا لیکن پھر فضا میں یکدم تبدیلی در آئی۔

اپنے اعصاب پر قابو پا کر حواس بحال کرتے ہی اُسے دو راہیں دکھائی دینے لگیں۔ پہلی راہ میں شدید تاریکی تھی۔ گھپ اندھیرا ایسا کہ

pklibrary.com

pklibrary.com

ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دے رہا تھا۔ دوسری راہ پر نکھرا اُجالا تھا۔ خوش کن بہار کی مہک تھی۔ تتلیاں اُڑتی ہوئی ہر سُو رنگ بکھیر رہی تھیں۔ دور کہیں سُریلے نغموں کی گنگناہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن یہ کیا؟

یہ کیسا تضاد تھا؟

تاریکی میں کسی گھٹن کا شائبہ نہ تھا۔ وہاں ایک پُرسکون سا آرام کیوں محسوس ہو رہا تھا؟ ایسا آرام جو کسی سحر کی طرح اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس نے دوسری جانب نگاہ دوڑائی۔ نکھرے اُجالے، خوش کن بہار کی مہک، رقصاں تتلیوں اور سُریلے نغموں کی گنگناہٹ میں ایک عجیب خاردار چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ گھٹن ایسی کی وجود میں وحشت برپا ہونے لگی۔

''کیا کروں؟ اُف! زندگی یہ کس موڑ پر لے آئی ہے؟ میں کیا کروں؟'' اس نے اُلجھ کر سوچا۔

چند لمحے اسی تذبذب میں بیت گئے۔

''مجھے سکون چاہیے۔ مجھے بس اطمینان چاہیے۔'' اس کے دل نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''لیکن اس راہ پر بہت سے مسائل بھی کھڑے ہو سکتے ہیں۔ زندگی کا طریقہ ہی بدل جائے گا۔'' دماغ نے متنبہ کرنے کا فریضہ نبھایا۔

''مجھے اس بات کی بالکل پروا نہیں۔ مجھے حالات اپنے مطابق ڈھالنے آتے ہیں۔ میرے لیے کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ مجھے ہر مسئلے کا حل تلاشنا بھی آتا ہے۔ میرے سامنے ہر رکاوٹ ریت کی دیوار ثابت ہوگی۔'' اس نے ایک عزم سے سوچا اور نکھرے اُجالے کی راہ پر قدم رکھ دیے۔

☆☆☆

اس دس مرلہ گھر کا سیاہ آہنی دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ دروازے کے سامنے دکھائی دینے والے سرسبز لان کی فضا غیر فطری حد تک بوجھل تھی۔ درجن بھر سے زائد کرسیوں پر چند خواتین نہایت مغموم انداز میں بیٹھی تھیں۔ ان سب کی آزردہ اور نم آنکھوں کا مرکز ایک چارپائی تھی جس پر سفید چادر میں ملبوس ایک بے جان وجود موجود تھا۔ یہ وجود چند گھنٹے قبل ہنستا مسکراتا، خوش باش اور زندگی سے بھرپور تھا۔ چہرے کی نزاکت اور دلکشی موت کی سختی کے باعث ماند محسوس ہو رہی تھی۔ چارپائی کے بالکل قریب بیٹھی خاتون پر سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ چہرے پر آنسوؤں کے نشان اور متورم آنکھیں ہر دیدہ نگاہ کو تاسف زدہ کر رہی تھیں۔ اپنی حالت سے بے نیاز وہ یک ٹک بیٹی کا چہرہ دیکھے جا رہی تھیں تاہم آس پاس بیٹھی خواتین کی سرگوشیاں سماعت کے لیے سخت آزار بنی ہوئی تھیں۔ وہ نہایت 'ماہرانہ' انداز میں موجودہ صورتِ حال پر رہی تھی۔

لیکن یہ کیا؟

یہ کیسا تضاد تھا؟

تاریکی میں کسی گھٹن کا شائبہ نہ تھا۔ وہاں ایک پُرسکون سا آرام کیوں محسوس ہو رہا تھا؟ ایسا آرام جو کسی سحر کی طرح اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس نے دوسری جانب نگاہ دوڑائی۔ نکھرے اُجالے، خوش کن بہار کی مہک، رقصاں تتلیوں اور سُریلے نغموں کی گنگناہٹ میں ایک عجیب خاردار چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ گھٹن ایسی کی وجود میں وحشت برپا ہونے لگی۔

''نہیں!'' اس کے وجود میں مزاحمت کی ایک بلند و بالا لہر اٹھی۔ ''مجھے اس راہ پر نہیں چلنا۔ یہاں بہت گھٹن ہے، بہت تپش ہے۔ مجھے اس اندھیرے میں ہی سکون ملے گا۔ مجھے سکون چاہیے۔ مجھے بس سکون چاہیے۔ سکون تو بس اسی اندھیرے میں ہے۔ مجھے یہیں جانا چاہیے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں قدم رکھتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

یہ فیصلہ کرتے ہی اُسے اپنا وجود ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ اس نے تاریکی کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

اُس کی زندگی ایک دوراہے پر تھی۔

ایسی صورتِ حال کا تو زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن یہی زندگی ہے۔ یہ از خود ایسے حالات بنا دیتی ہے کہ انسان ایسے ہی کسی دوراہے پر آ کھڑا ہوتا ہے اور قوتِ فیصلہ مفلوج سی ہونے لگتی ہے۔

اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ قوتِ فیصلہ اور ذاتی غیر جانبداری تو گویا منجمد ہی ہو گئی تھی۔ وہ ایک کشمکش گھڑی تھی۔ اس نے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کر کے اعصاب پر قابو پانے کا آغاز کیا اور اس دوراہے کا بھرپور جائزہ لیا۔ دھیرے دھیرے بے یقینی کی دُھند چھٹنے لگی۔ خود اعتمادی از سرِ نو بحال ہونے لگی۔

پہلی راہ پر تاریکی کا راج تھا۔ گھپ اندھیرا ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دے رہا تھا۔ دوسری راہ پر نکھرا اُجالا تھا۔ خوش کن بہار کی مہک تھی۔ تتلیاں اُڑتی ہوئی ہر سُو رنگ بکھیر رہی تھیں۔ دور کہیں سُریلے نغموں کی گنگناہٹ بھی محسوس ہو

pklibrary.com

تبادلۂ خیال کر رہی تھیں۔

''کیا ہو گیا اسے؟ ابھی کل شام تو میں نے اسے باہر واک کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اچھی خاصی تھی۔'' ایک نووارد خاتون نے دریافت کیا۔ وہ اس سڑک کے بالکل اختتامی کونے میں رہائش پذیر تھی۔

''خدا جانے! مجھے تو خود علم نہیں۔ آج صبح گاڑی میں کہیں لے جاتے دیکھا تھا میں نے۔ اس کے چند گھنٹے بعد ہی ایمبولینس چلی آئی۔ پہلے تو میں سمجھی کہ نیاز صاحب کو کچھ ہوا ہے۔'' دوسری خاتون نے ایک اور ہمسائے کا حوالہ دیا جو دیرینہ قلبی عارضہ میں مبتلا تھا۔

''کچھ بتایا نہیں کہ کیا ہوا تھا ماہم کو؟'' ایک اور خاتون نے متجسس ہو کر دریافت کیا۔ ''کہیں وہی کورونا تو نہیں ہو گیا تھا اسے؟''

''آئے ہائے! کورونا کہاں سے آ گیا بھئی؟'' پہلی خاتون نے ہاتھ نچایا۔ ''اور کورونا راتوں رات زندگی تھوڑے ہی ختم کر دیتا ہے۔ یہ کچھ اور ہی معاملہ ہے لیکن ابھی بتا نہیں رہے یہ۔''

''پتا تو خیر چل ہی جائے گا۔ ایسی باتیں بھلا چھپی تھوڑی رہتی ہیں۔'' نجمہ نامی اس خاتون نے بے نیازی سے کہا۔

''ہاں! اتنا تو علم ہے کہ اسے کس اسپتال لے کر گئے تھے۔ میرے بڑے بیٹے کی وہاں کافی جان پہچان ہے۔ میں اسے کہوں گی کہ پتا کروائے ماجرا کیا تھا؟'' رفیقہ نے اطمینان سے کہا۔ وہ اس علاقے میں 'بی بی سی' کی عرفیت سے مشہور تھی۔

اسی اثنا میں دروازے پر کسی گاڑی کے رکنے کی مخصوص آواز نے سب خواتین کو چونکا دیا۔ کچھ ہی پل گزرے تھے کہ کسی قیمتی پرفیوم کی خوشبو حواس کو معطر کرنے لگی۔ اس کے بعد ایک بیس سالہ لڑکی کی آمد ہوئی۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے ماہم کی چارپائی کے پاس چلی آئی۔

''یہ سب کیا، کیا گیا آنٹی جی؟ کیسے ہو گیا یہ سب؟'' اس نے گلناز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

نووارد کے یہ فقرات سماعت میں پڑتے ہی گلناز کے اعصاب جھنجھنا گئے۔

''سائرہ!.....'' انہوں نے ایک طویل چیخ ماری۔ ''سائرہ! ماہم چلی گئی۔ وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلی گئی۔ ماہم چلی گئی۔ یا اللہ! یہ تیرا کیسا انصاف ہے؟ میری بچی کیوں لے لی مجھ سے؟ کیسے رہوں گی میں اس کے بغیر؟ ہائے اللہ جی!''

گلناز کے اس جذباتی تلاطم نے وہاں موجود دیگر خواتین کی باہمی گفتگو میں خلل پیدا کر دیا۔ وہ بھی اب گلناز اور سائرہ کی طرف متوجہ ہو کر آزردگی اور صدمے کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ کئی ایک اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگی تھیں۔

''صبر کیجیے آنٹی! بس صبر کیجیے!'' سائرہ نے گلناز کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بہن! صبر کر و بس! اللہ کا مال تھا اس نے واپس لے لیا۔ آج نہیں تو کل جانا ہم سبھی نے ہے۔'' نجمہ نے فوراً آگے بڑھ کر دلاسا دیا۔

''نہیں ہوتا صبر!'' گلناز نے سینہ کوبی کی۔ ''صبر ہی تو نہیں ہو رہا مجھ سے۔ میری پھول سی اکلوتی بچی! یا اللہ! کیوں کر دیا ایسا؟ میرے ساتھ ہی کیوں کیا ایسے؟'' وہ ہذیانی انداز میں کہنے لگیں۔

سائرہ نے فوراً..... انہیں اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ وہ ماہم کے بچپن کی سہیلی تھی۔ اس کے والدین اسی روز عمرہ کی ادائیگی کے بعد واپس آئے تھے۔ انہیں ائرپورٹ سے لانے میں تاخیر کے باعث وہ یہاں بروقت نہیں پہنچ سکی تھی۔

''غسال خاتون آ گئی ہیں ماما جی! اب بتا دیں کیا کرنا ہے؟'' گلناز کا اٹھارہ سالہ بیٹا حمزہ گھٹنوں کے بل ماں کے پاس آ بیٹھا۔

گلناز کی آنکھوں سے آنسو مزید شدت سے بہنے لگے۔ انہوں نے چارپائی پر اپنی گرفت مضبوط تر کر دی۔ گلناز کی یہ حالت دیکھ کر حمزہ کی ذہنی و جذباتی شکستگی فزوں تر ہو گئی۔ وہ بدقت اپنے جذبات پر قابو پائے ہوئے تھا تاکہ زبیر کے لیے جذباتی سہارا فراہم کر سکے۔

''میں دیکھتی ہوں بیٹا!'' گلناز کی بڑی بہن نے خود کو سنبھالتے ہوئے حمزہ کو مخاطب کیا۔

''جی ٹھیک ہے!'' اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ ''غسل کا باقی سامان بھی تیار کروا دیجیے گا۔''

شہناز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد غسال خاتون کو مطلوبہ سامان اور جگہ فراہم کر دی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد سنہری حروف سے مزین سبز چادر تلے ماہم کا کفن میں ملبوس وجود ایک نئی قیامت برپا کر چکا تھا۔ گلناز کے دلدوز بین فلک کا کلیجا شق کرنے لگے تھے۔ کفن کی اوٹ سے دکھائی دینے والا وہ چہرہ حمزہ کے اعصاب کے لیے بھی ایک قیامت ہی ثابت ہو رہا تھا۔ اس لمحے ضبط کا دامن تار تار ہو گیا۔ وہ

pklibrary.com

دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسے اپنے کندھے پر کسی کس کا احساس ہوا اور سماعت میں ایک آواز نے گویا سیسہ پگھلا دیا۔

''قبر تیار ہو چکی ہے حمزہ! میں نے بھائی جان کو بھی کہہ دیا ہے۔ جنازہ اٹھانے کی تیاری کرو بس اب۔''

''چاچو! بس تھوڑی دیر اور!'' وہ تڑپ کر بولا۔ نگاہیں ہنوز بہن کے سپید چہرے پر ہی مرکوز تھیں۔

''ہمت کرو بیٹا! تم ہی اس طرح ہمت ہار دو گے تو بھائی جان اور بھابی کو کون سنبھالے گا؟ اب تمہی ان کا سب سے بڑا حوصلہ اور آسرا ہو۔'' عرفان نے اس کا کندھا تھپکا اور لان کی بیرونی حدود کے قریب موجود اپنے بیٹے کو اشارہ کر کے دیگر افراد کو آنے کا عندیہ دے دیا۔

چند لمحوں میں وہاں تقریباً نصف درجن افراد جنازے کی چارپائی اٹھانے چلے آئے تھے۔ ان افراد میں زبیر کی حالت خستہ ترین تھی۔ متورم آنکھیں، بکھرے بال، خشک ہونٹ ایک ترحم آمیز منظر تھا۔

''کہاں لے جا رہے ہیں میری بیٹی کو؟ میں اسے کہیں نہیں لے جانے دوں گی۔'' گلناز شوہر کو چارپائی کی طرف بڑھتے دیکھ کر تڑپتے ہوئے بولیں۔

''حوصلہ کریں مما! بس اب وداع کریں ماہم کو۔'' حمزہ نے انہیں کندھوں سے تھام لیا۔

''ایسے وداع کرتے ہیں کیا؟'' انہوں نے حمزہ کا گریبان جکڑ لیا۔ ''ایسے وداع کرو گے بہن کو؟ ارے! ابھی تو اس کی شادی کرنی ہے۔ کتنے ارمان تھے ہمارے۔ ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے اس کے لیے۔''

حمزہ نے مدد طلب نظروں سے اطراف میں دیکھا۔ سائرہ اس کا مدعا بھانپ گئی اور فوری طور پر گلناز کو اپنی بانہوں کی گرفت میں لے لیا۔

''کلمۂ شہادت!'' عرفان کی آواز بلند ہوئی۔

دیگر نصف درجن افراد بھی یہی کلمات دہراتے اب مرکزی دروازے کی جانب بڑھ گئے تھے۔

''ماہی! ماہی..... رک جا میری بچی! رک جا! ماں کو اکیلا چھوڑ کر کیوں جا رہی ہے؟ رک جا ماہی! مجھے بھی ساتھ لے جا۔'' گلناز سائرہ کی گرفت میں مچل کر رہ گئیں۔ حلق میں بے طرح خراشیں پیدا ہو گئی تھیں۔ حمزہ کا دل لہولہو ہو گیا تاہم اس نے چارپائی پر گرفت اور قدموں میں مضبوطی برقرار رکھی۔ گلناز اب سائرہ کے بازوؤں میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

ماہم کی تدفین کو دو روز بیت چکے تھے۔ گلناز کی طبیعت تنزلی کا شکار تھی۔ ابتدائی بے ہوشی کے بعد انہیں مکمل طبی امداد فراہم کرنے سے قدرے بہتری تو آئی تاہم اگلے ہی روز انہیں سینے میں شدید تکلیف کے باعث فوری اسپتال منتقل کرنا پڑا جہاں ڈاکٹرز کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود طبیعت میں کوئی بہتری آ کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ زبیر اور حمزہ اسی روز سے انہی کے پاس موجود تھے۔ قریبی عزیز و اقارب کے اصرار کے باوجود وہ گھر جا کر آرام کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو رہے تھے۔ عرفان اور شہناز انہیں باقاعدگی سے کھانا اور چائے پہنچا دیا کرتے جسے وہ بمشکل زہر مار کر پاتے تھے۔ سائرہ بھی حمزہ کو فون کر کے احوال دریافت کر لیتی۔ دوسرے روز شام کو وہ بھی اپنے والدین کے ہمراہ گلناز کی عیادت کے لیے چلی آئی۔ اس کے والدین زبیر اور شہناز سے گفتگو کرنے لگے۔ سائرہ مضطربانہ انداز میں انگلیاں چٹخاتی حمزہ کے پاس چلی آئی۔

''کیسے ہو حمزہ؟'' اس نے اپنائیت سے دریافت کیا۔

''تمہارے سامنے ہی ہوں۔'' وہ شکستگی سے بولا۔

ماہم کی قریبی سہیلی ہونے اور ایک دوسرے کے گھروں میں بلاتکلف آمد و رفت کے باعث وہ دونوں بھی خاصے بے تکلف تھے۔

''آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے؟ سوری! میں کل چکر نہیں لگا سکی۔ مما پاپا کل رات کی فلائٹ سے ہی واپس آئے ہیں۔'' اس نے ندامت سے وضاحت کی۔

''اِٹس او کے! شاید یہ بھی ہماری بدقسمتی ہی ہے۔ اگر انکل آنٹی اب بھی وہاں ہوتے تو دیارِ خدا میں ہمارے لیے دعا ہی کر لیتے۔'' وہ افسردگی سے گہری سانس بھرتے ہوئے کہنے لگا۔

''ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟ خدا تو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔'' وہ دلاسا دیتے ہوئے بولی۔

حمزہ نے خاموشی پر ہی اکتفا کیا۔ سائرہ اسے دلاسا دینے کے لیے اپنے الفاظ مجتمع کرنے لگی۔

☆☆☆

گلناز کے ذہن و حواس پر ایک دھند طاری تھی۔ گہری اور حیران کن طور پر سیاہ دھند۔ انہیں اپنے حواس منجمد سے محسوس ہو رہے تھے۔ اس جمود کے باوجود بدن میں ایک عجیب سی اینٹھن اور چبھن مضطرب کیے ہوئے تھی۔

''یہ کیسی اینٹھن تھی؟ یہ چبھن کیوں تھی بھلا؟'' انہوں نے

pklibrary.com

ذہن پر روردینا شروع کیا۔

اس روز سے دُھند قدرے چھٹتی محسوس ہوئی۔ انہیں ادویات کی مخصوص مہک اور کسی مشین کی مخصوص آوازوں کا احساس ہوا۔

''اسپتال۔ ایسی مہک اور آوازیں تو اسپتال میں ہوتی ہیں۔ تو کیا میں کسی اسپتال میں ہوں؟'' انہوں نے سوچا۔

''لیکن کیوں؟ میں اسپتال میں کیوں ہوں؟ کون بیمار ہے؟ میں کس کی عیادت کے لیے آئی ہوں؟'' ان کے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا۔

''پتا نہیں کتنی دیر ہوگئی مجھے یہاں آئے ہوئے؟ کس کے ساتھ آئی تھی میں؟''

''اوہ ہاں! دو مہینے پہلے معدہ خراب ہونے پر ڈرپ لگی تھی مجھے۔ اُس وقت بھی ایسی چبھن محسوس ہوئی تھی۔ لیکن ڈرپ کیوں لگی ہے مجھے؟ کیا ہوا ہے بھلا؟'' اضطراب شدید ہوا۔

اس اضطراب میں انہوں نے سر کو چند ایک مزید جھٹکے دیے۔ دُھند کچھ اور چھٹ گئی۔ حواس نے مزید بحالی اختیار کی تو کہیں دور سے کسی کے سسکیاں بھرنے کی آواز آئی۔ یہ آواز بہت مانوس تھی۔ برسابرس کی شناسائی تھی۔

''نہیں، ابھی اسپتال میں ہی ہوں۔ آج رات بھی شاید یہیں رکنا پڑے۔ گلناز باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

یہ آواز شہناز کی تھی۔ ان کی عزیز از جان اکلوتی بہن۔

''ہاں بھئی! کیا ٹھیک ہونا ہے؟ کل سے اسی جنجال میں پڑی ہوئی ہوں۔ اب ان حالات میں گھر کیسے آسکتی تھی؟ سوچا تھا قلوں سے فری ہو کے آجاؤں گی لیکن نہیں! اب اسپتال کا جھنجٹ پڑ گیا ہے۔'' اس بار شہناز کی آواز جھنجلائی ہوئی تھی۔

گلناز کے لاشعور کو جانے کیوں ایک ٹھیس سی لگی۔

''لیکن کیوں؟ یہ ٹھیس کیوں لگی تھی؟ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' اُبھی سوچوں نے مزید مضطرب کیا۔

''نہیں! ابھی ہوش میں نہیں آئیں۔ دعا کرو بس!'' ایک لمحے کے بعد دوبارہ آواز آئی۔

''ہاں! یہ تو ٹھیک ہی کہا۔ صدمہ تو واقعی بہت بڑا ہے۔ جوان اولاد کا دکھ تو اللہ کسی کو بھی نہ دکھائے۔ اور پھر ایسا بدنامی بھرا دکھ۔'' ایک توقف سے آنے والی صدا نے خلش میں مزید اضافہ کیا۔

دُھند میں سرسراہٹ ہونے لگی تھی۔

''غلطیاں تو ان کی اپنی بھی ہیں۔ جو حالات تھے، یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ لیکن خیر چھوڑو! ہمیں کیا؟ اب تو جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ اللہ پاک سب کی بچیوں کی حفاظت فرمائے۔ ماہم بھی اپنی ہی بچی تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں پلی بڑھی تھی۔''

شہناز نے فون بند کیا اور وہیں رکھی ایک کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر نیم دراز ہوگئی۔ شہناز کے ان فقرات نے دُھند کی سرسراہٹ میں مزید اضافہ کر دیا۔ ذہن میں کچھ مناظر یکدم اجاگر ہو گئے۔ سسکیاں..... آہیں..... کرب..... جنازے کی چارپائی..... ماہم کا کفن میں لپٹا وجود..... بدن کی اینٹھن بڑھ گئی۔

''ماہم..... آہ..... ماہم.....'' انہیں اپنی روح میں شدید چبھن محسوس ہوئی۔

شعور اور لاشعور گڈمڈ ہوگیا تھا۔ یوں جیسے ڈھیروں کپڑوں یا کاغذ کے ٹکڑوں کو اچھال کر گڈمڈ کیا جائے۔ دھیرے دھیرے یہ ٹکڑے یکے بعد دیگرے گرفت میں آنے لگے۔ انہیں شہناز اور اپنا بچپن یاد آیا۔ وہ دونوں اپنے والدین، دادا دادی اور تین بھائیوں کے ہمراہ ایک مناسب گھر میں رہتی تھیں۔ والدین انہیں سونے کا نوالہ کھلاتے لیکن شیر کی نگاہ سے دیکھتے۔ ان سبھی بہن بھائیوں پر حد سے زیادہ سختی روا رکھی گئی۔ دادا، دادی بھی کم 'ہٹلر' نہ تھے۔ وہ بھی ان کی تربیت میں مکمل سختی کرتے۔ میٹرک کے بعد پڑھائی کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ توجیہہ یہی تھی کہ لڑکیوں کو اتنا پڑھ لکھ کر آخر کیا کرنا ہے؟ انہیں گھرداری ہی تو سنبھالنی ہوتی ہے۔

یہ گھرداری دس، گیارہ سال کی عمر سے ہی کسی طوق کی طرح ان کے گلے میں ڈال دی گئی۔ ان دونوں بہنوں سے گھر کا ہر کام بلا رعایت کروایا جاتا۔ شہناز کام کاج میں قدرے چور تھی۔ گلناز ایسے مواقع پر چھوٹی بہن کی محبت میں اس کے حصے کا کام بھی جھٹ پٹ نمٹا دیا کرتیں۔

زندگی بس یونہی کولھو کے بیل کی طرح گزر رہی تھی۔ کام کاج کرتے، گھر سنبھالتے، پڑھائی لکھائی کا خواب بھی پورا نہ ہوسکا اور بیس سال کی عمر میں گلناز کی شادی کر دی گئی۔

''شادی..... آہ..... شادی۔'' گلناز کے دل سے ایک ہوک برآمد ہوئی۔

زبیر سے شادی بھی کہاں آسان تھی بھلا؟ زبیر ذمّے داریوں کے بوجھ تلے دبا ایک انسان تھا اور شریکِ حیات ہونے کے باعث ان ذمّے داریوں کا بار گلناز کو بھی یکساں طور پر بانٹنا پڑا۔ ان ذمّے داریوں میں الجھے اس جوڑے کو قدرت نے پانچ برس کے طویل انتظار کے بعد ماہم کی

صورت میں ایک تحفہ عطا کیا۔ گل گوتھنی، سرخ و سفید رنگت اور ریشم جیسی ملائم جلد والی وہ گڑیا سی بچی جسے پہلی بار گود میں لے کر اپنے سینے سے لگاتے ہی گلناز کو کائنات اپنی دسترس میں محسوس ہوئی تھی۔

ماہم کی پرورش نہایت ناز و نعم میں کی گئی۔ وہ خاندان بھر کی ایسی لاڈلی تھی کہ کانٹا بھی چبھنے پر سب کی پریشانی دیدنی ہوتی۔ اس ناز و نعم میں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب وہ عمر کی منازل طے کرتی اسکول جانے کے قابل ہوگئی۔

''اسکول..... آہ..... کیا دن تھا وہ بھی؟'' گلناز کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچا۔

انہیں گہرے رنگ کی اسکرٹ اور سفید قمیص میں ملبوس، بالوں کی دو پونیاں بنائے، منہ بسورتی بیٹی یاد آئی۔

''میری بچی! ڈاکٹر بنے گی۔'' انہوں نے ماہم کو تیار کرنے کے بعد اس کے سرخ و سفید رخساروں پر بوسے رسید کیے۔

''پھر میں سب کو انجکشن لگاؤں... گی۔ آپ کو اور پاپا کو بھی لگاؤں گی۔'' ماہم نے اپنے غصے کا اظہار کیا۔

گلناز کو بیٹی کی اس ادا پر بہت پیار آیا تھا۔ وہ اسکول جانے کے لیے بالکل راضی نہیں تھی تاہم بعد میں یہ بیزاری دلچسپی اور شوق میں ڈھلنے لگی۔ دلفریب نقوش کی حامل وہ بچی ذہانت میں بھی بے مثال تھی۔ اسے اساتذہ سے بے پناہ محبت ملی۔ اساتذہ اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے گلناز کا سر فخر سے بلند اور دل خوشی سے معمور ہو جاتا۔ اپنے خوابوں کی تعبیر بہت قریب محسوس ہوا کرتی۔

ماہم کی کامیابیوں کا سلسلہ یونہی بارہا گلناز اور زبیر نے دونوں بچوں کو ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا۔ ان کی ہر ضرورت فوری طور پر پوری کر دی جاتی۔ بچوں نے بھی انہیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ ماہم نے میٹرک میں علاقے بھر کے اسکولوں میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے۔ اس کی تصویر کتنا ہی عرصہ اسکول کے باہر ایک بینر پر لگی رہی۔ زندگی بہت پُرمسرت، پُرکیف اور پُرسکون تھی۔ اولاد کی کامیابیاں زبیر اور گلناز کو ہر تھکاوٹ فراموش کرنے پر مجبور کر دیتیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ جوش و جذبہ سے محنت کرنے لگتے۔ گلناز نے تاحال گھریلو کام کاج کی کوئی ذمے داری ماہم کے سر نہیں ڈالی تھی۔ اس کے ناز و نعم کا سلسلہ ہنوز برقرار تھا۔ اس پر پڑھائی کے سوا کوئی ذمے داری نہیں تھی۔ کچھ یہی حال حمزہ کا بھی تھا۔ اس پر بھی ذمے داریوں کا بوجھ بہت کم تھا۔ زندگی بہت پُرسکون تھی۔ یکا یک وہ سب ہو گیا۔

''لیکن کیسے ہو گیا؟ وہ سب کیسے ہو گیا؟ کہاں غلطی ہوئی تھی اُن سے؟'' گلناز کے ذہن پر ہتھوڑا زنی ہوئی۔ انہیں حقیقتاً ماہم پر بہت اعتبار تھا۔

''یہ اعتبار چکنا چور کیسے ہو گیا؟'' ایک اور سوچ کلبلائی۔

''اعتبار..... ہاں بس یہ اعتبار کی ہی تو مار تھی۔ ماہم..... آہ..... ماہم! کیوں کیا تم نے ایسا؟ کہاں کمی رہ گئی تھی ہمارے پیار میں؟ آخر ایسا کیا ہو گیا تھا تمہارے ساتھ؟'' کرب ہر ایک رگ چٹخا رہا تھا۔

اس کے بعد ذہنی رو رسم قل کے دوران ہونے والی خواتین کی گفتگو کی جانب مڑ گئی۔ انہوں نے شدومد سے سر جھٹکنا شروع کر دیا۔ وہ اس اذیت کا اعادہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ ذہن نے ردِعمل کے طور پر دوسری سمت پرواز بھر لی۔

''یہ زندگی بھی کیا عجب رنگ دکھاتی ہے؟ شہناز کے دلی جذبات میں اتنا کینہ کب اور کیسے آیا؟ شاید اس وقت جب میں اس کی اولاد کے تعلیمی ریکارڈ کا مقابلہ اپنی اولاد سے کرتی تھی۔ لیکن میں ان سے محبت بھی تو بہت کرتی تھی۔ محبت..... آہ..... محبت۔ ماہم نے بھی محبت کا کیا صلہ دیا؟ آہ! یہ محبت کیوں اتنا خوار کرتی ہے؟ کیوں اتنا رسوا کرتی ہے؟''

سوچوں کا یہ سفر ابھی رواں ہی تھا کہ انہیں کمرے میں ایک عجیب ٹھنڈک سرایت کرتی محسوس ہونے لگی۔ دھیرے، دھیرے یہ ٹھنڈک ان کی انگلیوں کی پوروں میں اترنے لگی۔ انہیں اپنے پاس والدین کے شفیق وجود دکھائی دیے۔ آنکھیں چھلک سی اٹھیں۔

''آپ بالکل ٹھیک تھے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کیا۔ آپ کی سوچ اور فلاسفی بالکل درست تھی۔ کاش ہم بھی آپ جیسے بن پاتے۔ کاش ہم نے آپ سے ہی کچھ سیکھ لیا ہوتا۔ کہاں غلطی کر دی؟ پتا نہیں کہاں غلطی کر دی؟''

آنکھوں کے گوشوں سے پانی رینگتا اب کنپٹیوں تک پہنچ گیا تھا۔ والدین کے شفیق نورانی چہروں پر شدید تاسف و ملال دکھائی دینے لگے۔ والدہ نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ بدن میں سرایت ہوتی ٹھنڈک اب پنڈلیوں سے ٹانگوں میں در آئی تھی۔

اسی اثنا میں انہیں ماہم بھی دکھائی دے گئی۔ اس کی آنکھوں میں ملال اور ندامت کے رنگ جھلک رہے تھے۔ گلناز نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا اور چہرہ دوسری

pklibrary.com

جانب پھیر لیا۔ ہاں وہ بات الگ تھی کہ دل میں کرب کی ایک اذیت ناک لہر اٹھی تھی۔

''مجھے معاف کر دیں ماما جی! پلیز مجھے معاف کر دیں۔'' وہ رُندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

ٹھنڈک اب گھٹنوں تک در آئی تھی۔ اس لمحے انہیں ایک مانوس سی آواز سنائی دی۔

''گلناز زبیر..... ولد..... جاوید علی..... وقت ختم ہو گیا ہے۔ چلی آؤ۔''

یہ اُن کا بلاوا تھا۔ یہ ان کے لیے طلبی کا اعلان تھا۔ ٹھنڈک نے اب رانوں کو جکڑ لیا تھا۔

''تو یہ سفر کا اختتام تھا۔ بس یہ زندگی یہیں تک تھی۔ زندگی نے بس یہیں تک ساتھ نبھانا تھا کیا؟ ابھی تو بہت کچھ کرنا تھا۔''

ان کے پردۂ تصور پر حمزہ کا چہرہ ابھرا۔ دل میں ایک چٹکی سی بھری گئی۔

''نہیں! روک دو یہ اعلان۔ ابھی نہیں! ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی تو بہت کام نمٹانے ہیں۔ ماہم چلی گئی لیکن حمزہ کے لیے ارمان تو سلامت تھے۔''

ٹھنڈک سینے تک چلی آئی۔ تنفس بگڑنے لگا تھا۔ انہوں نے بے بسی سے ہاتھ جھٹکے لیکن جنبش مفقود تھی۔ کنپٹیوں پر رینگتے آنسوؤں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔

''گلناز زبیر..... ولد..... جاوید علی..... وقت ختم ہو گیا ہے۔ چلی آؤ۔''

اعلان میں شدت آ گئی۔ والدین نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ماہم نے آگے بڑھ کر سہارا دیتے انہیں اٹھا کر بٹھایا۔ گلناز کو یکدم کسی ہلکے پھلکے احساس نے گھیر لیا۔ انہوں نے پلٹ کر عقب میں دیکھا۔ سوئیوں سے پرویا، منتشر بالوں، زرد چہرے والا وہ وجود ساکت ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے 'قفس' پر الوداعی نگاہ ڈالی اور والدین کا سہارا لیے ایک نئی منزل کی جانب روانہ ہو گئیں۔

☆☆☆

''کیا ہوا تھا آنٹی کو؟ اس دن تو بالکل ٹھیک چھوڑ کے گئی تھی میں۔'' سائرہ نے تشویش سے دریافت کیا۔

''ٹھیک کہاں تھیں؟ بس سنبھلی تھیں۔ کل رسم قل کے دوران وہ اپنی ہمت بالکل ہی ہار بیٹھیں۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''کیا ہوا تھا کل؟'' سائرہ چونکی۔ وہ والدین سے ملاقات کے لیے آنے والے مہمانوں کی خاطر داری کے باعث بہت مصروف رہی تھی۔

''جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر ایک کو بس یہی سسپنس تھا کہ ماہم کی موت کا اصل راز معلوم ہو جائے۔ سوسائٹی کے کسی لڑکے کی اسپتال میں واقفیت تھی۔ وہ 'بریکنگ نیوز' لے ہی آیا۔ اس نے اپنے گھر میں بتا دیا کہ ماہم کو کس وجہ سے وہاں لے جایا گیا تھا۔ بس کل ہر کسی کو یہی ٹینشن تھی کہ ماہم کس وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہوئی تھی۔'' وہ مزید تلخ ہوا۔

''پھر کیا اندازے لگائے سب نے؟'' وہ جز بز ہوئی۔

''کسی کا خیال تھا مارکس کم آئے۔ کوئی اس کا 'جی پی' گرنے کے اندازے لگائے بیٹھا تھا۔ کسی کا خیال تھا کہ نوجوان نسل بہت نازک مزاج ہو چکی ہے۔ پیرنٹس کی ڈانٹ ڈپٹ برداشت نہیں ہوتی اُن سے۔ ایک نے تو حد ہی کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ.....'' حمزہ کی آواز رُندھ گئی۔

سائرہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور دھیرے دھیرے تھپتھپانے لگی۔ وہ اس کی ادھوری بات سے مکمل مفہوم سمجھ گئی تھی۔

''سمجھ نہیں آتا کس کی نظر کھا گئی ہمارے ہنستے بستے گھر کو؟ کہاں کیا غلطی ہو گئی؟ ماہم کو آخر کس بات نے اتنا ڈپریسڈ کر دیا تھا؟ وہ مجھے اپنا بیسٹ فرینڈ کہتی تھی۔ کم از کم مجھ سے ہی بات کر لیتی۔ ہم مل بیٹھ کر کوئی حل نکال لیتے لیکن بات تو کرتی۔'' وہ اپنے بال مٹھی سے جکڑتے ہوئے بولا۔

''یہی بات میں بھی اس سے کہتی تھی کہ.....'' سائرہ نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

''تمہیں پتا تھا؟ تمہیں سب کچھ پتا تھا؟ تم نے بھی مجھ سے بات نہیں کی۔ ایسا کیسے کر سکتی ہو تم؟ سائرہ! تم ایسا کیسے کر سکتی ہو آخر؟'' وہ تڑپ اٹھا۔

سائرہ نے شکستگی سے سر جھکا لیا۔

''کون تھا وہ؟ بتاؤ مجھے؟ کون تھا وہ؟'' حمزہ نے اس کا بازو دبوچ لیا۔

''تم جانتے ہو اُسے۔'' سائرہ نے سسکاری بھری۔

''میں جانتا ہوں؟ کیسے؟ کون ہے وہ.....؟'' حمزہ نے چند نامناسب القابات کا اضافہ کیا۔

''زوہیب۔'' سائرہ نے اپنا بازو حمزہ کی گرفت سے آزاد کروانے کی ناکام لیکن بھرپور کوشش کی۔

''زوہیب؟ وہ زوہیب.....؟'' حمزہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ اس کی سماعت شہناز کی دلدوز چیخوں سے جھنجھنا اٹھی۔

حمزہ کا بدن اس بُری طرح شل ہوا کہ اسے اپنا وجود

pklibrary.com

بے جان ہوتا محسوس ہوا تھا۔

''الٰہی خیر! کیا ہوا ہے؟'' سائرہ بھی دہل گئی۔

حمزہ نے اپنی آنکھیں کرب سے میچ لیں۔

''نہیں..... اللہ جی! پلیز نہیں..... ایسا مت کرنا..... پلیز ایسا مت کرنا۔'' اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے لیکن وہ قبولیت کا لمحہ تھا۔ گلناز کی روح اپنی بیٹی کے پاس کوچ کر گئی تھی۔ تقدیر حمزہ کی اشک بار آنکھوں اور التجاؤں پر خندہ زن تھی کیونکہ ایک نئی اور لامتناہی آزمائش تو ابھی باقی تھی۔

☆☆☆

منظر ایک بار پھر وہی تھا۔ گھر کے لان میں رکھی مخصوص چارپائی پر گلناز کی میّت موجود تھی۔ شہناز کی سسکیوں نے ماحول مرتعش کر رکھا تھا۔ لان میں بیٹھی دیگر خواتین کے چہروں پر آزردگی اور خوف کے متفرق جذبات منعکس تھے۔ تین دنوں میں دو اموات نے ہر ایک کو ہی تاسف زدہ کر رکھا تھا۔ سرگوشیوں میں محو گفتگو ان خواتین کو دیکھ کر حمزہ کا خون کھول رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان دوغلی عورتوں کو دھکے مار کر اپنے گھر سے نکال دے۔ گلناز کی موت کی وجہ انہی خواتین کی لامتناہی طویل زبانیں ہی تو تھیں۔

''گورکن سے بات ہو گئی ہے بھائی جان! قبر تیار ہے۔ جنازہ اٹھانے کا بندوبست کیجیے بس!'' حمزہ کی سماعت میں عرفان کی آواز پڑی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ حمزہ دیکھ لیتا ہے۔'' زبیر نے منتشر سے انداز میں کہا۔

حمزہ کا دل چاہا کہ شہناز کی طرح دہاڑیں مار مار کر روتے ہوئے اپنا دلی غبار اور گھٹن کہیں باہر منتقل کر دے اور چیختے ہوئے زبیر سے کہے۔

''مجھ پر ترس کھائیں پاپا! میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے۔ اکلوتی بہن کے بعد ماں کا جنازہ اٹھانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔''

یہ الفاظ نوکِ زبان پر ہی مچل کر رہ گئے۔ زبیر کی شکستہ ذہنی حالت اور پژمردگی دیکھ کر اس کا دل غم سے مزید بوجھل ہو گیا۔ وہ اپنی تمام تر ہمت مجتمع کر کے اٹھا اور عرفان کے ہمراہ لان میں چلا آیا۔ اس کے بعد تمام افعال خالی الذہنی کے عالم میں انجام پائے۔ والدہ کا کفن میں ملبوس جسدِ خاکی قبر میں لٹاتے ہوئے اس کا ہر ایک مسام پسینہ اگل رہا تھا۔ بدن پر ہولناک لرزش طاری تھی۔ گلناز کی اس آخری آرام گاہ کو مٹی سے ڈھکتے ہوئے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی یہیں والدہ کی آغوش میں سر رکھے سو جائے۔ تدفین مکمل ہوتے ہی کئی احباب نے تعزیت کا رسمی فریضہ ادا کیا اور یکے بعد دیگرے رخصت ہونے لگے۔ حمزہ گھٹنوں کے بل بیٹھا قبر پر ہی نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''حمزہ! بھائی جان کو دیکھو..... کیا ہوا ہے بھائی جان؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟'' عرفان کی متوحش آواز سنائی دی۔

حمزہ گویا کرنٹ کھا کر مڑا۔ زبیر کا منہ غیر فطری سے انداز میں کھلا تھا۔ سینے کے زیر و بم سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کھینچ کر سانس لے رہے ہیں۔

''پاپا! کیا ہوا ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟'' اس نے زبیر کا سینہ مسلا۔

بیٹے کا لمس محسوس کرتے ہی زبیر اس کے بازوؤں میں جھول گئے۔

☆☆☆

سیاہ آسمان پر بادلوں کا راج تھا۔ ان گہرے بادلوں نے چاند اور ستاروں کی ضوفشانی بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھی تھی۔ حمزہ نے اپنی بائیک دروازے کے پاس روکی ہی تھی کہ چند قدم آگے کھڑی گاڑی پر نظر پڑی۔ اس گاڑی کے یہاں موجود ہونے کا مطلب یہ تھا سائرہ یا اس کے والدین میں سے کوئی ملاقات کے لیے آیا ہے۔ دروازے کا قفل کھولتے ہوئے حمزہ کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔ ان کی زندگی کے اس مشکل ترین وقت میں کئی 'اپنوں' نے طوطا چشمی کی انتہا کر دی تھی لیکن کئی 'بیگانے' اپنوں سے بڑھ کر اپنائیت و محبت کا ثبوت دیتے رہے تھے۔ وہ افسردہ قدموں سے چلتا زبیر کے کمرے میں چلا آیا جہاں اس کے اندازے کے عین مطابق سائرہ اپنے والدین کے ہمراہ موجود تھی۔

''کیسے ہو حمزہ؟'' سائرہ نے اسے دیکھتے ہی اپنی مخصوص ملائمت سے دریافت کیا۔

''تمہارے سامنے ہی ہوں۔'' حمزہ نے بوجھل انداز میں جواب دیا۔ نظریں البتہ والد کے ناتواں وجود پر ہی مرکوز تھیں۔ وہ سینے تک چادر اوڑھے اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ ان کا چہرہ سرسوں کی طرح زرد اور آنکھیں کسی صحرا کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ان کے دائیں دھڑ پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ ابتدائی طبّی امداد اور بہترین نگہداشت کے باوجود وہ اپنے اعضا کو مکمل طور پر جنبش دینے سے قاصر تھے۔

''صغیر کہاں ہے؟'' اس نے سائرہ سے دریافت کیا۔

اسپتال سے فراغت کے بعد عرفان نے ایک 'میل نرس' کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ بارہ سے چودہ گھنٹے زبیر کے

pklibrary.com

ساتھ ہی گزارتا تھا۔

''نماز پڑھنے گیا ہے۔'' سائرہ کے والد نے بتایا اور موضوعِ گفتگو از سرِ نو بحال کر دیا۔

حمزہ کے ہونٹوں پر ایک افسردہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

''مبارک ہو تمہیں! اللہ زندگی کے اس نئے سفر میں تمہیں خوشیاں ہی خوشیاں دکھائے۔'' اس نے سائرہ کو مخاطب کیا۔

سائرہ نے بھی پژمردہ مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور خوابناک سے انداز میں کہنے لگی۔

''ماہم کو بہت ویٹ تھا میری شادی کا۔''

''ہاں! وہ تو اکثر کہا کرتی تھی کہ تمہاری شادی پر ایک مہینہ پہلے ہی تمہارے گھر رہنے چلی جائے گی۔'' حمزہ کی آواز میں بھی آنسوؤں کی نمی چھلکی۔

''میں ابھی اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن روحان کو انہی دنوں چھٹی ملی ہے۔'' سائرہ کے انداز سے ندامت عیاں تھی۔

''اِٹس اوکے سائرہ! کسی کے بھی چلے جانے سے زندگی رک تو نہیں جاتی نا۔ گو آہیڈ پلیز!'' حمزہ نے متانت سے سمجھایا۔

سائرہ تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ لاابالی، شوخی اور شرارتوں سے بھرپور لڑکا کچھ ہی عرصے میں کس قدر تبدیل ہو گیا تھا۔ سائرہ کو اس کی شرارتیں ہنوز یاد تھیں۔ وہ اکثر آتے جاتے ان کو چٹکیاں بھرنا، بالوں سے کیچر اتار کر کہیں دور پھینک دینا یا کھلے بالوں کو پیچھے سے اٹھا کر منتشر انداز میں چہرے پر پھینک دینا اپنا 'فرض' سمجھتا تھا۔

کچھ لمحے اسی خاموشی میں بیت گئے۔

''ایک بات پوچھوں تم سے؟'' حمزہ نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''ہاں! پوچھو۔'' سائرہ نے اُلجھ کر جواب دیا۔

''وہ زوہیب ہی تھا نا؟ آر یو شیور؟''

''یس! ڈیم شیور! مجھ سے کیا بات چھپی ہوئی تھی ماہم کی بھلا؟'' سائرہ نے نظریں چُرا کر کہا۔

''کب سے چل رہا تھا یہ معاملہ؟''

''تین مہینے سے۔'' وہ آزردگی سے بولی۔

''ہوا کیا تھا دونوں میں؟ ایسا کیا ہوا تھا جو ماہم کو یہ قدم اٹھانا پڑا؟'' اس نے ہونٹ بھینچ کر دریافت کیا۔

''حمزہ! لیوِاٹ پلیز۔ ان باتوں کو دہرا کر خود کو کیوں تکلیف دینا چاہتے ہو؟'' سائرہ نے پہلو بدلا۔

''اس تکلیف سے زیادہ نہیں ہو گی وہ تکلیف۔ مجھے جاننا ہے پلیز!'' وہ مزید مُصر ہوا۔

سائرہ کے چہرے پر کشمکش اور اُلجھاؤ در آیا۔

''کچھ مت چھپانا مجھ سے۔ جو بھی ہوا تھا اے ٹو زیڈ بتاؤ مجھے۔'' حمزہ نے کسی خدشے کے تحت فوراً کہا۔

سائرہ نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے خیالات مجتمع کرتے ہوئے دھیمے انداز میں سلسلۂ کلام کا آغاز کر دیا۔ اس کی زبان سے برآمد ہونے والا ہر ایک لفظ اس کے سوختہ دل کی تپش میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ دل و دماغ میں شدید جھکڑ رواں تھے۔

''چلیں سائرہ بیٹا! بھائی صاحب سے اجازت لو اب۔'' متین کی آواز نے انہیں ماضی قریب کے دریچوں سے واپس حال میں لا پٹخا۔

''خود کو سنبھالو حمزہ! جو ہو گیا اسے ہم کسی بھی صورت تبدیل نہیں کر سکتے۔'' سائرہ نے ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

حمزہ ساکت بیٹھا خلا میں کسی نادیدہ نکتے کو دیکھتا رہا۔ اسے سائرہ اور اس کے والدین کی روانگی، الوداعی کلمات کی ادائیگی یا انہیں دروازے تک چھوڑنے کا خیال بھی نہ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ رات بے حد اذیت ناک تھی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی، کروٹیں بدلتے نرم بستر بھی کسی خاردار جھاڑی کے مانند چبھنے لگا تھا۔ اس کے دل و دماغ ہنوز اسی جھکڑ کی زد میں تھے۔ کبھی ماہم کی موت اور تدفین کے مناظر یاد آتے تو کبھی گلناز کی اذیت اور تدفین کسی کوڑے کی طرح برسنے لگتی۔

انہی خیالات میں اُلجھتے، خود سے لڑتے حمزہ نے اپنا موبائل فون پکڑا اور زوہیب کی انسٹاگرام پروفائل کھول لی۔ اس کا مانوس چہرہ اور وجیہہ نقوش دکھائی دیتے ہی لہو میں انگارے دوڑنے لگے۔

''اسے اتنی جلدی کیا تھی شادی کی؟ اس کو کوئی فرق نہیں پڑا کیا ماہم کے اس اسٹیپ کا؟'' حمزہ کی سماعت میں اپنے ہی الفاظ گونج تھے۔

''آئی ڈونٹ تھنک سو بڈی!'' سائرہ کے الفاظ نے دستک دی۔ ''اس نے اپنی مدر کے پریشر پر اس شادی کی ہامی بھری تھی اور آف کورس خوش ہی ہو گا وہ۔''

زوہیب کی پروفائل میں دکھائی دینے والی تصویریں اس بات کی شاہد تھیں۔ اس کے چہرے پر خوشی و آسودگی کسی

آبشار کی طرح بہہ رہی تھی۔ حمزہ کی نگاہوں میں زوہیب کا آسودہ اور ماہم کا بے جان سپید چہرہ گڈمڈ ہونے لگے۔ رگوں میں انگاروں کی تپش فزوں تر ہوگئی۔

''حم..... زہ..... حم..... زہ.....'' اسے زبیر کی گھٹی ہوئی آواز نے چونکایا۔

حمزہ نے فوراً موبائل ایک جانب پٹخا اور والد کے بستر کی جانب لپکا۔ صغیر کی روانگی کے بعد رات کے اوقات میں زبیر کی نگہداشت کے فرائض وہی سنبھالا کرتا تھا۔

''کیا ہوا پاپا؟ کچھ چاہیے آپ کو؟'' وہ نرمی سے بولا۔

زبیر نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھایا اور زیریں دھڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اسی لمحے حمزہ کو ایک ناگواری... بُو کا احساس ہوا اور وہ ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔ زبیر کو لگایا جانے والا پیمپر کھل جانے یا ڈھیلا رہ جانے کے باعث بستر گندہ کر گیا تھا۔

''اِٹس او کے پاپا! میں ابھی چینج کر دیتا ہوں۔ اِٹس آل رائٹ!'' اس نے زبیر کے چہرے پر محبت سے ہاتھ پھیر کر ان کے آنسو صاف کیے۔

زبیر بے بسی سے دائیں بائیں سر جھٹک کر رہ گئے۔

حمزہ نے کسی ناگواری کا اظہار کیے بغیر پیمپر، چادر اور کپڑے تبدیل کیے اور کمبل دوبارہ اوڑھا دیا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے بستر میں آلیٹا۔ زبیر کی طرف کروٹ کیے اس کے ذہن میں مختلف مناظر ہی گردش کر رہے تھے۔ وہ بے بسی سے اٹھا اور والد کے میڈیکل باکس سے ایک نیند کی گولی نکال کر نگل لی۔ نیند کی وادی میں اترنے سے قبل بھی اس کے ذہن میں آخری خیال زوہیب کا ہی تھا۔

☆☆☆

''ایک بات پوچھوں آپ سے زوہیب؟'' ثنا نے اٹھلا کر دریافت کیا۔ وہ متوسط قامت، گندمی رنگت، بھوری آنکھوں اور دلکش نقوش کی حامل تھی۔ اس کی شخصیت کا نمایاں پہلو کمر تک چھوتے طویل بال تھے۔

''ہاں پوچھو پوچھو۔'' زوہیب نے بے نیازی سے اسے دیکھا۔ زوہیب کے نقوش بلاشبہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھے۔ سرمئی آنکھوں اور گھنے بالوں نے اس کی شخصیت میں ایک ناقابلِ مزاحمت سحر پیدا کر رکھا تھا جسے کسی بھی طور نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

''آپ اتنے ہینڈسم اور ڈیشنگ ہیں۔ آپ کو تو کوئی بھی لڑکی مل سکتی تھی۔'' ثنا نے ایک توقف کے بعد کہا۔

زوہیب کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے عادتاً دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے بال سنوارے اور محظوظ ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں سمجھ گیا کہ تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو۔ بالکل سمجھ گیا۔''

''تو بتایئے پھر؟ کیا پوچھنا چاہ رہی ہوں؟'' اس کی اٹھلاہٹ میں اضافہ ہوا۔ وہ بات الگ تھی کہ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔

''تم یہی پوچھنا چاہ رہی ہو نا کہ میں نے تم سے ہی شادی کیوں کی؟ ہے نا؟'' زوہیب نے اطمینان سے دریافت کیا۔

ثنا نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اس سوال کے متعلق خاصی اُلجھن کا شکار تھی۔ زوہیب کی خوبروئی اور سحر انگیز شخصیت دیکھ کر 'ارینج میرج' ایک قطعی ناقابلِ ہضم بات تھی۔

''دیکھو وائف! ہر انسان کی لائف کے کچھ اصول ہوتے ہیں، فلاسفی ہوتی ہے تو میرے مائنڈ میں بھی اپنی لائف پارٹنر کا ایک اسکیچ تھا جس کے بارے میں امی کو سب علم تھا۔ تو بس اس اسکیچ پر تم پورا اتریں۔ سمپل از دیٹ۔'' اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''کیسا اسکیچ تھا آپ کے مائنڈ میں؟'' ثنا نے کسی خوش فہمی کے تحت دریافت کیا۔

''میں چاہتا تھا کہ میری لائف پارٹنر کسی بھی قسم کی 'کوایجوکیشن' میں نہ پڑھی ہو۔ اس کا کوئی پاسٹ نہ ہو۔''

زوہیب کی اس صاف گوئی پر ثنا خاموش رہ گئی۔ وہ شوہر سے خوب صورتی اور ذہانت کے پیمانوں کی بابت جواب سننے کی متمنی تھی۔ زوہیب کی ان توجیہات نے اسے ایک بے نام سی خلش میں مبتلا کر دیا۔

''کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہوگئی ہو اب؟'' زوہیب نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں!'' وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولی۔

''دیکھو ثنا! میں تمہیں پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں کہ مجھے ایسے نخرے دیکھنے یا برداشت کرنے کی عادت نہیں ہے۔ جو پوچھا کروں اس کا ڈائریکٹ اور کلیئر جواب دیا کرو۔ کچھ نہیں۔ پتا نہیں۔ چھوڑیں بس ٹائپ کی باتیں۔ میرا دماغ کھما دیتی ہیں۔ اور اگر کسی دن میرا دماغ واقعی گھوم گیا تو نقصان تمہارا ہی ہوگا۔ میرا غصہ پھر اتنی جلدی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ سمجھیں؟'' زوہیب نے سرد لہجے میں اسے دھمکایا۔

ثنا کو اپنے وجود میں برف سی اترتی محسوس ہوئی۔

pklibrary.com

زوہیب کا یہ ہٹیلا، سرد مہر اور سپاٹ انداز اسے ہزارہا اندیشوں میں مبتلا کر دیا کرتا تھا، وہ شادی کے بعد اس مختصر عرصہ میں ہی جان گئی تھی کہ زوہیب ایک خود پسند، انا پرست اور ضدی انسان ہے۔ اس کی ذات میں 'وٹامن میں' کی خاصی زیادتی تھی جو مقابل کو اپنے سامنے بالکل ہیچ سمجھتی۔

''پوچھ رہا ہوں میں تم سے کچھ؟'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''میں..... وہ..... بس..... یہ سوچ رہی تھی کہ ہنی مون پر کہاں جائیں گے؟'' اس نے جلدی سے بات بنائی۔

''ہنی مون کا کیڑا ابھی دماغ سے نکال دو۔ امی کی طبیعت بہتر ہونے تک میں یہاں سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' اس نے اپنے مخصوص دوٹوک انداز میں کہا۔

ثنا کی افسردگی مزید بڑھ گئی۔

''چائے بنا لاؤ میرے لیے! اور خیال رکھنا کل کی طرح میٹھا تیز نہ کر دینا۔ میں ڈائٹ کے معاملے میں بالکل کوئی کمپرومائز نہیں کرتا۔'' زوہیب کی بات ایک دفعہ پھر میں سے شروع ہو کر میں پر ہی ختم ہوئی تھی۔

ثنا بوجھل دل سے اٹھی اور شکستہ ارمان سمیٹتی سست روی سے چائے بنانے چل دی۔ اس کا وجدان مستقبل کی ایک ہولناک تصویر کشی کرتے دل و دماغ میں عجیب گھٹن پیدا کر رہا تھا۔ زوہیب کا یہ مزاج برداشت کرنا بالکل آسان نہیں تھا۔ اپنی قوتِ ارادی مضبوط کرتے ثنا لاعلم تھی کہ ان کا یہ رشتہ اب صرف چند روز پر ہی محیط رہ گیا ہے۔

☆☆☆

حمزہ کی طبیعت موسمی بخار اور زکام کے باعث بے حد بیزار و پژمردہ تھی۔ اس خرابیِ طبع میں والدہ کی کمی دل میں شدید چٹکیاں بھر رہی تھی۔ ماضی قریب میں ایسی کسی بھی صورتِ حال میں وہ اس کے لیے ہزارہا ٹوٹکے آزمایا کرتیں۔ اس کے سرہانے سے ہلنے کا نام ہی نہ لیتیں۔ ماہم بھی اپنی روایتی لڑائی ترک کر کے اسے حسبِ طلب قہوہ یا کافی بنا کر پلایا کرتی۔ مرحومہ والدہ اور بہن کی یہ یاد اس کی آنکھوں میں آتشیں نمی پیدا کرنے لگی۔

شام کے سائے گہرے ہوئے تو عرفان ان سے ملاقات کے لیے چلے آئے۔ وہ انہیں دونوں دکانوں کا کرایہ دینے آئے تھے۔

''بھائی جان کی طبیعت میں کوئی بہتری آئی یا نہیں؟'' انہوں نے رسمی طور پر حمزہ سے دریافت کیا۔

''آپ کے سامنے ہی ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟''

''انہوں نے کیا کہنا ہے؟ سب کچھ پاپا کی قوتِ ارادی پر ہی انحصار کرتا ہے۔ اور قوتِ ارادی کے معاملے میں وہ بالکل زیرو ہو چکے ہیں۔'' حمزہ نے مایوسی سے بتایا۔

عرفان نے آزردگی سے تھمبی انداز میں سر ہلایا اور پھر کسی خیال کے تحت کہنے لگے۔

''تم نے اسٹڈیز کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''ابھی تک تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا کروں؟ بالکل میچ نہیں کر پا رہا ہوں۔'' وہ شکستگی سے گویا ہوا۔

''میچ تو کرنا پڑے گا۔ ایسے کیسے چلے گا؟'' انہوں نے متانت سے سمجھایا۔

حمزہ نے شکست خوردگی سے سر جھکا لیا۔

''قبرستان چکر لگاتے ہو؟'' عرفان نے ایک توقف کے بعد دریافت کیا۔

''نہیں! کئی دن سے پاپا کی طبیعت کی وجہ سے نہیں جا پا رہا۔'' اس نے اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا۔ گو یہ اعتراف ادھورا ہی تھا۔ وہ عرفان کے سامنے اپنی کم ہمتی تسلیم نہ کر سکا کہ اپنے جذباتی بحران کا خوف اسے قبرستان جانے سے روک دیتا ہے۔

''بارشوں کے موسم میں چکر لگاتے رہا کرو۔ سمجھے؟''

حمزہ نے اُلجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اسٹڈیز کے بارے میں بھی کچھ سوچو۔ دکانوں کے کرائے سے کب تک زندگی چلے گی؟''

حمزہ نے ہونٹ بھینچ کر ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''دیکھو بچے! ہو سکتا ہے اس وقت تمہیں میری باتیں بُری لگیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ زندگی کسی نہ کسی طرح گزارنی ہی پڑتی ہے۔ ہمیں آگے بڑھنا ہی پڑتا ہے۔ بھائی جان کا اکلوتا سہارا اور رشتہ اب تم ہو۔ بی اسٹرانگ۔ اوکے!'' انہوں نے حمزہ کے کندھے پر تھپکی دی۔

''جی اوکے! تھینک یو!'' وہ بوجھل سانس لیتے ہوئے بولا۔

عرفان کے روانہ ہوتے ہی اس نے زبیر کو سکون آور دوائی دی اور ایک گولی خود بھی نگل لی۔ نیند سے ہم آغوش ہونے سے قبل اس کی سماعت میں آخری آواز تیز بارش کی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح خاصی خنک اور ابر آلود تھی۔ حمزہ نے میل نرس

کے آنے کے بعد زبیر کے معاملات اس کے سپرد کیے اور اپنی بائیک پر قبرستان روانہ ہوگیا۔ قبرستان اس ہاؤسنگ سوسائٹی کی ہی ملکیت اور اس کی رہائش گاہ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ بائیک مرکزی دروازے پر کھڑی کرنے کے بعد اس نے اپنے ٹوٹتے بدن اور شدید دکھتے ہوئے سر کو سنبھالتے ہوئے دروازہ دھکیلا اور قبرستان کے احاطے میں قدم رکھ دیے۔ کچی زمین بارش کے بعد خاصی دلدلی ہوچکی تھی۔ اسے اپنا دل کسی بھاری چٹان تلے دبتا محسوس ہونے لگا۔ والدہ اور بہن کے آخری لمحات اور پھر تدفین کے سبھی مناظر نہایت بے دردی سے اس پر حملہ آور ہوگئے۔ آنسو کسی جھڑی کی طرح آنکھوں سے رواں تھے۔

''یا اللہ! مجھے ہمت دینا۔ مجھے اس غم سے نکلنے کی ہمت دینا بس۔'' اس نے آسمان کی جانب چہرہ اٹھاتے ہوئے گڑگڑا کر کہا اور دائیں ہاتھ سے آنسو صاف کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ جہاں ایک اور غم و صدمہ اس کا منتظر تھا۔ ماہم اور گلناز کی قبریں بارش کے باعث بالکل بیٹھ چکی تھیں۔ ان قبروں کے چاروں اطراف گڑھے بن گئے تھے جو پانی سے لبریز ایک ہولناک منظر پیش کر رہے تھے۔ قبروں کے کتبے پچھلی جانب گر کر زمین میں دھنس چکے تھے۔

حمزہ کا دل یکدم ہی کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ وہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور اپنی ہتھیلیوں کی اوک بنائے گڑھوں سے پانی نکالنے لگا۔ اس جنونی کوشش میں نہ جانے کتنا وقت بیت گیا۔ اس کا دکھتا بدن مزید اذیت محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کوشش میں بالکل ہلکان ہوجانے کے بعد وہ ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور گلناز کی قبر کا کتبہ زمین سے کھینچ کر باہر نکالنے لگا۔ اگلے چند لمحوں میں اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ امر اس کے لیے بالکل ناممکن ہے۔ دلدلی زمین میں کتبے کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔

''چھوڑ دو باؤ! کیوں تھکا رہے ہو خود کو؟'' اسے اپنے عقب میں ایک سپاٹ آواز نے چونکایا۔

حمزہ نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سامنے گورکن موجود تھا۔ اس کی عمر تقریباً ساٹھ برس، سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید اور رنگت سیاہ تھی۔ سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب بے نیازی اور سرد مہری جھلکتی تھی۔

''یہ حالت دیکھ رہے ہو تم ان قبروں کی؟ اس چیز کے پیسے ملتے ہیں کیا تمہیں؟'' حمزہ بھڑک گیا۔

''اوئے باؤجی! ٹھنڈ رکھو۔ کیوں اتنی گرمی کھا رہے ہو؟ ٹھنڈ رکھو!'' اس پر حمزہ کے غصے کا بالکل اثر نہ ہوا تھا۔

''ٹھنڈ کے بچے! میں کمپلین کروں گا تیری۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے یہاں؟'' وہ پانی کے گڑھوں اور کتبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید برافروختہ ہوا۔

''جاؤ! یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ بارش پر تیرا زور ہے نہ میرا۔ یہ تو ہر سال ہی ایسا ہوتا ہے۔ موسم کھلنے دو۔ مٹی کی لپائی دوبارہ کروالینا۔ اللہ اللہ خیر صلا!'' وہ بے نیازی سے کہنے لگا۔

حمزہ حیرت و تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''کس قدر بے حس انسان ہو تم!'' اس نے سر ہلایا۔

''بے حسی کیا باؤ؟ میرا کام ہے یہ، آدھی سے زیادہ زندگی قبروں کو دیکھ دیکھ کر گزاری ہے۔ یہ سب دیکھ رہا ہے نا؟'' گورکن نے چاروں اطراف میں شکستہ قبروں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ سب بھی تیری ہی طرح کسی نہ کسی کے پیارے تھے۔ لوگ دفناتے ہیں، چار چھ مہینے چکر لگاتے ہیں پھر آہستہ آہستہ عید، شبرات، محرم میں قبروں سے مٹی جھاڑنے چلے آتے ہیں۔ تو میں نے ہر کسی۔ کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا نا؟ اگر کسی کو اپنا پیارا عزیز ہے تو آتا جاتا رہے۔ ہم لپائی میں مدد کے لیے تیار ہیں۔''

''میں چار چھ مہینے بعد چکر لگانے والوں میں سے نہیں ہوں سمجھا تو؟'' حمزہ ایک بار پھر بھڑکا۔

گورکن اس کے انداز پر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''نئی نئی چوٹ لگی ہو تو سبھی ایسے کرتے اور کہتے ہیں۔ تو کوئی نئی بات نہیں کر رہا۔ میں پچھلے چالیس سال سے یہی کچھ دیکھ اور سن رہا ہوں۔ میں ادھر اپنے کوارٹر میں ہوں۔ لپائی کروانی ہو تو پیسے دے جانا ورنہ ایک دو ماہ میں یہ قبریں بالکل بیٹھ جائیں گی۔ پھر ان پر کسی نہ کسی کی قبر بن جائے گی۔''

گورکن سفاکانہ حد تک صاف گو تھا۔ حمزہ کو اپنی رگوں میں لہو اُبلتا محسوس ہونے لگا۔ گورکن کی باتیں اس کے قلب و روح پر تازیانے کی طرح برس رہی تھیں۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے وہ۔'' اس کے اندر سے ایک صدا اُبھری۔ ''تم اتنے دن سے یہاں آنے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہے تھے۔ اور سب باتیں چھوڑو! تم تو اتنے بے غیرت ہو کہ ان دونوں کی موت کے ذمے دار سے واقف ہونے کے باوجود کچھ نہیں کر پائے ہو۔''

اس کوڑے نے اسے بے طرح بلبلا کر رکھ دیا۔

''زوہیب..... یو باسٹرڈ! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تو ایسے کیریکٹر کا مالک ہوگا۔ میرے سامنے آجا ایک بار تو میں.....'' اس نے دانت کچکچائے۔

pklibrary.com

''تو میں؟ تو میں کیا بھئی؟ کیا کر سکتے ہو تم؟ بزدلوں کی طرح آنسو بہانے کے سوا تم کر بھی کیا سکتے ہو؟'' کوڑے کی ضرب مزید شدید ہوئی۔

''آئی ول کل دیٹ باسٹرڈ!'' اس نے گلناز کی قبر سے گیلی مٹی اپنی مٹھی میں بھینچتے ہوئے خود کلامی کی۔

''اور ریئلی؟'' ایک استہزائیہ صدا نے اسے مضطرب کیا۔

''یس..... یس ریئلی! میری زندگی برباد کر دینے والا وہ شخص اتنے آرام سے اپنی زندگی کیسے انجوائے کر سکتا ہے؟ میری ماں، بہن یہاں قبروں میں بھی بے آرام ہیں۔ میرا باپ وہاں بستر پر معذور پڑا ہے اور وہ اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔'' اس نے دوسری مٹھی میں ماہم کی قبر کی مٹی بھینچ لی۔

''انصاف..... ہم'' اسی پُرسوچ آواز نے کہا۔

''انصاف تو یہ ہے کہ وہ بھی ایسی ہی اذیت سے گزرے۔ اسے بھی تو کسی پیارے کی جدائی کا صدمہ دیکھنا چاہیے نا؟''

''ہاں! اور ایک بار نہیں بار بار دیکھنا چاہیے۔'' حمزہ نے دائیں مٹھی میں دبی مٹی کی مہک سونگھی۔ اسے اپنے وجود میں حیران کن طور پر توانائی کی نئی لہریں سرایت ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ ٹوٹتے بدن اور دکھتے سر کی اذیت پل بھر میں ہی فراموش ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی جیب سے ایک رومال نکالا اور دونوں ہتھیلیوں سے مٹی اس میں جھاڑنے کے بعد گرہ لگا لی۔ گورکن کو لپائی اور کتبوں کی ازسرِنو تنصیب کے پیسے دے کر وہ گھر آیا تو اس کے ذہن میں ایک جزوی حکمتِ عملی طے پا چکی تھی۔

☆☆☆

''تیز تیز قدم اٹھاؤ بھئی! اتنی سست روی سے کیوں چل رہی ہو؟'' زوہیب نے ثنا کو گھرکا۔ وہ دونوں اس وقت ایک پارک کے جاگنگ ٹریک پر موجود تھے۔

''بس! مجھ سے اور نہیں چلا جا رہا۔'' ثنا نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

''واک تو تمہیں کرنی پڑے گی۔ شادی کو ابھی ٹائم ہی کتنا ہوا ہے اور تمہارا ویٹ بڑھنے لگا ہے۔ یہی حال رہا تو کسی دن ڈھول بن جاؤ گی۔'' وہ اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں بولا۔

ثنا کو اس لمحہ سخت اہانت محسوس ہوئی تھی۔ شادی کے بعد ہونے والی دعوتوں سے اس کے کھانے پینے کے معمولات میں خاصی بے ترتیبی اور عدم توازن در آیا تھا۔

''ویٹ صرف میرا تو نہیں بڑھا۔ آپ بھی اس معاملے میں خاصے خود کفیل ہو چکے ہیں۔'' اس نے جتایا۔

''میری تو خیر تم بات ہی نہ کرو۔ مجھ پر ہر چیز سوٹ کرتی ہے۔ تم اپنی فکر کرو بس۔ اسی طرح سستی دکھائی تو صبح شام واک پر لایا کروں گا۔ سمجھیں؟'' زوہیب کا اطمینان برقرار تھا۔

ثنا نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ اپنے متفرق جذبات میں گھرے ان دونوں کو ہی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک سنگی بینچ پر بیٹھے حمزہ کی شرر بار نظروں کی زد میں ہیں۔ اس لمحے حمزہ کی جزوی حکمتِ عملی کے خدوخال مکمل طور پر تشکیل پا چکے تھے۔

☆☆☆

ثنا اور زوہیب کو واک پر جاتے ہوئے کئی روز بیت چکے تھے۔ زوہیب بہر صورت اس سے ایک گھنٹا واک کرواتا تھا۔ ثنا کی دوہائی، بے ترتیب تنفس اور ٹانگوں کی لرزش اس پر کوئی اثر کر کے ہی نہ دیتی۔

ان سب معاملات سے قطع نظر ثنا کے لیے پُراذیت لمحات وہ ہوتے تھے جب کوئی نہ کوئی لڑکی مسکراتی نگاہوں سے زوہیب کی جانب متوجہ ہو جاتی۔ زوہیب کا جوابی مسکراہٹ کا تبادلہ اسے جلتے انگاروں کی تپش میں مبتلا کر دیا کرتا تھا۔ اُس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ جینز، شرٹ، مختصر بالوں والی، میک اَپ سے لتھڑی ایک لڑکی نے زوہیب کو دیکھا اور پُرجوش انداز میں اس کے پاس چلی آئی۔ زوہیب نے بھی اسے دیکھتے ہی اپنے قدم روک دیے۔

''ہیلو جی!'' لڑکی نے وارفتگی سے اسے دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔

''ہیلو مائی ڈیئر! واٹ آ پلیزنٹ سرپرائز!'' زوہیب بھی پُرجوش ہوا۔ ''یہاں کیسے بھئی؟ تم تو آسٹریلیا چلی گئی تھیں نا؟''

''یس! دو دن پہلے ہی واپس آئی ہوں ہالیڈیز پر۔'' لڑکی کی نگاہوں میں ایک عجیب سی کیفیت ہلکورے لینے لگی۔ ثنا اس کیفیت کے ماخذ سے انجان نہیں تھی۔

''تم بالکل ویسی کی ویسی ہی ہو۔ ذرا بھی نہیں بدلیں۔'' زوہیب کی نظریں اس کے چست لباس سے جھلکتے جسمانی خدوخال سے اُلجھنے لگیں۔

''سیم ٹو یو سوئٹ ہارٹ!'' وہ مخمور انداز میں بولی۔

''میرا انٹروڈکشن نہیں کروائیں گے بھئی اِن سے؟'' ثنا کے لیے خاموش رہنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔

pklibrary.com

''اوہ..... یس!'' زوہیب کو اس کی موجودگی یاد آئی۔
''ان سے ملو رومی! یہ میری وائف ہیں۔'' اس نے رسمی سے انداز میں بتایا۔
''شادی کر لی..... اتنی جلدی؟'' رومی نے صدمے سے کہا۔
''ہاں! کرنی پڑی۔ خیر! تم، سناؤ؟ کہیں کوئی انگیجمنٹ وغیرہ تو نہیں ہوئی؟'' اس نے تجسس سے دریافت کیا۔
''نہیں بھئی! میں ابھی اپنی لائف انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ اتنی جلدی شادی کے جھمیلوں میں پڑنے کا کوئی شوق نہیں ہے مجھے۔'' رومی نے نخوت سے ثنا کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
''تمہارا نمبر وہی ہے نا؟'' زوہیب نے مزید پُرشوق نگاہوں سے اسے دیکھا۔
''یس! سیم۔'' وہ بھی اسی انداز سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
ثنا کے ضبط کا پیمانہ بالکل لبریز ہو گیا۔
''گھر چلیں زوہیب؟ امی اکیلی ہوں گی۔'' اس نے سرد مہری سے شوہر کو مخاطب کیا۔
زوہیب نے ایک ناگوار نگاہ اس پر ڈالی اور بادلِ ناخواستہ رومی سے الوداعی کلمات ادا کرنے لگا۔ ثنا کا مزاج سخت برہم ہو چکا تھا لیکن وہ اپنی ہی ترنگ میں تھا۔ مزاج بھی خاصا خوشگوار ہو چکا تھا اور یہ بات ثنا کو مزید طیش زدہ کر رہی تھی۔ پارک کے مرکزی دروازے پر پہنچ کر زوہیب ایک بار ٹھٹک کر رک گیا۔ ثنا نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا تو ایک لڑکی کی دید نے اس کے ضبط کا پیمانہ بالکل ہی لبریز کر دیا۔
''اوہ..... ہیلو! آپ یہاں کیسے؟'' حجاب میں لپٹی اس لڑکی نے زوہیب کو مخاطب کیا۔
''جیسے آپ!'' اس نے برجستگی سے جواب دیا۔
لڑکی بے اختیار کھلکھلا اٹھی۔ ثنا نے ایک شرربار نگاہ شوہر پر ڈالی اور اکھڑ انداز میں کہنے لگی۔
''آپ کی ہیلو ہائے ختم ہو جائے تو گھر آجایئے گا۔ میں چلتی ہوں۔ بائے!''
''او کے! تم چلو میں آتا ہوں ابھی۔'' زوہیب نے بے نیازی سے جواب دیا۔
ثنا سرتاپا سلگتے ہوئے پاؤں پٹخ کر آگے بڑھ گئی۔ اس کی حسیات البتہ زوہیب پر ہی مرکوز تھیں۔ وہ چند ثانیوں کے بعد پلٹ کر دیکھتی اور زوہیب کو اسی لڑکی سے محوِ گفتگو پا کر مزید سلگ جاتی۔ اس کشمکش اور اُلجھن میں اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ایک بائیک بغلی سڑک سے تیزی سے اس کی طرف بڑھی ہے۔ اس کا چہرہ عقبی سمت مڑتے ہی بائیک نے اسے زوردار ٹکر مار کر کئی فٹ دور اُچھالا اور فوراً ہی یوٹرن لے کر اسی بغلی سڑک سے ہوتی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔
ثنا کے سر کے گرد سڑک لہو سے رنگین ہو چکی تھی۔ چہرے، ہاتھوں اور جسم کے دیگر حصوں پر بھی شدید خراشیں آئی تھیں۔ کچھ ہی لمحوں میں اس کے آس پاس نصف درجن سے زائد افراد اکٹھے ہو گئے۔
''کیا ہوا؟ کیسے ہٹ ہوئی ہیں یہ؟''
''کوئی بائیک دیکھی تھی میں نے۔'' دوسری صدا اُبھری۔
''نمبر نوٹ کیا تھا کیا؟'' تیسرے فرد نے دریافت کیا۔
''نہیں! نمبر پلیٹ نہیں تھی۔''
اس اثنا میں زوہیب بھی اسی حجاب والی لڑکی کے ہمراہ وہاں چلا آیا۔ اس کا چہرہ سخت متوحش دکھائی دینے لگا تھا۔ ثنا کی یہ حالت دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔
''موبائل دیکھو ان کا۔ میں ایمبولنس کال کرتا ہوں۔ پتا نہیں کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟''
''میں ہوں اس کے ساتھ۔ میری وائف ہے یہ۔'' زوہیب کی پھنسی ہوئی آواز پر سبھی افراد اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔
ثنا کی لہو سے سنی آنکھوں میں متفرق جذبات جھلکنے لگے۔ حسرت، خلش، گلے، شکوے اور پھر ایک الوداعی رنگ۔ اس کے بدن میں اینٹھن کے باعث جھٹکے پیدا ہوئے اور آنکھیں بے نور ہو گئیں۔

☆☆☆

حمزہ اپنے بستر میں دبکا کمبل منہ تک تانے لیٹا تھا۔ زبیر کی طبیعت آج صبح ہی سے کافی خراب تھی۔ حمزہ نے ڈاکٹر کے مشورے سے انہیں سکون آور گولیاں کھلا دی تھیں جس کے باعث اب وہ محوِ نیند تھے۔ حمزہ کی حالت البتہ شدید منتشر تھی۔ پردۂ تصور پر آج شام کے مناظر جھلک دکھانے لگتے۔ ثنا کو بائیک سے ٹکر مارنے کی پرچھائیاں لرزنے لگتیں تو اگلے ہی لمحے ایک دھڑکا اسے گھیر لیتا۔ ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ سے ایسا محسوس ہوتا کہ دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ اس کے بعد تخیل کی کارفرمائیاں شروع ہو جاتیں۔ اس دستک کے بعد پولیس دندناتی ہوئی اندر آتی اور چند اہلکار اسے گریبان سے

pklibrary.com

پکڑ کر گھسیٹ لیتے۔ ان کے پاس کسی سی سی ٹی وی سے لی گئی تصویر ہوتی۔

تخیل کے دوسرے منظر میں پولیس کے ہمراہ زوہیب بھی اس کے گھر چلا آتا اور اسے دیکھتے ہی نفرت بھری نگاہ اس پر ڈال کر کہتا۔

''یہی ہے وہ بائیکر! میں پرسنلی اسے جانتا ہوں۔ میں نے اس کے کندھوں کی شیپ سے اسے پہچانا تھا۔ اریسٹ کر لیں اسے۔''

یہ کشمکش اور اُلجھن رات بھر یونہی جاری رہی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ حد تو یہ تھی کہ زبیر کو دی جانے والی سکون آور گولی استعمال کرنے کے باوجود اسے نیند نہیں آئی تھی۔ صبح ہوتے ہی اندیشوں کا بار کچھ ہلکا ہوا۔ ذہنی رو میں تبدیلی آئی تو وہ پہلی مرتبہ اپنا 'ٹارگٹ' مکمل ہونے کا سکون رگ و پے میں سرایت کرتا محسوس کرنے لگا۔ زوہیب کو ملنے والی اذیت، اس کے چہرے سے جھلکنے والا کرب دیکھنے کے لیے دل شدت سے مچلنے لگا۔ بوجھل آنکھیں انگلیوں کی پوروں سے مسلتے وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

زوہیب کے گھر میں مرد و خواتین کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ثنا کی جواں مرگ نے عزیز و اقارب اور احباب کو سخت صدمہ پہنچایا تھا۔ حمزہ صبح آٹھ بجے وہاں پہنچا تو ثنا کو آخری غسل دینے کے لیے لے جایا جا چکا تھا۔ اس گھر میں موت کی مخصوص مہک اور کثیر مجمع کے باوجود واضح طور پر محسوس ہونے والی ایک ویرانی محسوس کر کے اس کے دل میں سکون و اطمینان کی لہریں ہلکورے لینے لگیں۔ وہ ایک کونے میں کھڑا ہو کر تمام تر صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔

زوہیب کی والدہ بھی ایک کرسی پر بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر طاری صدمہ اور آزردگی دیکھ کر حمزہ کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ ان کے اردگرد موجود خواتین اپنے روایتی انداز میں دلاسے دیتے ہوئے تجسس کا بھی بھرپور اظہار کر رہی تھیں۔

''خدا کی یہی مرضی تھی بہن! وہ اتنی ہی لکھوا کر لائی تھی۔ یہ بھی شکر کرو کہ زوہیب کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اکلوتے بیٹے کی زندگی بخش دی اللہ نے۔'' ایک خاتون کہنے لگیں۔

''وہ بھی تو کسی کی بیٹی ہی تھی۔ میری طرح ایک ماں ہی تھی جس کی گود اُجڑی ہے۔'' رابعہ نے اپنے مخصوص متانت بھرے انداز میں جواب دیا۔

حمزہ کو اس جواب کی صداقت اور جذبات کی نیک نیتی میں بالکل شبہ نہیں تھا۔ وہ دلی طور پر رابعہ کی اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی کا قائل تھا۔

''ہاں ہاں..... بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔'' خاتون نے فوراً پینترا بدلتے ہوئے شدومد سے سر ہلایا۔

حمزہ کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ ان خواتین کے دل و دماغ میں برپا خیالات سے بخوبی واقف تھا۔ ان میں سے اکثریت ایسی خواتین کی تھی جو اپنی بیٹیوں کے رشتے کی آس میں رابعہ سے نتھی ہو رہی تھیں۔ حمزہ اس معاشرتی تضاد اور بے حسیانہ رویّوں پر کڑھ کر رہ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ثنا کی میت غسل کے بعد وہاں لائی گئی تو ایک کہرام برپا ہو گیا۔

''زوہیب کہاں ہے؟ میرا بچہ ٹھیک تو ہے نا؟'' رابعہ نے ماما سے مغلوب ہو کر اپنی بڑی بہن سے دریافت کیا۔ انہیں بیٹے کے متوقع 'جذباتی بحران' پر سخت تشویش لاحق تھی۔

''اس کے کوئی جاننے والے آئے تھے۔ انہی کے پاس بیٹھا ہے باہر۔'' بہن نے بتایا۔

حمزہ، زوہیب کی تلاش میں بیرونی سمت چلا آیا۔ کچھ ہی دیر میں اسے زوہیب دکھائی دے گیا۔ اس نے بہترین برانڈ کا نفیس لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ ایسی کٹھن گھڑی میں اس طرح ذاتی آرائش و زیبائش کا خیال رکھنا 'زوہیب امجد' کا خاصہ ہی ہو سکتا تھا۔ ذہن میں متفرق خیالات لیے حمزہ اطراف کا جائزہ لیتا رہا۔ چہرے مختلف لیکن مناظر یکساں تھے۔ جذبات اور تڑپ میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ ثنا کے والدین، بہن بھائی اور دیگر عزیز و اقارب کا دکھ فطری اور واضح طور پر جھلک رہا تھا۔

اسی لمحے اس کی نظر ایک نوجوان پر پڑی جس کے نقوش میں ثنا کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ نوجوان مغموم انداز میں سر جھکائے ایک خاتون کے پاس گیا اور جھک کر کچھ کہنے لگا۔ یہ منظر بھی مانوس ہی تھا۔

''نہیں! بالکل نہیں! یہ تم کیا کہہ رہے ہو عثمان؟ میں اسے کہیں نہیں جانے دوں گی۔ اسے یہیں رہنے دو میرے پاس میری آنکھوں کے سامنے۔'' خاتون نے تڑپ کر کہا۔

عثمان نے والدہ کے ہاتھ تھام لیے اور دھیرے سے سمجھانے لگا۔

''حوصلہ کیجیے مما پلیز! اللہ کی یہی رضا تھی۔ ثنا کو رخصت کرنا ہی ہے اب۔''

''کیسے بھائی ہو تم؟ تمہیں بہن کا ذرا خیال نہیں ہے۔

pklibrary.com

کہیں نہیں لے کے جانا اِسے۔ میں نے کہہ دیا ہے بس۔ میں کیسے رہوں گی اِسے دیکھے بغیر؟ ارے! اس سے بات کیے بغیر تو مجھے چین نہیں پڑتا اور تم اسے رخصت کرنے کی بات کر رہے ہو؟ اسے ایک بار کر تو چکی ہوں رخصت۔ اب دوبارہ ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ اس رخصتی کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ ہائے اللہ! اللہ جی! میری بچی! کیوں چلی گئی؟'' خاتون نے تڑپ کر اس کا ہاتھ جھٹکا۔

اس منظر اور الفاظ نے حمزہ کا دل گداز کر دیا۔ دل و دماغ پر گلناز کی یاد حملہ آور ہوگئی۔ حمزہ کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کی آنکھوں کے نم گوشوں کی وجہ والدہ کی یاد تھی یا اس کے سامنے موجود ایک اور ماں کی تڑپ۔ اسے اپنے وجود میں ایک عجیب سی خلش اور ملال کا احساس ہونے لگا۔ تاہم یہ کیفیت عارضی ہی رہی۔ اگلے ہی لمحے زوہیب جنازے کی چارپائی اٹھانے کے لیے چند افراد کے ہمراہ وہاں چلا آیا۔ حمزہ کے بدن میں ایک بار پھر انگاروں کی سوختگی در آنے لگی۔ اسے رابعہ کی مغموم کیفیت اور زوہیب کی پژمردگی لطف دینے لگی۔ اس لطف میں اضافے کے لیے حمزہ نے جنازے کے ساتھ ہی قبرستان روانگی کا ارادہ کرلیا۔

☆☆☆

ثنا کی آخری رسومات مکمل ہو چکی تھیں۔ زوہیب اور دیگر اقارب نے اسے لحد نشین کر دیا۔ دیگر شرکاء رسمی انداز میں تعزیت کا فریضہ نبھاتے یکے بعد دیگرے رخصت ہونے لگے۔ حمزہ نہایت سکون و اطمینان سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد وہاں ثنا کے والد، بھائیوں اور زوہیب کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ حمزہ مضبوط قدموں سے چلتا زوہیب کے پاس گیا اور ایک توقف سے کہنے لگا۔

''السلام علیکم جی!''

''وعلیکم السلام! تم بھی آئے تھے؟ سوری میں نے دیکھا ہی نہیں تمہیں۔'' زوہیب نے پژمردگی سے جواب دیا۔

''جی اِٹس او کے! میں سمجھ سکتا ہوں آپ کی کنڈیشن۔'' حمزہ نے بھرپور اپنائیت کا مظاہرہ کیا۔ ''آپ کی مسز کا مجھے بہت افسوس ہے۔ پروردگار آپ کو صبر اور مرحومہ کے لیے اگلی منزلوں میں آسانی فرمائے۔''

''آمین! شکریہ۔'' زوہیب نے بوجھل سانس خارج کی اور قدرے توقف سے کہنے لگا۔ ''مجھے ماہم اور آنٹی گلناز کی ڈیتھ کا بہت افسوس ہے۔ کوشش کے باوجود جنازے پر نہیں آسکا تھا۔''

''اِٹس او کے! میں سمجھ سکتا ہوں۔ ایک نئی زندگی شروع ہوئی تھی آپ کی۔ کوئی ایشو نہیں۔ خیر! اپنا خیال رکھیے گا۔ میں گھر بھی چکر لگاؤں گا انشاء اللہ۔'' حمزہ نے متانت کا دامن تھامے رکھا۔

''یس شیور! ضرور لگانا چکر۔ میں ویٹ کروں گا۔'' زوہیب نے اپنی کنپٹیاں دبائیں۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ گھر جا کے آرام کیجیے پلیز!'' حمزہ نے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

زوہیب نے اثبات میں سر ہلایا اور سست روی سے چلتا قبرستان کے مرکزی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

ثنا کی تدفین کو ایک مہینہ بیت چکا تھا۔ زوہیب بظاہر اپنے معمولاتِ زندگی میں مصروف ہو گیا تھا تاہم اس کا اندرونی خلفشار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ فطری طور پر ایک خود پسند شخص تھا اور خود پسندی کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ اسے اپنی نمائش اور برتری ظاہر کرتے رہنے کے لیے کسی نہ کسی صنفِ مخالف کی لازمی ضرورت ہوتی ہے۔ زوہیب کو ثنا کے روپ میں ایک 'کھلونا' ملا ہوا تھا۔ ایسا کھلونا جو اس کی جنسی، معاشرتی اور ذہنی آسودگی کا بہترین ذریعہ تھا۔ اس نے رابعہ کے ایما پر ثنا کے جہیز کا سامان واپس بھجوایا تو کمرے کی ویرانی مزید دل ہولانے لگی۔

اس اندرونی وحشت اور اضطراب سے بے حال ہو کر وہ رابعہ کے کمرے میں چلا آیا جہاں ایک رشتے دار خاتون تعزیت کے لیے آئی بیٹھی تھیں۔ یہ خاتون سوئے اتفاق 'میرج بروکر' بھی تھیں۔

''طبیعت کیسی ہے میرے چاند؟'' رابعہ نے بڑی محبت سے دریافت کیا۔

''ٹھیک ہوں۔ آپ کے سامنے ہی ہوں۔'' وہ دانستہ طور پر آزردگی سے مسکرایا۔

رابعہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اکلوتے بیٹے کی زندگی میں در آنے والی یہ ویرانی انہیں ہر لمحہ مضطرب رکھتی تھی۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ بلڈ پریشر والی گولی ریگولر کھا رہی ہیں نا آپ؟'' زوہیب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ختم ہو گئی تھیں کل رات۔ تمہیں بتانا یاد ہی نہیں رہا۔'' انہوں نے خفت سے بتایا۔

''کمال کرتی ہیں امی آپ ویسے۔'' زوہیب جز بز ہوا۔ ''میں نے کتنی بار کہا ہے کہ میڈیسن ختم ہونے سے

pklibrary.com

دو دن پہلے مجھے بتا دیا کریں۔ میڈیسن میں کوئی ناغہ نہ کیا کریں۔"

"وہ بس یہ ذمے داری شانے ہی اٹھائی ہوئی تھی۔ وہی سارا حساب کتاب رکھتی تھی۔ میڈیسن کھلاتی بھی وہی تھی۔" رابعہ نے دانستہ طور پر یہ ذکر چھیڑا۔

"میری مانو تو بیٹے کی دوسری شادی کا کچھ سوچو۔ تم اس عمر میں کہاں گھر سنبھالتی پھرو گی؟" رشتے دار خاتون ہما نے لقمہ دیا اور زوہیب سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔

"مجھے پتا ہے بیٹا! تمہارے لیے یہ فیصلہ آسان نہیں ہوگا۔ لیکن اپنی ماں کا ہی کچھ سوچو۔ انہیں اس عمر میں آرام اور توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ توجہ کوئی میڈ تو نہیں دے سکتی نا؟ اس گھر کو ایک بہو کی ضرورت ہے۔"

زوہیب کچھ سوچنے اور متذبذب ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔

"پلیز میرے چاند! مجھ سے اس گھر اور تمہاری زندگی کی ویرانی نہیں دیکھی جا رہی۔ یہی حال رہا تو مجھے اور کئی بیماریاں لگ جائیں گی۔" رابعہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک اٹھے۔

زوہیب تڑپ کر آگے بڑھا اور ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"جیسے آپ کی مرضی اور خوشی! میری شرطیں بہر حال آپ کو پتا ہی ہیں۔ میں ان پر کوئی کمپرومائز نہیں کر سکتا۔"

"میرے بیٹے کو کوئی کمپرومائز کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" وہ محبت سے بولیں۔

"میری نظر میں کافی لڑکیاں ہیں اس وقت بھی۔" ہما نے اگلے ہی لمحہ موبائل فون میں درجن بھر سے زائد تصاویر نکال لیں۔

زوہیب نے فون تھاما اور ہر ایک تصویر کا بغور 'ایکسرے' کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک تصویر پسند کر چکا تھا جس میں لڑکی نے سر پر سلیقے سے دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ چہرے پر میک اپ بھی بالکل مناسب تھا۔ مکمل آستینوں پر مشتمل لباس چست نہیں تھا۔ آنکھوں میں سنجیدگی اور مسکراہٹ کا انوکھا ملاپ اس کی شخصیت کو منفرد روپ فراہم کر رہا تھا۔ زوہیب چند لمحوں تک اس کی آنکھوں، چہرے کی ساخت، نقوش میں پنہاں سحر اور 'باڈی لینگویج' کا معائنہ کرتا رہا اور پھر اپنی مخصوص بے نیازی سے وہ تصویر ان خاتون کے سامنے کر دی۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"شانزہ..... اکلوتی بیٹی ہے والدین کی۔" ہما نے تفصیل بتائی۔

"کرتی کیا ہے؟ پڑھ ہی رہی ہوگی؟" زوہیب نے کُریدا۔

"ہاں! پڑھ رہی ہے۔ ہوم اکنامکس کالج میں فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔" ہما نے جواب دیا۔

"تو شادی کی اتنی جلدی کیا پڑ گئی انہیں؟" وہ مشکوک ہوا۔

"اس کے والد کو سیکنڈ اسٹیج کینسر ہے میرے چاند!" رابعہ نے بیٹے کو مخاطب کیا۔ وہ ہما سے پہلے ہی ان لڑکیوں کا 'بائیو ڈیٹا' دریافت کر چکی تھیں۔

"تو علاج کروالیں۔ یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ بیٹی کی شادی کر دینے سے کینسر ختم ہو جائے گا؟"

بیٹے کے اس سوال پر رابعہ گہری سانس بھر کے رہ گئیں۔ وہ زوہیب کے مزاج سے بخوبی واقف تھیں۔ اس نے گزشتہ بار بھی انہیں اپنے سوالات سے یونہی زچ کیا تھا۔

"فیملی میں پراپرٹی کے بھی کچھ ایشوز ہیں۔ اس لیے بیٹی کو جلد از جلد اپنے گھر کا کر دینا چاہتے ہیں۔" ہما نے اسے اپنی معلومات سے آگاہ کیا۔

"فیملی میں کزن وغیرہ بھی تو ہوں گے۔ ان سے کبھی شادی کا سلسلہ نہیں چلا کیا؟ میری پہلی شادی کے متعلق کیا بتائیں گے انہیں؟ اب ایسی بھی کیا مجبوری ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ایسے شخص سے کر دیں گے جس کی وائف کی کچھ ٹائم پہلے ہی ڈیتھ ہوئی ہے؟"

زوہیب کے اس سوال پر رابعہ جھنجلا گئیں۔ بیٹے کے مزاج کا یہ پہلو انہیں ہمیشہ یونہی کوفت زدہ کیا کرتا تھا تاہم وہ کسی ردِعمل سے گریز ہی کرتی تھیں۔ اس بار بھی وہ متانت سے اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"تمہاری کون سی عمر گزر گئی ہے جو انہیں ایشو ہوگا؟ باقی انہیں ہینڈل کرنا میرا مسئلہ ہے۔ میں جانوں میرا کام جانے۔ میرے چاند کو بھی کوئی انکار کر سکتا ہے کیا؟ ان لوگوں کو اگر کوئی ایشو ہوا بھی تو یہ ان کی بیڈ لک ہی ہوگی۔ میرا بیٹا ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہے۔ ایسا ہیرا صفت لڑکا انہیں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ میرے بیٹے کو لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہے۔ شانا کا چہلم ہوتے ہی میں تمہارا نکاح کر دوں گی۔"

زوہیب کی آنکھیں احساسِ تفاخر سے چمک اٹھیں۔ وہ بے نیازی سے اپنے دیگر کاموں میں مشغول ہو گیا۔

pklibrary.com

☆☆☆

ماہم اور گلناز کی رسم چہلم قریب تھی۔ حمزہ نے گھر میں ایسی کسی 'تقریب' کے لیے عزیز و اقارب، ہمسایوں اور احباب کو مدعو کرنے سے گریز ہی کیا تھا۔ دوپہر کے بعد سائرہ اپنے والدین کے ہمراہ ملاقات کے لیے چلی آئی۔ روحان کسی ضروری کام میں اُلجھنے کے باعث ان کے ساتھ نہیں آسکا تھا۔ ابتدائی علیک سلیک کے بعد وہ حمزہ سے کہنے لگی۔

''مجھے ماہم اور آنٹی جی کے لیے قرآن پاک پڑھ رکھے ہیں۔ انہیں ختم شریف میں شامل کرلینا۔''

''میں نے کسی کو بلانا ہی نہیں۔ میں پھر سے وہ سب باتیں، اندازے اور طنز میں لپٹے سوال نہیں سن سکتا۔ کل ایک مدرسے کے بچوں سے قرآن خوانی کروا کے دیگ بانٹ دوں گا۔''

''بہترین فیصلہ ہے۔'' وہ افسردگی سے مسکرائی۔ اس کی توجہ زبیر سے محوِ گفتگو والدین پر بھی مرکوز تھی۔

''انکل کی طبیعت میں کوئی امپروومنٹ دکھائی نہیں دے رہی۔ ان کی ول پاور تو بہت اسٹرانگ ہوتی تھی۔'' اس نے تاسف سے زبیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! پتا نہیں امپروومنٹ کیوں نہیں ہو رہی؟ علاج میں کوئی کسر ہے نہ ہی ایکسرسائز میں۔ ان کی اسپیکنگ اسکلز بہت زیادہ ڈیمیج ہو رہی ہیں۔ تم یقین نہیں کرو گی کہ وہ بات کرتے ہوئے اگلے کا نام بھول جاتے ہیں۔ مجھے مخاطب کرنا ہو تو عرفان، جاوید، ماہم، نصر اور تین چار مزید رشتے داروں کے نام لینے کے بعد انہیں میرا نام یاد آتا ہے۔'' حمزہ کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

''بہت افسوس ہوتا ہے یہ سب سوچ کر۔ ایک ہنستا بستا گھر کیسے ویران ہو گیا ہے۔'' سائرہ کی آنکھوں میں بھی نمی در آئی۔

''سارا گھر نہیں سائرہ! اس وقت صرف میری لائف برباد ہوئی ہے۔ ماما اور ماہم اس دنیا سے ناتا توڑ چکی ہیں۔ پاپا یہاں میڈیسنز کے اثر میں سو جایا کرتے ہیں۔ رہ گیا میں! تو میں بالکل اکیلا ہو گیا ہوں۔ کوئی بھی نہیں میرے پاس۔ کوئی بھی تو نہیں ہے میرے ساتھ۔ ہر رات تھک کر بستر پر لیٹتا ہوں تو ایک ہی بات کسی پھندے کی طرح میرے گلے میں آ پھنستی ہے۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔'' وہ بلا تکان کہتا چلا گیا۔

''ایسی کیا بات ہے حمزہ؟ مجھ سے تو شیئر کر سکتے ہو نا؟'' سائرہ نے دلگیری سے جواب دیا۔

''یہ مائیں بڑی جھوٹی ہوتی ہیں سائرہ! بہت بڑی جھوٹی۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''ایسا کیوں سوچ رہے ہو تم؟'' سائرہ کے دل پر ایک گھونسا لگا۔

''سچ کہہ رہا ہوں۔ میری ماں کو ہی دیکھ لو۔ ساری زندگی مجھے اس بھرم میں رکھا کہ وہ سب سے زیادہ پیار مجھے کرتی ہیں۔ ہمیشہ ہر معاملے میں مجھے اہمیت دی۔ لیکن ہوا کیا؟ بیٹی کے ساتھ چلی گئیں۔ ایک بار بھی میرا نہیں سوچا۔ ایک بار تو میرے بارے میں سوچ لیتیں۔ لیکن نہیں! انہیں تو بیٹی سے ہی محبت تھی بس۔ اسی لیے تو میرا خیال نہیں آیا۔ کبھی معاف نہیں کروں گا میں انہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گا۔''

حمزہ کا یہ ہذیان دیکھ کر سائرہ کا دل غم سے لبریز ہو گیا۔

''اس سب کا ذمے دار صرف ایک ہی شخص ہے۔ صرف ایک شخص نے سب، کچھ برباد کر دیا۔'' وہ کرب سے بولی۔

''خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ سنا ہے اس کی وائف کسی ایکسیڈینٹ میں ماری گئی ہے۔'' حمزہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے حتی الامکان سرسری سے انداز میں کہا۔

''لیکن مجھے تو لگتا ہے کہ خدا کی رسی اس کے لیے زیادہ دراز ہے۔ کنفرم نیوز ملی ہے کہ ذوہیب کی دوسری شادی ہوئی ہے۔'' سائرہ نے دکھ سے بتایا۔

''جہنم میں جائے! میں نے اس کا معاملہ خدا کے سپرد کیا۔ وہی اس سے ہمارا انتقام لے گا۔'' اس نے دانستہ طور پر بے بسی سے جواب دیا۔

''آمین! تم بھی بس اپنی اسٹڈیز پر دھیان دو۔ تمہیں یاد ہے نا انکل اور آنٹی کو تمہیں کسی اچھی پوسٹ پر دیکھنے کا کتنا شوق تھا۔ بس انہی کے خواب پورے کرنے ہیں تمہیں۔'' سائرہ نے سنجیدگی اور شفقت سے اسے سمجھایا۔

حمزہ نے بوجھل انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔ سائرہ تقریباً نصف گھنٹے تک اس سے مختلف موضوعات پر بات چیت کرتی رہی۔ اس کے بعد والدین کے ہمراہ رخصت ہو گئی۔ وہ رات حمزہ کے لیے بے حد کربناک تھی۔ حمزہ کے ذہن میں ایک نیا ابال پیدا ہونے لگا تھا۔ سائرہ کی دی گئی خبر نے اس کی سوختگی میں اضافہ کر دیا تھا۔

''کس قدر بے حس ہے یہ شخص؟'' اس کے لیے انسانی جان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ اتنی جلدی نئی شادی رچا کے بیٹھ گیا ہے۔'' اس کے ذہن میں ایک دکھ بھری سوچ

اُبھری۔

''انسانی جان یا جذبات کی کوئی اہمیت ہوتی تو وہ ماہم کے ساتھ ایسا کیوں کرتا؟'' جارحانہ سوچ نے دستک دی۔

''غلطی میری بھی ہے۔ مجھے ثنا کی موت کے بعد اس سے یوں غافل نہیں ہوجانا چاہیے تھا۔ کسی نہ کسی طرح اس کی خبر رکھنی چاہیے تھی۔'' وہ جز بز ہوا۔

''لیکن باخبر رہنے کا کوئی ذریعہ بھی تو ہو؟ اس کی پرسنل لائف تک کیسے پہنچ سکتا ہوں میں؟'' جارحانہ سوچ نے تحریک دی۔

کچھ دیر اس نہج پر سوچتے رہنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔

''اوہ یس! یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی۔ میرا دھیان پہلے اس طرف کیوں نہیں گیا؟'' وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اور موبائل فون تھام کر زوہیب کا نمبر نکال لیا۔

اگلے پانچ منٹ تک اس سے گفتگو کے بعد وہ اس کے گھر تک رسائی کی راہ ہموار کر چکا تھا۔ اس رات نیند کی وادی میں قدم رکھنے سے قبل حمزہ نے اپنے ذہن میں ایک نئی حکمتِ عملی طے کرلی تھی۔

☆☆☆

زوہیب اور شانزہ کی رسمِ نکاح انجام پا چکی تھی۔ زوہیب کا اطمینان اس کے بشرے سے مکمل طور پر عیاں تھا۔ عزیز و اقارب کے چبھتے ہوئے سوالات سے گریز کے لیے اس تقریب میں درجن بھر سے بھی کم افراد مدعو کیے گئے تھے۔

نکاح کے بعد وہ ضروری رسومات کی ادائیگی ہوتے ہی جب حجلہ عروسی میں پہنچا تو اپنے مزاج سے مغلوب ہوتے ہی شانزہ سے گفتگو کا آغاز کردیا۔

''میری لائف میں میری ماں کی بہت اہمیت ہے۔''

''ہر ایک انسان کی زندگی میں ہی ہوتی ہے۔ یہ تو انڈر اسٹوڈ سی بات ہے۔'' شانزہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''آپ کو میری مدر کا بہت خیال رکھنا ہے۔'' اس نے تنبیہہ کی۔

''ہمم..... انشاء اللہ۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''ان کی میڈیسنز اور کھانے پینے میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونے دینی۔'' اس نے ایک اور مطالبہ کیا۔

''نہیں ہونے دوں گی انشاء اللہ!'' شانزہ نے گہری سانس لی۔

''کھانا بنانا آتا ہے نا ویسے؟'' زوہیب نے مشکوک سے انداز میں دریافت کیا۔

''ظاہری سی بات ہے۔ کوئی بھی والدین ایسی کسی ٹریننگ کے بغیر تو بیٹی کی شادی نہیں کردیا کرتے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''کیسا کھانا بنا لیتی ہیں ویسے؟''

''آپ کی مدر جیسا تو نہیں بنا سکتی بہرحال۔'' شانزہ اس کے سوال کا اصل مدعا فوراً بھانپ گئی۔

''بالکل! ان جیسا ٹیسٹ تو کسی کے ہاتھ میں بھی نہیں ہے۔'' وہ فخر سے بولا۔

''ہو بھی نہیں سکتا۔ ماں کے ہاتھ کا ٹیسٹ لانے کے لیے تو ایک عمر چاہیے ہوتی ہے۔'' شانزہ نے بھی لگی لپٹی کے بغیر کہا۔ وہ زوہیب کے ان سوالات سے خاصی اُلجھن محسوس کررہی تھی۔

''آپ کو میری امی سے سیکھنا ہوگا کھانا بنانا۔ مجھے کھانے کے نام پر 'ایکسپریمنٹس' نہیں چاہیے بھئی۔'' وہ استہزائیہ بولا۔

شانزہ کو اس مطالبہ پر خاصی اہانت محسوس ہوئی۔ وہ سخت اضطراب محسوس کرنے لگی تھی۔

''میں چینج کرلوں پلیز؟'' اس نے موضوعِ گفتگو تبدیل کرنے کے لیے کہا۔

''یہ میک اَپ کہاں سے کروایا ہے آپ نے؟'' زوہیب کو یکدم خیال آیا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' وہ تیکھے انداز میں بولی۔

''کچھ اوور سا لگ رہا ہے۔'' زوہیب نے استہزائیہ کہا۔

''مجھے تو کوئی برائی نظر نہیں آئی اس میں۔ سب نے ہی اتنی تعریف کی میری کہ بالکل 'ڈول' لگ رہی ہوں۔'' شانزہ نے فخریہ بتایا۔

''چہرہ ایسا لگ رہا ہے جیسے آٹا تھوپ کر پینٹ کردیا ہو۔'' زوہیب کے مزاج میں ہار ماننا بالکل نہیں تھا۔ اس کی بات کو کسی نے آج تک ایسے رد بھی نہیں کیا تھا۔

''یہ تو آج کل ٹرینڈ میں ہے۔ خیر! آپ کو کیا پتا ہوگا ایسی باتوں کا؟'' اس نے بھی اطمینان سے چوٹ کی اور قدرے توقف سے کہنے لگی۔

''میک اَپ تو خیر آپ کا بھی کچھ عجیب ہی لگ رہا تھا۔ میری کئی کزنز کافی ہنس رہی تھیں آپ کے چہرے پر 'بلش آن' دیکھ کر۔'' اس نے بات کے اختتام پر تاسف جتایا۔

pklibrary.com

زوہیب کے احساسِ برتری پر ایک زبردست چوٹ لگی۔

''مجھے میک اَپ کروانے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟''

وہ بدک گیا۔

''خیر! یہ بات تو نہ کریں آپ۔ ہر دولھا ہی اپنے چہرے پر تھوڑی بہت ڈیٹنگ پینٹنگ تو کرواتا ہی ہے۔'' اس نے ملائمت سے ایک اور چوٹ کی۔ پھر ایک ٹشو پیپر لے کر اس کے چہرے پر رگڑ کے سامنے کر دیا۔

''یہ کیا ہے پھر؟'' وہ محظوظ انداز میں بولی۔

زوہیب جز بز ہو کر رہ گیا۔ اسے زندگی میں ایسے 'جوابات' کبھی نہیں ملے تھے۔ اس نے بلبلا کر عجلت بھرے انداز میں اسے 'منہ دکھائی' کی انگوٹھی پہنائی اور کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ شانزہ کی یہ زبان دانی اور دوٹوک انداز میں اپنی بات مقابل تک پہنچانے کا 'فن' اس کے وجود میں ابھی سے گھٹن پیدا کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

زوہیب اور شانزہ کی زندگی کے نئے سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ ابتدائی چند روز تک تو زوہیب شانزہ کی جانب سے ان سوالات کا منتظر ہی رہا کہ اس نے شریکِ حیات کے لیے اسی کا ہی انتخاب کیوں کیا تھا؟ تاہم اس کی جانب سے خاموشی پر زوہیب نے ایک روز باتوں باتوں میں خود ہی جتا دیا۔

''میرے مائنڈ میں لائف پارٹنر کا ایک ہی اسکیچ ہوتا تھا۔''

''اچھا! کیا اسکیچ تھا آپ کے مائنڈ میں؟'' شانزہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تابعداری اور وفاداری تو سب سے پہلے ضروری ہے۔ شوہر کی مرضی کے خلاف عورت کو کوئی بھی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ میں نے ثنا کو بھی یہی سمجھایا تھا اور اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔'' اس نے تفاخر سے بتایا۔

''اوکے! میرے مائنڈ میں بھی لائف پارٹنر کا ایک اسکیچ تھا۔ لیکن خیر! میرے والدین نے یقیناً کوئی بہتر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔ باقی میرے خیال میں شوہر کو بھی عزت دینے کا فن آنا چاہیے۔ یہ تالی تو دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ عزت اور توجہ دینے سے ہی واپس ملتی ہے۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

زوہیب مضطرب انداز میں اپنی نو بیاہتا کا یہ روپ دیکھنے لگا۔ اسے دھیرے دھیرے یہ اندازہ ہونے لگا تھا کہ اپنی ظاہری شخصیت کے برعکس شانزہ بے حد منہ پھٹ اور بے باک لڑکی ہے۔ مقابل کے لیے ادھار رکھنا تو اسے آتا ہی نہیں تھا لیکن وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ والدین نے شادی بھی اس کی مرضی کے خلاف طے کی تھی۔ وہ اپنے علاقے کے ایک ایسے نوجوان کو پسند کرنے لگی تھی جو اُن کے فرقے سے تعلق ہی نہیں رکھتا تھا۔ والدین نے جذباتی استحصال کا ازلی سہارا لے کر اسے زوہیب سے شادی کے لیے راضی تو کر لیا تھا لیکن وہ ٹھہری عورت ذات! اولین محبت کی خلش دل سے کیونکر نکال پاتی؟ نکاح کے مقدس بندھن میں بندھ جانے کے باوجود اس کے دل کا ایک کونا ہنوز عدنان کی یادوں اور کسک سے آباد تھا۔ زوہیب کی زبان سے ثنا کا ذکر سن کر یہ کسک یکدم شدت اختیار گئی۔ اسی جذبے اور حسد سے مغلوب ہو کر وہ زوہیب سے کہنے لگی۔

''مجھے ماضی میں رہنے اور اسی سے کمپیریزن کرتے رہنے والے لوگ بھی پسند نہیں ہیں۔ انسان کو اتنا پریکٹیکل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے حال میں رہ کر اسے یادگار بنا سکے۔ ثنا کون تھی؟ کیا کرتی تھی؟ کیسے رہتی تھی؟ اس گھر پر اس کا کیا اثر تھا؟ اسے آپ نے کیا سمجھایا؟ اس نے کہاں کیا کمپرومائز کیے؟ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں شانزہ ہوں۔ میرا اپنا ایک لائف اسٹائل ہے۔ میں اپنا رشتہ اور گھر کسی کی مثال سامنے رکھ نہیں چلاؤں گی۔ میری اپنی ایک فلاسفی ہے۔ میں اس سے ہٹ کر نہیں چل سکتی۔''

زوہیب اس دوٹوک انداز پر ششدر رہ گیا۔ اسے اس لمحے ثنا کی کئی خوبیاں یاد آئی تھیں۔ اور پھر اس کے بعد ایک اور پرچھائیں جھلک دکھانے لگی۔ ماہم زبیر..... جس کی تابعداری اور خلوص میں اسے کوئی بھی شبہ نہیں رہا تھا۔ ماہم کی یاد آتے ہی اس کے انجام نے دل میں ایک زوردار چٹکی بھری۔ زوہیب کے ان خیالات میں شانزہ کی آواز نے خلل پیدا کیا۔

''میرے فائنل سمسٹر کی فیس پے کرنی ہے۔''

''کس خوشی میں؟'' وہ رکھائی سے بولا۔

شانزہ اس انداز پر ساکت رہ گئی۔

''کیا مطلب کس خوشی میں؟ آپ کی ممانے کمٹمنٹ کی تھی کہ شادی کے بعد میری تعلیم مکمل کروائیں گی۔''

''مجھے ایسی کوئی کمٹمنٹ یاد نہیں۔'' اس نے مزید رکھائی اختیار کی۔

''دس اِز ناٹ فیئر!'' وہ تڑپ اٹھی۔

زوہیب اسے نظرانداز کیے اپنے موبائل فون پر مصروف ہو گیا۔

''میرے والدین نے اسی شرط پر رشتے کی ہامی بھری تھی کہ شادی کے بعد تعلیم نہیں رکے گی۔'' وہ ایک بار پھر زور دیتے ہوئے بولی۔

''نکاح نامے پر ایسی کوئی شرط نہیں لکھی تھی۔ اگر لکھی بھی ہوتی تو اب میری مرضی سے ہی تمہیں ہر قدم اٹھانا ہے۔'' زوہیب نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''اور آپ کی مرضی کیا ہے؟'' شانزہ کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹکا۔ برسوں سے دیکھے خواب ایک ہی لمحے میں چکنا چور ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

''بس پڑھ لیا جتنا پڑھنا تھا۔ اب گھر سنبھالو۔ دیٹس اِٹ!'' وہ دوٹوک بولا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ لوگ اس حد تک 'بدعہد' ہوں گے۔ میرے والدین سے جھوٹ بول کر رشتہ کیا آپ لوگوں نے۔'' آنسوؤں کا پھندا مزید گہرا ہوا۔

''جھوٹ تو تم لوگوں نے بولا تھا۔ بلکہ ایک شاندار ڈراما 'کری ایٹ' کیا۔'' اس نے طنز کیا۔

''کیسا ڈراما؟ ہم نے کسی موقع پر جھوٹ نہیں بولا۔'' وہ تڑپ گئی۔

''سیکنڈ اسٹیج کینسر..... پراپرٹی ایشو..... بس رشتہ کروانے کی حد تک ہی تھے۔ میں نے تو آج تک تمہارے والد کو کسی اسپتال جاتے یا کورٹ کا چکر لگاتے نہیں دیکھا۔ بیٹی بوجھ بن گئی تھی تو کوئی اور بہانہ بنا لیتے۔ اس طرح ایموشنل ڈراما کری ایٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس نے اطمینان سے ایک اور طنز کیا۔

شانزہ حیرت و صدمے سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک کسک و حسرت ہلکورے لینے لگی تھی۔ الفاظ گنگ ہو گئے تھے۔ شانزہ کی اس کیفیت سے 'محظوظ' ہوتے ہوئے زوہیب نے اپنی توجہ مکمل طور پر موبائل فون کی جانب مبذول کر لی۔

☆☆☆

حمزہ نے اپنی حکمتِ عملی کی جزئیات کافی حد تک طے کر لی تھیں اور اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے پہلے قدم کے طور پر زوہیب کے گھر جا پہنچا۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ کھولنے کے لیے آنے والی شخصیت کو دیکھ کر اس کے وجود میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا۔ اس کے سامنے سنجیدہ صورت اور آنکھوں میں قدرے بیزاری کی کیفیت لیے ایک خاتون کھڑی تھی جسے تھوڑی سی رعایت کے بعد لڑکی ہی کہا جا سکتا تھا۔

''جی فرمایئے! کس سے ملنا ہے آپ کو؟ یقیناً زوہیب سے ہی ملنا ہوگا۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن! وہ ابھی گھر نہیں ہیں۔ آپ بعد میں آیئے گا۔'' اس نے حسبِ عادت فراٹے بھرتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ گھر پر انتظار کر لوں۔'' حمزہ نے شائستگی سے جواب دیا۔ ''آپ چاہیں تو رابعہ آنٹی سے پوچھ سکتی ہیں، مجھے اندر بلانا چاہیے یا نہیں؟ حمزہ زبیر نام ہے میرا۔''

''حمزہ زبیر..... وہی تو نہیں جس کی بہن نے.....'' شانزہ بات کرتے کرتے یکدم خاموش ہو گئی۔ اس نے رابعہ اور زوہیب سے ایک بار حمزہ کے اہلِ خانہ پر پڑنے والی افتاد کا ذکر سنا تھا۔

''جی ہاں! وہی۔'' حمزہ نے ہونٹ بھینچ کر جواب دیا۔ شانزہ قدرے خفت زدہ دکھائی دینے لگی تاہم حسبِ عادت اپنی اس کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگی۔

''امی تو سو رہی ہیں۔ بہرحال! آ جاؤ اندر۔ زوہیب آتے ہی ہوں گے۔''

حمزہ نے تعظیمی انداز میں سر جھکایا اور نہایت متانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔

''چائے پیو گے یا ٹھنڈا؟'' اس نے لٹھ مار انداز میں دریافت کیا۔ وہ فی الوقت خاصی جھنجلاہٹ اور اضطراب کا شکار تھی۔

حمزہ متذبذب دکھائی دینے لگا۔

''اب یہ مت کہنا کہ اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟''

حمزہ اس کی کیفیات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ شانزہ کی عادات و مزاج اسے اپنے حسبِ حال ہی محسوس ہوئی تھیں۔

''جو بھی آپ پلا دیں۔'' وہ نظریں جھکائے ہی کہنے لگا۔

شانزہ اس بات کا بھی کوئی سخت جواب دینا چاہتی تھی لیکن حمزہ کے چہرے اور نظروں سے جھلکتی 'شرافت' نے کچھ کہنے سے باز ہی رکھا اور وہ خاموشی سے چائے بنانے چل دی۔

باورچی خانہ میں کام کے دوران وہ اپنے دل و دماغ پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے رگ و پے میں اضطراب و وحشت کے سوا کچھ بھی نہ تھا — شادی کے بعد کسی ایک دن بھی خوشی یا اطمینان نصیب نہیں ہوا تھا۔ آئے روز کے جھگڑے اور بحث ایک معمول بن چکے تھے۔ شانزہ سے زوہیب کی خود پسندی اور بھونرا صفتی بالکل بھی پوشیدہ نہیں رہ

pklibrary.com

سکی تھی۔ اس کے آئیڈیل لائف پارٹنر میں شوہر کا ایسا روپ بالکل 'فٹ' نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ ترخ کر جواب دینے سے بالکل گریز نہ کرتی۔ نتیجہ ایک زوردار مباحثے اور پھر لڑائی کی صورت میں برآمد ہوتا۔ اس جھگڑے کا اختتام بھی ایک نئے آزار کو جنم دیا کرتا۔ دونوں فریقین کی 'انا پسندی' انہیں صلح کے لیے پہل پر روکے رکھتی۔ گھریلو ماحول اس قدر تناؤ زدہ ہو چکا تھا کہ رابعہ اکثر دن کے اوقات میں بھی سکون آور گولیوں کا استعمال کرنے لگی تھیں اور اب بھی ایسی ہی مسکن دوا کے زیرِ اثر سو رہی تھیں۔

چائے بنانے کے بعد اس نے ایک کپ حمزہ کو تھمایا اور دوسرا خود لیے اس کے مقابل ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ حمزہ مکمل شعوری کوشش کے تحت اپنا بہترین تاثر قائم کرنے میں جُتا تھا۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی وہ توصیفی انداز میں کہنے لگا۔

''چائے بہت ٹیسٹی بنی ہے۔ اپنی ماما کے بعد میں نے ایسی ٹیسٹی چائے آج پہلی بار پی ہے۔''

''ہاں! میرے ہاتھ کی چائے سبھی بہت شوق سے پیتے تھے۔'' اس نے تفاخر سے جواب دیا تاہم نظروں کی بے چینی میں ایک خلش واضح تھی کہ موجودہ زندگی میں اسے کیسی ناپسندیدگی اور نکتہ چینی کا سامنا ہے۔

''یقیناً پیتے ہوں گے۔ بہت آؤٹ کلاس ہے۔'' اس نے فراخدلی سے سراہا۔

''زوہیب کو کب سے جانتے ہو تم؟'' شانزہ نے یکدم پوچھا۔

''جب سے ہم یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ تقریباً آٹھ سال۔''

حمزہ کے اس جواب پر شانزہ ہنکارا بھر کر خاموش ہو گئی۔ چند لمحے مزید خاموشی میں بیت گئے۔

''کہاں رہ گئے ہیں یہ؟ ابھی تک نہیں آئے۔ حد ہوتی ہے بے پروائی کی بھی۔'' وہ غصے سے بڑبڑائی۔

''کسی ضروری کام میں بزی ہوں گے۔'' حمزہ نے متانت سے کہا۔

''فون کر کے پتا کرتی ہوں ورنہ پھر چیخ چنگھاڑا مچا دیں گے آ کر۔'' اس نے بے اختیار کہا۔

حمزہ اس کی اذیت نما بے بسی اور 'چیخ چنگھاڑا' کی اصطلاح پر زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے چائے کا کپ خالی کر کے ایک تپائی پر رکھا اور اطمینان سے شانزہ کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اس کی آنکھیں اور چہرہ کسی کھلی کتاب کی طرح بہ آسانی پڑھ رہا تھا۔ شانزہ زوہیب کی خود پسندی، انا پرستی اور خودسری کے باعث اپنی خود اعتمادی، عزتِ نفس اور ذاتی وقار سے محروم ہو کر نہایت منتشر اعصاب کی حامل بن چکی تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی محسوس ہونے لگیں۔

''کیا ہوا ہے شانزہ جی؟ اینی پرابلم؟'' وہ نرمی و متانت سے پوچھنے لگا۔

''فون پتا نہیں کہاں رکھ کر بھول گئی ہوں۔'' وہ روہانسا ہونے لگی تھی۔

حمزہ آنکھیں سکیڑ کر اسے بغور دیکھنے لگا۔ اس کی حرکات میں رتی بھر بھی مصنوعی پن نہیں تھا۔

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں ہیلپ کر سکتا ہوں۔'' اس نے مزید شائستگی سے شانزہ کو مخاطب کیا۔

''کیسے؟ تمہارے ہوائی چیزوں سے رابطے ہیں کیا؟'' وہ جھنجلا کر بولی۔ یہ جھنجلاہٹ فطری طور پر اس کے مزاج کا خاصہ تھی۔

''آپ اپنا نمبر بتائیے۔ میں رِنگ دیتا ہوں۔ پلیز رِاف یو ڈونٹ مائنڈ!''

شانزہ اس پیشکش پر چند لمحوں کے لیے متذبذب ہوئی پھر دیوار پر لگی گھڑی پر نگاہ پڑتے ہی کسی فیصلے پر پہنچ کر اپنا نمبر بتانے لگی۔ حمزہ نے وہ نمبر ڈائل کیا تو دوسری جانب گھنٹی بجنے کی مدھم آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کہیں دور سے موبائل رِنگ ٹون بجتی محسوس ہوئی۔

''کچن..... کچن میں ہے میرا موبائل۔'' شانزہ نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور کچن کی جانب لپک کر موبائل اٹھا لائی۔ اس کے بعد وہ عجلت میں زوہیب کا نمبر ملانے لگی۔

حمزہ کو اس کی بے چینی اور حرکات بہت محظوظ کر رہی تھیں۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ زوہیب کو اگلی چوٹ پہنچانے کے لیے اسے زیادہ 'محنت' نہیں کرنی پڑے گی۔

''کہاں رہ گئے ہیں آپ؟ آپ کا وہ مہمان کب سے آیا بیٹھا ہے یہاں۔ اگر کسی کو ٹائم دیا ہے تو خود بھی ٹائم پر ہی گھر آ جانا چاہیے۔'' وہ حسبِ عادت بلا تکان بولتی چلی گئی۔

''بزی ہوں میں اِس وقت۔'' زوہیب کی مصروف سی آواز حمزہ کو قدرے فاصلے پر بھی سنائی دے گئی تھی۔

''اگر بزی تھے تو آپ کا کام نہیں بنتا تھا کہ ایک فون یا ٹیکسٹ کر کے ہی اسے آنے سے منع کر دیتے۔ ایکسکیوز کر لیتے۔ حد ہوتی ہے بے پروائی کی بھی۔'' وہ اپنی آواز قدرے پست کرتے ہوئے بولی۔

''بھونکتی رہو۔ تمہیں تو عادت ہے۔ اسے واپس بھیج

دو فی الحال۔ میں خود ہی اس سے بات کرلوں گا بعد میں۔'' زوہیب نے غصے سے کہہ کر فون بند کردیا۔

شانزہ ان الفاظ و انداز پر شدید اہانت محسوس کرنے لگی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

''وہ بزی ہیں ابھی۔ تم سے بعد میں بات کرلیں گے۔'' شانزہ بھینچی ہوئی آواز میں بولی۔

''اوہ۔ اِٹس اوکے! غلطی میری ہی ہے۔ مجھے فون کر کے آنا چاہیے تھا۔'' حمزہ نے شائستگی سے جواب دیا پھر ایک توقف کے بعد اپنا فون نکالا اور شانزہ کا نمبر ڈیلیٹ کر کے موبائل اس کے سامنے کردیا۔

شانزہ اس حرکت پر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں ستائش اور دلچسپی کے رنگ امڈ آئے تھے۔ حمزہ الوداعی کلمات کی ادائیگی کے بعد گھر لوٹ آیا۔ وہ اپنی 'کارکردگی' اور 'نتائج' سے کلی طور پر مطمئن تھا۔

☆☆☆

سکون بخش ادویات کے زیرِ اثر خوابیدہ زبیر کو یکدم کسی تلخی کا احساس ہوا تو وہ بیدار ہوگئے۔ پیاس نے یکدم ہی شدت اختیار کرلی تھی۔

''گلناز تو ہمیشہ پانی کا بھرا جگ اور گلاس میرے سرہانے رکھا کرتی تھی۔ آج وہ کیسے بھول گئی؟'' انہوں نے حیرت سے سوچا۔

''گل! مجھے پانی پلانا ذرا۔'' انہوں نے اپنی شریکِ حیات کو آواز دینی چاہی لیکن الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر برآمد ہوئے تو سب سے پہلے بے یقینی نے ذہن کو شدید جھٹکا دیا۔

''میں گلناز کو آواز کیوں نہیں دے پارہا بھلا؟ میری گویائی کو کیا ہوگیا ہے؟'' ذہن میں ایک فوری سوچ اُبھری۔

''گلناز!'' انہوں نے ایک بار پھر آواز دیتے ہوئے بستر سے اٹھنا چاہا تو بدن نے جنبش سے ہی انکار کردیا۔

ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ دھیرے سے بائیں طرف گردن موڑی تو حمزہ کے خوابیدہ چہرے پر نگاہ پڑتے ہی دل میں زوردار چٹکی بھری گئی۔ حواس اب مکمل طور پر 'بیدار' ہو گئے تھے۔ انہیں اپنی معذوری اور دیگر حالات پل بھر میں ہی 'یاد' آگئے تھے۔

اسی لمحہ نگاہ دائیں دیوار پر نصب ایک دیوار پر پڑی۔ اس تصویر میں وہ گلناز کے ہمراہ نہایت خوشگوار انداز میں کھڑے تھے۔

''گل..... آہ..... گلناز! کہاں چلی گئیں تم؟ مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں چلی گئیں تم؟ تم تو کہتی تھیں کہ زندگی بھر میرا یونہی ساتھ دو گی۔ کبھی اکیلا نہیں چھوڑو گی۔ پھر یہ بے وفائی کیوں؟''

جواب ندارد تھا۔ انہوں نے کرب سے آنکھیں میچیں اور گردن کا رخ دوسری سمت کرلیا۔ اعصاب کے لیے آزمائش وہاں بھی موجود تھی۔ اس دیوار پر زبیر کے والدین کی تصویر آویزاں تھی۔ شہر کے بہترین مصور سے بنوایا گیا یہ 'اسکیچ' بالکل حقیقی تصویر ہی محسوس ہوتی تھی۔

زبیر کا دل خلش سے معمور ہوگیا۔ انہیں والدین کی نگاہوں میں اپنے لیے سخت تاسف محسوس ہورہا تھا، زبیر نے نظریں چُرالیں۔ حلق کے کانٹے شدید تر ہوگئے۔ یکدم ہی ماہم نظروں کے سامنے آگئی۔

''ماہم..... آہ..... ماہم! کہاں کمی رہ گئی تھی ہمارے پیار میں؟ کہاں کوتاہی کردی ہم نے جو تم ایسی راہ پر چل نکلیں؟'' ان کے دل سے ایک ہوک برآمد ہوئی۔

''بہت اعتبار تھا تم پر! خدا کی قسم! بہت اعتبار تھا تم پر۔'' آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چھلکی۔

پاؤں میں ٹھنڈک کا ایک عجیب احساس سرایت کرگیا تھا۔

اعتبار! ہاں اعتبار..... یہ اعتبار صرف ماہم پر ہی نہیں ایک اور رشتے پر بھی تھا۔ باہمی اعتبار کے اس رشتے کا 'قتل' ہی انہیں اس موڑ تک لے آیا تھا کہ وہ یوں بستر نشین ہو کر ایک ملازم اور پھر بیٹے کی وقت توجہ کے محتاج ہوگئے تھے۔ انہوں نے ایک نظر دوبارہ خوابیدہ حمزہ پر ڈالی جو ہمہ وقت ان کی صحت کے لیے پریشان رہتا تھا۔ وہ آج تک اسے یہ نہ بتا سکے تھے کہ انہیں کس 'انکشاف' نے اس حال تک پہنچایا تھا۔

بدن میں سرایت ہوتی ٹھنڈک پنڈلیوں سے ہوتی ٹانگوں میں در آئی تھی۔

تخیل میں وہ مناظر اُجاگر ہوگئے جب رسمِ قل کے روز گلناز کو اسپتال لے جانے کے بعد وہ گھر سے اپنا اے ٹی ایم کارڈ لینے آئے تھے۔ ماہم کے کمرے پر نظر پڑتے ہی ذہن میں ایک خیال کلبلایا اور وہ اس کی کتابوں، پرانی ڈائریوں اور موبائل فون کی تلاشی لینے لگے۔ موبائل کی چند اہم 'ایپس' پر حسبِ روایت قفل لگا تھا۔ انہوں نے بلا ارادہ ہی 'گیلری' کھول لی جہاں ایک قیامت ان کی منتظر تھی۔ گیلری میں ایسا حالیہ مواد بھی خودکار انداز میں ڈاؤن لوڈ ہو کر محفوظ ہو چکا تھا۔ جسے کسی نے گزشتہ رات بھیجا تھا۔ واٹس ایپ پر 'آٹو ڈاؤن لوڈ' سروس نے اسے خود ہی نہایت 'ذمے داری' سے گیلری کی راہ دکھا دی تھی۔ زبیر کا ہر ایک مسام پسینہ اُگلنے لگا۔ انہوں

pklibrary.com

نے بلا سوچے سمجھے وہ موبائل فون آف کر دیا۔ ان کے حواس مختل ہو چکے تھے۔

بدن کی ٹھنڈک اب گھٹنوں تک چلی آئی تھی۔

اے ٹی ایم سے پیسے نکال کر اسپتال پہنچانے تک وہ موبائل کسی انگارے کی طرح جیب میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہا تھا۔ اسپتال میں رسمی کارروائیاں مکمل کرنے کے بعد وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئے۔ اس رات آخری پہر کے بعد وہ قبرستان پہنچے اور ماہم کی قبر سے گیلی مٹی میں ایک شگاف ڈال کر وہ موبائل اندر پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ کتنی ہی دیر اس قبر سے لپٹے روتے رہے۔

ٹھنڈک دھیرے دھیرے بالائی دھڑ میں سرایت کر گئی۔

''زبیر علی..... ولد..... علی حسن..... وقت ختم ہو گیا ہے..... چلے آؤ!'' صدا سنائی دی۔

کنپٹیوں پر آنسوؤں کی مقدار کئی گنا بڑھ گئی۔ اسی اثنا میں ماہم بھی وہاں چلی آئی۔ اس کی آنکھوں میں ندامت اور گریز تھا۔ زبیر نے اسے دیکھ کر رُکھائی سے منہ موڑ لیا۔ اس نے بجھی نظروں سے زبیر کی سمت دیکھا اور سہارا دے کر انہیں بٹھا دیا۔ زبیر کو اپنا وجود روئی سے بھی ہلکا پھلکا محسوس ہوا تھا۔ انہوں نے حیرت سے عقبی سمت مڑ کر دیکھا۔ نحیف، لاچار، بے حس و حرکت وجود بالکل ہی ساکت ہو چکا تھا۔ اگلے ہی لمحہ انہیں گلناز اور والدہ بھی دکھائی دے گئیں۔ وہ ان چاروں کی معیت میں ایک نئی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

شانزہ سے اس پہلی ملاقات کو ایک ہفتہ بیت چکا تھا۔ حمزہ بظاہر اپنے روزمرہ معاملات میں مصروف ہو چکا تھا تاہم اس کا ذہن شانزہ اور زوہیب کے باہمی معاملات میں اُلجھا رہتا تھا۔ ان کی چپقلش اور ذہنی ہم آہنگی کا فقدان اسے بے حد سکون فراہم کیا کرتا۔ اس رات بھی وہ ان کی چپقلش سے فائدہ اٹھانے کی بابت سوچتے کافی تاخیر سے سویا تھا۔

اگلی صبح زبیر کو ناشتے کے لیے اٹھانے لگا تو سینے کا مخصوص زیروبم موجود نہ دیکھ کر دیوانہ وار انہیں جھنجوڑنے لگا۔

''پاپا! اٹھیں پاپا! فار گاڈ سیک! آنکھیں کھولیں اپنی۔'' وہ ان کے پپوٹے اپنی انگلیوں سے اٹھا کر کھولنے لگا۔ ''اٹھ جائیں نا یار پاپا! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ اٹھ جائیں۔'' وہ اب ان کا چہرہ دائیں بائیں ہلانے لگا لیکن بدن تو روح کے پنچھی کو کب سے آزاد کر چکا تھا۔

''آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں پاپا؟ مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ کم از کم آپ تو میرا ساتھ دیتے۔ آپ بھی ماما کی طرح بے وفا ہی نکلے۔ آپ نے بھی میرا خیال نہیں کیا۔ آپ سب نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ کس کے سہارے چھوڑ گئے ہیں مجھے؟ کیسے جیوں گا میں؟ کیا کروں گا میں؟''

حمزہ اُن کے بستر کے پاس زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی کراہیں مع خراش چیخوں میں منتقل ہو گئی تھیں۔ وہ اپنا سر بستر پر زور زور سے پٹخنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس کے حواس ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

☆☆☆

حمزہ کے وجود پر ایک قیامت بیت چکی تھی۔ اُس نے کسی 'زومبی' کی طرح زبیر کی تدفین کے مراحل مکمل کیے۔ عرفان اور چند دیگر قریبی احباب نے اسے اپنے گھر منتقل ہونے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن اس کا انکار اقرار میں تبدیل ہو کے ہی نہ دیا۔

''میں نے اب زندگی گزرنے کے لیے سہارے تلاش کرنے چھوڑ دیے ہیں۔'' اس نے رُکھائی سے جواب دیا تھا۔

''کوئی بھی انسان اکیلا نہیں رہ سکتا بیٹا! تم اتنے بڑے گھر میں اکیلے کیسے رہو گے؟ ضروریاتِ زندگی کیسے مینیج کرو گے؟ جذباتی فیصلہ مت کرو۔ میرے ساتھ چلے چلو پلیز!'' عرفان نے اسے قائل کرنا چاہا۔

''میں دنیا کا پہلا انسان تو نہیں ہوں جسے تنہا رہنا ہے۔ دنیا بھری پڑی ہے تنہا لوگوں سے۔ زندہ رہتے ہی ہیں سب۔ مرنا تو اپنے وقت پر ہی ہے۔ باقی رہی بات ضروریاتِ زندگی کی۔ تو وہ بھی کر لوں گا کسی نہ کسی طرح۔ آپ کی محبت اور خلوص کا بہرحال شکریہ۔''

اس دوٹوک جواب کے بعد عرفان کے پاس کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ ترحم بھری نظروں سے بھتیجے کو دیکھتے وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حمزہ کتنی ہی دیر خالی الذہنی کے عالم میں وہیں ساکت بیٹھا رہا۔ رشتوں کے معاملے میں قلاش ہو جانے کے بعد اس کی ذہنی کیفیت میں ایک تلاطم پیدا ہو چکا تھا۔ ایک بھیانک اور تباہ کن تلاطم۔ جس کی زد میں آنے والا ہر شخص... ایسے ہی بھیانک انجام سے دوچار ہوتا۔ تلاطم کا یہ عفریت زوہیب کی زندگی سے جُڑے رشتے نگلنے کے لیے بے تاب تھا اور یہ موقع بھی قدرت نے اسی روز فراہم کر دیا۔

اُس رات وہ شکستگی اور پژمردگی سے چُور بدن لیے بستر پر لیٹا تو موبائل فون کی گنگناہٹ نے اسے سخت جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ اسکرین پر دکھائی دینے والا نمبر کافی مانوس تھا۔ اس کی آنکھوں میں پتھریلی سنجیدگی در آئی۔

''ہیلو! کون؟'' وہ دانستہ طور پر انجان بنتے ہوئے بولا۔

''السلام علیکم! میں بات کر رہی ہوں۔ شانزہ۔'' دوسری جانب سے ایک دھیمی متذبذب آواز سنائی دی۔

حمزہ کے جبڑے بھنچ گئے۔

''وعلیکم السلام! کیسے یاد کیا مجھے؟''

''آپ کے والد کی ڈیتھ کا سنا تھا۔ بہت افسوس ہوا مجھے۔'' شانزہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''بس یہ افسوس ہی رہ جاتا ہے۔ رشتے بچھڑ جاتے ہیں اور اپنی جگہ یہ افسوس چھوڑ جاتے ہیں۔'' وہ آزردگی سے بولا۔

''ہمت کیجیے حمزہ!'' وہ نرمی سے بولی۔

''کتنی؟ اور کتنی ہمت کروں؟ اور تقدیر کو یہ ساری ہمت مجھ ہی سے کیوں چاہیے بھئی؟'' حمزہ تلخ ہوا۔

''میں آپ کے والد سے کبھی ملی تو نہیں لیکن وہ یقیناً بہت اعلیٰ ظرف اور باکردار انسان ہوں گے۔ اسی لیے تو آپ میں بھی شرافت اور ظرف موجود ہے۔'' شانزہ نے ایک توقف سے کہا۔

حمزہ کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس لمحہ وہ اسے کیسے بتاتا کہ ہر شرافت میں بھی ایک 'شر' اور 'آفت' بہرحال موجود ہوتی ہے۔ حمزہ اسی شر اور آفت سے مغلوب ہو چکا تھا۔

'جی ہاں! ایسے ہی تھے وہ۔'' حمزہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کو اس وقت اور مضبوطی دکھانی ہوگی۔ آئی نو! آپ اس وقت بالکل تنہا ہیں لیکن ہمت سے ہی اپنا فیوچر بنا سکتے ہیں۔'' اس نے ایک بار پھر روایتی انداز میں کہا۔

''یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔'' حمزہ کو بالآخر اپنا مطلوبہ 'نکتہ' مل گیا۔ ''میں بالکل تنہا ہوں لیکن ایک ایسے انسان کو بھی جانتا ہوں جو مجھ سے بھی زیادہ تنہا ہے۔ اس کی تنہائی تو مجھ سے بھی زیادہ بھیانک ہے۔ وہ اپنے آس پاس قریبی رشتوں کی موجودگی کے باوجود ایک عذاب ناک تنہائی کا شکار ہے۔ اس کے باوجود جی رہا ہے تو میں اسے دیکھ کر اپنی ہمت بندھا لوں گا۔ میں بھی زندگی گزار ہی لوں گا۔'' وہ افسردگی سے کہنے لگا۔

''کک..... کون؟ کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟'' شانزہ بے طرح چونکی۔

''آپ کی۔'' وہ دوٹوک بولا۔ ''آپ کی بات کر رہا ہوں۔ آپ جیسی تنہا اور دردناک زندگی تو کسی کی بھی نہیں ہو گی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نن..... نہیں..... ہاں..... وہ میرا مطلب ہے کہ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

''کیونکہ میں آپ کے شوہر کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آئی ایم ریئلی سوری۔ ہوسکتا ہے آپ کو میری بات بُری لگے لیکن سچ تو یہ ہے کہ آپ کے شوہر کو صرف اور صرف اپنی ذات سے محبت ہے۔ وہ اپنے علاوہ کسی سے محبت کر سکتے ہیں نہ ہی عزت۔'' اس نے تاسف زدہ انداز اختیار کیا۔

''میرے شوہر آپ کے بھی تو کچھ لگتے ہیں؟'' شانزہ تنک کر بولی۔

''جی ہاں! مجھے اس بات سے کب انکار ہے بھلا؟ ان سے کوئی رشتہ تھا اسی لیے تو آپ سے واقفیت ہے۔ اگر یہ واقفیت نہ ہوتی تو مجھے یہ کیسے علم ہوتا کہ اس دنیا میں مجھ سے بھی تنہا ایک انسان ہے۔''

حمزہ دانستہ طور پر ایک ہی بات دہرا کر اُس کی دکھتی رگ دبا رہا تھا۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ شانزہ کے لبوں سے ایک سسکی برآمد ہوئی اور وہ آزردگی سے کہنے لگی۔

''شکر ہے کسی کو تو میری یہ تنہائی نظر آئی۔ ورنہ یہاں تو یہ حال ہے کہ سگے ماں باپ کو بھی میرا درد محسوس نہیں ہوتا۔ وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ زوہیب جیسے شخص سے شادی میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔''

''انہیں کیا پتا کہ یہ شادی آپ کی بدقسمتی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سچ بتاؤں آپ ایسا لائف پارٹنر ڈیزرو ہی نہیں کرتی تھیں۔'' حمزہ نے مزید تاسف جتایا۔

''اچھا! تو کیسا لائف پارٹنر ڈیزرو کرتی تھی میں؟'' وہ بے اختیار پوچھ اٹھی۔

''لونگ..... کیئرنگ..... جس کو آپ سے محبت ہوتی۔ جو آپ کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا۔ آپ کو عزت دیتا۔ آپ کے سوا کسی کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اپنا سب کچھ صرف آپ کے نام کرتا۔'' حمزہ نے اس کی دکھتی رگ مزید دبائی۔

اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ شانزہ کس شدت سے ماضی

pklibrary.com

کے آسیب میں جکڑی گئی ہے۔ اسے اپنے آس پاس ہر گوشے، ہر ذرّے میں عدنان کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کی محبت، توجہ کا انداز، ستائش، پروا، طلب، حسرت، تمنا اور قدر اس کے دل سے ہوک برآمد کر رہی تھی۔ ایک انمول رشتے کے متبادل زوہیب جیسے شخص کا ساتھ ملنا دل و دماغ میں ایک نیا حشر برپا کیے ہوئے تھا۔ حمزہ کی زبان سے یہ ہمدردی کے بول سننے کے بعد تو یہ خسارہ اور بھی شدید محسوس ہونے لگا تھا۔ آنسو کسی جھڑی کے مانند آنکھوں سے بہتے چلے گئے۔

کئی لمحے اسی خاموشی میں بیت گئے۔

''شاید آپ نے میری بات کا مائنڈ کرلیا ہے۔ آئی ایم ریئلی سوری!''

''نہیں ایسا نہیں ہے..... بس ذہن کسی اور طرف چل نکلا تھا۔ آپ سے پھر بات ہوگی حمزہ! ٹیک کیئر!'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ہم! میں سمجھ گیا آپ شاید کچھ دیر اکیلے رہنا چاہتی ہیں یا شاید مجھے یہ کہنا چاہیے کہ آپ کچھ دیر اپنے اندر بسی ایک دنیا میں وقت گزارنا چاہتی ہیں۔ اوکے۔ نو ایشو!'' حمزہ نے اطمینان سے اگلا داؤ کھیلا۔

شانزہ اس کے کامل اندازوں اور اپنی ذہنی کیفیت کو یوں آسانی سے سمجھ لیے جانے پر حیران رہ گئی تھی۔ اس نے الوداعی کلمات کی ادائیگی کے بغیر ہی فون بند کیا اور تکیے میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حمزہ قدرے آسودگی محسوس کرنے لگا۔

☆☆☆

حمزہ اور شانزہ کی اس مواصلاتی گفتگو کو تین روز بیت چکے تھے۔ حمزہ نہایت صبر و سکون سے یہ وقت گزار رہا تھا۔ اسے قوی امید تھی کہ شانزہ اس سے ایک بار پھر رابطہ کرے گی۔ دوسری جانب شانزہ کا بھی یہی حال تھا۔ زوہیب کے رویّے کی بدصورتی اور اس کی انا پرستی، خود پسندی جھیلتے حمزہ کی صورت میں ایک غمگسار کا ملنا تپتے صحرا میں کسی نخلستان کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اسے ایسے ہی کسی ہمدرد کی تلاش ہی نہیں بلکہ اشد ضرورت تھی۔

کچھ روز تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے شام کے وقت زوہیب کی غیر موجودگی میں حمزہ کو فون کرلیا۔ ابتدائی علیک سلیک کے بعد وہ کہنے لگی۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک رہتی ہے آج کل؟''

حمزہ نے اس کے اندازِ تخاطب میں تبدیلی واضح طور پر محسوس کی۔

''میں نے طبیعت کی خرابی یا ٹھیک ہونے کا حساب رکھنا چھوڑ دیا ہے۔'' وہ افسردگی سے کہنے لگا۔

''اس طرح تو زندگی نہیں گزرتی نا بھئی؟'' اس نے سمجھانا چاہا۔

''زندگی گزار بھی کون رہا ہے؟ میں تو بس ایک مجبوری نبھا رہا ہوں۔'' اس کی پژمردگی یاسیت میں ڈھل گئی۔

''اچھا! ایک بات تو بتاؤ؟''

''ایک کیا دو پوچھیے۔ میں تو سارا دن کسی سے بھی بات کرنے کے لیے ترس جاتا ہوں۔'' وہ حسرت سے بولا۔

''ہماری طرف کیوں نہیں آتے اب؟'' شانزہ نے اپنائیت سے دریافت کیا۔

''دل ہی نہیں چاہتا بس۔'' حمزہ کی آزردگی بالکل فطری تھی۔

''دل کو سمجھایا کرو نا۔'' اپنائیت مزید واضح ہوئی۔

''نہیں سمجھتا۔ کیا کروں؟'' وہ بے بسی اور جھنجلاہٹ سے بولا۔

شانزہ اس کے جذباتی بحران پر افسردگی محسوس کرنے لگی۔

''کوئی دوست وغیرہ بھی نہیں؟ یا کوئی رشتے دار جن کی طرف چلے جایا کرو تم؟'' اس نے ایک اور راہ سجھائی۔

''نہیں! میری دوست صرف ماہم تھی۔ ہم بچپن سے ہی ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرتے۔ اس کے بعد.....'' حمزہ کا لہجہ رُندھ گیا۔ اسے ماہم کی شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ اپنی زندگی کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات اس سے بانٹنے والی وہ بہن اتنی بڑی بات چھپائے کس قدر خاموشی سے لحد نشین ہوگئی تھی۔

''آئی ایم سوری حمزہ! میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔'' اس نے فوراً وضاحت کی۔ ''مجھے تمہاری فیملی کا ریئلی بہت افسوس ہے۔''

''اِٹس اوکے! آئی ایم سوری۔ میرا مقصد بھی آپ کو یوں ڈسٹرب کرنا نہیں تھا۔ ریئلی سوری!'' اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

حمزہ کا یہی نرم، شائستہ لہجہ اور مقابل کو توجہ و اہمیت دینے کا انداز شانزہ کا دل گداز کر دیتا تھا۔ زوہیب سے شادی کے بعد وہ ایسے اوصاف کے حامل 'سامع' کی کمی شدت سے محسوس کرنے لگی تھی۔

وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ قلب و روح میں صحرا کی

موجودگی اور جان لیوا حد تک کانٹوں کی اس چبھن نے شانزہ کو ایک فوری فیصلے پر آمادہ کرلیا۔ وہ حمزہ سے بے اختیار کہہ اٹھی۔

''مجھ سے کرو گے دوستی؟''

''اگر آپ مجھ پر ترس کھا کر ایسا کہہ رہی ہیں تو سوری! مجھے کسی زبردستی کے رشتے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ دانستہ طور پر رُکھائی سے بولا۔

شانزہ پل بھر کے لیے خاموش ہوگئی۔ اب وہ اسے کیسے سمجھاتی کہ وہ تو خود اپنی تنہائی اور کسک سے مجبور تھی۔ اسے بھی کسی 'کندھے' کی ضرورت تھی جس پر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرسکے۔ حمزہ کے ذاتی اوصاف میں اس کی 'کم عمری' بھی ایک مثبت پہلو تھا۔ وہ اس سے عمر میں چھوٹا تھا لہٰذا کسی پٹڑی سے ہٹنے کا امکان بھی کم ہی رہتا۔

''دل سے کہہ رہی ہوں۔'' وہ دھیمے سے بولی۔

''شیور؟'' حمزہ نے مزید سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''یس! ڈیم شیور!'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

''اوکے! ڈن۔'' حمزہ پہلی بار مسکرایا۔

اسے اپنے مقصد میں اتنی جلدی کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ مقابل کی ذہنی کیفیت اس سے بھی زیادہ دگرگوں تھی اور یہ نکتہ اسے بے حد فائدہ پہنچا سکتا تھا۔

''اچھا! اب فرینڈشپ کے ٹوکن کے طور پر ایک وعدہ کرو مجھ سے۔'' وہ قدرے استحقاق سے کہنے لگی۔

''آپ حکم کیجیے۔ آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر۔''

حمزہ کے اس بے ساختہ انداز نے شانزہ کے دل میں ماضی کی ایک اور یاد اُجاگر کردی۔

''ہمارے گھر آتے جاتے رہو گے۔'' وہ سنبھل کر بولی۔

''مجھے کوئی ایشو نہیں۔ بس آپ کے شوہر کو کہیں بُرا نہ لگے۔'' حمزہ نے اسے آئینہ دکھایا۔

شانزہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوگئی۔ اسے اپنی کیفیت کسی رقصاں مور کی سی محسوس ہوئی تھی جسے اپنی مستی و سرشاری میں اچانک ہی بھدے پاؤں دکھائی دے گئے ہوں۔

''زوہیب کا کوئی بھروسا بھی نہیں۔'' اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے اعتراف کیا۔

''جی ہاں! ان کا واقعی کوئی بھروسا نہیں۔'' حمزہ نے گویا اسے 'آگاہ' کیا۔

''زوہیب ایسے کیوں ہیں حمزہ؟'' وہ بے بسی سے پوچھنے لگی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ شادی کے مختصر عرصے میں ہی اس رشتے اور زوہیب کی فطرت سے عاجز آگئی تھی۔

''وہ ایسے ہی ہیں بس! ہم تو اکثر ایک بات کہا کرتے تھے کہ بہت ہی بدقسمت ہوگی جو اُن کی لائف پارٹنر بنے گی۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ ان کے ساتھ 'نباہ' کرنے کے لیے بہت ہمت اور صبر کی ضرورت ہے۔'' حمزہ نے تاسف جتایا۔

''چلو! کوئی تو ایسا سوچتا اور سمجھتا ہے۔ ورنہ یہاں تو سب اسی کے گن گاتے اور اسے کوئی 'بھگوان' سمجھتے ہیں۔'' شانزہ تلخ ہوئی۔

''میں آپ کا اشارہ سمجھ رہا ہوں۔ لیکن رابعہ آنٹی ایک ماں ہیں۔ اور ماں کبھی بھی اپنی اولاد کو غلط نہیں کہے گی۔'' حمزہ نے صاف گوئی سے کہا۔

''ٹھیک ہے! غلط نہ کہے لیکن اچھے بُرے کی کوئی تمیز تو سکھا سکتی تھیں نا؟ اور کچھ نہیں تو عورت ذات کی عزت کرنا ہی سکھا دیتیں۔'' وہ اذیت سے کہنے لگی۔

''ہاں یہ انہوں نے غلط کیا۔ بہت غلط کیا۔'' حمزہ نے تائید کی۔ ''خیر! آپ اپنی اولاد کو ایسی تربیت نہ دیجیے گا۔ اسے باپ جیسا بالکل نہ بنانا۔''

حمزہ کی اس بات پر شانزہ کے دل سے ہُوک برآمد ہوئی۔ وہ چاہ کر بھی حمزہ کو یہ بات نہ بتا سکی کہ زوہیب ابھی کم از کم پانچ سال تک اولاد پیدا کرنے کے حق میں ہی نہیں ہے۔ حمزہ پر اعتبار کرکے دوستی کا رشتہ استوار کرنا اپنی جگہ لیکن اتنی جلدی ایسا گہرا اعتبار تو قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ شانزہ نے موضوعِ گفتگو تبدیل کرکے حمزہ کے مشاغل کی بابت دریافت کرنا شروع کردیا۔

☆☆☆

شانزہ اور حمزہ کی اس دوستی کو ایک ماہ سے زائد عرصہ بیت گیا تھا۔ ان دونوں میں حیران کن باہمی اعتماد اور ذہنی ہم آہنگی پروان چڑھ چکی تھی۔ شانزہ نے اسے زوہیب اور اپنی رفاقت میں اتار چڑھاؤ کے علاوہ ماضی کے اس پہلو سے بھی آگاہ کردیا تھا جو اَب تک اس کے دل کے نہاں خانوں تک ہی محدود تھا۔ حمزہ کے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات یا انکشاف نہیں تھا۔ اس کا وجدان پہلے ہی اس بات سے آگاہ تھا کہ شانزہ ماضی قریب میں کسی نہ کسی کی ذات میں ملوث رہ چکی ہے۔

حمزہ نے بھرپور توجہ اور دلچسپی سے شانزہ کی 'داستانِ عشق' سنی اور حسبِ ضرورت ستائش، حیرانی اور پھر تاسف کا

pklibrary.com

تڑکا بھی لگاتا رہا۔

''بہت ناانصافی ہوئی ہے آپ کے ساتھ۔ یقین مانیں میں نے ایسی 'پاکیزہ محبت' آج تک کہیں دیکھی نہ سنی۔ کاش آپ کے والدین اس شادی کے لیے مان جاتے۔'' اس نے بھرپور اپنائیت سے کہا۔

''بس یہ زندگی اگر' مگر اور کاش کے پھیر میں ہی چلتی رہتی ہے۔ یہی اس دنیا کا دستور ہے شاید۔'' شانزہ نے آزردگی سے کہا اور موضوعِ گفتگو تبدیل کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''تمہاری زندگی میں کبھی کوئی لڑکی نہیں آئی کیا؟ کوئی گرل فرینڈ.....کوئی لور؟'' اس نے قدرے شوخی جتائی۔

''آپ یقین نہیں کریں گی لیکن سچ یہی ہے کہ کوئی بھی نہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''اوہ ہاں بھئی! تم نے بتایا تھا کہ تمہاری زندگی میں ماہم کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔''

''جی ہاں! وہ ایک بہترین دوست تھی۔ میری خوشی میں مجھ سے بھی زیادہ خوش اور میری کسی بھی پریشانی میں مجھ سے بھی زیادہ ٹینس۔ میرے ہر روز کے لیے کپڑے بھی وہی سلیکٹ کرتی تھی۔ پیپرز میرے ہوتے تھے لیکن جاگتی وہ تھی۔ ہر آدھے گھنٹے بعد چائے یا کافی بنا کر لے آیا کرتی۔ میرے رزلٹ اور برتھ ڈے کی خوشی میں سب کو پارٹی دیتی۔ ایسے کسی بھی موقع پر کیک بھی خود بیک کرتی۔ مجھے کبھی گفٹ مانگنا ہی نہ پڑا اس سے۔ اسے پہلے ہی علم ہوتا تھا کہ مجھے کیا چاہیے۔'' حمزہ بلاتکان کہتا چلا گیا۔

شانزہ بھی اس کی ہر ایک بات نہایت توجہ اور انہماک سے سن رہی تھی۔ حمزہ کے خاموش ہونے پر وہ گہری سانس بھرتے ہوئے کہنے لگی۔

''اچھے لوگ جانے کیوں کم عمر لکھوا کر لاتے ہیں۔ وہ اپنی اس مختصر زندگی میں ساری کی ساری خوشیاں بانٹ دیتے ہیں۔''

''یو آر رائٹ! ماہم نے بھی خوشیاں ہی بانٹی تھیں لیکن پھر.....'' وہ روانی میں کہتا یکدم رک گیا۔

''پھر کیا؟ ماہم کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا حمزہ؟'' وہ نرمی سے مستفسر ہوئی۔

اس نرمی میں ایک تجسس کی جھلک بھی بہرحال واضح تھی۔

''آپ کو بھی تو پتا ہی ہوگا۔'' حمزہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوگیا۔ ''آپ کے گھر میں کوئی نہ کوئی بات تو ہوتی ہی ہو گی۔''

''ہاں! تمہارے فادر کی ڈیتھ پر زوہیب اور اُن کی والدہ کو بات کرتے سنا تھا کہ جوان بیٹی کا صدمہ لے بیٹھا انہیں۔ میں نے پوچھا بھی تھا کہ کس کی بات کر رہے ہیں؟ انہوں نے صرف اتنا بتایا کہ سوسائڈ کیس تھا یہ۔''

''نہیں! سوسائڈ نہیں مرڈر تھا یہ۔ میری بہن کا مرڈر ہوا تھا۔''

حمزہ کے اس انکشاف نے شانزہ کو حیرت سے اُچھلنے پر مجبور کر دیا۔

''واٹ؟ ریئلی؟ مرڈر؟ مائی گڈنیس! لیکن زوہیب اور امی نے تو.....'' وہ بے ساختگی سے بات کرتے یکدم سنبھل گئی۔

''انہوں نے کیا بتایا ہے آپ کو؟'' حمزہ کے جبڑے بھنچ گئے تاہم انداز متوازن ہی رہا۔

''نہیں۔ کچھ نہیں۔ وہ تو بس ویسے ہی۔'' شانزہ فوراً سنبھل گئی۔

''کچھ تو گوسپ کرتے ہوں گے۔ میں مان ہی نہیں سکتا کہ وہ ماہم یا ہماری فیملی کے متعلق کوئی بات نہ کرتے ہوں۔'' حمزہ کے جبڑے مزید بھنچے۔

''چھوڑو اس بات کو! یہ ماں بیٹا کبھی کسی کی عزت نہیں کر سکتے۔ انہیں احساسِ برتری کا مرض ہے۔ ان دونوں کی سوچ اپنی ذات کے دائرے سے کبھی باہر نہیں نکل سکتی۔ یہ کبھی کسی انسان کی عزت نہیں کر سکتے۔ پھر وہ چاہے زندہ ہو یا مردہ۔'' شانزہ نے ایک گہری سانس لے کر حتی الامکان نرم الفاظ میں کہا۔

حمزہ کا خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ بدن کی اینٹھن میں یکدم ہی اضافہ ہوگیا تھا۔ اسے رابعہ سے بالکل ایسی امید نہ تھی۔

''خیر! تم بتاؤ۔ کیسے مرڈر ہوا تھا؟ قاتل کو کوئی تو سزا ملی ہوگی۔'' اس نے تجسس سے دریافت کیا۔

''ملے گی۔ سزا بھی ملے گی اُسے۔ وہ ٹائم بھی بہت جلد آنے والا ہے۔'' اس نے آتشیں لہجے میں جواب دیا۔

''آئی سی! یعنی پولیس کیس اور انویسٹی گیشن چل رہی ہے ابھی۔''

''یس! انجام آپ بھی بہت جلد دیکھیں گی۔'' وہ معنی خیزی سے بولا۔

''گریٹ! پھر تو میں دعا کروں گی کہ وہ وقت جلد از جلد آئے۔'' شانزہ نے خلوص سے کہا۔

pklibrary.com

''آمین! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔'' حمزہ کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔

اس کے وجود میں شدید تلاطم برپا تھا۔ اسے اب فوری طور پر اپنے منصوبے کے اگلے حصے پر عمل کے لیے مناسب وقت کا بے صبری سے انتظار تھا اور پھر قدرت نے یہ موقع بھی فراہم کردیا۔

☆☆☆

رابعہ اس وقت اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی تھیں۔ گھر بھر میں خاموشی اور ویرانی کا راج تھا۔ زوہیب اور شانزہ اس شام ... شانزہ کے گھر گئے تھے۔ اس کے والدین اگلے روز عمرے کی ادائیگی کے لیے روانہ ہورہے تھے۔ اس ضمن میں بیٹی اور داماد کو الوداعی ڈنر پر بلوایا گیا تھا۔ گو یہ دعوت رابعہ کو بھی بصد خلوص و اصرار دی گئی تھی لیکن وہ کچھ دیر بالکل تنہا رہنا چاہتی تھیں۔ ان کی زندگی میں اس قدر 'شور شرابہ' آچکا تھا کہ وہ اب لمحاتی خاموشی و سکوت کے لیے بھی ترستی تھیں۔

اپنے ان خیالات میں غلطاں رابعہ کو حلق میں کانٹوں کی چبھن محسوس ہوئی تو ہاتھ بلا ارادہ تپائی پر رکھے جگ کی طرف بڑھ گیا۔ جگ حسبِ سابق خالی تھا۔ رابعہ سخت جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوگئیں۔ ان کی زبان سے بے اختیار شانزہ کی بے پروائی کے لیے چند شاندار القابات برآمد ہوگئے۔

''اس شادی کے لیے تمہیں ہی جلدی تھی۔ اب برداشت بھی کرو۔'' ان کے دماغ پر ایک سوچ نے دستک دی۔

''مجھے کیا علم تھا کہ ایک عذاب گلے ڈال لوں گی۔'' انہوں نے بے بسی کا اظہار کیا۔

نگاہیں کمرے کی مشرقی دیوار کا طواف کرنے لگیں۔ اس دیوار پر ان کے مرحوم شوہر کی تصویر آویزاں تھی۔ امجد کا انتقال زوہیب کے بچپن میں ہی ہوگیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے بیٹے کی پرورش تنِ تنہا کی تھی۔

''مجھے آج زوہیب کے سسرال چلے ہی جانا چاہیے تھا۔ کم از کم شانزہ کے والدین کو اس کی 'اوقات' سے تو آگاہ کرتی۔'' ایک اور سوچ نے تحریک دی۔

''اگر ایسا کر بھی لیتی تو کیا اس کی زبان بند رہتی؟ وہ زوہیب سے دوبدو بحث کرسکتی ہے تو کیا میری عزت رکھے گی؟'' وہ جز بز ہوئیں۔

نگاہیں ایک بار پھر مرحوم شوہر کی تصویر کا طواف کرنے لگیں۔

''کیوں چلے گئے آپ؟ اتنی جلدی کیوں چلے گئے؟ میں نے زندگی کے ہر قدم پر آپ کی کمی محسوس کی ہے۔ لیکن اس موڑ پر تو بالکل ہی ڈھے گئی ہوں۔'' انہوں نے شکستگی سے اعتراف کیا۔

آنکھوں میں نمکین پانی جمع ہونے لگا۔ آنسو رخساروں پر بہہ نکلنے کے لیے بے تاب ہی تھے کہ اسی اثنا میں دروازے پر گھنٹی کی تیز آواز نے انہیں چونکا دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی گھنٹی پر ہاتھ رکھ کے بھول گیا ہے۔ رابعہ کوفت سے اٹھیں اور دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

''کون ہے بھئی؟ صبر تو کرو۔'' وہ چڑ کر بولیں۔

''میں ہوں۔ دروازہ کھولیے پلیز!'' دوسری جانب سے حمزہ کی آواز سنائی دی۔

رابعہ کا مزاج مزید برہم ہوگیا۔ انہیں حمزہ اور اس کے اہلِ خانہ سے بے حد چڑ تھی۔ وہ انہیں کبھی بھی دلی طور پر قبول نہیں کرپائی تھیں۔

''زوہیب گھر میں نہیں ہے۔ بعد میں آنا۔'' انہوں نے رکھائی سے بتایا۔

''جی مجھے پتا ہے وہ دونوں گھر میں نہیں ہیں۔ آپ کا موبائل شاید آف ہے۔ میرے نمبر پر کال آئی ہے کہ ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ اسپتال میں ہیں۔ میں آپ کو لے جانے کے لیے ہی آیا ہوں۔'' حمزہ نے اعتماد سے نہایت بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

نتیجہ حسبِ توقع برآمد ہوا۔ رابعہ نے متوحش انداز میں دروازہ کھول دیا۔ حمزہ اسی لمحے کی تاک میں تھا۔ اس نے دستانہ بردار ہاتھوں سے رابعہ کو فوری طور پر اندر دھکیلا اور خود اندر بڑھتے ہوئے عقب میں ٹانگ کی ضرب سے دروازہ بند کردیا۔ رابعہ اس حرکت پر سخت برافروختہ ہوئیں۔

''کیا بدتمیزی ہے یہ؟'' وہ بھڑک گئیں۔

''جب تمیز سے بات کی تھی تو دروازہ کھول دیتیں نا؟ آپ نے ہی مجبور کیا ہے اس حرکت پر مجھے۔'' حمزہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' وہ درشتی سے بولیں۔

''چاہتا تو بہت کچھ ہوں لیکن آپ سے ایک رشتہ قائم رہا ہے اسی کا لحاظ کرلوں گا۔'' حمزہ نے رکھائی سے کہا اور رابعہ کی کلائی اس شدت سے دبوچی کہ ہاتھ کی نسیں اُبھر آئیں۔

اس کے بعد حمزہ نے اپنی جیب سے ایک تیار شدہ انجکشن برآمد کرکے سُوئی نہایت احتیاط سے رابعہ کی نس میں

گھونپ دی۔ اسے انجکشن کی کارکردگی پر مکمل اعتماد تھا۔ یہ انجکشن اس نے بھاری رقم کے عوض صغیر سے خصوصی طور پر تیار کروایا تھا۔ اس میں تیار کردہ دوا بدن میں سرایت ہوتے ہی نہایت قلیل عرصے میں اپنی کارگزاری کا آغاز کر دیتی۔ پہلے مرحلے پر مریض کے اعصاب جامد ہوتے۔ اعضا سے قابو ختم ہوتا اور دھیرے دھیرے فشارِ خون یوں تنزلی کا شکار ہوتا کہ دھڑکنیں بالکل ہی معدوم ہو جاتیں۔

انجکشن کی دوا نس میں سرایت کرنے کے بعد حمزہ نے رابعہ کو ان کی خواب گاہ میں پہنچایا اور بستر پر لٹانے کے بعد کمرے سے باہر چلا آیا۔ رابعہ کی متوقع موت اور زوہیب کو پہنچنے والی ایک اور زک اسے ابھی سے ہی سکون فراہم کر رہی تھی۔

☆☆☆

رابعہ کی نگاہیں کمرے کی چھت پر مرکوز تھیں۔ ان کے اعصاب شدید بوجھل ہو چکے تھے۔ جسم میں سوئیاں چبھنے کی سی سنسناہٹ ایک حشر برپا کیے ہوئے تھی۔ وہ گزشتہ پندرہ منٹ سے اسی عالم میں لیٹی تھیں۔ موبائل فون تھام کر کسی کو اپنی حالت زار سے باخبر کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ یہ بے بسی آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت بہنے لگی۔

''یا اللہ! میں کیا کروں؟ میری مدد فرما۔'' وہ دل ہی دل میں گڑگڑائیں۔

اگلے ہی لمحے اُن کی ذہنی رو زوہیب اور شانزہ کی جانب مرکوز ہو گئی۔ وہ دونوں تاحال گھر نہیں لوٹے تھے۔ اگر لوٹ آتے تو شاید صورت حال میں کوئی بہتری در آتی۔ اس کے ساتھ ہی حمزہ کا چہرہ پردۂ بصارت پر لہرانے لگا۔

''اس لڑکے کو گھر آنے کی اجازت دینی ہی نہیں چاہیے تھی مجھے۔ یہ لوگ مجھے شروع دن سے ہی یونہی پسند نہیں تھے۔'' ان کے ذہن نے ایک بار پھر وہی تحریک دی۔

''کاش میں نے انہیں آٹھ سال پہلے ہی اس گھر میں داخل نہ ہونے دیا ہوتا۔ کاش۔'' وہ بے بسی سے سوچنے لگیں۔ لاشعور اب آٹھ سالہ سفر طے کرنے لگا تھا۔

رابعہ نے شوہر کی وفات کے بعد معاشی سہارے کے لیے کبھی کسی کی جانب دستِ سوال دراز نہیں کیا تھا۔ وہ بھلے وقتوں کی ایم اے، بی ایڈ اور ایک سرکاری اسکول میں معلمہ تھیں۔ شوہر کی دائمی جدائی کے بعد گھر پر ٹیوشن پڑھانے کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ ماہم اور حمزہ سے پہلی ملاقات اسی ضمن میں ہوئی تھی جب ایک روز گلناز دونوں بچوں کو لیے ان کے پاس داخلے کے لیے آئی تھیں۔ رابعہ کو وہ خاتون ایک آنکھ نہیں بھائی تھیں۔ انہوں نے بچوں کی تعلیمی کارکردگی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''میرے بچے بہت انٹیلی جنٹ ہیں۔ انہیں بہت کم ٹیوشن کی ضرورت پڑی ہے۔ میں انہیں خود ہی پڑھاتی رہی ہوں۔ آج کل بس طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے ٹائم نہیں دے پا رہی۔''

''اللہ پاک آپ کو صحت و سلامتی عطا فرمائے۔'' رابعہ نے رسمی انداز میں جواب دیا تھا۔

''آمین۔ شکریہ جی! ویسے میرے بچوں کا خیال رکھیے گا۔ یہ ڈانٹ اور مار سے بالکل نہیں چلیں گے۔ انہیں بس پیار سے پڑھائیے گا۔ ہم نے کبھی انہیں پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا۔''

گلناز کی اس بات پر رابعہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئیں۔ انہیں ایسی خواتین سے سخت چڑ ہوتی تھی جو اپنے بچوں کے لیے ضرورت سے زیادہ ہی فکرمندی اور 'بچپنے' کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔ رابعہ کے ذاتی تجربے کے مطابق ایسی خواتین بچوں سے زیادہ 'بچہ' ہوتی تھیں۔ ان کے دل میں فوری خیال یہی پیدا ہوا کہ گلناز کو شائستگی سے انکار کر دیں لیکن اپنے معاشی حالات نے انہیں یہ کڑوا گھونٹ بھرنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت انہیں زوہیب کی فیس بھرنے کے لیے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔

ماہم اور حمزہ کی پڑھائی کا آغاز ہو گیا۔ اگلے ایک ماہ میں رابعہ کو ان دونوں کی عادات سے چڑ ہونے لگی تھی۔ وہ ہمیشہ دیگر بچوں سے الگ تھلگ اور خاصے لیے دیے رہتے تھے۔ اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب رابعہ نے حسب عادت ماہم سے بھی دیگر بچیوں کی طرح گھر کے چھوٹے موٹے کام کروانے شروع کر دیے۔ وہ ان بچوں سے برتن دھلوانے، چھت سے کپڑے اتارنے اور ٹیوشن ختم ہونے پر کمرے کی صفائی ستھرائی کا کام کروا لیتی تھیں۔ لڑکے البتہ باہر کے ہلکے پھلکے کام کر دیتے تھے۔ ماہم کے ہر ایک انداز میں پھوہڑپن اور بے رغبتی نمایاں ہوتی۔ حمزہ بھی بددلی سے ہی کوئی ذمے داری نبھاتا تھا۔ رابعہ نے ایک روز انہیں بے دلی کے اس مظاہرے پر جھاڑ پلا دی۔ اگلے ہی روز گلناز تن فن کرتی ان کے پاس چلی آئیں۔

''یہ بھلا کیا بات ہوئی میڈم جی! ہم بچوں کو پڑھنے کے لیے بھیجتے ہیں یا ملازم بننے کی ٹریننگ لینے؟''

''استاد کا بہت حق ہوتا ہے بچوں پر۔ اگر وہ کوئی ذاتی کام کروا بھی لے تو کیا حرج ہے آخر؟'' انہوں نے نپے تلے

سے انداز میں جواب دیا۔

''میرے بچے یہاں کوئی کام نہیں کریں گے۔ اگر آپ کو اتنی ہی مجبوری ہے تو اپنے بیٹے سے کروا لیا کریں کام۔ وہ سارا دن لور لور پھرنے کے سوا کرتا ہی کیا ہے؟'' وہ بدلحاظی سے بولیں۔

''مائنڈ یور لینگویج۔'' رابعہ اپنے بیٹے کے ذکر پر بھڑک گئیں۔

زوہیب حقیقتاً ان کی کمزوری تھا۔ شوہر کے بعد وہی ان کا سہارا اور آرزوؤں کا مرکز تھا۔ ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ دیگر خواتین کی اولاد کے بارے میں ایسی عادات اور طرزِ فکر پر چیں بہ جبیں رہنے والی رابعہ خود بھی اسی راہ کی مسافر تھیں۔

''میں نے کیا غلط کہا ہے؟'' گلناز نے دبے بغیر کہا۔

''آپ غلط کہہ نہیں بلکہ کر رہی ہیں۔ اپنی اولاد کے ساتھ بہت غلط کر رہی ہیں۔ انہیں بے حد نازک مزاج بنا رکھا ہے۔ ماہم بارہ سال کی ہوگئی ہے لیکن اسے اتنا بھی ... سلیقہ نہیں کہ کسی مہمان کو کولڈ ڈرنک کیسے سرو کرنی ہے۔ حمزہ کو اتنا سینس نہیں کہ بازار سے ایک سو پچاس کی کوئی چیز کیسے خریدنی ہے؟'' وہ صاف گوئی سے بولیں۔

''تو وہ ہمارا سر درد ہے نا۔ اپنے بچوں کو یہ سلیقہ اور سینس سکھانے کے لیے ہم ابھی زندہ ہیں۔ آپ اپنا کام کیجیے بس۔ ہم انہیں یہاں پڑھنے بھیجتے ہیں۔ انہیں پڑھائیے بس۔ باقی کام سکھانا ہماری ذمے داری ہے۔ ہمارے بچے یہاں ملازم بننے نہیں آتے ہیں۔'' گلناز نے مزید بدلحاظی سے کہا۔

''آپ کو اگر کوئی ایشو ہے تو اپنے بچے کہیں اور پڑھنے کے لیے بھیج دیں۔ میری طرف سے معذرت ہی سمجھیں۔'' انہوں نے رکھائی سے جواب دیا۔

گلناز منہ بنائے وہاں سے چلی گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے محلہ بھر کی خواتین میں یہ بات مشہور کر دی کہ انہوں نے رابعہ کی کن عادات کے باعث بچوں کو ٹیوشن سے اٹھایا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی چند ایک مزید خواتین نے بھی اپنے بچوں کو بھیجنے سے انکار کر دیا۔ معاشی تعطل نے رابعہ کی بیزاری اور چڑچڑے پن میں مزید اضافہ کر دیا۔

بستر پر دراز رابعہ کا اعصابی جمود شدید ہونے لگا تھا۔ انہیں ایک عجیب سی غنودگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بہت عجیب لمحات تھے۔ یادیں، باتیں، احتساب اور اذیت ایک پل کے لیے بھی چین نہیں لینے دے رہے تھے۔

''حمزہ نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ؟ وہ تو بہت

عزت و احترام دینے والا لڑکا تھا۔ یہ اچانک ایسا کیوں ہو گیا؟'' شل ہوتے دماغ میں ایک اور سوچ ابھری۔

''اس بات کا جواب تو تمہیں بھی پتا ہے رابعہ بی بی!'' ایک سفاک سوچ نے آئینہ دکھایا۔ ''تمہارا بیٹا ہی اس کا ذمے دار ہے۔ اب اگر تمہیں اپنی مامتا میں کبھی بیٹے کا قصور نظر نہیں آیا تو کوئی کیا کہہ یا کر سکتا ہے۔''

رابعہ کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ ان کے پاؤں میں ایک نامانوس سی ٹھنڈک سرایت کرنے لگی تھی۔ بھولی بسری یادیں یکے بعد دیگرے کچوکے لگانے لگیں۔ انہیں بے اختیار وہ لمحات یاد آئے جب وہ دیگر بچوں کے لیے ایک سخت گیر استاد لیکن زوہیب کے لیے بے بسی کی حد تک نرم مزاج تھیں۔ دیگر خواتین کو اولاد کے معاملے میں طنز و تشنیع کا نشانہ بنانے والی وہ خود اپنے بیٹے کے لیے ہر نرمی جائز سمجھتیں۔ انہیں اپنے لاڈ پیار میں زوہیب کی خود پسندی، انا پرستی اور ہٹ دھرمی کبھی محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔ زوہیب کی یہ عادات کس لمحہ صنفِ نازک سے رومانوی تعلقات کی جانب مائل

pklibrary.com

ہوئیں، انہیں اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ احساس تو اس وقت ہوا جب اپنے ٹیوشن کی ہی ایک چودہ سالہ لڑکی کو پانی پینے جانے کے بہانے کچن میں زوہیب سے محوِ گفتگو دیکھا۔ زوہیب کی عمر اس وقت پندرہ برس تھی۔ اس نے نہایت بے باکی سے سویرا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ان کی آنکھوں سے چھلکتے جذبوں نے رابعہ کو سخت برافروختہ کیا تاہم کسی فوری ردِعمل سے گریز ہی کیا۔ بعدازاں بھی وہ اپنی مامتا سے مجبور ہو کے بیٹے کو تو کچھ نہ کہہ سکیں البتہ سویرا نامی اس لڑکی کو 'چوری' کے الزام میں ٹیوشن سے نکال پھینکا۔

''میری بیٹی ایسی نہیں ہے میڈم جی! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' سویرا کی والدہ ان کے سامنے بلکتی رہیں۔

''تم ماں ہو اس کی، تمہیں اپنی اولاد کی غلطی بھلا کیسے نظر آئے گی؟ میں نے اسے خود اپنی الماری سے پیسے نکالتے دیکھا ہے۔ اللہ جانے کتنی چیزوں پر ہاتھ صاف کر چکی ہوگی پہلے۔'' وہ رُکھائی سے بولیں اور اس کی ایک بھی سنے بغیر ذلیل وخوار کر کے گھر سے نکال دیا۔

زوہیب اپنی کم عمری کے باوجود 'سچائی' بھانپ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ گھر میں تو کسی لڑکی کی جانب متوجہ نہ ہوا البتہ بیرونی سرگرمیاں مکمل اہتمام سے جاری رہیں۔ رابعہ نے ان سرگرمیوں میں کبھی دخل دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ وہ اکلوتی اولاد کی خودسری سے واقف تھیں اور اسے خود سے کسی صورت دور نہیں کر سکتی تھیں۔

زوہیب کے معاملے میں اپنی یہ 'کشادہ دلی' اور اعلیٰ ظرفی، یاد آتے ہی رابعہ کی بے چینی سوا تر ہوگئی۔ ٹھنڈک اب رانوں تک چلی آئی تھی۔ ذہن کا ایک گوشہ ہنوز حمزہ کے اس فعل اور پس منظر کے متعلق الجھا ہوا تھا۔ انہیں ماضی قریب کے وہ لمحات یاد آئے جب ایک صبح ماہم انتہائی منتشر حالت میں ان کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ زوہیب سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کی 'حالت' اور 'وجۂ حالت' نے رابعہ کا ذہن ہی الٹا دیا تھا۔

''نکل جاؤ یہاں سے۔ اس سے پہلے کہ میں تمہارے والدین کو یہاں بلاؤں ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ۔'' وہ چلّائی تھیں۔

''ایک بار میری بات تو سن لیجیے پلیز! میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں۔ مجھے بات کرنے کا ایک موقع تو دیجیے۔'' ماہم گڑگڑائی تھی۔

رابعہ نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ اس کے بعد وہ زوہیب کی شادی کے درپے ہو گئیں۔ ان کے تئیں زوہیب کی بھونرا صفتی ختم کرنے کا یہی ایک شافی علاج تھا لیکن ہوا کیا؟

''آہ..... تم اب ہی باز آجاتے زوہیب!'' ان کے لبوں سے بے آواز کراہ برآمد ہوئی۔ ٹھنڈک نے اب بالائی دھڑ کو دبوچنا شروع کر دیا تھا۔

حمزہ کا تصور ایک بار پھر ذہن میں آتے ہی ان کا وجدان زوہیب کے متعلق تشویش زدہ ہونے لگا۔

''یا اللہ! میرا بچہ..... اسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔'' وہ اپنا بے ترتیب تنفس سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔

اسی اثنا میں کمرے کا دروازہ کھلا اور انہیں زوہیب، شانزہ کے چہرے دکھائی دیے۔ ان کے انداز سے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ واپسی میں جھگڑ کر ہی آئے ہیں۔ رابعہ کے دل کو ایک ٹھیس سی لگی۔ تنفس اب اکھڑنے لگا۔

''مما! مما جی! کیا ہوا ہے آپ کو؟ کیا ہوا ہے؟'' زوہیب فوری طور پر اُن کی جانب لپکا۔

رابعہ نے ہاتھ آگے بڑھا کر بیٹے کو اپنے سینے سے لگانا چاہا لیکن کہیں کوئی جنبش نہ تھی۔ ان کے بدن کو ایک شدید جھٹکا لگا اور گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔ شانزہ اور زوہیب انہیں جھنجوڑتے ہوئے ایمبولنس کے لیے کال کرنے لگے۔

☆☆☆

وہ ماہ فروری کی ایک قدرے سرد شام تھی۔ شانزہ اپنی خوابگاہ میں موجود شدید تناؤ کا شکار تھی۔ اس کی آنکھیں متورم اور چہرہ اترا ہوا تھا۔ گاہے بگاہے کسی درد کے تاثرات بھی چہرے سے جھلکتے تو اس کے لبوں سے ایک کراہ برآمد ہو جاتی۔

شانزہ کا اس دوپہر زوہیب سے جھگڑا ہوا تھا۔ وجۂ تسمیہ زوہیب کی بھونرا صفتی ہی تھی۔ وہ حسبِ عادت اس لڑکی سے نہایت شیریں انداز میں محوِ گفتگو تھا۔ شانزہ کا دل جل کر خاک ہو گیا۔ اس کے ضبط کا پیمانہ یکدم لبریز ہو گیا۔ ردِعمل کے طور پر اس نے زوہیب کے ہاتھ سے موبائل چھینا اور کال بند کر کے فون بستر پر پٹخ دیا۔

''یہ کیا نان سینس ہے؟'' وہ بھڑک گیا۔ رابعہ کی وفات کے بعد اس کا مزاج قطعی ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنے 'معاملات' میں مزید 'خودمختار' تھا۔

''اس نان سینس سے تو کم ہی ہے جو آپ کر رہے ہیں۔'' شانزہ نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''میں کیا کر رہا ہوں؟'' وہ سابقہ انداز میں ہی بولا۔

''تمہیں ہزار مرتبہ کہا ہے کہ میرے پرسنل میٹرز میں دخل

pklibrary.com

اندازی مت کیا کرو۔ اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھتی ہو؟ اپنی اوقات میں رہنا سیکھو!''

''اچھا! کیا اوقات ہے ویسے آپ کی نظر میں میری؟ یہ بھی بتا دیجیے آج۔''

''میری ہر ضرورت کا خیال رکھو۔ گھر سنبھالو۔ بس!'' وہ بے نیازی سے بولا۔

شانزہ کا دماغ بالکل ہی گھوم گیا۔ وہ اس بات کا کوئی سخت جواب دینا چاہتی تھی کہ فون ایک بار پھر گنگنانے لگا۔ زوہیب نے لپک کر کال ریسیو کی اور دوسرے ہاتھ سے اسے دھکیلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ مصروف سے انداز میں واپس آیا اور نہانے کی تیاری کرنے لگا۔ شانزہ کی چھٹی حس چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ وہ کسی لڑکی سے ملاقات کے لیے جا رہا ہے۔ اس کا تن بدن سلگ کر رہ گیا۔ وہ غصے سے زوہیب کی طرف بڑھی۔

''کہاں جا رہے ہیں؟''

''نن آف یور بزنس۔'' اس نے تنفر سے جواب دیا اور حقارت سے ہاتھ جھٹکتا اپنا والٹ، بائیک کی چابی اٹھائے روانہ ہو گیا۔

شانزہ کا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اپنی سوچوں میں اُلجھی اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر یکدم شانے پر دباؤ محسوس ہوا تو پژمردہ سے انداز میں اٹھی اور واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے منتشر ذہن سے بالکل ہی محو ہو گیا کہ زوہیب حسبِ عادت واش روم میں وائپر لگائے بغیر ہی چلا گیا ہوگا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ گیلے فرش پر پاؤں پھسلا اور وہ زمین بوس ہو گئی۔ اس کا وزن دائیں بازو اور کولہے پر پڑا تھا۔ اس کے لبوں سے اضطراری چیخ برآمد ہوئی لیکن وہاں اسے دیکھنے اور مدد کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے بائیں بازو سے بدقت سہارا لیے اٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی دوبارہ بستر پر آ بیٹھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کا بدن بے طرح ٹوٹنے لگا تھا۔ درد جب ناقابلِ برداشت ہوا تو اس نے حمزہ کا نمبر ملا لیا۔ حمزہ اس کی آواز سنتے ہی بھانپ گیا کہ وہ کسی اذیت میں ہے۔

''کیا ہوا ہے شانی؟ سب ٹھیک تو ہے؟'' وہ تشویش سے بولا۔

''حمزہ! ہیلپ می پلیز!'' وہ رونے لگی۔

''ہاں ہاں! بولیے نا۔ کیا ہوا ہے؟ آپ تو بہت مضبوط ہیں۔ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟ کیا ہوا ہے؟'' وہ مزید اپنائیت سے بولا۔

''مجھے چند پین کلرز اور ونوجن جیل لا دو۔''

''کیا ہوا؟ کہیں چوٹ لگی ہے کیا؟'' اس نے فکرمندی جتائی۔

''ہاں! بس تم جلدی سے یہ میڈیسنز گھر لے آؤ۔ گھر پر کوئی بھی نہیں ہے۔'' وہ کراہی۔

''ٹھیک ہے! میں آ رہا ہوں۔ ڈونٹ وری۔''

''میں دروازہ کھول دیتی ہوں کسی طرح۔ تم آ جانا اندر۔''

شانزہ کی اس بات پر حمزہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ قدرت نے اسے بہترین موقع فراہم کر ہی دیا تھا۔ اس نے شانزہ کو دلاسا دیا اور کچھ ہی دیر بعد اس کے گھر پہنچ گیا۔

☆☆☆

''یہ سب کیا ہے؟ اتنا کچھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟'' شانزہ نے اس کے ہاتھوں میں بسکٹ اور جوس کے پیکٹ دیکھ کر کہا۔

''خالی پیٹ تو دوا نہیں کھلا سکتا تھا نا میں آپ کو۔'' وہ رعب جماتے ہوئے بولا اور پیکٹ سے ایک بسکٹ نکال کر خود اسے کھلانے لگا۔

شانزہ کی آنکھیں مزید بھیگ گئیں۔ وہ ایسے ناز و انداز کی زوہیب سے طلبگار تھی لیکن ان تلوں میں تیل ہی کہاں تھا؟

''ہوا کیا تھا؟ کیسے چوٹ لگی آپ کو...؟'' حمزہ کے استفسار پر شانزہ نے مختصراً ساری بات بتا دی۔

''حد ہوتی ہے بے پروائی کی بھی۔'' حمزہ نے تاسف سے سر جھٹکا اور بسکٹ اسے تھما کر باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

''کیا کرنے لگے ہو؟'' شانزہ نے حیرانی سے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں! خاموشی سے بیٹھی رہیں وہیں۔'' اس نے کونے میں رکھا ایک وائپر اٹھایا اور پانی خشک کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے میں واپس آیا اور مصروف سے انداز میں بسکٹ، جوس کے خالی ڈبے ایک کونے میں رکھی ٹوکری میں پھینک دیے۔ اسی لمحے اس کی نگاہ ڈریسنگ ٹیبل پر بکھری اشیا پر پڑی۔ اس نے وہ چیزیں سمیٹ کر اپنے ٹھکانوں پر رکھیں۔ گیلا تولیا اٹھا کر ایک کرسی کی پشت پر پھیلایا اور دیگر چیزیں بھی سمیٹ کر اسی اپنائیت بھرے انداز میں شانزہ کو دوا کھلانے کے بعد کہنے لگا۔

''یہ جیل خود لگا لیجیے گا۔ میں اب چلتا ہوں۔ اتنی دیر رکنا مناسب نہیں میرا۔ جیل لگا کر آرام کیجیے گا بس۔''

شانزہ آنسوؤں بھری آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتی رہی۔ وہ اس لمحے حمزہ کے کردار سے حقیقتاً بہت متاثر

ہوئی تھی۔ حمزہ نے جیل اس کے ہاتھ پر رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''اوکے! ٹیک کیئر۔ میں دروازہ لاک کر دوں گا جاتے ہوئے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے رنگ کر دینا۔''

اس کی روانگی کے بعد وہ ساکت لیٹی زوہیب اور حمزہ کا مقابلہ کرتی رہی۔

''یہ بھی تو ایک مرد ہی ہے۔ کتنا فرق ہے ان دونوں میں؟ اگر یہ چاہتا تو میرے ساتھ رک سکتا تھا۔ میری چوٹوں پر مساج کے بہانے اس تنہائی کا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ لیکن نہیں! اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ بلکہ اسے تو میری ہی عزت کی فکر تھی۔ میرے کام سمیٹ کر کس قدر شرافت سے واپس چلا گیا۔ آہ..... اور ایک میرا شوہر ہے۔ اس میں احساس نام کی کوئی شے ہی نہیں۔ عورت ذات کی عزت کرنے کے تصور سے ہی کوسوں دور ہے۔ اس کی زندگی میں لڑکیوں سے تعلقات کی کوئی حد ہی نہیں۔ احساسِ ذمے داری کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔''

وہ سوچوں کے اس جال میں اُلجھتی دردکش ادویات کے زیرِ اثر نیند سے ہم آغوش ہوگئی۔

☆☆☆

حمزہ اپنے نیم تاریک اور تنہائی سے گھٹن زدہ گھر میں کھانا کھا کر برتن دھونے میں مصروف تھا۔ آغاز میں شہناز یا عرفان اسے کھانا پہنچا دیا کرتے تھے لیکن پھر حمزہ نے خود ہی منع کر دیا۔ وہ کسی پر بھی بوجھ بن کر زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی عزتِ نفس اور ذاتی وقار بہت عزیز تھا۔ اسی وقار کی بحالی کے لیے اس نے ایک جزوی حکمتِ عملی تیار کر رکھی تھی جس پر عمل درآمد کی ابتدا بھی ہوگئی تھی۔

اس حکمتِ عملی کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کی دماغی روشانزہ اور زوہیب کی جانب متوجہ ہوگئی۔ رابعہ کی تدفین پر زوہیب کی تڑپ اور حالت نے اسے بے انتہا سُرور فراہم کیا تھا۔ ان لمحات کا کیف یاد کرتے اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ در آئی۔ اپنے منصوبے کے اگلے حصے پر عمل کا وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆

زوہیب تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو شانزہ کا مزاج خاصا برہم تھا۔ زوہیب نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے اپنی ہی دُھن میں ناشتا کیا اور مسرور سے انداز میں بائیک کی چابی تھامے گھر سے روانہ ہوگیا۔ اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد اس نے بائیک مخصوص مقام پر کھڑی کی اور اسی مسرور انداز میں اندر بڑھ گیا جو اس کا خاصہ تھا۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ساجد نامی ایک چپراسی اس کے پاس آیا اور کاغذ کا ایک پرزہ اسے تھما دیا۔ زوہیب کاغذ دیکھ کر چونک گیا۔

''ہاں چلو! میں آرہا ہوں۔'' اس نے نخوت سے ساجد کو مخاطب کیا۔

''مے آئی کم اِن میم!'' کچھ لمحوں بعد وہ ایک آراستہ پیراستہ دفتر کے دروازے پر دستک دیے کہنے لگا۔

''یس! کم اِن۔'' ایک مترنم نسوانی آواز سنائی دی۔ اس ترنم میں البتہ سختی بھی واضح محسوس ہوتی تھی۔

زوہیب اندر داخل ہوا۔ اس کے سامنے ایک مستطیل میز کے عقب میں تقریباً پچپن سالہ خاتون بیٹھی تھی۔

''یس میم! آپ نے بلایا تھا مجھے؟'' اس نے شائستگی سے شمائلہ نامی اس خاتون کو مخاطب کیا۔

ہلکی نیلی سوتی نفیس ساڑی میں ملبوس شمائلہ کا شخصی تاثر مقابل کو شائستگی اور اخلاق کے جامے میں رہنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ شمائلہ نے ایک خاموش، سرد نگاہ اُس پر ڈالی۔ زوہیب کو کسی غیر معمولی پن کا احساس ہونے لگا۔ ان تاثرات اور نگاہوں میں آج کچھ نہیں سب کچھ ہی مختلف تھا۔ شمائلہ نے اس کی اُلجھن اور اضطراب بھانپ لیا تاہم اسی خاموشی سے ایک لفافہ اس کے سامنے کر دیا۔ زوہیب مزید اُلجھ گیا۔ اس نے وہ لفافہ کھولا اور اندر موجود کاغذ کے مندرجات پر نظر دوڑاتے ہی دماغ گویا بھک سے اُڑ گیا۔

''یہ..... یہ سب کیا ہے میم؟''

''تمہاری جاب ٹرمینیشن لیٹر ہے۔ دکھائی نہیں دے رہا کیا؟ یا کیریکٹر کے ساتھ آنکھیں بھی خراب ہوگئی ہیں؟'' شمائلہ نے تُرکھائی سے اسے مخاطب کیا۔

زوہیب کے لیے اس کا... یہ انداز اور الفاظ بالکل غیر متوقع تھے۔

''آپ مجھ سے اس طرح کیسے بات کر سکتی ہیں؟ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہیں؟'' اس نے وہ کاغذ گلاس ٹاپ پر پٹخا۔

''اس طرح..... اس طرح کر سکتی ہوں۔'' شمائلہ نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور کچھ چھیڑ چھاڑ کے بعد اس کے سامنے کر دیا۔

زوہیب نے جھنجلاہٹ میں وہ فون تھاما۔ اس کے سامنے ایک ویڈیو رواں ہوتے ہی گویا سٹی گم ہوگئی۔ جھنجلاہٹ اور غصہ شدید بے یقینی میں ڈھل گئے تھے۔ اس

pklibrary.com

ویڈیو میں اُسے اپنا 'وجود' دکھائی دے رہا تھا لیکن اس حالت و انداز میں کیسے؟ ایسا کیسے ممکن تھا بھلا؟ اس نے موبائل پر گرفت سخت کی اور بائیں ہاتھ سے اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔

''بے کار کوششیں کر رہے ہو۔ یہ تم ہی ہو اور ہزار بار جھٹلانے کے بعد بھی تم ہی رہو گے۔'' شمائلہ نے رُکھائی سے کہا۔

زوہیب نے ایک نظر شمائلہ پر ڈالی اور پھر دوبارہ موبائل فون کی جانب دیکھنے لگا۔ منظر ہنوز وہی تھا۔ اس کے سامنے وہ خود ایک کتھئی رنگ کا تولیا زیریں بدن پر لپیٹے باتھ روم میں نصب آئینے کے سامنے موجود تھا۔ اس کے چہرے کی شیو اختتامی مراحل میں تھی۔ شیو مکمل ہوتے ہی اس نے آفٹر شیو لوشن لگایا اور آئینے میں خود کو مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''آج تو خیر نہیں! آج تو کالج میں لڑکیوں پر بجلیاں گرنے والی ہیں۔ آج تو موبائل فون پر یہی میسج ہوں گے۔ سر! آپ بہت کول لگ رہے تھے۔ سر! یو آر سو ہینڈسم۔ سر! آپ کی پرسنالٹی نہایت ڈیشنگ ہے۔ او مائی گاڈ! واٹ لولی پرسنالیٹی سر!''

اس کے بعد زوہیب نے ایک اسٹینڈ پر رکھا برش اٹھایا اور بال سنوارتے ہوئے گنگنانے لگا۔

''بچنا اے حسینو! لو میں آ گیا۔ حُسن کا عاشق..... حُسن کا دشمن..... اپنی ادا ہے یار و سب سے جدا..... ہے..... ہو.....''

وہ ہر ایک فقرے کے ساتھ باقاعدہ تاثرات دیتا بدن کو بھی رقص کے انداز میں جنبش دے رہا تھا۔ کچھ دیر اس سرگرمی میں مشغول رہنے کے بعد اس نے سامان بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھینکا اور آئینے میں ایک بار پھر خود کو دیکھتے ہوئے مشہور ڈائیلاگ دہرانے لگا۔

''میں اتنا 'سندر' ہوں میں کیا کروں؟''

ویڈیو کے اختتام پر زوہیب کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔

''آگے بھی دیکھ لو ذرا! چند کارنامے اور بھی موجود ہیں موبائل میں۔'' شمائلہ نے سرد مہری سے اسے مخاطب کیا۔

زوہیب کی انگلی نے خودکار انداز میں حرکت کی۔ اس کے وجود پر دھیرے دھیرے لرزش طاری ہونے لگی۔ اعصاب کشیدگی کا شکار ہو رہے تھے۔ اب اس پٹاری سے جانے کون سا سانپ برآمد ہوگا؟

اگلی ویڈیو کا آغاز ہوا تو زوہیب کی کنپٹیوں میں خون کی سنسناہٹ تیز تر ہو گئی۔ اس ویڈیو میں 'سیمی' نامی لڑکی سے ویڈیو کال پر مصروف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے لگاوٹ اور چہرے کی بشاشت کسی بھی طور اس کے عہدے یا پیشے سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ کانوں میں ایئر پوڈز ہونے کے باعث ویڈیو میں سیمی کی آواز تو عیاں نہیں تھی تاہم زوہیب کو یہ گفتگو اپنی جزئیات سمیت یاد تھی۔ اس کی سماعت میں وہ گفتگو خودکارانہ طور پر گونجنے لگی۔

''امید ہے، آپ نے میرا یوں کال کرنا مائنڈ نہیں کیا ہوگا سر!'' سیمی نے ابتدائی علیک سلیک کے بعد کہا۔

''اوہ نو مائی ڈیئر! مائنڈ کیوں کرنا ہے؟ مائنڈ تو بالکل نہیں کیا۔ بس سرپرائزڈ ہوا ہوں۔'' زوہیب نے اپنے مخصوص انداز میں اسے مخاطب کیا۔

دفتر کی کرسی پر بیٹھے زوہیب کے لیے اپنا وہ چہرہ اور تاثرات دیکھنے محال ہو رہے تھے۔

''تھینک یو سو مچ سر! مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ مشکور ہوئی تھی۔

''اینی ٹائم مائی ڈیئر! اینی ٹائم!'' وہ ہر ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ آنکھوں میں ایک شاطرانہ چمک پیدا ہو گئی تھی۔

''مجھے ہوم ٹیوشن چاہیے سر! میں اکاؤنٹس میں ذرا ویک ہوں۔ آپ سمجھ کر لیں گے نا؟''

''ہم! مشکل تو ہے ذرا۔'' اس نے تذبذب کی اداکاری کی۔

''پلیز سر! انکار مت کیجیے گا۔ میں نے بہت امید سے آپ کو کال کی ہے۔ پلیز!'' وہ مُصر ہوئی۔

''آل رائٹ!'' زوہیب نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں انکار کر دیتا لیکن آپ ایک ذہین شاگرد ہیں۔ آپ میں آگے بڑھنے کا بہت پوٹینشل ہے۔''

''تھینک یو! تھینک یو سو مچ سر!'' سیمی ریشہ خطمی ہوئی تھی۔ ''آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ بس آپ یہ بتائیے کہ آپ کی کیا خدمت کی جائے؟''

''ہم! خدمت!'' وہ گہری سوچ میں مبتلا ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ ''فیس تو آپ کو بتا دیں گے لیکن اس کے علاوہ ایک کپ کافی اور کھانا۔ آپ کے ہاتھوں سے بنا ہوا۔ آئی ایم شیور! آپ کے ہاتھوں کا ٹیسٹ لاجواب ہوگا۔''

سیمی کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ مسکراتی آنکھوں میں ایک واضح مختلف چمک اُبھری تھی۔ اس نے لگاوٹ بھرے

pklibrary.com

الوداعی کلمات کے بعد فون بند کیا تو زوہیب اپنا موبائل ہاتھوں میں گھماتے ہوئے گنگنانے لگا۔

''میں اتنا سندر ہوں میں کیا کروں؟''

اس ویڈیو کے اختتام پر زوہیب کی انگلی نے ایک بار پھر خودکار انداز میں جنبش کی۔ اگلی ویڈیو میں بھی وہ بستر پر دراز کسی کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ اس روز شانزہ اپنے والدین کے پاس گئی تھی اور زوہیب نے مائدہ سے خاصی 'طویل' گفتگو کی تھی۔ یہ ویڈیو اسی ویڈیو کال کا ایک 'کلپ' تھی تاہم زاویہ ایسا تھا کہ مائدہ کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

زوہیب کو اپنے مساموں سے پسینہ اگلتا محسوس ہونے لگا۔

''میں تو آپ کی شخصیت کی پہلے ہی ون فین ہو گئی تھی سر!'' مائدہ نے لودیتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آہاں..... اب ایسا بھی کوئی پرنس چارمنگ نہیں ہوں میں۔'' زوہیب نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

''اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہیں۔ آپ ایک جینئس ہیں سر!''

''آپ کہتی ہو تو مان لیتا ہوں بھئی!'' اس نے کسرِ نفسی کا مظاہرہ کیا۔

''ڈونٹ ٹیل می سر! کہ آپ کو آج تک کسی نے ایسا نہیں کہا پہلے۔'' وہ بے یقینی سے کہنے لگی۔

''ہمم! کہتے تو سبھی ہیں۔ اسٹوڈنٹس، کولیگ، اسٹاف اور.....'' زوہیب دانستہ طور پر خاموش ہوا۔

''اور کون سر؟'''' مائدہ بے تاب ہوئی۔

''لیوائٹ! بہت پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں۔'' اس نے تجاہل برتا۔ یہ اشارہ واضح طور پر باحجاب رہنے والی شمائلہ کی جانب تھا۔

''کیا آپ ان سب سے بات کرتے ہیں سر؟'' مائدہ نے اضطراب سے دریافت کیا تھا۔

''پہلی بات تو یہ کہ ڈونٹ کال می سر!'' اس نے تنبیہہ کی۔

''پھر کیا پکاروں آپ کو؟'' مائدہ کی آنکھیں چمکیں۔

''جو تمہارا دل چاہے۔ لیکن اس وقت ہم اسٹوڈنٹ ٹیچر بالکل نہیں ہیں۔ اوکے!'' وہ مخمور انداز میں بولا۔

''اوکے زیبی!'' مائدہ نے جذبات سے بوجھل ہو کر کہا۔

''میں نے کبھی کسی سے ایسے بات نہیں کی۔ لیکن تم جانے کیسے میرے اتنے قریب آ گئی ہو؟'' زوہیب نے بے بسی جتائی۔

''یہ میری خوش بختی ہے سر! اوہ سوری..... آئی مین..... زیبی! میں آپ سے.....'' وہ ہچکچا کر کہنے لگی۔

''تم مجھ سے کیا؟'' اس نے شہ دی۔

''پیار کرنے لگی ہوں آپ سے..... آئی لو یو زیبی! سوچتی ہوں کالج کے بعد کیسے رہوں گی آپ کے بغیر۔''

''پیار..... اوہ ریئلی؟'' زوہیب نے ابرو اچکائے۔ اس نے اپنی جون بدل لی تھی۔

''یس ریئلی! آپ کو یقین نہیں ہے کیا؟''

''نہیں..... یہ باتیں میں جانے دن میں کتنی بار اور کس کس سے سنتا ہوں۔ میں اس بات کو کبھی سیریس نہیں لیتا۔ یہ صرف وقتی اٹریکشن ہوتی ہے۔ تھنگ ایلس۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

''سنتے ہوں گے۔ لیکن میری اور اُن کی فیلنگز میں فرق ہے۔'' مائدہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

''کیا فرق ہے؟ کیا کر سکتی ہو میرے لیے ایسا جو باقی نہیں کر سکتا کوئی۔'' اس نے نخوت سے دریافت کیا۔

''آپ بتائیں کیا کروں ایسا کہ آپ کو یقین آ جائے۔'' مائدہ بے بسی سے بولی۔

زوہیب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کے سامنے ایک مطالبہ رکھ دیا۔ مائدہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہو گئے۔

''بس؟ اتنی ہی محبت تھی۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ پیار پیار کہنا آسان ہوتا ہے۔'' اس کے استہزائیہ اور کٹھور انداز پر مائدہ کے آنسو بہہ نکلے۔ وہ رُندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

''آپ ایک بار کہیے کہ آپ بھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بس ایک بار کہہ دیجیے کہ آپ مجھ سے.....'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''میں رات کے اس ٹائم اپنی فیملی کو چھوڑ کر تم سے بات کر رہا ہوں۔ کیا اب بھی تمہیں اس بات میں کوئی شک ہے؟'' وہ نخوت سے بولا۔ ''خیر! آئی لو یو..... میں نے ایسی فیلنگز کبھی کسی کے لیے محسوس نہیں کیں۔ آئی ریئلی لو یو۔''

زوہیب کے اس اقرار پر مائدہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے زوہیب پر اپنی 'محبت' کی 'سچائی' ثابت کرنے کے لیے خود کو بے لباس کر دیا۔

زوہیب اب نہایت فصاحت سے اس کے جسمانی پیچ و خم کی شان میں رطب اللسان ہو گیا۔ زوہیب کے ہاتھوں کی

pklibrary.com

لرزش یکدم بڑھ گئی۔ اس نے فوراً انگلی کو جنبش دی۔ اگلی ویڈیو میں اپنا اور شانزہ کا چہرہ دیکھ کر اس کا وجود ہل کر رہ گیا۔

''یا اللہ! اب کیا قیامت ٹوٹنی ہے۔'' وہ سراسیمہ ہوا۔

''کس سے بات کر رہے تھے آپ؟'' شانزہ نے حسبِ مزاج لٹھ مار انداز میں دریافت کیا تھا۔

''تم سے مطلب! اپنے کام سے کام رکھو بس۔'' اس نے رُکھائی سے جواب دیا تھا۔

''آپ کو شرم نہیں آتی؟ ذرا بھی شرم نہیں آتی کیا؟'' وہ تاسف سے بولی۔

''کیوں؟ میں کوئی ننگا ناچ دکھاتا ہوں سڑکوں پر؟'' زوہیب نے نہایت واہیات انداز میں دریافت کیا۔

''کچھ تو خیال کریں۔ کچھ تو شرم کر لیں۔ ٹیچر ہیں آپ۔ ایک ٹیچر ہیں آپ۔ مطلب بھی سمجھتے ہیں اس بات کا؟ اس عہدے کے تقدس کا ذرا بھی پاس ہے آپ کو؟ یہ کس قدر نازک اور اہم 'ذمے داری' ہے۔ کچھ تو خیال کر لیں۔ روحانی والدین ہوتے ہیں ٹیچرز۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی ٹیچر کا ایسا روپ نہیں دیکھا۔ کس مٹی سے بنے ہیں آپ؟ شرم کیوں نہیں آتی یہ سب کرتے ہوئے؟'' وہ عاجز آ کر پھٹ پڑی تھی۔

''کیوں؟ میں کیوں شرم کروں بھئی؟ شرم تو ان ماں باپ کو کرنی چاہیے جنہوں نے اپنی اولاد کو ایسی تربیت اور پھر چھوٹ دے رکھی ہے کہ وہ کسی بھی ہینڈسم کو دیکھ کر اپنی اوقات سے باہر ہو جاتی ہیں۔ شرم تو انہیں آنی چاہیے جو کالج میں ایسے آتی ہیں جیسے کسی فیشن شو میں آئی ہوں۔ اور ایک بات تو طے ہے بھئی! یہ لڑکیاں پڑھنے نہیں بلکہ اپنے لیے پارٹنرز ڈھونڈنے آتی ہیں۔ کسی کو 'سیکس پارٹنر' چاہیے ہوتا ہے تو کسی کو لائف پارٹنر۔ اگر میں ان کی آفر قبول نہیں کروں گا تو کسی کلاس فیلو یا ایکس وائے زیڈ کو اپنا آپ پیش کر دیں گی۔ تو پھر میں ہی کیوں نہیں؟'' زوہیب نے ڈھٹائی سے جواب دیا تھا۔

''بہت ہی چیپ بے ہودہ خیالات ہیں آپ کے۔ بہت ہی چیپ انسان ہیں آپ۔ مجھے اب سمجھ آتی ہے کہ آپ کو ایسی لائف پارٹنر کیوں چاہیے تھی جو کہیں کسی کو ایجوکیشن میں نہ پڑھی ہو۔'' شانزہ صدمانی کیفیت میں تھی۔

''چیپ میں نہیں۔ چیپ وہ لوگ ہیں جو اپنی اولاد کو اس طرح سجا بنا کر نمائش کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ چیپ میں نہیں وہ لوگ ہیں جنہیں یہ ہوش ہی نہیں ہوتا کہ ان کی اولاد بند کمروں میں موبائل تھامے کیا کچھ کر رہی ہے۔ چیپ میں نہیں وہ لوگ ہیں جنہیں کسی سے بھی یونہی 'پیار' ہو جاتا ہے اور اس پیار کو پانے کے لیے اپنا آپ پیش کرتے ان والدین کا بھی نہیں سوچتیں جو اُن پر اعتماد کر کے 'آزادی' دیتے ہیں۔ میں ان کو جذباتی سہارا نہیں دوں گا تو کوئی اور دے لے گا۔ پھر میں ہی کیوں نہیں بھئی؟ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ یہ سب میرے لیے 'سوشل ورک' ہے۔ جذباتی بیماروں کو سہارا دے کر انہیں کسی 'گمراہی' میں گرنے سے بچاتا ہوں۔'' وہ بلا تکان کہتا خود کو عیاں کرتا گیا۔

''مائی گڈنیس! گھن آ رہی ہے مجھے آپ سے۔ یُو آر میفٹلی سک۔ اس اُجلے چہرے کے پیچھے اتنا گھناؤنا کیریکٹر ہو گا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لعنت بھیجتی ہوں میں آپ پر اور اپنے اس رشتے پر۔'' شانزہ اپنا ضبط کھو بیٹھی۔

''شٹ اَپ یو بچ!'' زوہیب نے بھڑک کر اسے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

شانزہ نے بھی غصے سے بے قابو کر اپنے ناخنوں سے اس کا منہ نوچ لیا اور غراتے ہوئے بولی۔

''پتا نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی جب میرے والدین نے تمہارے پروفیشن اور اس شکل و صورت کے فریب میں آ کر تمہیں میرا لائف پارٹنر بنا دیا۔ گھن آ رہی ہے مجھے تم سے اور تمہارے وجود سے۔''

''مجھ سے گھن آ رہی ہے تمہیں؟'' اس نے شانزہ کے بال مٹھی میں دبوچ لیے۔ ''تم ہو کیا؟ اوقات کیا ہے تمہاری؟ احسان مانو میرا کہ تم سے شادی کر کے تمہاری کوئی حیثیت بنا دی ہے۔ مجھ جیسا ہینڈسم اور گڈلکنگ شخص تو تم جیسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ ہونہہ! گھن آتی ہے۔'' وہ اس کے سر کو زوردار جھٹکے دینے لگا۔

شانزہ کی کراہیں چیخوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ اس لمحہ وہ اپنے والدین کی بابت سوچ رہی تھی جن کی غیر موجودگی میں وہ یہیں قید رہنے پر مجبور تھی۔ زوہیب نے اسے گھسیٹ کر بستر پر پٹخا اور اپنی وحشت کا نشانہ بناتے ہوئے بے طرح روند دیا۔

ویڈیو میں یہ مناظر دیکھتے زوہیب کی سٹی گم ہو چکی تھی۔ اپنے کردار کی کجی اور بیوی کے ساتھ جنسی تعلق یوں منظرِ عام پر آنے سے وہ عجیب شکست و ریخت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ذہن میں شدید جھکڑ رواں تھے۔ اس کا شخصی پندار بُری طرح مجروح ہوا تھا۔ وہ اوائل عمری سے ہی نہایت خود پسند اور انا پرست شخص تھا۔ اسے اپنی ذات سے زیادہ کچھ بھی عزیز نہیں تھا۔ وجاہت اور خوبروئی پر مان خود پسندی کی حدود سے بھی

تجاوز کر چکا تھا۔ اس نرگسیت کو لگنے والی یہ ٹھیس سنبھالنا اس کے لیے شدید مشکل ہو رہا تھا۔

''تو تم ان ویڈیوز کی بیس پر مجھے رسٹی کیٹ کر رہی ہو؟'' اس نے نہایت بدتمیزی سے شائلہ کو مخاطب کیا۔

شائلہ سرد نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی گویا ایسی ہی بدگوئی کی توقع ہو۔ زوہیب نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میز پر رکھا پیپر ویٹ اٹھایا اور موبائل فون پر مارتے ہوئے کرچی کرچی کر دیا۔ شائلہ کے چہرے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری اور وہ درشتی سے کہنے لگی۔

''یہ ویڈیو اور ان کے علاوہ کئی تصاویر اس وقت کالج کے آدھے اسٹوڈنٹس اور والدین تک پہنچ چکی ہیں۔ انٹرنیٹ پر وائرل ہو چکی ہیں۔ کس کس کا موبائل توڑو گے تم؟ آئی ڈونٹ نو! یہ کام کس نے کیا ہے؟ اس کا طریقہ غلط سہی لیکن تھینک گاڈ! ہمارے کالج کو تم جیسے 'کینسر' سے نجات مل گئی۔''

زوہیب کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔

''اسٹوڈنٹس..... وائرل..... پیرنٹس..... وائرل..... کینسر..... وائرل.....'' اس کے ذہن پر ہتھوڑا زنی ہونے لگی۔

''کیا ہو گیا ہے یہ؟ کون ہو سکتا ہے اس کے پیچھے؟ اُف..... بدنامی..... وائرل..... وائرل..... وائرل.....'' ہتھوڑا زنی شدید تر ہو گئی۔

''یو مے گو ناؤ!'' شائلہ نے رُکھائی سے کہا اور ایک نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالے توقف سے کہنے لگی۔ ''گیٹ لاسٹ!''

زوہیب کا وجود شل ہو گیا۔ اعصاب کسی بھی قسم کی حرکت سے انکاری تھے۔

''وائرل..... وائرل..... وائرل.....'' الفاظ کی ہتھوڑا زنی جاری تھی۔

اس نے بدقت خود کو اٹھایا اور گھسٹتا ہوا باہر چلا آیا۔ اردگرد دکھائی دینے والے طلبہ و طالبات کی نگاہوں.... سے جھلکنے والی نفرت اسے مزید شکستگی میں مبتلا کرنے لگی۔ اسے اس نفرت سے شدید گھٹن اور وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ ان نگاہوں میں تو ہمیشہ عزت، محبت، ستائش اور عقیدت ہوتی تھی۔ یہ نفرت کیسے در آئی؟ اس نے تو اپنا تاثر ہمیشہ مثبت قائم رکھا تھا۔ اپنے قدبت میں کہیں کوئی کمی نہیں آنے دی تھی۔ تو آج وہ خود کو ایک 'بونا' کیوں محسوس کر رہا تھا؟ اس کے بدن پر ہر ایک مسام میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اس لرزش اور لڑکھڑاہٹ پر قابو پاتے وہ کالج کے مرکزی دروازے سے باہر آ گیا جہاں اس کے اعصاب کے لیے ایک اور قیامت منتظر تھی۔

☆☆☆

شانزہ اپنے بستر پر سر نہوڑائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں شدتِ گریہ سے متورم تھیں۔ چہرہ نچڑا ہوا اور بال منتشر تھے۔ اس کی نگاہیں خلا میں ساکت تھیں۔ وہ زوہیب کی روانگی کے بعد سے ہی ایسی حالت میں یہاں بیٹھی تھی۔ سوچیں اور خیالات کسی واہمے کی طرح اس پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ زوہیب کی نفسیاتی و اخلاقی کجی اور روش مکمل طور پر عیاں ہونے کے بعد اس کے ہمراہ رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن گھر سے جاتی تو بھی کہاں؟ والدین کو کس طرح قائل کرتی کہ وہ زوہیب سے کسی سابقہ محبت کی یاد میں علیحدگی نہیں چاہتی بلکہ اس جیسے شخص کے ساتھ گزارا کسی بھی صورت ممکن نہ تھا۔

اِن خیالات میں اُلجھی شانزہ کو دروازہ دھاڑ سے کھلنے کی آواز نے چونکایا۔ اس انداز اور زوہیب کی آمد نے اسے حیرت زدہ تو کیا تاہم اصل سکتہ تو زوہیب کی حالت دیکھ کر ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال کسی تیز دھار آلے سے بہت اجڈ طریقے سے ایسے کاٹے گئے تھے گویا جھاڑیوں کا ڈھیر لگا ہو۔ بھویں سرے سے ہی غائب تھیں۔ چہرے پر بھی چند ایک زخموں کے نشانات بہت بھیانک تاثر دے رہے تھے۔ زوہیب اس کے بال مٹھی میں دبوچتے ہوئے کہنے لگا۔

''کون تھا وہ؟ بتا دے مجھے کون تھا وہ؟''

''کون؟ کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟ اور یہ ہوا کیا ہے؟'' شانزہ نے کراہتے ہوئے کہا۔

''مکر کرتی ہے مجھ سے حرامزادی! مکر کرتی ہے۔ میری پیٹھ پیچھے کس کتے کے بچے کو یہاں بلاتی ہے؟'' وہ چلّایا۔ ''کس نے کیمرا لگایا یہاں؟ کس نے میری ویڈیوز وائرل کی ہیں؟ حرامزادی! تو نے اور تیرے یار نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔''

''اپنے جیسا سمجھ رکھا ہے مجھے کیا؟'' شانزہ نے بھڑک کر جواب دیا۔ اذیت کی شدت سے اب اس کی زبان سے بھی مغلظات برآمد ہونے لگی تھیں۔

زوہیب کا دماغ بالکل ہی الٹ گیا۔ کشمکش اور جنون میں اس نے شانزہ کو گھونسوں کی زد پر رکھ لیا۔ شانزہ نے بھی جوابی طور پر اپنے ناخنوں سے اس کے چہرے پر نقش و نگار بنا دیے۔ اس کی زبان سے بھرپور مغلظات برآمد ہونے لگیں۔

pklibrary.com

ان مغالطات میں وہ زوہیب کی ولدیت پر شکوک کے علاوہ رابعہ کے کردار کو بھی مختلف مردوں سے منسوب کرنے لگی۔

''بکواس بند کر حرامزادی! خبردار میری ماں کے متعلق ایک بھی لفظ زبان سے نکالا۔'' زوہیب نے اس کی گردن دبوچ لی۔

شانزہ کے لیے سانس لینا دشوار ہونے لگا۔ اس نے اضطراری طور پر ہاتھ پاؤں مارے تو اگلے ہی لمحے پھل کاٹنے والی چھری گرفت میں آگئی۔ شانزہ نے بھرپور قوت سے وہ چھری زوہیب کی گردن میں گھونپ دی۔ زوہیب کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ شانزہ نے تین بار مختلف مقامات پر وحشیانہ انداز میں یہ عمل دہرایا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا۔ لہو اُگلتے زخم بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ شانزہ بھی سراسیمگی سے خود سے سرزد ہو جانے والا یہ فعل دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر وحشت برسنے لگی تھی۔ بستر لہو سے رنگین ہوتے دیکھ کر وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی۔ اسی لمحے ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ اس نے چند اشیاء اٹھائیں اور کمرے کا دروازہ مقفل کر کے باہر نکل گئی۔ وہ اپنی منزل سے قطعی لاعلم تھی۔

☆☆☆

حمزہ اپنی بائیک پر قبرستان کی جانب گامزن تھا۔ اس کے چہرے پر پتھریلی سختی تھی۔ اس نے قبرستان کے مرکزی دروازے پر بائیک روکی ہی تھی کہ جیب میں مخصوص ارتعاش نے ٹھٹکا دیا۔ اس نے موبائل فون نکالا تو دوسری سمت شانزہ کی بے وقت کال نے چونکا دیا۔

''اس وقت کال کر رہی ہے یہ۔ لگتا ہے کچھ ہوا ہے۔'' اس کے ذہن میں سوچ اُبھری۔

اس اثنا میں کال اختتام پذیر ہو چکی تھی۔ اگلے ہی لمحہ فون نے ایک بار پھر گنگنانا شروع کر دیا۔ حمزہ نے محظوظ نگاہوں سے اسکرین پر دوبارہ نگاہ ڈالی۔ دوسری جانب شانزہ... ہی تھی۔ کال کے اختتام پذیر ہونے تک حمزہ اسی ساکت انداز میں اسکرین کو دیکھتا رہا تھا۔ تیسری کال بھی فوری طور پر موصول ہوگئی۔ حمزہ کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''لگتا ہے کوئی 'ڈاڈھی' ہی مصیبت آن پڑی ہے بے چاری پر۔'' اس نے فون کی گھنٹی خاموش کی اور اطمینان سے قبرستان کی اندرونی سمت بڑھ گیا۔ اسے ماہم اور گلناز سے ملاقات کر کے اپنی 'کارگزاری' کی خبر بھی تو دینی تھی۔

☆☆☆

زوہیب کے زخموں سے لہو کا اخراج بند ہو کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے دروازہ غیر مقفل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کے بعد وہ کچھ لمحوں تک چلاتے ہوئے مدد کے لیے پکارنے لگا۔ اس کوشش سے زخم کی ٹیسوں میں اضافہ ہوا تو وہ مزید وحشت زدہ ہو گیا۔ لہو اس کی قمیص رنگین کرنے لگا تھا۔ اس نے سراسیمہ ہو کر ڈریسنگ ٹیبل سے ٹشو اٹھائے اور زخم بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو وہ واش روم سے ایک تولیا اٹھا لایا اور گردن سے لپیٹ لیا۔ اس کے ذہن پر کمرے سے باہر نکلنے کی دُھن سوار تھی۔

''ہیلپ..... پلیز ہیلپ می! مجھے یہاں سے نکالو کوئی۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

جواب میں سناٹے اور سکوت کے سوا کہیں کوئی ردِعمل نہ تھا۔ اپنی اس بے بسی اور تڑپ میں وہ ایک بنیادی نکتہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ اس وقت اس علاقے کے گھروں میں زیادہ تر خواتین ہی ہوتی ہیں۔ ان میں سے اکثریت خوابِ خرگوش کے مزے لیا کرتی اور باقی ماندہ اپنے ملازمین سے کام کاج کروانے میں مگن ہوتی تھیں۔

اگلے پندرہ منٹ میں لہو کے بلاتعطل اخراج سے نقاہت کے باعث آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا تو وہ گھٹنوں کے بل وہیں زمین بوس ہو گیا۔

''مما! مما جی! کہاں ہیں آپ؟ مجھے بچالیں۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں ابھی جینا چاہتا ہوں۔ اللہ جی! پلیز! میں ابھی جینا چاہتا ہوں۔ اس بار معاف کر دیں۔ سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ آئی پرامس اللہ جی! میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ بس ایک بار معاف کر دیں۔'' وہ بچوں کی طرح بلکنے لگا۔

''زندہ رہ کر بھی کیا کرو گے؟ کسی کو منہ دکھانے لائق تو رہے نہیں ہو۔ زندہ رہ کر بھی کیا کر لو گے؟'' ایک سفاک سوچ نے اسے آئینہ دکھایا۔

''کہیں فارن نکل جاؤں گا۔ کہیں آؤٹ آف سٹی موو کر جاؤں گا۔ نہیں رہوں گا یہاں۔'' اس نے ایک توقف کے بعد خود کو توجیہہ دی۔

''پلے کیا ہے تمہارے جو کہیں فارن نکلو گے؟'' اس بار ایک استہزائیہ سوچ نے کوڑا برسایا تو وہ بلبلا کر رہ گیا۔

وہ ایک احتسابی لمحہ تھا۔ اسے اپنی زندگی بھر کی کوتاہیوں کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ والد کی وفات کے بعد زوہیب کی عمر چار برس تھی۔ رابعہ نے اپنے تئیں اسے ایک بہترین نجی اسکول میں داخل کروایا۔ وہ اسے اعلیٰ تعلیم کے بعد کسی بہترین عہدے پر فائز دیکھنا چاہتی تھیں۔ اسکول

کا عملہ روزِ اول سے ہی اس 'کیوٹ' اور 'اسمارٹ' سے بچے کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ مڈل تک آتے زوہیب ستائش، مدارج اور توجہ کا آخری حد تک عادی ہو گیا تھا۔ میٹرک میں پہنچ کر یہ 'لت' صنفِ نازک کی 'محبوبانہ موجودگی کی طلبگار بن گئی۔ اس ضمن میں رابعہ کے پاس ٹیوشن کے لیے آنے والی لڑکیاں آسان ترین ہدف تھیں۔ اس نے کئی ایک سے 'تعلقات' استوار کیے اور پھر ایک روز رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔

اس لمحے وہ رابعہ کے کسی سخت ردِعمل سے خائف تھا تاہم ان کی جانب سے نرم الفاظ میں سمجھائے جانے پر اسے مزید بلاشیری ملی۔

''آئی ایم سوری مما! آئی پرامس۔ آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' اس نے ندامت کا اظہار کیا۔

رابعہ نے اسے اپنے ساتھ لپٹا کر مزید عہد و پیمان کیے اور اپنے معمولات میں مصروف ہو گئیں۔ اُس روز کے بعد زوہیب نے نہایت احتیاط سے یہ انگز کھیلی۔ اس کے لیے ایک خوش آئند بات یہ بھی تھی کہ رابعہ اس حقیقت سے آگاہ تھیں کہ وہ بے تحاشا محنت کے باوجود ایک 'ایوریج' اسٹوڈنٹ ہی رہے گا۔ اس نے اپنی انہی 'غیر نصابی سرگرمیوں میں 'سی' گریڈ ایم بی اے مکمل کیا اور ملازمت کے حصول کے لیے جوتیاں چٹخانے لگا۔

اگلے ایک برس تک بے روزگاری کا آزار جھیلنے کے بعد جب اس پریشانی میں رابعہ کی طبیعت آئے روز خراب رہنے لگی تو وہ پہلی بار حقیقی پریشانی میں مبتلا ہوا تھا۔

''جب تک کوئی ملازمت نہیں ملتی تم کہیں ٹیچنگ کے لیے اپلائی کیوں نہیں کرتے؟'' اس کے ایک دیرینہ دوست بلال نے مشورہ دیا۔

''واٹ..... ٹیچنگ..... نو وے۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''کیا برائی ہے اس میں۔ ایور گرین پروفیشن ہے۔''

''میں نے ساری زندگی اپنی مدر کو دو، تین، پانچ سو کے لیے لوگوں کی باتیں سنتے دیکھا ہے۔ مجھے یہ پروفیشن بالکل پسند نہیں۔ بہت محنت ہے اس میں اور پرافٹ بالکل نہیں۔'' زوہیب نے بتایا۔

''یہ کس پرانے زمانے کی بات کر رہے ہو؟ اب نیا دور ہے بھائی۔ پرائیویٹ کالجز کی بھرمار نے ٹرینڈ ہی بدل دیا ہے۔ تم جیسے ہینڈسم اور گڈ لکنگ ٹیچرز کو تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ اپلائی کر کے دیکھو۔ کچھ عرصہ لگاؤ وہاں۔ پھر کوئی اور جاب مل جائے تو بے شک چھوڑ دینا۔'' بلال نے سمجھایا۔

زوہیب نے اس کے مشورے اور 'سفارش' پر ایک کالج میں اپلائی کر دیا اور شومئی قسمت اسے ملازمت کا پروانہ مل بھی گیا۔ رابعہ کو یہ خبر ملی تو وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئیں۔

''کیا ہوا؟ آپ خوش نہیں ہوئیں کیا؟'' اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

''پتا نہیں۔ میں اس وقت بہت کنفیوز ہوں۔'' وہ اُلجھ کر بولیں۔

''لیکن کیوں مما جی؟ مجھے تو لگتا تھا کہ آپ بہت خوش ہوں گی۔ میں نے آپ کا ہی پروفیشن سلیکٹ کیا ہے۔'' زوہیب جز بز ہوا۔ ''اگر آپ کو کوئی ایشو ہے تو میں کہیں فارن میں اسٹڈی ویزا ٹرائی کرتا ہوں۔ یہاں رہ کر تو کچھ نہیں مل سکتا۔'' اس نے ماں کی دکھتی رگ دبائی۔

رابعہ اس لمحے دہل کر خاموش ہو گئی تھیں۔ وہ ایک طرف اکلوتے بیٹے کی اس متوقع دوری پر متوحش تھیں تو دوسری جانب اسے یہ سمجھانے سے قاصر تھیں کہ یہ پیشہ نہایت نازک ہے۔ سنجیدگی اور احساس ذمے داری اس کی اولین شرط ہے اور زوہیب میں یہ دونوں عناصر ہی ناپید تھے۔ اس پر مستزاد بھوزا صفتی کو وہاں مزید جلا ملتی۔

''فارن نہیں جاؤ گے تم! کسی بھی صورت نہیں۔ بس ایک پرامس کرو مجھ سے! اپنے اس پروفیشن میں کبھی حرام کی ملاوٹ نہیں کرو گے۔ اس ذمے داری کو مکمل خلوص سے نبھاؤ گے۔'' وہ سنجیدگی سے بولیں۔ انہیں اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر بخوبی اندازہ تھا کہ اب 'حالات' بہت بدل چکے ہیں۔ درس و تدریس کا معزز اور بااعتماد پیشہ ایک 'مذاق' بن چکا تھا۔ والدین نے بچوں کو ضرورت سے زیادہ 'نازک مزاج' بنا رکھا تھا۔ رابعہ کو کئی بار ایسا محسوس ہوتا کہ موجودہ دور میں والدین نے بچوں کی پسند، ناپسند کو اس قدر ہوا بنا لیا ہے گویا وہ ان کے والدین اور یہ ان کی اولاد ہوں۔ اس نازک مزاجی میں اساتذہ کی ازلی حیثیت و دبدبہ تو کہیں ماند ہی پڑ گیا تھا۔ دوسری جانب اب اساتذہ خود بھی اپنا اصل مقام و مرتبہ فراموش کر کے مادّی فوائد کے پھیر میں پڑ چکے تھے۔ عجب انتشار کا عالم تھا۔ غضب کی بے پرواہیاں اور مجرمانہ غفلتیں تھیں۔

والدہ کے خیالات سے بے خبر زوہیب نے فوراً عہد کر لیا۔ ملازمت کا آغاز ہوا تو اسے حقیقی معنوں میں اپنی 'افتاد' کا احساس ہوا۔ اس کالج میں پڑھنے والے طلبہ و طالبات کی

pklibrary.com

اکثریت 'ایوریج' ذہانت کی حامل تھی۔ بیس فیصد اعلیٰ ذہانت کے حامل تھے۔ انتظامیہ ان دونوں فریقین کو یکساں طور پر اپنا ذریعۂ کاروبار بنائے ہوئے تھی۔ زوہیب کی خوبروئی اور سحر انگیز شخصیت نے کالج بھر میں 'دھوم' مچادی تھی۔ صنفِ نازک کی اکثریت اس کی 'توجہ' کے لیے بے تاب دکھائی دینے لگی۔ یہ وہ مخصوص 'طبقہ' تھا جسے پڑھائی لکھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ تربیت سے کوسوں دور یہ لڑکیاں صرف والدین کی تمنائیں پوری کرنے کے لیے پڑھائی کا 'طوق' گلے میں ڈالے ہوئے تھیں۔ اور پھر بہت جلد وہ وقت بھی چلا آیا جب زوہیب کو احساس ہوا کہ اس کی زندگی ایک دوراہے پر تھی۔

ابتدائی مشکلات کے بعد اس نے بہت جلد حالات کو اپنے تابع کرلیا اور بہت جلد کالج کا ہر دلعزیز ٹیچر بن گیا۔ یہ اس کی اضافی ذہانت ہی تھی جس کے باعث اس نے درجنوں لڑکیوں سے بیک وقت تعلقات استوار کیے اور کسی کو شبہ بھی نہ ہونے دیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ یہ سبھی طالبات ایسے مخصوص طبقے سے تعلق رکھتی ہیں جنہیں استاد کی عزت سے کبھی آشنا ہی نہیں کروایا گیا۔ اس طبقے کے لیے استاد صرف ایک تنخواہ دار ملازم تھا۔ ان کے والدین نے اپنے 'لاڈ پیار' میں اولاد کو اساتذہ کا اصل مقام باور ہی نہیں کروایا۔ یہ طبقہ کسی نہ کسی طور نفس کا پجاری تھا۔ انہیں ہر چمکتی چیز سونا دکھائی دیتی اور وہ اس چمک سے بے تاب ہو کر اس کے حصول کے لیے مچلنے لگتیں۔ زوہیب نے ان لڑکیوں کا بھرپور جذباتی استحصال کیا۔ وہ اس کی باتوں کے جال میں ایسا پھنستیں کہ تحائف، نوازشات، جسمانی قرب کے علاوہ موٹی رقوم 'ادھار' دے دینے میں بھی کوئی مضائقہ تو کیا اپنے لیے فخر ہی سمجھتیں۔ عمیر کی کمزوری دیرے زیرے خوابیدگی میں تبدیل ہوگئی۔ رابعہ بیٹے کی زندگی میں در آنے والی اس تبدیلی سے بے خبر نہیں تھیں۔ انہوں نے اس کی اصلاح کے لیے روایتی راہ اپناتے ہوئے پہلے ثنا اور پھر شانزہ سے شادی کروادی لیکن اس کی سرگرمیوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ گردن تک اس دلدل میں دھنس چکا تھا اور آج یہ دلدل اسے نگلنے کے لیے بے تاب تھی۔

''اللہ جی! پلیز! ایک چانس دے دیں۔ میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ کبھی کہیں خیانت نہیں کروں گا۔'' وہ نقاہت سے ڈوبتے ذہن کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

اس لمحے سے رابعہ سے کی گئی عہد شکنی پر سخت ملال ہو رہا تھا۔ کاش وقت کا پہیا واپس مڑ سکتا۔ وہ اس عہد کو پورا کیے پیشہ وارانہ فرائض نبھالیتا۔ پھر کوئی بوجھ اور ملال اس کے سر نہ ہوتا۔

''اس سادگی پر کون نہ مرجائے اے خدا!'' اسے اپنی سماعت میں ایک مانوس آواز محسوس ہوئی تو بے طرح بدک گیا۔

اسی پل ماہم کی موجودگی کے احساس نے وحشت مہمیز تر کردی۔

''تم اس سے بھی بدتر انجام کے مستحق تھے۔ تمہیں مر کے بھی کہیں چین نہ ملے گا۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''نہیں! پلیز نہیں! اس سب میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔'' زوہیب تڑپ کر کہنے لگا۔

''ہاں! قصور میرا تھا۔ سراسر میرا ہی تھا۔ تم تو دودھ کے دُھلے تھے۔'' ماہم نے مزید نفرت دکھائی۔

''معاف کر دو مجھے۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔'' زوہیب نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ نقاہت اس قدر غالب آچکی تھی کہ سر بے طرح چکرا رہا تھا۔ بدن میں ٹھنڈک بھری سنسناہٹ کسی نئی 'مسافت' کا عندیہ دے رہی تھی۔ اسے یہ مسافت اختیار نہیں کرنی تھی۔ اسے ابھی مزید جینا تھا۔

نقاہت اور ٹھنڈک یکساں تناسب سے بڑھتی جارہی تھی۔ حواس پر تاریکی غالب آنے لگی تھی۔ اس نے ماہم کے سامنے ایک بار پھر ہاتھ جوڑنے چاہے لیکن اعضا نے حرکت سے انکار کردیا۔ سینے پر گویا کوئی بھاری سل دھر آئی۔ زوہیب نے بھرپور قوت لگا کر سانس لینے کی کوشش کی۔ اس کا منہ ابھی وا ہوا ہی تھا کہ بدن کو ایک جھٹکا لگا اور تاریکی نے ہر احساس ڈھانپ لیا۔ خوبرو، ساحر اور ہر دلعزیز زوہیب امجد کا شاندار وجود بے جان ہو کر ایک جانب ڈھلک گیا۔

☆☆☆

گلناز اور ماہم کی قبریں اس بار قدرے بہتر حالت میں تھیں۔ گورکن کو ہر ماہ دی جانے والی رقم کا نتیجہ کافی مثبت تھا۔ حمزہ نے ان دونوں کی قبر پر باری باری فاتحہ خوانی کی اور اپنے ہمراہ لائی پانی کی بوتل سے ایک جانب خصوصی طور پر رکھے گئے مٹی کے کٹورے بھر دیے۔ اس کے بعد حشرات و پرندوں کے لیے مخصوص خوراک بکھیرنے کے بعد وہیں رکھی ایک اینٹ پر بیٹھ گیا۔ آنسو کسی آبشار کے مانند آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

''کاش! ماہم کاش تم نے مجھے ہی کچھ بتا دیا ہوتا۔ ہم

اس مسئلے کو مل کر حل کر لیتے۔ ایک بار مجھ پر اعتبار تو کیا ہوتا۔'' اس نے بہن کے کتبے پر دیکھتے قبر کی مٹی پر ہاتھ پھیرا۔ ذہن ایک بار پھر سائرہ کے کیے گئے انکشافات کی جانب مبذول ہو گیا۔

''آر یو شیور! وہ زوہیب ہی تھا؟'' اس نے سائرہ سے دریافت کیا تھا۔

''یس شیور! مجھ سے ماہم کی کیا بات چھپی ہوئی تھی بھلا؟'' سائرہ نے جواب دیا تھا۔

اس کے بعد حمزہ کے شدید اصرار پر وہ مکمل سچائی آشکار کرتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔

''ماہم ناز و نعم میں پلی بڑھی تھی۔ اس نے بچپن سے ہی ذہانت کے جھنڈے گاڑے تھے۔ کوایجوکیشن میں پڑھنے کے باعث کسی لڑکے سے شناسائی اس کے لیے نئی بات یا کوئی ہوا ہرگز نہیں تھی۔''

''اگر ایسا تھا تو پھر وہ زوہیب کی طرف کیسے مائل ہو گئی؟ اسے اچھی طرح پتا تھا کہ ماما کی رابعہ آنٹی سے بالکل نہیں بنتی۔'' حمزہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''سچ کہوں حمزہ! ہم لڑکیاں بہت عجیب ہوتی ہیں۔ ہماری فطرت شاید خود ہمارے لیے بھی ناقابلِ فہم ہوتی ہے۔ کبھی تو کسی پہاڑ سے ٹکرا کر اپنا وجود قائم رکھتی ہیں اور کبھی کسی ریت کی دیوار کے سامنے ڈھے جاتی ہیں۔ کالج کا ماحول تمہارے سامنے ہی ہے۔ زوہیب ہر ایک کے لیے 'ہاٹ کیک' تھا۔ لڑکیاں اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بے تاب رہتی تھیں۔ ہزار ہا جتن کرتی تھیں۔ ایسے میں وہ ماہم کی ذہانت کے باعث خود اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کے ایگزامز رزلٹ کی دل کھول کر تعریف کرتا تو دیگر لڑکیاں جل کر خاک ہو جاتیں۔ ماہم کو اس کھیل میں مزہ آنے لگا۔ وہ پڑھائی میں مزید محنت کرنے لگی۔ زوہیب کے علاوہ دوسرے ٹیچرز بھی اس کی ذہانت کے گن گاتے۔ ماہم کا نام ہر ایک کے لیے حسد کی ایک علامت بن گیا تھا۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

''پھر؟ پھر کیا ہوا تھا؟ ایسا کیا ہوا تھا کہ ماہم کو اتنا بڑا قدم اٹھانا پڑا؟'' حمزہ چیخ گیا۔

''بہک گئی تھی۔ کسی بھی لڑکی کے لیے نامحرم کی ستائش بہت جان لیوا نشہ ہوتی ہے۔ وہ بھی بہک گئی تھی۔ اسے زوہیب کی توجہ و ستائش کی لت لگ گئی تھی۔ ہر لڑکی کی طرح اسے بھی یہی گمان تھا کہ زوہیب دلی طور پر صرف اسی کی جانب مائل ہے۔ میں نے کہا نا حمزہ! ہم لڑکیاں بہت عجیب ہوتی ہیں۔ ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہماری تعریف کرنے والے مقابل کو ہماری ذات میں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے بعد ہم از خود یہ فرض کر لیتی ہیں کہ اسے ہم سے محبت ہو گئی ہے۔ اس کے بعد ہماری عقلمندی یہیں تک محدود نہیں رہتی۔ ہم مقابل کے لیے اپنا خلوص و محبت ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔'' اس نے آزردگی سے بتایا۔

''ماہم نے کیا کیا تھا زوہیب کے لیے؟'' حمزہ کا تنفس غیر متوازن ہوا۔

''بہت کچھ۔ مجھے تو بعد میں علم ہوا کہ وہ اپنی پاکٹ منی سے گفٹس دیتی۔ ٹاپکس سمجھنے کے بہانے ویڈیو کالز کرتی۔ وہ اس محبت میں سرتاپا ڈوب چکی تھی۔''

''تم نے اسے منع کیوں نہیں کیا؟ سمجھایا کیوں نہیں اسے کبھی؟'' وہ چیخا۔

''کوئی لڑکی جب کسی لڑکے کی ذات میں انوالو ہوتی ہے نا حمزہ! تو اسے اپنا وجود عقل کل لگنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے اس کی زندگی میں آنے والا یہ شخص بالکل مختلف ہے کیونکہ اسے اس لڑکی سے محبت ہوئی ہے۔ وہ اس کے ساتھ فیئر ہے اور کبھی اسے چیٹ نہیں کرے گا۔''

''تم لڑکیاں ایک چھوٹی سی بات بھول جاتی ہو کہ مرد دریافت کا پرندہ ہے۔ وہ کسی کو بھی ایک بار تسخیر کرنے کے بعد بہت جلد اس سے بیزار بھی ہو جاتا ہے۔'' حمزہ تلخ ہوا۔

سائرہ گہری سانس بھر کے رہ گئی اور ایک توقف سے کہنے لگی۔

''ماہم اپنی زندگی میں بہت خوش تھی۔ اُس کے پاس ذہانت، توجہ اور ایک من پسند مرد کی بھرپور محبت تھی۔ وہ ہر لمحہ ہواؤں میں اُڑا کرتی۔ پھر وہ یکدم کاج سے پھٹیاں کرنے لگی۔''

''ہاں! ان دنوں اسے شدید بخار ہو گیا تھا۔'' حمزہ کو بھی یاد آیا۔

''وہ بخار دراصل اسٹریس کی وجہ سے ہی تھا۔'' سائرہ نے ہونٹ بھینچے۔

''کیسا اسٹریس؟'' حمزہ مضطرب ہوا۔

سائرہ مکمل طور پر ان لمحات میں کھو گئی جب ماہم اس کے سامنے بلکتے ہوئے اپنی پریشانی کا اظہار کر رہی تھی۔

''مجھے کئی روز سے اَن نون نمبرز سے کالز آ رہی تھیں۔ میں اگنور کرتی رہی۔ پھر مجھے واٹس ایپ پر پکچرز ریسیو ہونے لگیں۔''

pklibrary.com

''کیسی پکچرز؟'' سائرہ چونکی۔

''مت پوچھ سائرہ! کچھ مت پوچھ۔ کسی نے میری پکچرز کو ایڈٹ کر کے بہت غلط انداز میں.....'' وہ سسکیوں میں بات مکمل نہ کر سکی۔

''لیکن تو نے وہ سینڈ کسے کی تھیں؟'' سائرہ نے اسے جھنجوڑا۔

''زیبی کو۔ ان کا موبائل فون کسی نے گن پوائنٹ پر لیا تھا نا۔ یہ سارا سلسلہ اسی کے بعد شروع ہوا ہے۔'' ماہم نے بے بسی سے بتایا۔ سائرہ اس انکشاف پر سر پیٹ کر رہ گئی۔

''کیوں سینڈ کرتی رہیں تم؟ کیا ہو گیا تھا تمہیں آخر؟''

''پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے؟ وہ کہتے تھے کہ دیکھ کر ڈیلیٹ کر دوں گا۔ مجھے اُن پر اعتماد تھا کہ وہ ڈیلیٹ کر دیتے ہوں گے۔ پھر کچھ ویڈیو کالز کے شانس.....''

''یا اللہ! یہ تو نے کیا کر دیا ماہی؟'' سائرہ نے اضطراب سے ہاتھ ملے۔

''میں نے تو کچھ نہیں کیا سائرہ! میں نے تو بس محبت کی تھی۔ مجھے کیا علم تھا کہ یہ سب ہو جائے گا۔ زوہیب کے موبائل سے ڈیٹا اور نمبر لے کر کوئی مجھے بلیک میل کرنے لگے گا کہ میری تصویریں وائرل کر دیں گے۔'' وہ بلکنے لگی۔

''تم ایک بار زوہیب سے بات کرو۔ وہ ایف آئی اے میں رپورٹ کریں۔'' سائرہ نے تجویز دی۔

''زوہیب تو ایسے بے دید ہوئے ہیں گویا مجھے جانتے ہی نہیں۔ میں نے انہیں محبت کا واسطہ دیا تو پتا ہے کیا کہا؟''

سائرہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں نے کبھی تم سے کوئی کمٹمنٹ نہیں کی۔ تم اپنی مرضی سے مجھے پکچرز بھیجتی تھیں۔ میرا اب اس معاملے میں کوئی کنسرن نہیں ہے۔ یہ تمہاری پرابلم ہے اسے خود ہی سولو کرو۔ یہاں تک کہہ دیا کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے وہ پکچرز ان کے موبائل سے لیک ہوئی ہیں۔ خدا جانے میں نے کس کس کو مزید بھیج رکھی ہوں گی۔ کوایجوکیشن میں پڑھنے والی لڑکی ہوں تو کسی ایک لڑکے سے تھوڑا [illegible] بات کرتی ہوں گی۔ اس کے آنسو بے قابو ہو چکے تھے۔

''مائی گڈنیس! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ.....''

ماہم کے اس انکشاف پر سائرہ ششدر رہ گئی۔

''میرا فون اٹھاتے ہیں نہ ہی ٹیکسٹ کا جواب دیتے ہیں۔ بلاک کر دیا ہے انہوں نے مجھے۔ گھر بھی گئی تھی اُن کے لیکن رابعہ آنٹی نے ملنے ہی نہیں دیا۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''حمزہ سے بات کرو۔ کسی پر تو اعتماد کرنا پڑے گا ماہی! ورنہ بلیک میلنگ کا یہ سلسلہ کبھی نہیں رکے گا۔'' سائرہ نے ایک اور راہ سجھائی۔

ماہم بالکل خاموش ہو گئی۔

اس کا وجود کسی خلا میں معلق تھا۔ اطراف پر دُھند طاری تھی۔ قلب و روح پر اس قدر تناؤ تھا کہ اعصاب منجمد ہو چکے تھے۔ ایسی کیفیت کا تو زندگی میں تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن یہی زندگی ہے۔ یہ از خود ایسے حالات بنا دیتی ہے کہ انسان ایسے ہی کسی خلا میں معلق ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس نے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کر کے اعصاب پر قابو پانے کا آغاز کیا۔ دھیرے دھیرے اس کوشش میں کامیابی ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد اعصاب قابو میں آئے تو حواس قدرے بحال محسوس ہونے لگے۔ اب اطراف کی دُھند چھٹنے لگی تھی۔

اس لمحے دل میں خوش فہمی پیدا ہوئی کہ حالات میں بہتری در آئے گی۔ مسائل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ زندگی ایک بار پھر سابقہ ڈگر پر لوٹ آئے گی۔ وہی خوشگوار ڈگر جب ہر سُو خوشیاں رقصاں تھیں، خوشبو گنگناتی تھی اور ہواؤں میں موسیقیت کا غلبہ تھا۔ ہر ایک شے کس قدر نکھری ہوئی، اجلی اور پُرسکون تھی۔ اس کے وجود میں ایک پل کے لیے وہ سب کچھ دوبارہ اپنی دسترس میں لینے کا عزم مچلنے لگا لیکن پھر فضا میں یکدم تبدیلی در آئی۔

اپنے اعصاب پر قابو پا کر حواس بحال کرتے ہی اسے دوراہیں دکھائی دینے لگیں۔ پہلی راہ میں شدید تاریکی تھی۔ گھپ اندھیرا ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دے رہا تھا۔ دوسری راہ پر نکھرا اجالا تھا۔ خوش کن بہار کی مہک تھی۔ تتلیاں اڑتی ہوئی ہر سو رنگ بکھیر رہی تھیں۔ دور کہیں سُریلے نغموں کی گنگناہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن یہ کیا؟

یہ کیسا تضاد تھا؟

تاریکی میں [illegible] گھٹن کا شائبہ نہ تھا۔ وہاں ایک پُرسکون سا آرام کیوں محسوس ہو رہا تھا؟ ایسا آرام جو کسی سحر کی طرح اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس نے دوسری جانب نگاہ دوڑائی۔ نکھرے اجالے، خوش کن بہار کی مہک، رقصاں تتلیوں اور سُریلے نغموں کی گنگناہٹ میں ایک عجیب خاردار چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ گھٹن ایسی کہ وجود میں وحشت برپا ہونے لگی۔ سرتاپا انگاروں کی سی سوختگی الگ تھی۔ حمزہ اور والدین کو حقیقت بتا دینے سے ان کی نظروں میں آنے والی نفرت کیسے برداشت ہو گی؟ کالج میں سب میری ایسی ہی کسی

بدنامی کے منتظر ہوں گے۔ کیسے فیس کروں گی سب کو؟

''نہیں!'' اس کے وجود میں مزاحمت کی ایک بلند و بالا لہر اٹھی۔ ''مجھے اس راہ پر نہیں چلنا۔ یہاں بہت گھٹن ہے، بہت تپش ہے۔ مجھے اس اندھیرے میں ہی سکون ملے گا۔ مجھے سکون چاہیے۔ مجھے بس سکون چاہیے۔ سکون تو بس اسی اندھیرے میں ہے۔ مجھے یہیں جانا چاہیے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں قدم رکھتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

یہ فیصلہ کرتے ہی اُسے اپنا وجود ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ اس نے تاریکی کی جانب قدم بڑھا دیے۔ دو درجن سے زائد نیند آور گولیاں پھانک کر وہ اپنے تئیں اہلِ خانہ کو ہر رسوائی و بدنامی سے نجات دلا گئی تھی۔

حمزہ کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو رواں ہو گئے۔ اس نے دونوں قبروں سے مٹی اٹھا کر ایک نئے رومال میں باندھ لی۔ اس کے ذہن میں ایک نیا 'خیال' در آیا تھا۔ وہ گھر جا کر اس بارے میں آرام و سکون سے سوچ بچار کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

شانزہ ایک کونے میں دبکی اپنے بدن کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ زوہیب کو زخمی کر کے فرار ہونے کے بعد وہ غیر ارادی طور پر ہی یہاں چلی آئی تھی۔ اس کا ذہن ماؤف اور وجود شل تھا۔ اپنی زندگی میں آنے والا یہ نیا موڑ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ خدشات اور واہمے ہنوز دل لرزا رہے تھے کہ زوہیب ابھی کسی کونے سے برآمد ہو کر اسے دبوچ لے گا۔

''مکر کرتی ہے حرامزادی! مجھ سے مکر کرتی ہے۔ بتا کسے بلایا تھا یہاں؟ کہاں کیمرے لگوائے تھے تو نے؟'' اس کی سماعت میں زوہیب کی آواز گونجی۔

وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ اس کے ذہن میں ماضی قریب کے کچھ پل اچانک ابھر آئے۔

''حمزہ..... اوہ..... تو یہ تم تھے..... تم ہمارے گھر میں زوہیب سے اسٹڈیز میں ہیلپ کے لیے نہیں بلکہ اپنے کسی مقصد کے لیے آتے تھے۔ اُس روز بھی تم میری فکر میں نہیں بلکہ اپنے مطلب کے لیے وہاں آئے تھے۔'' اس کے اعصاب مزید شل اور وجود شکستہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

حمزہ نے قبرستان سے واپسی پر اپنے لیے کھانا لیا اور بوجھل سے انداز میں گھر روانہ ہو گیا۔ کھانے کے اوقات میں یہ پژمردگی اور بوجھل پن یونہی اس پر طاری ہو جایا کرتا تھا۔ گھر کے مرکزی دروازے پر پہنچتے ہی حسبِ سابق تنہائی اور ویرانی نے اس کا استقبال کیا۔

لیکن نہیں! اس روز وہاں کوئی اور بھی اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔

شانزہ..... متورم آنکھوں، زخمی چہرے، کٹے پھٹے ہونٹوں اور منتشر بالوں نے اسے ایک ہولناک روپ دیا ہوا تھا۔ حمزہ کے دل میں تاسف کی ایک لہر اٹھی تاہم دوسرے ہی لمحے ایک اور سوچ اس پر غالب آ گئی۔

''لعنت ہے تم پر حمزہ زبیر! انسانیت کا یہ سبق بھول کیوں نہیں جاتے تم؟ بھول جاؤ سب۔ پہلے ہی اپنا سب کچھ گنوا چکے ہو۔ اب تمہیں اس دنیا سے سب کچھ چھیننا ہے۔ دنیا کو اسی کے سکوں میں ادائیگی کرنی ہے۔'' یہ سوچ آتے ہی اس کی نگاہوں میں نفرت اور بے حسی کے رنگ منعکس ہونے لگے۔

☆☆☆

''یہ کیا ہوا ہے تمہیں؟'' حمزہ نے شانزہ کو دیکھ کر رُکھائی سے دریافت کیا۔

شانزہ تاسف و صدماتی کیفیت میں اُسے دیکھتی رہی۔

''اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟''

حمزہ نے خاموشی سے دروازہ غیر مقفل کیا اور اندر بڑھ گیا۔ شانزہ بھی اس کے عقب میں تھی۔ ٹی وی لاؤنج میں پہنچ کر حمزہ نے کھانے کا لفافہ ایک جانب رکھ دیا۔

''کیوں آئی ہو یہاں؟''

''کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا؟'' شانزہ نے دکھ سے دریافت کیا۔

''میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ بس تمہارے شوہر کو اس کے سکوں میں ادائیگی کی ہے۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

''بہت اعتماد کیا تھا تم پر میں نے۔'' شانزہ کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔

''وہ تمہارا ہیڈک تھا۔'' زوہیب نے ایک بار پھر رُکھائی سے کہا۔

''کیا تم نے ایک بار بھی مجھ سے بے لوث دوستی نہیں کی؟'' شانزہ نے کسی آس کے تحت دریافت کیا۔

''دوستی؟'' وہ ہنسا۔ ''مائنڈ اِٹ شانزہ صاحبہ! میرے پرسنل ویوز میں ایک مرد اور عورت میں صرف 'غرض' اور 'طلب' کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ دوستی، محبت، پیار بس کتابی باتیں ہیں۔ مجھے تمہارے شوہر کو اس کے جرائم کی سزا دینی تھی۔

pklibrary.com

میری یہ غرض مجھے تمہارے پاس لے آئی۔ تمہیں توجہ اور اہمیت کی طلب تھی۔ تم میری طرف کھنچی چلی آئیں۔ اب یہ غرض وطلب ختم ہو گئے ہیں تو کیسا رشتہ؟ تم اپنی راہ لو میں اپنی راہ لیتا ہوں۔''

شانزہ کے دماغ میں لاوا کھولنے لگا۔

''کیا ایک لمحے کے لیے بھی نہیں؟'' اس نے ایک بار پھر دریافت کیا۔

''نہیں! اور تم اس رشتے کو دوستی سمجھتی بھی کیسے رہیں؟ تم تو شوہر سے انتقامی طور پر مجھ سے بات کرتی تھیں۔ کوئی فرق کیا تھا تم دونوں میں؟'' حمزہ نے بدلحاظی سے کہا اور رخ موڑ کر کھانے کا لفافہ اٹھائے باورچی خانے کی جانب بڑھ گیا۔ شانزہ کے دماغ میں کھولتا لاوا بے قابو ہو گیا۔ اسے اپنے وجود پر شدید غصہ آنے لگا تھا۔ اس طیش ونفرت میں اس نے اپنے لباس میں پوشیدہ وہی چھری نکالی اور دبے قدموں حمزہ کے پیچھے چل دی۔ حمزہ اپنے ہی خیالات میں مگن کھانا برتن میں نکال رہا تھا۔ شانزہ نے بائیں ہاتھ سے اس کے بال دبوچے اور دائیں ہاتھ میں تھامی وہ چھری شہ رگ پر پھیر دی۔ حمزہ کے ہاتھوں سے برتن چھناکے کی آواز سے فرش پر جا گرے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ حلق پر رکھے اور تیورا کر زمین بوس ہو گیا۔ اس کے حلق سے بلند ہوتی خرخراہٹ کی صدائیں اور بدن کو لگنے والے جھٹکے ایک ہولناک منظر تھا۔ شانزہ نے وحشت زدہ ہو کر وہ چھری وہیں پھینک دی۔ اس کی نگاہوں میں زوہیب اور حمزہ کی لہو آلود گردنیں گڈمڈ ہونے لگیں۔

''خون..... خون..... خون..... پولیس پکڑ لے گی مجھے۔ میں نے دوسری بار چھری ماری ہے کسی کو۔ اب پولیس مجھے گرفتار کر لے گی۔'' اس نے اپنے چہرے پر زوردار طمانچے مارے اور ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر بیرونی سمت دوڑ لگا دی۔

حمزہ کی گردن سے رستا لہو اب فرش پر نقش ونگار بنانے لگا تھا۔ اس کے ڈوبتے ذہن میں ماہم اور گلناز کی قبروں پر خود سے کیا جانے والا ایک نیا عزم تھا۔ وہ اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد اسی پیشے سے وابستہ ہونا چاہتا تھا جس نے اسے یہ دائمی کسک فراہم کی تھی۔ وہ ان والدین کو جھنجوڑنا چاہتا تھا جو اپنا مقام ومرتبہ فراموش کر کے اولاد کی تربیت سے مجرمانہ حد تک غافل ہو چکے تھے۔ وہ ان اساتذہ کو بھی اپنی غیر ذمے داریوں کا احساس دلانا چاہتا جو مادّی فوائد اور ذاتی تسکین کے لیے اخلاقیات اور پیشہ وارانہ سنجیدگی سے کوسوں دور ہو چکے تھے۔

''اچھا ہی ہوا۔ بہت طویل سفر کرنا پڑتا مجھے۔ پتا نہیں کوئی میرا ساتھ دیتا بھی یا نہیں؟ میں تنہا کیسے سب کچھ کر لیتا؟ اچھا ہی ہوا یہ زندگی بس یہیں تک تھی۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے حالات وروّیوں کا جہنم برداشت کرنا نہیں پڑے گا۔ بہت اچھا ہوا۔''

حمزہ کے ہاتھ پاؤں مرتعش ہوتے اب مڑ چکے تھے۔ بے نور آنکھوں میں تشکر کی ایک واضح جھلک تھی۔

☆☆☆

کالج میں چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ ہر جانب ایک جم غفیر تھا۔ گاڑیوں اور بائیکس کا مخصوص شور بھی فضا کو مرتعش کیے ہوئے تھا۔ یونیفارم میں ملبوس لڑکیاں فائلز اور بیگ اٹھائے نہایت مسرور ومگن انداز میں باہر نکلنے لگیں۔ نین تارا بھی بے نیازی سے اپنی منزل کی جانب رواں تھی۔ اس نے چہرے پر ہلکا سا میک اَپ کر رکھا تھا۔ چال میں مستانہ پن اور آنکھوں میں خمار دیکھ کر اندرونی مسرت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ اس کی سرشاری میں ایک گداگر عورت کی آمد نے خلل پیدا کر دیا۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے اور لباس سخت بدبودار تھا۔ چہرے اور بدن پر میل کی تہیں جمی تھیں۔

''کہاں جا رہی ہے؟'' اس نے کرختگی سے دریافت کیا۔

''تم سے مطلب؟ جاؤ اللہ بھلا کرے۔'' نین تارا نے ٹالا اور قدم آگے بڑھا دیے۔

''کون ہے وہ؟ کس کو سوچتی ہوئی جا رہی ہے واپس؟'' گداگر عورت نے اس کا راستہ پھر روک لیا۔

''اے مائی! دفع ہو جا یہاں سے۔'' نین تارا بھڑک اٹھی۔

''مت چل! اس رستے پر مت چل۔ کچھ نہیں ملتا۔ مرد اور عورت میں صرف غرض اور طلب کا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ تیرا کوئی کلاس فیلو ہے یا ٹیچر؟ کزن ہے یا محلے دار؟ مت کرنا! کسی پر بھی اعتبار نہ کرنا۔ گرداب میں پھنس جائے گی۔ مرد اور عورت کا یہ رشتہ گرداب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ گرداب ایک نہیں بہت سی زندگیاں نگل لیتا ہے۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

نین تارا نے غصے اور اضطراب سے اُسے زور سے دھکا دیا اور تیز قدموں سے چلتی آگے بڑھ گئی۔ اُسے اپنے 'خمار' میں کوئی 'خلل' گوارا نہیں تھا۔

❖❖❖

pklibrary.com

مفید مصیبت

جمال دستی

ہر انسان زندگی میں مشکلات سے دوچار ہوتا ہے... انسان کو لازمی طور پر زندگی گزارنے کے لیے بنیادی لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے... جن کے بغیر زندگی کا تصور ممکن نہیں... انہیں حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ میں خیالات و تصورات کو جنم دینے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے... ایک ایسے ہی مجبور شخص کا ماجرا جو اپنے مثبت اندازِ فکر کے باعث مسلسل دشواریوں کا شکار تھا...

سوچ و زندگی کا دھارا بدل دینے والی مفید مصیبت کا کمال.....

اُس کی آنکھ کھلی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بدن کا سارا خون اس کے دماغ میں بھر گیا ہو۔ باوجود کوشش کے بھی آنکھوں کو کھلے رکھنا ممکن نہیں ہو پا رہا تھا مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے گردوپیش کا جائزہ لینے کا عمل جاری رکھا۔ اسی سعی کے نتیجے میں اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں ایڑیوں اور ٹخنوں میں بھی شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ وہ ایک واہیات صورتِ حال کو سمجھنے کی تگ و دو میں مصروف ہی تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ یہ صوتی تصادم اتنا اذیت ناک تھا کہ وہ سرتاپا لرز کر رہ گیا۔ بے ساختہ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

اگلے ہی لمحے اس نے قدموں کی آواز سنی۔ کوئی کھلے ہوئے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کھلی آنکھوں سے دکھائی دینے والے منظر نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اپنے سامنے ایک شخص کو الٹا کھڑا دیکھا۔ اس کے پاؤں اوپر اور سر نیچے تھا۔ وہ بندہ اپنا چہرہ، اس کے چہرے کے نزدیک لاکر چند لمحات تک بہ غور اسے دیکھتا رہا پھر بہ آواز بلند بولا۔

''اسے ہوش آگیا ہے.....''

وہ جس کسی سے بھی مخاطب تھا، اس نے جب جواب دیا تو اس کی آواز کمرے کے باہر سے آئی تھی۔ ''اسے نیچے اتارو۔ میں باس کو بلاتا ہوں۔'' باہر موجود شخص نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''اب اس سے پوچھ تاچھ کی جاسکتی ہے۔''

باہر والے کی بات سن کر صورتِ حال اس پر واضح ہو گئی۔ وہ اس وقت چھت سے لٹکا ہوا، ہوا میں جھول رہا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں کسی مضبوط رسی کی جکڑ میں تھے اور سر نیچے کی جانب، فرش سے چند فٹ اوپر تھا۔ الٹا لٹکایا جانے کے سبب ہی اسے اپنے جسم کا سارا خون دماغ کے اندر جمع محسوس ہو رہا تھا اور اس کی نگاہ میں آنے والی ہر شے الٹی دکھائی دے رہی تھی۔

بعض حقائق نہایت ہی تلخ اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ ان لمحات میں اس کا پورا بدن کسی پھوڑے کے مانند دکھ رہا تھا۔ اسے یاد آگیا کہ چند لوگوں نے اسے اغوا کر کے اس کمرے تک پہنچایا تھا اور یہاں لاتے ہی اس کی تسلی سے مرمت بھی کر ڈالی تھی۔ اس سے بار بار ایک ہی سوال کیا جا رہا تھا..... اس سوال کے اندر کئی سوالات تھے۔

''تم کون ہو، کس گینگ سے تعلق رکھتے ہو۔ تم نے کس کے کہنے پر ہمارے کام میں ٹانگ اڑائی..... وغیرہ۔''

وہ کوئی مجرم تھا اور نہ ہی کسی گینگ سے اس کا کوئی واسطہ تھا — وہ قسمیں کھا کھا کر اپنی صفائی پیش کرتا رہا لیکن کسی نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ وہ اس کی زبان کھلوانے کے لیے اسے بے دریغ پیٹتے رہے اور اسی تشدد کے دوران میں وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ کب ان ظالموں نے اسے بے ہوشی کی حالت میں چھت سے الٹا لٹکا دیا تھا۔

اب وہ ہوش میں آچکا تھا اور خود کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ اس

pklibrary.com

نے کچھ بھی نہیں کیا تھا، اس کے باوجود بھی وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔

☆☆☆

بے روزگاری کے درد کو صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جس پر کبھی یہ عذاب نازل ہوا ہو۔ وہ پچھلے چند ماہ سے اسی عذاب کے ساتھ شب و روز گزار رہا تھا۔ وہ ان معنوں میں کہ اس کا دن جاب کی تلاش میں ''دفتر..... دفتر'' کھیلتے نکل جاتا تھا اور رات اس سوچ کے ساتھ بسر ہوتی تھی کہ کل کیا ہوگا۔ وہ تعلیم یافتہ تھا اور شادی شدہ بھی۔ اس کی ایک تین سالہ بیٹی تھی۔ رہائش اپنی نہیں تھی، اس لیے بھی اس کی فکر کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ مالک مکان نے گھر خالی کرنے کا نوٹس دے رکھا تھا۔ وہ اس وقت اپنے کچن کو ''آباد'' رکھنے کی بھی پوزیشن میں نہیں تھا، مکان کا کرایہ ادا کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔

وہ لگ بھگ پانچ ماہ سے فارغ بیٹھا تھا۔ محاورتاً ''بیٹھا ہونا'' تو ٹھیک تھا لیکن درحقیقت وہ ان دنوں پہلے سے کہیں زیادہ متحرک تھا۔ وہ کہیں بھی، کسی بھی قسم کی جاب حاصل کرنے کے لیے مسلسل ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ شاید ہی شہر کا کوئی ایسا آفس یا ایسی فرم ہو جہاں اس نے اپنی ''سی وی'' نہ دے رکھی۔

''کیا ضروری ہے کہ اسی نوعیت کی نوکری دوبارہ حاصل کی جائے جو پانچ ماہ پہلے تمہارے پاس تھی۔'' ایک رات اس کی بیوی نے کہا۔ ''کرنے کو اور بھی درجنوں کام ہیں۔ تم کہیں اور قسمت آزمائی کیوں نہیں کرتے ہو؟''

''مثلاً؟'' اس نے سوالیہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

''بھئی! سیدھی سی بات ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''تم نے قانون کی تعلیم حاصل کی ہے تو تمہیں، میرے خیال میں اسی شعبے میں کوشش کرنا چاہیے۔''

اس نے ''بی۔اے، ایل ایل بی'' کر رکھا تھا۔ بیوی کی بات سننے کے بعد اس نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وکیل بننے کے بعد میں نے عدالت ہی کا رخ کیا تھا۔ ایک سال تک جوتے گھسنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اس دنیا کے لیے نہیں بنا ہوں۔ اس پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے انسان کو بنیادی اخلاقیات کو پامال کرنا پڑتا ہے۔ وہاں جھوٹ اور ریاکاری، آسیجن سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اگر آپ کے پاس پیسا ہے تو آپ پولیس، وکیل، جج حتیٰ کہ قانون کو بھی خرید سکتے ہیں۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں

pklibrary.com

ہے اسی لیے میں نے اپنے کالے کوٹ کو وارڈ روب کے حوالے کرنے کے بعد ہی نوکری کی تلاش کا کام شروع کیا تھا۔ مجھے ایک کمپنی میں باعزت اور مناسب جاب مل بھی گئی تھی مگر میری بدقسمتی کہ میں وہاں آفس پولیٹکس کا شکار ہو گیا اور وہ نوکری میرے ہاتھ سے نکل گئی۔''

''ایسا نہیں ہے کہ میں قسمت کو نہیں مانتی.....'' اس کی بیوی نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن قسمت کو حرکت میں لانے کے لیے راستہ انسان ہی کو بنانا پڑتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں، انسان کا عمل ہی اس پر نصیب کے دروازے کھولتا ہے۔''

''تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میری کوشش میں کوئی کمی ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''یا یہ کہ میں ایک باعمل شخص نہیں ہوں؟''

''تم میری بات کا غلط مطلب نہ نکالو۔'' بیوی نے صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''میں تو صرف تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ تمہاری تگ و دو کا قبلہ درست نہیں ہے۔''

''آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟'' وہ خفگی بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''بس، یہی کہ.....!'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''تم نے ''ایل ایل بی'' کر رکھا ہے لہٰذا تمہیں وکالت ہی کرنا چاہیے اور..... اس کام کے لیے سب سے زیادہ مناسب جگہ ''عدالت'' ہے!''

''تمہاری اس بات سے تو یہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ میں نے ابھی وکلا، عدالتوں اور انصاف کے حوالے سے تمہیں جو کچھ بھی بتایا ہے، تم اس پر یقین نہیں رکھتی ہو۔'' وہ خاصے کڑوے لہجے میں بولا۔ ''گویا میں نے تمہارے سامنے بکواس کی ہے؟''

''تم میری بات کو سمجھنے کے بجائے اسے غلط رنگ دے رہے ہو۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ ''جھوٹ، بے ایمانی، ریاکاری، بدعنوانی کس شعبے میں نہیں ہے مگر ایڈجسٹ تو کرنا پڑتا ہے نا۔''

''مجھ سے ایڈجسٹ نہیں ہوتا۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''پانچ ماہ پہلے مجھے جس ملازمت سے برخاست کیا گیا، وہاں بھی تو کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ اگر میں سیٹھ کے داماد کے ساتھ ''تعاون'' کرتے ہوئے اپنی آنکھیں ''بند'' رکھتا تو وہ نوکری میرے ہاتھ سے نہ جاتی لیکن اپنے سیٹھ کو دھوکا دینا مجھے گوارا نہیں تھا۔ لہٰذا عدم تعاون کے نتیجے میں سیٹھ کے داماد نے میرے خلاف ایسی سازش بُنی کہ الٹا میں ہی مجرم ٹھہرا.....''

اس کے قطعی انداز نے بیوی کے لبوں پر قفل ڈال دیا۔ اس کی نظر میں، پاکستان میں زندگی کا ایسا کوئی بھی شعبہ نہیں تھا جس میں کم یا زیادہ کرپشن موجود نہ ہو۔ وہ یہی بات اپنے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی سوئی ایک ہی مقام پر اٹک کر رہ گئی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس مصیبت سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

☆☆☆

اس نے قانون کی تعلیم اس لیے حاصل کی تھی کہ مظلوموں اور کمزوروں کو عدالت سے انصاف دلا سکے اور بُرے لوگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت کو بھرپور انداز میں استعمال کر سکے لیکن عملی زندگی میں جب اس کا واسطہ عدالتوں اور وہاں موجود عجیب و غریب نظام سے پڑا تو اسے معلوم ہوا کہ ''انصاف'' کسی ہُما یا سیمرغ ایسا کوئی فرضی اور خیالی پرندہ ہے جو صرف صاحبِ ثروت لوگوں کے ہی قابو میں آتا ہے۔ ان تلخ حقائق نے اُس کا دل کھٹا اور دماغ کڑوا کر دیا تھا۔ ہر سچا آدمی جذباتی بھی ہوتا ہے۔ اس نے بھی جذبات میں آ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ سبزی کا ٹھیلا تو لگا لے گا مگر بہ حیثیت وکیل کام نہیں کرے گا۔ اس کا یہ فیصلہ غلط تھا یا درست، اس پر طویل بحث ہو سکتی تھی لیکن حاصلِ بحث بہرکیف یہی تھا کہ اسے وکالت نہیں کرنا تھی۔

پانچ ماہ پہلے اس کے ہاتھ سے نکل جانے والی نوکری کا تعلق ایک سیٹھیا کمپنی (کوئی بھی ایسی کمپنی جس کا روحِ رواں ایک مطلق العنان سیٹھ ہو جس کا حکم حرفِ آخر سمجھا جاتا ہو) سے تھا۔ وہ اس کمپنی کے اکاؤنٹس وغیرہ دیکھتا تھا۔ سیٹھ جی نے اپنے داماد کو بھی کمپنی میں فٹ کر رکھا تھا۔ داماد جی اپنی فطرت اور مزاج کے لحاظ سے مجرمانہ ذہنیت کا حامل تھا۔ وہ چونکہ اکاؤنٹ کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا لہٰذا بہت جلد اس نے سیٹھ کے داماد کے دو تین گھپلے پکڑ لیے۔

یہ بدعنوانی ایسی کھلی تھی سیٹھ کا داماد اپنے بچاؤ کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایک روز تنہائی میں اس سے ملا اور دوستانہ انداز میں کہا۔

''میں تمہاری پیشہ ورانہ قابلیت کو مان گیا ہوں۔ اگر ہم دوست بن جائیں تو اس میں ہم دونوں ہی کا فائدہ ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب!'' اس نے اُلجھن زدہ انداز میں داماد سیٹھ کی طرف دیکھا۔ ''آپ کو جو بھی کہنا ہے، واضح الفاظ میں کہیں۔''

''ایک بات بتاؤ.....'' سیٹھ کا داماد اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''یہ کمپنی کس کی ہے؟''

''سیٹھ صاحب کی۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں سیٹھ صاحب کا کیا لگتا ہوں؟''

''ان کی بیٹی کا شوہر.....یعنی کہ اُن کا داماد.....!''

''سیٹھ صاحب کی کل کتنی اولادیں ہیں؟''

''صرف ایک بیٹی جو کہ آپ کی بیوی ہے۔''

''اگر سیٹھ صاحب اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں تو یہ کمپنی اور ان کا تمام مال و جائداد میری بیوی کا ہو جائے گا۔'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کیا تمہیں اس میں کوئی شک ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''سیٹھ صاحب کی بیوی کئی سال پہلے فوت ہو گئی تھیں۔ ان کی کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے۔ ان کی اکلوتی بیٹی آپ کی بیوی ہے لہٰذا میرے پاس شک کرنے کا جواز نہیں ہے کہ سیٹھ صاحب کا سب کچھ ان کی بیٹی یعنی آپ کی بیوی ہی کا ہے۔''

''تو پھر یہ پدی سی بات تمہارے بھیجے میں جگہ کیوں نہیں بنا رہی کہ میرا سب کچھ میری بیوی کا اور میری بیوی کا سب کچھ میرا ہے.....؟''

''میں نے اس حقیقت سے کب انکار کیا ہے جناب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن آپ جو بات کر رہے ہیں، وہ سیٹھ صاحب کے مرنے کے بعد کا معاملہ ہے مگر سیٹھ صاحب تو ابھی زندہ ہیں۔ آپ ان سے مانگ کر جو بھی لے لیں یا وہ اپنی مرضی سے آپ کو جو بھی دے دیں، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ جو آپ چپکے چپکے اپنے سُسر صاحب کو چونا لگا رہے ہیں، میں اس پر خاموش تماشائی بنا بیٹھا نہیں رہ سکتا۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟'' وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں مستفسر ہوا۔

''توسرا!'' وہ مؤدب لہجے میں بولا۔ ''میں تو اصول کی بات کر رہا ہوں۔''

''زیادہ اصول پسندی اور وفاداری تمہارے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔'' سیٹھ کے داماد نے تلخ تیز انداز میں کہا۔

وہ قطعی لہجے میں بولا۔ ''مجھے پروا نہیں ہے۔''

''ٹین پرسنٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''آپ رشوت کی پیشکش سے میرا منہ بند کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جناب۔'' اس نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ میں ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' نہیں ہوں۔''

''او.....!'' سیٹھ کے داماد نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تو تمہیں زیادہ کٹ چاہیے؟''

''آپ میرے بارے میں بالکل غلط اندازہ لگا رہے ہیں جناب!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کسی بھی قیمت پر مجھے خرید نہیں سکتے۔ میں ہر حال میں سیٹھ صاحب کا وفادار رہوں گا۔ ہاں البتہ، آپ کی بھلائی کے لیے میں ایک مفید مشورہ دے سکتا ہوں۔''

داماد جی نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیسا مشورہ؟''

''آج پندرہ تاریخ ہے۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''میں ہر ماہ کے اختتام پر کمپنی کا حساب سیٹھ صاحب کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ کے پاس دو ہفتے ہیں۔ آپ نے کُل ملا کر پانچ لاکھ روپے کی جو خرد بُرد کی ہے، وہ اماؤنٹ چپ چاپ لوٹا دیں۔ میں اسے آپ کی پہلی غلطی سمجھ کر بھول جاؤں گا اور اس کے بارے میں سیٹھ صاحب کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں آپ کے ساتھ اس سے زیادہ تعاون نہیں کر سکتا۔''

''اگر میں ایسا نہ کروں تو.....؟'' سیٹھ کے داماد نے نفرت بھری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تو.....آپ کی اس ''تو'' کا درست جواب آنے والا وقت ہی دے گا جناب!'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''پندرہ دن کے بعد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

''میں تمہیں اور آنے والے وقت کو دیکھ لوں گا۔'' سیٹھ صاحب کے داماد نے دانت پیس کر کہا۔ ''تم مجھے بالکل نہیں جانتے ہو۔''

وہ داماد جی کے ان دھمکی دار الفاظ کے جواب میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا لیکن اس نے اپنی زبان بند رکھی اور اس ماہ کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا جب وہ داماد کا اعمال نامہ سیٹھ صاحب کے سامنے رکھنے والا تھا۔

وہ بنیادی طور پر ایک صلح جو اور شریف النفس انسان تھا۔ شریف اور امن پسند انسان کی ہزار خوبیاں ایک طرف مگر اس کی شرافت اور بھولا پن اکثر و بیشتر کسی خرابی سے کم ثابت نہیں ہوتے۔ وہ اس مہینے کے ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا اور داماد جی نے اس کی شریفانہ بے خبری سے فائدہ اٹھا کر اس پر

pklibrary.com

ایک کاری وار کر دیا۔ تین روز بعد ہی وہ اپنے سیٹھ کے سامنے ایک مجرم کے طور پر کھڑا تھا۔ اس پر پانچ لاکھ روپے کے غبن کا الزام تھا۔

میں نے اپنی صفائی میں، سیٹھ کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے اس کے داماد کے گھناؤنے کردار کا تفصیلاً تذکرہ کیا لیکن شاطر داماد نے اس کے خلاف ایسی سازش بُنی تھی کہ وہ خود کو بے گناہ ثابت نہ کر سکا۔ سیٹھ کے داماد نے ساتھ کام کرنے والے دو افراد کو پیسے دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ان افراد کی گواہی نے حقائق پر پردہ ڈال کر اسے غبن کا مجرم ثابت کر دیا۔ یہ تو ایک حقیقت تھی کہ کمپنی کے حسابات میں پانچ لاکھ کا گھپلا ہوا تھا لیکن سیٹھ کے داماد نے اپنے عیار ذہن کا استعمال کر کے اس معاملے کا سارا ملبا اس پر ڈال دیا تھا۔

''شکر ادا کرو کہ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کر رہا۔'' سیٹھ نے غصیلی نظر سے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''پانچ لاکھ کا نقصان تو رہا ایک جانب لیکن تم نے میرے معصوم اور فرشتہ صفت داماد پر جو غلیظ الزام لگایا ہے، میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ آج کے بعد تم کبھی مجھے اپنی منحوس شکل نہیں دکھانا۔''

اسے نوکری کے جانے کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا خود پر لگنے والے غبن کے اس گھناؤنے الزام کا جو اس کے لیے سوہانِ روح بن گیا تھا۔ اس نے قانون کی تعلیم محض اس لیے حاصل کی تھی تاکہ وہ بے بس اور لاچار لوگوں کو انصاف دلا سکے لیکن وقت کی ستم ظریفی کہ وہ خود کو انصاف دلانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

ان بے رحم اور سفاک لمحات میں، وہ خود کو خود پر ایک بوجھ، ایک مصیبت سمجھ رہا تھا.....!

☆☆☆

وہ ایک سچا اور کھرا انسان تھا۔ ایسے صادق القول لوگوں کے دوست بہت کم ہوتے ہیں مگر جو ہوتے ہیں، وہ پھر انہی کی طرح پُراخلاص اور قابلِ بھروسا مانے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک ہمدرد دوست نے اس سے کہا۔

''ہر انسان کی زندگی میں اچھا اور بُرا وقت ضرور آتا ہے۔ آج کل تم جن حالات سے گزر رہے ہو، وہ کافی تکلیف دہ اور تشویشناک ہیں۔ اگرچہ میں بڑے پیمانے پر تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا لیکن ایک مفید مشورہ ضرور دے سکتا ہوں۔''

''تم میری نظر میں ایک صائب الرائے شخص ہو۔''

اس نے اپنے دوست سے کہا۔ ''ایک درست مشورے کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ میں تمہارے مشورے پر ضرور عمل کرنا چاہوں گا۔''

''میں ایک اللہ والے کو جانتا ہوں۔'' اس کے دوست نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم اس بزرگ سے جا کر ملو۔ مجھے یقین ہے، وہ تمہارے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالے گا۔''

''یار! ہمارے ہاں یہ شعبہ حد سے زیادہ بدنام ہو چکا ہے۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔ ''جدھر دیکھو، کوئی نہ کوئی آستانہ کھلا ہوا ہے جہاں پر دنیا کے ہر مسئلے کو گارنٹی کے ساتھ حل کرنے کے دعوے کیے جاتے ہیں۔''

''تم غلط سمجھے میرے دوست!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں ڈھونگی آستانے والوں اور ڈبا پیروں میں سے کسی کی بات نہیں کر رہا۔ یہ درست ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کی طرح روحانیت کے معاملات میں بھی دو نمبر لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی نفسانی خواہشات اور مال و زر کے حصول کی خاطر لوگوں سے دھوکا کرتے ہیں لیکن ابھی بھی کہیں کہیں اصلی اللہ کے دوست موجود ہیں اگرچہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی ہے۔''

دوست نے مذکورہ اللہ والے کی اتنی تعریف کی کہ وہ اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ آئندہ روز وہ اپنے دوست کے ساتھ اس بزرگ کے پاس پہنچ گیا۔

وہ شہر کے صاف ستھرے علاقے میں بنا ہوا ایک دو منزلہ مکان تھا۔ ان صاحب نے اپنے پاس آنے والے افراد سے ملاقات کے لیے ایک کمرا مختص کر رکھا تھا۔ اس نے جب ان بزرگ کو دیکھا تو اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

وہ اپنے ذہن میں یہ تصور لے کر آیا تھا کہ وہ جس ہستی سے ملاقات کرنے جا رہا ہے، وہ کوئی عمر رسیدہ اور باریش شخص ہوگا لیکن جب اس کا سامنا ایک کلین شیو شخص سے ہوا تو اسے حد سے زیادہ حیرت ہوئی۔ اس کی عمر بھی چالیس کے آس پاس تھی۔ وہ پینٹ اور شرٹ میں ملبوس کوئی بینک میں کام کرنے والا نفیس آفیسر لگ رہا تھا۔

اس کے چہرے پر تردد اور تذبذب کے آثار دیکھے تو اس اللہ والے نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ دراصل ہمارے ذہن میں بچپن ہی سے یہ بٹھا دیا گیا ہے کہ دین کے حوالے سے کوئی بھی کام کرنے کے لیے انسان کے چہرے پر داڑھی، سر پر دستار اور بدن پر کوئی زرق برق جُبّہ لازمی ہونا چاہیے۔ ان تمام چیزوں میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن رب تعالیٰ کے ہاں چیزوں سے زیادہ

انسان کی نیت اور عمل کی اہمیت ہے۔ اگر کسی انسان کی نیت صاف اور عمل مثبت ہے تو اللہ ہر حال میں اس کا مددگار ہے۔ یہ مالک کی مرضی ہے کہ وہ اپنے کس بندے سے کون سا کام لے۔ یاد رکھیں کہ رب تعالیٰ نے ایک بندہ بھی بے مصرف اور خواہ مخواہ پیدا نہیں کیا۔ ہر شخص اس کائنات کا ایک ننھا سا پرزہ ہے جس کے بغیر کائنات کا نظام چل نہیں سکتا لہٰذا کبھی کسی کو حقیر اور فضول مت جانو.....!''

وہ اس اللہ والے کی باتیں سن کر بے حد متاثر ہوا اور اسے اپنی داستانِ غم پوری تفصیل کے ساتھ سنا ڈالی۔ ان صاحب نے کامل توجہ کے ساتھ اس کی بپتا سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''دھوبی میلے کپڑے کو دھوتا ہے اور میرا پروردگار صاف کو۔ جو شخص اس معاشرے میں جتنا زیادہ سچا اور کھرا ہوتا ہے، اسے اتنی ہی زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسی آزمائشوں سے گزر کر بندہ اللہ کے قریب ہو جاتا ہے۔''

''حضرت! میں نے تو بچپن سے یہی سنا ہے کہ اللہ، بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے.....!'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''بے شک!'' اس اللہ والے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ اللہ واقعی اپنے ہر بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے لیکن شاید آپ نے میرے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ میں نے عرض کیا تھا..... آزمائشوں سے گزر کر بندہ اللہ کے قریب ہو جاتا ہے یعنی میں نے بندے کے، اپنے معبود کے پاس آنے کی بات کی تھی۔''

''سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے میری درد بھری کہانی تو سن لی۔ اب یہ بھی بتا دیں کہ ایک بندے کو اپنے مالک کا قرب حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ میرے اوپر نازل ہونے والے ان مصائب کا سبب کیا ہے؟ میں کس طرح ان سے نجات حاصل کر سکتا ہوں؟''

''آپ نے ایک سوال کے اندر تین سوالات پوچھ ڈالے ہیں۔'' اس اللہ والے نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''خیر، میں اپنی فہم و فراست کے مطابق، آپ کو جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔''

اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی۔ وہ ہمہ تن گوش اس بزرگ کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس اللہ والے نے کہنا شروع کیا۔

''میں کوئی ستاروں کی چالیں اور ہاتھ کی لکیریں دیکھنے والا نجومی نہیں ہوں کہ آپ کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی کر سکوں۔ جس مالک نے آپ کو اس امتحان میں ڈالا ہے، وہی آپ کو اس سے باہر بھی نکالے گا۔ کب اور کس طرح؟ یہ سب بھی پاک پروردگار ہی جانتا ہے۔ باقی جہاں تک آپ کے مسائل اور اللہ سے نزدیکی کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ.....'' آگے بڑھنے سے قبل انہوں نے لمحاتی خاموشی اختیار کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''انسان کی زندگی میں داخل ہونے والی مشکلات میں سے ننانوے فیصد کا وہ خود بالواسطہ یا بلاواسطہ ذمے دار ہوتا ہے۔ اگر انسان دیانت داری کا استعمال کرتے ہوئے اپنے معاملات کو درست کرے تو وہ مشکل خود بہ خود رخصت ہو جاتی ہے۔ باقی بچے ایک فیصد مسائل اور..... یہ صرف خوش قسمت لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ پاک پروردگار جب اپنے کسی پسندیدہ بندے کے درجات بلند کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے آزمائش کی بھٹی میں ضرور ڈالتا ہے تاکہ وہ اللہ کی اس نعمت کی قدر و قیمت سے روشناس ہو جائے۔ انعام و اکرام کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا ازحد ضروری ہے۔ اب رہ گیا اللہ کے قرب کا معاملہ.....'' انہوں نے ایک بار پھر توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں، اللہ صرف عبادت اور ریاضت سے تو نہیں مل سکتا۔ اس کے قرب کے حصول کے لیے عبادت کے ساتھ ساتھ نیکی اور بھلائی کے کاموں کا تسلسل بھی جاری رہنا چاہیے۔ اللہ کے بندوں کی مدد اور خدمت بھی عین عبادت ہے۔''

''قبلہ! فی زمانہ چھوٹی سے چھوٹی بھلائی کرنے کے لیے بھی پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے۔'' اس نے شاکی لہجے میں کہا۔ ''جہاں زندگی کے لالے پڑے ہوں وہاں انسان کیا خاک نیکی کرے گا۔ انسان کی اپنی جیب خالی ہو تو وہ کیونکر دوسروں کی مدد کر پائے گا؟''

''میں آپ کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتا۔'' اس اللہ والے نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اگر ہر انسان اس وقت کا انتظار کرتا رہے کہ اس کے پاس پیسا آئے گا تو وہ تب نیکی کا کوئی کام کرے گا تو اس ذہنیت کے ساتھ سمجھ لیں کہ دنیا سے نیکی کا وجود ہی ناپید ہو جائے گا۔ نیکی اور بھلائی کا کام کرنے

pklibrary.com

کے لیے پیسے کی نہیں، ہمت اور ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کسی ضعیف یا بیمار انسان کا ہاتھ پکڑ کر سڑک پار کرا دیں تو یہ بھی ایک نیکی ہے۔ اسی طرح پوچھنے والے کو درست راستہ بتانا اور راستے میں پڑا ہوا کوئی کانٹا یا پتھر اس خیال سے ہٹا دینا کہ اس راہ سے گزرنے والوں کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، یہ تمام افعال نیک کام ہیں جن کا بے حساب اجر ملتا ہے۔''

اس اللہ والے کی بصیرت افروز باتوں نے اس کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر کیا تھا۔ وہ دل شکستہ وہاں آیا تھا مگر واپسی میں وہ خاصا پُرامید اور مطمئن تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا برا وقت قریب الختم ہے۔ بہت جلد وہ ان نامساعد حالات سے نکل آئے گا۔

''جب بھی رب تعالیٰ کی جانب سے کوئی آزمائش آئے تو اسے بھی مصیبت نہ جانو.....'' یہ وقتِ رخصت اس جوان بزرگ نے نصیحت کی۔ ''اگر آپ غلطی پر نہیں ہیں تو وہ نام نہاد مصیبت بھی آپ کے لیے فائدہ مند اور نفع بخش ہی ثابت ہو گی۔ صوفیا کے ہاں اسے مفید مصیبت کہا جاتا ہے..... جو نصیب والوں پر ہی نازل ہوتی ہے۔

اس نے ان بزرگ کی نصیحت کو ذہن نشین کرنے کے بعد ان کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلا آیا۔

اگلے ہی روز اسے بغیر پیسوں والی ایک چھوٹی سے نیکی کرنے کا موقع ملا۔ اس اللہ والے کی نصیحت اس کی یادداشت میں تازہ بہ تازہ تھی چنانچہ اس نے وہ موقع ضائع نہ کیا جس کے نتیجے میں اسے اغوا کر کے اس عقوبت خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی لیکن اسے ٹائم کا درست اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس وقت کسی تاریک کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر دبیز پٹی بندھی ہوئی تھی۔ شاید اسی پٹی کی وجہ سے اسے اس کمرے میں ہر طرف اندھیرا ''دکھائی'' دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ اسی کمرے کی چھت سے الٹا لٹکا ہوا، ہوا میں جھول رہا تھا۔ جب وہ حالتِ بے ہوشی سے نکلا تو اس نے کمرے میں ایک کرخت صورت شخص کو دیکھا تھا جس نے اس کے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد اپنے کسی ساتھی کو اس کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی تھی۔ جواباً اس کے ساتھی نے اسے نیچے اتارنے کا حکم دیا تھا تاکہ باس اس سے پوچھ تاچھ کر سکے۔

اب وہ کرسی پر کسمپرسی کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو موڑ کر پشت پر مضبوط نائیلون کی ڈوری سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس کی ٹانگیں بھی کرسی کے پایوں کے ساتھ کس کر جکڑ دی گئی تھیں۔ وہ ایک حد سے زیادہ حرکت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

ان لمحات میں اُس کا دماغ مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جن میں ایک سوچ یہ بھی تھی کہ شاید یہ سب سیٹھ کے داماد کا کیا دھرا ہے۔ پانچ ماہ گزر جانے کے بعد بھی اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی اور اس نے اسے اغوا کرا کے یہاں پہنچا دیا تھا۔ وہ انتظار کرنے لگا کہ ان کا باس آ کر اس سے کیا سوال کرتا ہے۔ الٹا لٹکانے سے پہلے اس سے جو پوچھ گچھ کی گئی تھی، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ کسی غلط فہمی کی بنا پر اسے پکڑ کر وہاں لے آئے تھے۔ اس کا کبھی بھی کسی گینگ سے کوئی تعلق رہا تھا اور نہ ہی اس نے کسی کے معاملے میں ٹانگ اڑائی تھی..... سوائے سیٹھ کے داماد کی کرپشن والے معاملے کے۔

وہ انہی متضاد خیالات کے ساتھ نبرد آزما تھا کہ اس نے انسانی قدموں کے کمرے میں داخل ہونے کی آواز سنی۔ شاید ان لوگوں کا باس، اس سے پوچھ تاچھ کرنے وہاں آ گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ آنے والا اس کے سامنے کسی کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے ایک کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''اگر تمہارا دماغ درست ہو گیا ہے تو سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ تم کس گروہ کے لیے کام کرتے ہو اور تم نے ہمارے معاملات میں کودنے کی کوشش کیوں کی؟''

''میں نے نہ پہلے کوئی جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی اب کسی قسم کی غلط بیانی کروں گا۔'' وہ نحیف مگر پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''تم لوگوں کو کوئی شدید نوعیت کی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میرا مجرموں کے کسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو ایک سیدھا سادہ اور امن پسند شہری ہوں۔ آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہو۔''

''ہم نے پہلی بار اسے ایک اتفاق ہی سمجھا تھا۔'' اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''لیکن پے در پے تین بار یہ حرکت ہوئی تو ہم نے اس راستے کی نگرانی کی اور تمہیں ''رنگے ہاؤس'' پکڑ لیا.....!''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' اس نے اُلجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''آپ کون سی حرکت کی بات کر رہے ہو؟''

''کیا تم نے آج شام سے پہلے ایک اسٹریٹ سے

گزرتے ہوئے، مخصوص انداز میں پڑے ہوئے تین پتھروں کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے ایک طرف نہیں ہٹا دیا تھا.....؟'' اس شخص نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

''ہاں، آپ درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ بے خوفی سے بولا۔ ''میں نے ان تین چھوٹے پتھروں کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار کر سڑک سے ہٹا دیا تھا تاکہ وہاں سے گزرنے والوں کو کوئی پریشانی نہ ہو اور..... یہ کام میں نے ایک اللہ والے کے کہنے پر کیا تھا۔''

''کون اللہ والا؟'' اس شخص نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

اس نے اسے اللہ والے نیک بندے کے بارے میں تفصیلاً بتایا اور آخر میں کہا۔ ''ان بزرگ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ راستے میں پڑے ہوئے کانٹے یا پتھر کو ہٹا دینے سے بہت اجر و ثواب ملتا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس چھوٹی سی نیکی کے بدلے میں، میں چھت سے الٹا لٹکا دیا جاؤں گا اور کسی گینگ سے وابستہ کر کے مجھے بے دردی سے زدوکوب کیا جائے گا۔ خدارا..... میری بات کا یقین کریں اور مجھے یہاں سے جانے دیں۔ گھر میں میری بیوی اور بچی پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو کہ تم نے اس سے پہلے ان تین پتھروں کو راستے سے نہیں ہٹایا تھا؟'' غنڈوں کے باس نے کُریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔

''جی، بالکل۔ میں صد فیصد راست گوئی سے کام لے رہا ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میں تو اس رستے سے آج پہلی بار گزرا ہوں۔''

''تم اس ویران سڑک کی طرف کیا کرنے گئے تھے؟'' باس نے ایک اہم سوال کیا۔ ''وہ علاقہ ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا۔ وہاں ترقیاتی کام جاری ہے.....؟''

''میں ایک بے روزگار اور مصیبت کا مارا ہوا بندہ ہوں۔'' اس نے دکھی لہجے میں جواب دیا۔ ''نوکری کی تلاش میں صبح گھر سے نکلتا ہوں اور سورج ڈھلنے کے بعد ہی میری واپسی ہوتی ہے۔ اس دوران میں کہیں اپنی سی وی ڈراپ کرتا ہوں اور کہیں انٹرویو دینے پہنچ جاتا ہوں۔ بس، اسی خواری میں پورا دن نکل جاتا ہے۔ آج شام میں بھی میں سی ویو کے علاقے میں واقع ایک آفس سے نکلا اور تھکا ہارا پیدل ہی ایک سمت چل پڑا تھا۔ اس وقت میں حد درجہ مایوس اور پریشان تھا۔ پچھلے پانچ ماہ سے جاری بے روزگاری نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی ہے۔ میں اپنی ہی دُھن میں چلا جا رہا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں کہ میں کب اس ویران راستے پر جا نکلا جہاں تین پتھر ایک خاص ترتیب کے ساتھ پڑے ہوئے تھے۔ شاید میری بدقسمتی مجھے کھینچ کر وہاں لے گئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ راستے سے پتھر ہٹانے والی یہ نیکی اس قدر بھاری پڑ جائے گی۔''

''تمہاری باتوں سے سچائی جھلکتی ہے۔'' اس شخص نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''ان پتھروں کو تم نے نیکی اور بھلائی کی غرض سے اس راستے سے ہٹا دیا تھا لیکن تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ ان پتھروں کا اپنی جگہ پر پڑے رہنا ہمارے لیے کتنا اہم تھا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ ہمت سے کام لیتے ہوئے بولا۔ ''میں ان پتھروں کی وہاں موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''نہ جاننا تمہارے حق میں بہتر ہے۔'' اس شخص نے سنگین لہجے میں کہا۔ ''ہم کوئی اچھے انسان نہیں ہیں۔ ہم ممنوعہ اشیا کو اِدھر سے اُدھر پہنچانے کے لیے ان پتھروں کو نشانی اور راہنمائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، خیر.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ہم آج رات کے آخری پہر تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔ اگر اپنی زبان بند رکھو گے تو سلامت رہو گے ورنہ.....!''

''میں سمجھ سکتا ہوں، ورنہ کے بعد میرے ساتھ کیا کیا ہو سکتا ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی اور اپنی بیوی بچی کی سلامتی کو خطرے میں ڈالنے کی حماقت نہیں کروں گا۔''

''اسی میں تمہاری بھلائی ہے.....'' غنڈوں کے باس نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تم مجھے ایک شریف انسان لگے ہو۔ میں تمہارے روزگار کے لیے دعا کروں گا کہ تمہیں جلد ہی کوئی نوکری مل جائے تاکہ تم پریشان حال سنسان اور ویران سڑکوں پر مٹرگشت کرتے نہ پھرو.....''

ایک خطرناک مجرم اس کے لیے دعا کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کن الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کرے، لہٰذا اس نے خاموش رہنے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

اُس کی تین سالہ بیٹی بہت ہی معصوم اور بھولی بھالی تھی۔ ماں نے اسے بہلا پھسلا کر سلا دیا تھا لیکن خود وہ شوہر کے انتظار میں پوری رات جاگتی رہی تھی۔ آج تک ایسا نہیں

pklibrary.com

ہوا تھا کہ وہ بغیر بتائے رات بھر گھر سے باہر رہا ہو اسی لیے وہ حد سے زیادہ پریشان تھی۔ وہ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتی اور متلاشی نظر سے گھر کے داخلی دروازے کو تکنے لگتی۔ بالآخر فجر کے وقت اس کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز پر وہ، کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند دروازے کی جانب لپکی اور جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے اس کا شوہر دگرگوں حالت میں کھڑا تھا۔ وہ ہاتھ سے پکڑ کر اسے اندر لے آئی۔

''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''اور تمہیں اس حال کو کس نے پہنچایا ہے.....؟''

''میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔'' اس نے نحیف سی آواز میں بیوی سے کہا۔ ''پہلے مجھے فریش ہو جانے دو۔ پھر بات کرتے ہیں۔''

بیوی نے اُس سے کوئی بحث تکرار نہیں کی اور وہ واش روم میں گھس گیا۔ اس نے آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ واش روم میں گزارا۔ جب وہ تروتازہ ہو کر اور صاف ستھرا لباس پہن کر واش روم سے نکلا تو اس دوران میں بیوی ناشتا تیار کر چکی تھی۔

ناشتے کے دوران میں اس نے اپنی بیوی کو خود پر ٹوٹنے والی اُفتاد کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ اس کی بپتا سننے کے بعد بیوی نے خالصتاً بیویوں والا سوال کیا۔

''تم نے ان غنڈوں کو بتایا نہیں کہ تم ایک وکیل ہو.....؟''

''وہ اتنے خطرناک لوگ ہیں کہ کسی وکیل اور کسی دلیل کو خاطر میں نہیں لاتے۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔ ''شکر کرو کہ انہوں نے میری بات کا یقین کر لیا اسی لیے میں اس وقت تمہارے سامنے زندہ سلامت بیٹھا ہوا ہوں۔''

''بھاڑ میں گئی نوکری۔'' اس کی بیوی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میں اب تمہیں گھر سے باہر نہیں نکلنے دوں گی۔''

''کیا گھر میں بیٹھ کر میں انڈے دوں گا جن سے نکلنے والے چوزوں سے ہم کوئی پولٹری فارم کھولیں گے۔'' اس نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یا پھر بھوکے پیاسے گھر میں بند ہو کر اجتماعی خودکشی کا ارادہ ہے؟''

بیوی نے اس کی طنز آمیز سنجیدہ بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں ایک بات تو بتانا ہی بھول گئی۔''

''کون سی بات؟'' اس نے دلچسپی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ کوئی جواب دیے بغیر اندر کمرے میں گھس گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی بیوی اسے کون سی انوکھی بات بتانے والی ہے۔''

جب وہ کمرے سے نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک لیٹر تھا۔ ''یہ کل دن میں ایک کوریئر والا دے گیا تھا۔'' اس نے مذکورہ لیٹر اپنے شوہر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔''

''چلو، میں کھول کر دیکھ لیتا ہوں۔'' اس نے بیوی کے ہاتھ سے وہ لیٹر لیتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

آئندہ دو منٹ میں، وہ اس لیٹر کو کھول کر دو مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ اس دوران میں بیوی کی نظر مسلسل اُس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس نے جوش بھری آواز میں استفسار کیا۔

''تمہارا چہرہ خوشی سے چمک رہا ہے۔ مجھے بھی بتاؤ، آخر اس لیٹر میں ہے کیا.....؟''

''یہ ایک اپوائنٹ منٹ لیٹر ہے۔'' وہ مسرت سے لب ریز لہجے میں بولا۔ ''مجھے ایک ٹریڈنگ کمپنی میں ''لیگل ایڈوائزر'' کی جاب مل گئی ہے۔ ابتدائی تنخواہ اسّی ہزار روپے ہے۔ تین ماہ کے بعد وہ لوگ میرے کام کو دیکھتے ہوئے، میری تنخواہ میں اضافہ کر دیں گے۔''

اس خوش خبری نے بیوی کو نہال اور سرشار کر دیا۔ وہ خود بھی بہت زیادہ خوش تھا۔ وہ پچھلے پانچ ماہ میں پتا نہیں، کہاں کہاں اپلائی کر چکا تھا۔ ایک درجن سے زیادہ آفسز میں تو اس کا انٹرویو بھی ہو چکا تھا۔ یہ ٹریڈنگ کمپنی بھی انہی میں سے ایک تھی۔

آج کا دن..... بلکہ گزشتہ روز اُس کے لیے نہایت ہی مبارک ثابت ہوا تھا حالانکہ پچھلی رات اس نے بڑی اذیت میں گزاری تھی۔ اس رات کے بھیانک تصور نے اسے لرزا دیا۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں اس اللہ والے کے یہ الفاظ تازہ ہو گئے۔

''اگر آپ غلطی پر نہیں ہیں تو یقین کریں، آپ پر نازل ہونے والی مصیبت آپ کے لیے نفع بخش اور بڑی فائدہ مند ثابت ہوگی۔ صوفیا کے ہاں ایسی آزمائش کو ''مفید مصیبت'' کہا جاتا ہے۔''

ایک باعزت اور مستحکم ملازمت مل جانے کی خوشی تو اپنی جگہ تھی ہی لیکن اس کے اطمینان کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے پروردگار کی آزمائش میں پورا اترا تھا۔

❖❖❖

pklibrary.com

مجرم ذہن

عکسِ فاطمہ

آغاز ہی سے انسانی فطرت کسی ایک راستے کا انتخاب کر لیتی ہے... جس سے اس کے کردار اور ذہن کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے... مجرمانہ ذہن رکھنے والے شعوری، لاشعوری طور پر جرم کے بارے میں ہی سوچتے رہتے ہیں چاہے وہ ان کے لیے سودمند ہو یا نہ ہو...

گھریلو ملازمہ کے مجرمانہ ذہن میں گھومتی منفی سوچ کا چونکا دینے والا انجام.....

رینی کو چیزیں چرانے کی لت تھی۔ وہ سالوں سے مس میک کی خدمت پر مامور تھی۔ مس میک، رینی کی اس خصلت سے بہ خوبی واقف تھی مگر وہ اسے برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ عمر کے اس حصے میں رینی اس کا واحد سہارا تھی۔ اس نے اچھے سے مس میک کا خیال رکھا ہوا تھا۔ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ رینی اپنی مالکن کی پسند اور ناپسند سے آگاہ تھی۔

ساتھ رہتے ہوئے انسان ایک دوسرے کا عادی ہو

pklibrary.com

جاتا ہے۔ اگر یہی عادی پن حد سے تجاوز کر جائے تو ضرورت کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ گویا رینی درحقیقت مس میک کی ضرورت بن چکی تھی چنانچہ وہ رینی کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ رینی کی چھوٹی موٹی چوریوں اور دوسری تمام ہیرا پھیریوں کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی لیکن جب معاملہ کسی قیمتی یا نایاب شے کی خرد برد کا ہو تو پھر مس میک کو ایکشن لینا پڑتا تھا اور اس کا ''ایکشن'' بھی خاصا تمیز دار اور نفسیاتی ہوا کرتا تھا۔

چند روز قبل مس میک ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اپنی اسٹڈی میں جا بیٹھی۔ رینی بھی اس کے نزدیک ہی ایک کرسی پر موجود تھی۔ مس میک کو مطالعے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی اسٹڈی کسی لائبریری سے کم نہیں تھی۔ دورانِ مطالعہ اس نے گردن اٹھا کر ایک بک شیلف کی طرف دیکھا تو اسے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا۔

مذکورہ شیلف کے اوپر کونے میں، ایک چاندی کا شوپیس رکھا رہتا تھا۔ وہ شوپیس دراصل ایک شپ کا ننھا منا ماڈل تھا جسے چاندی سے تیار کیا گیا تھا اور چاندی کا وہ شوپیس اس وقت اپنی جگہ پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مس میک نے جیسے ہی کتاب سے نگاہ اٹھا کر بک شیلف کی طرف دیکھا تھا تو رینی کی نظر نے بھی اپنی مالکن کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ مس میک کی نگاہ پلٹی اور رینی کے چہرے پر جم گئی۔ دونوں کی نظریں ملیں تو مس میک نے ایک طویل اور معنی خیز سانس خارج کی اور دوبارہ مطالعے میں مصروف ہو گئی۔

اگلی صبح وہ شوپیس اپنے مقام پر موجود تھا۔

بس، مس میک کی تنبیہہ، سرزنش، ملامت اور ہدایت کا یہی شائستہ طریقہ کار تھا جسے کبھی کبھار ہی آزمانا پڑتا تھا ورنہ معمولی نوعیت کی چیزوں کے سرقے سے تو وہ ہمیشہ صرفِ نظر ہی کیا کرتی تھی۔ اشیا تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ مس میک ایسے چھوٹے موٹے نقصانات کو بنیاد بنا کر رینی کو اپنے گھر سے بے دخل نہیں کر سکتی تھی۔ ایک طویل عرصے سے ساتھ رہتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے کے مزاج، عادات اور فطرت کو بخوبی سمجھ چکی تھیں۔

اسی گھر میں یعنی مس میک کے گھر میں ایک تیسرا کردار بھی موجود تھا اور وہ تھی ایک عام گھریلو ملازمہ جس کے ذمے جھاڑو پونچھے سے لے کر دھلائی صفائی اور کھانا بنانے تک کا ہر چھوٹا بڑا کام تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک کل وقتی گھریلو ملازمہ تھی۔ رینی کی حیثیت تو مس میک کی کیئر ٹیکر ایسی تھی۔ اسی وجہ سے وہ مس میک کی نظر میں زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ مذکورہ گھریلو ملازمہ کلوٹلڈ نے کبھی خود کو رینی سے برتر سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کلوٹلڈ دل سے رینی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ شاید اس کا نفسیاتی پہلو یہ ہو کہ کلوٹلڈ خود کو مس میک کی ملازمہ سمجھتی تھی جبکہ رینی اس پر ایسے حکم چلاتی تھی جیسے اس گھر کی اصلی مالکن وہی ہو۔ رینی کا یہ دھونس زبردستی والا رویہ کلوٹلڈ کو شاق گزرتا تھا تاہم اس نے اپنی مالکن مس میک کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے کبھی بھی رینی سے کھلم کھلا جھگڑا نہیں کیا تھا۔ یہ ملازمت اس کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ وہ کسی بھی حال میں مس میک کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔

وہ ماہِ نومبر کی ایک خنک اور خوشگوار شام تھی۔ مس میک اور رینی ایک کمرے میں موجود تھیں۔ دروازے پر دستک ہوئی تو رینی نے نگاہ اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا جبکہ مس میک ایک میگزین کے مطالعے میں مصروف رہی۔ دروازہ کھلا اور کلوٹلڈ ایک ٹرے میں چائے وغیرہ اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ رینی نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس نے کلوٹلڈ کو دیکھا ہی نہ ہو۔

کلوٹلڈ اچھی طرح جانتی تھی کہ رینی اس کو پسند نہیں کرتی۔ تاہم اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا اور ٹرے میز پر رکھنے کے بعد اس نے اُن دونوں کے لیے دو کپ میں چائے نکال دی اور مس میک والے کپ میں لیموں کا رس بھی نچوڑ دیا پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔

کلوٹلڈ کے جانے کے بعد رینی نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میں تو اس پر بالکل بھروسا نہیں کر سکتی۔''

اس کا اشارہ کلوٹلڈ کی جانب تھا۔ مس میک نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''ہاں، میں جانتی ہوں کیونکہ یہ بات تم پہلے بھی کئی بار کہہ چکی ہو۔''

رینی نے بُرا سا منہ بنایا اور چمٹی کی مدد سے دو شوگر کیوبز اٹھا کر اپنی چائے کی پیالی میں ڈال لیے جبکہ ایک کیوب کو اس نے نیچے قالین پر گرا دیا۔ پھر وہ ایک جانب جھک کر اس شوگر کیوب کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس دوران میں مس میک غیر محسوس انداز میں رینی کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھی۔

مس میک نے دیکھا، رینی نے قالین کے اوپر سے

pklibrary.com

اس شوگر کیوب کو اٹھایا اور چپکے سے اپنے ٹراؤزر کی جیب میں رکھ لیا۔ یہ بھی ایک طرح کی چوری ہی تھی۔ مس میک نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کو، کپ کے پیچھے چھپا لیا۔

ایک شوگر کیوب کی بھلا کیا حیثیت ہوتی ہے لیکن ''چوری'' جن لوگوں کی گھٹی میں شامل ہو، انہیں تو کچھ نہ کچھ بے سبب بھی چرانا ہوتا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ چیز ان کے کام کی ہے بھی یا نہیں..... بس، رینی بھی کچھ ایسی ہی چورنی تھی۔

کلوٹلڈ کو مس میک کی ملازمت میں آئے دو سال ہوئے تھے جبکہ رینی کو اس گھر میں پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ کلوٹلڈ سے پہلے رینی ہی کچن کو بھی سنبھالتی تھی لیکن مس میک، رینی کے ہاتھ کا بنا ہوا بدمزہ کھانا کھا کھا کر بور ہو چکی تھی اسی لیے اس نے کلوٹلڈ کو اپنے ہاں ملازمت دی تھی۔ اس موقع پر بھی رینی نے مس میک کے اس فیصلے کی مخالفت کی تھی۔

''کسی باہر کے انسان کو مستقل گھر کے اندر رکھنا ٹھیک نہیں ہوگا مس میک!'' رینی نے اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''ہم بھلا کسی اجنبی پر، آنکھیں بند کر کے بھروسا کیسے کر سکتے ہیں؟''

اس وقت وہ دونوں اسٹڈی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ مس میک نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی پھر کینٹ کی ایک سگریٹ سلگانے کے بعد معتدل انداز میں کہا۔

''رینی! کبھی تم بھی تو اس گھر کے لیے باہر کی ایک انسان ہی تھیں اور میرے لیے بالکل اجنبی..... میں نے تم پر بھروسا کیا اور آج سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔''

مس میک کو سگریٹ نوشی کی پرانی عادت تھی اور ''کینٹ'' اس کا پسندیدہ برانڈ تھا۔ مس میک کی اسموکنگ رینی کو پسند نہیں تھی لیکن ظاہر ہے، وہ اپنی مالکن کو سگریٹ پھونکنے سے منع تو نہیں کر سکتی تھی تاہم وہ ہلکے پھلکے اور معنی خیز انداز میں اپنا احتجاج ریکارڈ کراتی رہتی تھی۔ اس وقت تو یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کیونکہ مس میک نے کلوٹلڈ کے مقابلے میں اس کی ذات پر سوال اٹھا دیا تھا۔

''مس میک!'' وہ زیرِ بحث موضوع پر سے، اپنی مالکن کی توجہ ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''میں حیران ہوں کہ آپ نے یہ کارنامہ کس طرح انجام دیا ہوگا!'' وہ اسٹڈی کے مختلف شیلوز میں سجی کتابوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اتنی نادر و نایاب کتابوں کو ایک جگہ جمع کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر.....!''

رینی نے بات ادھوری چھوڑی تو مس میک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سگریٹ کا ایک گہرا کش لینے کے بعد استفسار کیا۔ ''مگر..... کیا.....؟''

''مگر آپ کی سگریٹ نوشی سے ان قیمتی کتابوں کو یقیناً تکلیف پہنچتی ہوگی.....'' رینی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''سگریٹ کا زہریلا دھواں ان کے اندر رچ بس گیا ہے۔ جب میں ان کے نزدیک سے گزرتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی کوئی سگریٹ ہی ہیں۔ تمباکو کی مخصوص بو ان کے وجود کا حصہ بن چکی ہے۔''

''میں تو تمہیں یہی مشورہ دے سکتی ہوں کہ.....'' مس میک نے یکے بعد دیگرے سگریٹ کے دو کش لگانے کے بعد سپاٹ آواز میں کہا۔ ''تم ان کتابوں کو سونگھنا بند کر دو اور جب بھی تمہارا ان کے قریب سے گزر ہو تو تم اپنی ناک بند کر لیا کرو یا پھر سانس روک لیا کرو.....''

مس میک کے اس کورے جواب کے بعد رینی کے لیے اور کچھ کہنے اور سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ خجل سی ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

کلوٹلڈ کی ملازمت کنفرم ہوئی تو اس نے گراؤنڈ فلور پر، کچن سے متصل کمرے میں رہائش اختیار کر لی۔ پہلے یہ کمرا رینی کے تصرف میں تھا۔ رینی اب بالائی منزل پر، مس میک کے برابر والے کمرے میں شفٹ ہو گئی تھی۔

رینی اور کلوٹلڈ کے باہمی اختلافات اور ایک دوسرے کے لیے ان کی پسند و ناپسند تو اپنی جگہ قائم رہی تاہم انہیں ایک بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ دونوں اس گھر میں مس میک کی خدمت کے لیے ہیں۔ لہٰذا ہر حال میں انہوں نے اپنی مالکن کا خیال رکھنا ہے۔

☆☆☆

اس علاقے میں سب سے زیادہ خستہ حال گھر مس میک ہی کا تھا جس کا بڑا سبب اسی کی کنجوسی اور بے پروائی تھی۔ وہ اپنے گھر کی دیکھ ریکھ پر پیسا خرچ کرنے سے پہلے ہزار بار سوچتی تھی اور عمل ایک بار بھی نہیں کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ علاقے کے بچوں نے مس میک کے مکان کو آسیب زدہ سمجھنا شروع کر دیا تھا اور اگر کسی بچے کی بہادری کو آزمانا ہوتو اس سے یہی کہا جاتا تھا کہ..... پہلے تم اس بھوت بنگلے میں جا کر دکھاؤ۔ اس کے بعد ہی ہم مانیں گے کہ تم جگر والے ہو..... وغیرہ، وغیرہ.....

کسی زمانے میں مس میک اپنے گھر میں اکثر پارٹیز

pklibrary.com

دیا کرتی تھی جن میں پڑوسی ذوق شوق سے شریک ہوا کرتے تھے مگر اب وہ رونق، چہل پہل اور ہنگامے قصۂ پارینہ ہو کر رہ گئے تھے۔ لوگوں نے اس کے گھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس گھر کی طرح انہوں نے مس میک کو بھی کوئی سال خوردہ بیزار اور ویران کھنڈر ہی سمجھ لیا تھا اور اس میں ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ مس میک خود ہی سب سے کٹ گئی تھی۔

مس میک بچپن اور جوانی میں تو ''مس'' تھی ہی لیکن عمر کے اس آخری حصے میں بھی وہ ''مس'' ہی تھی کیونکہ اس نے زندگی بھر شادی وغیرہ کا ''تکلف'' نہیں کیا تھا۔ وہ ایک نارمل اور اوسط طبعی عمر سے کہیں زیادہ ہی جی چکی تھی مگر اس کے انداز و اطوار سے یہی سمجھ میں آتا تھا کہ فی الحال، اس کا دنیا چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اس رات ڈنر پر رینی اور مس میک حسبِ معمول ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھیں۔ رینی کی نگاہ مس میک پر ہی جمی ہوئی تھی۔ رینی نے اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت کو مس میک کی طرح کھانا کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت مس میک اسپیریگس کے ایک ڈنٹھل کو اپنی انگلیوں میں دبائے عجیب انداز میں حرکت دے رہی تھی۔ اسی دوران میں وہ وقفے وقفے سے اس سبز اسپیریگس (ایک قسم کی سلاد) کو ''ہولنڈیز ساس'' میں ڈبو ڈبو کر ''کچر کچر'' اسے کھا بھی رہی تھی۔ رینی جانتی تھی کہ ''ہولنڈیز'' مس میک کی پسندیدہ ساس (چٹنی) تھی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسان اپنی کسی پسندیدہ شے کو بھونڈے انداز میں کھائے!

''کلوٹلڈ جان گئی ہے کہ آپ کو یہ ساس بے حد پسند ہے.....'' رینی نے اپنے مخصوص حاسدانہ انداز میں مس میک سے کہا۔ ''وہ ایک دن اسی ساس میں زہر ملا کر آپ کو کھلا دے گی کیونکہ آپ اس پر اندھا بھروسا کرنے لگی ہیں جو کہ اچھی بات نہیں ہے۔''

مس میک نے رینی کی تنبیہ پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور وہ اسپیریگس کے ساتھ کماحقہ، انصاف کرنے میں مصروف رہی۔

''وہ اس گھر سے چیزیں بھی چراتی رہتی ہے۔'' رینی نے شاکی لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ نے اسے ڈھیل دے رکھی ہے۔ مجھے لگتا ہے، کلوٹلڈ ایک دن اس گھر کو خالی کر کے ہی چھوڑے گی۔''

کلوٹلڈ کے لیے رینی کے دل میں موجود نفرت اور حسد کے جذبات سے مس میک اچھی طرح واقف تھی لیکن جب رینی نے کلوٹلڈ کے چور ہونے کی بات کی تو مس میک کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ یہ تو ایسا ہی تھا کہ..... اُلٹا چور کوتوال کو گھورے۔

مس میک نے اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش کی تو اسے زور کا ٹھسکا لگا کیونکہ عین اسی وقت وہ اسپیریگس کو اپنے منہ کی طرف لے جا رہی تھی اور رینی کے مضحکہ خیز الزام نے اسے ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا جس کے نتیجے میں، ہولنڈیز ساس میں لتھڑا ہوا اسپیریگس منہ کے بجائے مس میک کی ناک میں جا گھسا تھا۔

مس میک نے ایک مختصر کھانسی کے بعد اسپیریگس کے ڈنٹھل کو پلیٹ میں رکھا، نیپکن اٹھا کر اپنی ناک کو صاف کیا اور وائن کے دو گھونٹ لے کر اپنی پسندیدہ کینٹ سگریٹ سلگا لی۔ وہ کھانے کے اختتام پر ہی سگریٹ جلایا کرتی تھی۔ رینی کے لیے یہ ایک واضح اشارہ تھا کہ مس میک اب مزید کچھ نہیں کھائے گی۔

مس میک نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لگانے کے بعد اپنے نتھنوں سے دھواں خارج کیا اور اپنی سگریٹ کے گل (راکھ) کو اسپیریگس والی پلیٹ میں جھاڑتے ہوئے رینی کو تکنے لگی۔

''چینی کے قیمتی برتنوں کے ساتھ ایسی حرکت قطعی مناسب نہیں ہے مس میک۔'' رینی نے اسپیریگس والی پلیٹ کو ایک طرف کرنے کے بعد کانچ کی ایک فینسی ایش ٹرے اپنی مالکن کے سامنے رکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''اس کام کے لیے ایش ٹرے کو استعمال کرنا چاہیے۔''

''تم غلط نہیں کہہ رہی ہو رینی!'' مس میک نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس گھر میں موجود تمام تر کراکری نہ صرف نایاب اور قیمتی ہے بلکہ یہ میری فیملی کی ایک یادگار بھی ہے، وہ فیملی جس کا، میرے سوا کوئی ایک فرد بھی اس وقت زندہ نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، میرے دفن ہو جانے کے بعد کوئی رشتے دار نکل کر سامنے آ جائے..... اس گھر کو ہتھیانے کے لیے.....!''

ستر کا ہندسہ عبور کرنے کے بعد ہر انسان کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ کسی بھی وقت اس کا بُلاوا آ سکتا ہے۔ مس میک چاہے مرنے کا ارادہ نہ رکھتی ہو مگر شعوری اور لاشعوری طور پر اسے بھی ضرور یہ احساس تھا کہ اس کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے اسی لیے کچھ عرصہ پہلے اس نے اپنے گھر اور اس میں موجود ہر شے کو ایک سماجی اور فلاحی

ادارے کے نام کر دیا تھا اور یہ بات رینی کو معلوم نہیں تھی۔ رینی تو یہی آس لگائے بیٹھی تھی کہ مس میک کی موت کے بعد سب کچھ اس کا ہو جائے گا۔ وہ مس میک کے بعد اس کے گھر اور دیگر تمام چیزوں پر اپنا حق سمجھتی تھی۔

مس میک، رینی کی اس خود غرضانہ سوچ سے بہ خوبی آگاہ تھی لیکن اس نے کبھی رینی کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے طور پر سوچ رکھا تھا کہ وہ رینی کی طویل خدمات کے صلے میں اسے ایک ہینڈسم اماؤنٹ اور قیمتی فرانسیسی کراکری تحفے میں دے گی۔

☆☆☆

وہ رات مس میک کے لیے خاصی تکلیف دہ اور کٹھن ثابت ہوئی تھی۔ ڈنر کے بعد اس نے تھوڑا وقت اسٹڈی میں گزارا اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو اس نے اپنے معدے اور سر کو بھاری پایا۔

ایسی کیفیت عموماً اس وقت ہوا کرتی تھی جب وہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھا لیا کرتی تھی مگر آج تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے تو معمول سے کم ہی ڈنر کیا تھا۔ وہ کھانے کی شوقین تھی لیکن بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ اس نے کھانے کے معاملے میں احتیاط کا دامن مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اب وہ انتہائی محفوظ، زود ہضم اور چنیدہ چیزیں ہی کھاتی تھی اور وہ بھی قلیل مقدار میں۔ وہ اپنے معمولات پر سختی سے کاربند تھی۔ آج ڈنر میں اس نے کوئی بداحتیاطی نہیں کی تھی پھر اس کے پیٹ میں مروڑ کیوں اٹھ رہا تھا؟

وہ آدھی رات کا عمل تھا اور مس میک اپنے بیڈ پر بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کی آنتوں کی اینٹھن کا آخر کیا سبب ہو سکتا ہے اسی سوچ بچار کے دوران میں، اس کے ذہن میں رینی کی کہی ہوئی ایک بات تازہ ہو گئی۔

''کلوٹلڈ ایک دن ہولنڈیز ساس میں زہر ملا کر آپ کو کھلا دے گی کیونکہ آپ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگی ہیں۔''

''یہ کلوٹلڈ اس حد تک جا سکتی ہے؟'' مس میک نے خود سے سوال کیا۔ ''کیا اس نے ہولنڈیز ساس میں زہر ملا دیا تھا جس کے کھانے سے میری طبیعت بگڑ گئی ہے؟''

''نہیں!'' اس کے ذہن ہی سے ان سوالات کی تردید بھی آ گئی۔ ''عین ممکن ہے کہ رینی کے کہنے کے مطابق، کلوٹلڈ اس گھر سے چھوٹی موٹی چیزیں چرا لیتی ہو لیکن میری جان لینے کے بارے میں وہ نہیں سوچ سکتی۔ مجھ سے اس کی کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اگر اسے نقصان ہی پہنچانا ہوا تو اس کی کسی بھی سنگین کارروائی کا نشانہ میں نہیں، بلکہ رینی بنے گی۔''

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مس میک کے پیٹ کی تکلیف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اب تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا کھایا پیا سب معدے سے سفر کرتے ہوئے اس کے حلق کی جانب بڑھ رہا ہے اور اس میں ہولنڈیز ساس کا مخصوص ذائقہ سب سے نمایاں تھا۔ جب یہ کیفیت اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ بیڈ سے اُتر کر واش روم میں گھس گئی۔

متلی کی انتہا پر اس کا جی اس قدر مالش کر رہا تھا کہ واش روم میں داخل ہوتے ہی اس نے کموڈ کا رخ کیا اور یکے بعد دیگرے تین قے کر کے، معدے میں موجود غیر ہضم شدہ خوراک کو کموڈ میں الٹ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی طبیعت ہلکی پھلکی ہو گئی۔

اس کے بعد اس نے بیسن پر ہاتھ منہ دھویا اور دانت برش کر کے وہ دوبارہ اپنے بیڈ پر آ گئی۔ اب اس کی حالت اچھی ہو گئی تھی اور اس کا دماغ بھی صحت مندانہ مثبت اور تعمیری انداز میں سوچنے لگا تھا۔ نیند کی آغوش میں پناہ لینے سے پہلے اس نے چند اہم فیصلے کیے.....

''نمبر ایک..... رینی اور کلوٹلڈ کے آپسی اختلافات چاہے آسمان کو کیوں نہ چھو رہے ہوں لیکن وہ دونوں میری خدمات پر مامور ہیں لہٰذا مجھے ان کے ساتھ ایسا سلوک کرنا چاہیے جو میری موت کے بعد بھی انہیں میری یاد دلاتا رہے۔''

''نمبر دو..... اگر گردونواح کے لوگ مجھ سے غافل ہو گئے ہیں تو اس میں ان کا نہیں، میرا قصور ہے۔ میں نے پچھلے کئی سال سے اپنے گھر میں کوئی دعوت نہیں رکھی اور اگر کسی نے اپنے ہاں بُلایا ہے تو میں گئی نہیں۔ تعلقات تو میل ملاپ ہی سے قائم رہتے ہیں لہٰذا مجھے خود سے عہدِ تجدید تعلقات کرنا ہو گا اور اس عہد کا عملی ثبوت دیتے ہوئے فوری طور پر اپنے گھر میں ایک عالی شان پارٹی کا اہتمام کرنا ہو گا۔''

''نمبر تین..... مجھ سے زیادہ اچھا اور لذیذ کھانا بھلا اور کون بنا سکتا ہے! یہ تو میری ہی سستی اور کوتاہی ہے کہ میں نے اپنی ریسیپیز کو ایک باکس میں بند کر کے رکھ دیا ہے اور ملازماؤں کے بنے ہوئے کھانے جیسے تیسے کھا رہی ہوں۔ اب میں اس باکس کو کھولوں گی اور اس پارٹی کی تمام ڈشز

pklibrary.com

میری خصوصی ریسپیز کے مطابق ہی تیار کی جائیں گی۔"

انسان جب مثبت انداز میں سوچتا ہے تو اس کا اندر اور باہر اطمینان اور خوشی سے سرشار ہو جاتا ہے۔ ان لمحات میں مس میک بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔

اگلی صبح مس میک کی طبیعت پوری طرح بحال ہو چکی تھی۔ کلوٹلڈ نے جب اس کے سامنے ناشتے کی میز سجا دی تو اس نے اپنے لیے صرف بٹر ٹوسٹ اور چائے کا انتخاب کیا اور کلوٹلڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے رسان سے کہا۔

"کلوٹلڈ! پچھلی رات میری طبیعت کافی گڑبڑ رہی ہے اور شاید یہ ہولنڈیز ساس کی وجہ سے تھا۔"

قبل اس کے کہ کلوٹلڈ جواب میں کچھ کہتی، رینی نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو پہلے ہی پتا تھا.....!"

"رینی.....!" مس میک نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

"مس میک بہت ہی نازک طبیعت کی ہیں۔" رینی نے کلوٹلڈ کی طرف دیکھتے ہوئے ڈھٹائی سے کہا۔ "انہیں کوئی بھی چیز دیتے ہوئے بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا کرو۔ ویسے اس ساس کے ذریعے تم نے انہیں مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

رینی کی یاوہ گوئی نے کلوٹلڈ کے اعصاب میں تناؤ ایسی کیفیت پیدا کر دی۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر غصیلی نظر سے رینی کو گھورنے لگی۔

"بس، بہت ہو گیا۔" مس میک نے ماحول کو سازگار بنانے کی غرض سے سخت لہجے میں کہا۔ "تم دونوں آپس میں لڑنے جھگڑنے سے باز آجاؤ ورنہ مجھے کوئی ہنگامی فیصلہ کرنا پڑے گا۔" پھر وہ براہِ راست کلوٹلڈ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"آج کے بعد ڈائننگ ٹیبل پر مجھے ہولنڈیز ساس نظر نہیں آنا چاہیے کلوٹلڈ..... اسپیریکس کے ساتھ تھوڑا سا بٹر اور لیمن.....بس!"

کلوٹلڈ نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ رینی نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔ مس میک اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"اس گھر میں ہم صرف تین افراد ہیں اور تم دونوں کا کام مجھے آرام اور سکون مہیا کرنا ہے لیکن تم جس طرح ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش میں رہتی ہو، وہ افسوس ناک ہونے کے ساتھ ہی میرے لیے بڑا اذیت ناک بھی ہے۔ میں اس گھر کے اندر امن و آشتی چاہتی ہوں اور رونق بھی لہٰذا میں نے ایک فیصلہ کیا ہے.....!"

مس میک نے ڈرامائی انداز میں بات ادھوری چھوڑی تو رینی اور کلوٹلڈ نے پہلے معاندانہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر سوالیہ انداز میں اپنی مالکن کو تکنے لگیں۔

"میں اس گھر کی روایات کو تازہ بلکہ زندہ کرنا چاہتی ہوں۔" مس میک نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شاندار پارٹیز اس گھر کا خاصہ رہا ہے مگر کئی سالوں سے یہ تعطل کا شکار ہے۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو مگر اس کی تجدید ہونا چاہیے۔ خوش باش اور صحت مند زندگی گزارنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ سو، دو روز بعد میں اپنے گھر میں ایک دعوت رکھ رہی ہوں۔"

"لیکن مس میک....." مس میک کے خاموش ہوتے ہی رینی نے اعتراض جڑ دیا۔ "آپ کی صحت اب اس کی اجازت نہیں دیتی!"

"میں یہ سب اپنی صحت کو بہتر بنانے کے لیے ہی تو کرنے جا رہی ہوں۔" مس میک نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "ہمارا پہلا خاص مہمان چارلی کٹلر ہوگا۔"

"چارلی کٹلر.....!" رینی نے دہرایا اور کہا۔ "یعنی آپ کا اٹارنی؟"

"ہاں، مجھے چارلی سے کچھ اہم باتیں بھی کرنا ہیں۔" مس میک نے جواب دیا۔ "چارلی کے علاوہ ہمارے دونوں طرف کے ہمسائے بھی۔ میں نے ان لوگوں کو عرصہ دراز سے نہیں دیکھا۔ میل ملاپ اور خوش گپیوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہونا چاہیے۔ زندگی کا کیا بھروسا..... کسی وقت بھی بُلاوا آسکتا ہے۔ انسان ہزاروں، لاکھوں سال تو نہیں جی سکتا نا..... کیوں رینی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا.....؟"

رینی نے آج سے پہلے مس میک کو اس انداز میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اپنی مالکن کے استفسار پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"بالکل.....کوئی بھی سدا زندہ نہیں رہ سکتا....."

رینی نے مس میک کی بات کا جواب تو دے دیا تھا لیکن وہ اپنی مالکن کے اس نئے انداز پر کھٹک گئی تھی۔ اسے تو مس میک کی دعوت والی بات ہی ہضم نہیں ہوئی تھی، اوپر سے چارلی کٹلر کی آمد..... رینی کا دماغ بہت دور تک سوچ

pklibrary.com

رہا تھا۔ مس میک اپنے اٹارنی سے کیا مشورہ کرنے والی ہے؟ کہیں ان اہم باتوں کا تعلق مس میک کے اس مکان سے تو نہیں ہے؟ کیا اس نے اپنی وراثت کے حوالے سے کوئی حتمی فیصلہ کرلیا ہے.....؟ وغیرہ ہم!

یہ اور اسی نوعیت کے درجنوں سوالات رینی کی بے قراری کا باعث بن گئے تھے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ مس میک، اپنے اٹارنی چارلی کٹلر کے ذریعے تیار کی جانے والی وصیت کے مطابق یہ گھر اور اس میں موجود ہر شے پہلے ہی ایک فلاحی ادارے کے نام کرچکی ہے۔ مس میک کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کی تمام تر جائداد کو وصیت کی رو سے مذکورہ سماجی ادارے کے پاس چلے جانا تھا۔

رینی چونکہ اس کڑوی حقیقت سے واقف نہیں تھی اسی لیے وہ، اس کے سوا ہر زاویے میں اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑا رہی تھی۔ گھوڑا چاہے کتنا بھی صحت مند اور تیز دوڑنے والا کیوں نہ ہو لیکن اگر گھڑسوار کے ذہن میں منزل کا نشان موجود نہیں تو وہ ہمیشہ ناکام و نامراد ہی رہتا ہے.....!

☆☆☆

عرصہ دراز کے بعد ہی سہی مگر روایات کو زندہ رکھنے کی غرض سے مس میک نے ایک بڑا قدم اٹھایا تھا۔ اس کے کھانوں کی تعریف ہر کوئی کرتا تھا۔ لوگ اکثر اس سے ان لذیذ ڈشز کی ریسیپز کے بارے میں پوچھا کرتے تھے لیکن وہ مسکرا کر ٹال جاتی تھی۔ کئی فوڈ میگزین والے بھی اس کے پیچھے پڑے رہتے تھے مگر مجال ہے کہ اس نے اپنا یہ ''راز'' کسی سے شیئر کیا ہو.....!

آج پھر، کافی عرصے بعد وہ چوبی باکس کھل گیا تھا جس کے اندر مس میک نے اپنی ساری ریسیپز کو احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ کلوٹلڈ اور رینی اس کی مددگار بنی ہوئی تھیں اور وہ خود کچن میں گھس کر مہمانوں کی ضیافت کے لیے مختلف ڈشز تیار کررہی تھی۔ کلوٹلڈ کو اس نے اپنے ساتھ کچن میں رکھا ہوا تھا۔ جبکہ رینی دیگر کاموں میں لگی ہوئی تھی جیسا کہ برتنوں کی صفائی اور ڈائننگ ٹیبل کی سجاوٹ وغیرہ۔ مس میک کے گھر میں بیش قیمت کراکری موجود تھی مگر پچھلے کئی سال سے وہ تمام ڈنر سیٹ، ٹی سیٹ، واٹر سیٹ..... استعمال میں نہیں آئے تھے۔ اس ڈنر پارٹی کے بہانے ان نفیس برتنوں کی قسمت بھی ''جاگ'' اٹھی تھی۔

مہمانوں میں سے کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ پڑوسیوں میں سے ٹام یوسٹس مہنگی اور پرانی شراب کی ایک بوتل ساتھ لایا تھا جبکہ لورین بارٹل اسکول کی پرنسپل ایمریٹا اپنے ہاتھ کا بنا ہوا چاکلیٹ کیک اٹھائے ہوئے تھیں اور مس میک کا اٹارنی مسٹر چارلی کٹلر اس کے لیے ایک مشہور کمپنی کی خوشبو لے کر آیا تھا۔ سینٹ کی وہ بوتل چھوٹی سی مگر بہت قیمتی تھی۔

کھانے کے دوران میں خوش گپیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ سب گزرے ہوئے وقت کی یادوں کو تازہ کرکے خوش ہورہے تھے۔ کلوٹلڈ اور رینی ڈائننگ ٹیبل کے نزدیک ہی، مہمانوں کی خدمت کے لیے چاق و چوبند کھڑی تھیں اور وقفے وقفے سے وہ اپنی مالکن کے احکامات کی تعمیل کررہی تھیں۔

''کچھ بھی نہیں بدلا.....'' ٹام یوسٹس نے چہکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہی ذائقہ، وہی لطف..... مس میک! آپ کی ریسیپز زبردست ہیں۔''

''مس میک کے ہاتھ میں جولذت ہے، وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی۔'' ایمریٹا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ اپنی ریسیپز کو چھپا کر رکھتی ہیں۔ اگر یہ میرے اسکول میگزین کے لیے ایک آدھ ریسپی دے دیتیں تو ان کی شہرت اس علاقے سے نکل کر پورے ملک میں پھیل چکی ہوتی۔''

''میں مس میک کو طویل عرصے سے جانتا ہوں۔'' اٹارنی چارلی نے کہا۔ ''ان کی ریسیپز کے پیچھے تو کوئی ''کک بک'' والے بھی ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ اگر یہ چاہتیں تو اپنا گھریلو میگزین بھی نکال سکتی تھیں مگر وہی بات کہ یہ اپنے راز کو ''راز'' ہی رکھنا چاہتی ہیں۔''

''لیکن اب میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا ہے.....'' مس میک نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

سب نے چونک کر، بے یقینی سے مس میک کی طرف دیکھا۔ ایمریٹا پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''تو کیا آپ نے اپنی ریسیپز کو پبلش کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے..... میرا مطلب ہے، کسی ''کک بک'' کی شکل میں؟''

''نہیں!'' مس میک نے نفی میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔ ''آج میں نے یہ ساری ڈشز کلوٹلڈ کی مدد سے تیار کی ہیں۔ مطلب یہ کہ میں نے صرف نگرانی کی ہے اور یہ سب کا سب کھانا میری ہدایات پر کلوٹلڈ نے تیار کیا ہے۔ اگر میں اس دنیا میں باقی نہیں بھی رہوں تو آپ لوگوں کو یہ مزے دار ڈشز کھانے کو

ملتی رہیں گی کیونکہ میں نے اپنی ریسیپیز والا باکس بھی کلوٹلڈ کے سپرد کر دیا ہے۔''

مہمانوں نے پہلے تو معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ حیرت اور بے اعتباری کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مس میک کو تکنے لگے۔ ٹام یوسٹس نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

''کیا واقعی مس میک.....؟''

مس میک نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ایمریٹا نے سوالیہ نظر سے کلوٹلڈ کی طرف دیکھا تو کلوٹلڈ نے ذومعنی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی مالکن کے بیان کی تائید کر دی۔

اس موقع پر رینی کی حالت دیدنی تھی۔ وہ سارا دن کلوٹلڈ اور مس میک کے ساتھ کام میں مصروف رہی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ کچن کا کام ان دونوں نے سنبھال رکھا تھا لیکن مس میک نے ریسیپیز والا باکس کب کلوٹلڈ کے حوالے کیا، یہ بات وہ نہیں جانتی تھی اور مس میک نے بھی اس سے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ یہ سنسنی خیز انکشاف تو ابھی ڈائننگ ٹیبل پر ہوا تھا۔

ایمریٹا، ٹام، چارلی میں سے ہر کوئی مس میک کے اس فیصلے کو ستائش کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ کلوٹلڈ بھی بہت زیادہ خوش دکھائی دے رہی تھی۔ مس میک نے اپنے مہمانوں کے سامنے اس کی جو عزت افزائی کی تھی، وہ کلوٹلڈ کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی۔

رینی کی ذہنی کیفیت سب سے مختلف تھی۔ کلوٹلڈ اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ پچھلے دو سال میں اس نے کلوٹلڈ کو اس گھر سے نکلوانے کے لیے اپنا ہر حربہ آزمایا تھا حتیٰ کہ اس پر مختلف چیزوں کی چوری کے الزامات کے علاوہ مس میک کو، ہولنڈیز ساس میں زہر ملا کر ہلاک کرنے کا ایشو بھی اٹھایا تھا مگر مس میک نے کلوٹلڈ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی اور..... اب تو مس میک نے اپنی ریسیپیز والا چوبی باکس بھی کلوٹلڈ ہی کو دے دیا تھا۔

''بڑھیا! یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا.....'' مس میک کے لیے اس کے دل میں پہلی مرتبہ نفرت کا جذبہ جاگا۔ ''میں نے ساری زندگی تمہاری خدمت کی اور تمہاری ساری عنایات کا رخ اس جمعہ جمعہ آٹھ دن سے آئی ہوئی معمولی نوکرانی کی طرف ہے۔ میں اس ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتی۔''

رینی کے دماغ میں اس وقت ایٹمی دھماکے ہو رہے تھے۔ یہ تابکاری اس کے دل و دماغ کو کھا رہی تھی مگر وہ چپ چاپ کھڑی سب کو دیکھ رہی تھی۔

ڈنر کے بعد مہمان ایک، ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ سب سے آخر میں مس میک کا اٹارنی مسٹر چارلی کٹلر گیا تھا اور جانے سے پہلے اس نے اسٹڈی میں بند ہو کر مس میک سے خفیہ میٹنگ بھی کی تھی۔

اس دوران میں رینی اور کلوٹلڈ ڈائننگ ٹیبل پر سے برتن اٹھانے اور بچا ہوا کھانا سنبھالنے میں مصروف رہی تھیں۔ رینی نے کلوٹلڈ کو اتنا زیادہ خوش پچھلے دو سال میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت رینی کا دھیان کلوٹلڈ پر نہیں بلکہ اسٹڈی پر لگا ہوا تھا اور اس کے دماغ میں صرف یہی سوچ چل رہی تھی۔

''کہیں مس میک اپنے اٹارنی سے کوئی وصیت وغیرہ تو تیار نہیں کروا رہیں.....؟''

☆☆☆

اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز اور سنسنی آمیز تھی۔ پولیس کی گاڑی اور ایمبولینس کے سائرنز نے وہاں کے مکینوں کو وقت سے پہلے بیدار کر دیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے تھے اور ان سائرنز کے شور کا سبب جاننے کے لیے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ سب کا رخ ایک ہی سمت تھا اور وہ تھا مس میک کا دو منزلہ مکان.....!

مکان کے سامنے، ہلال کی شکل کے ڈرائیو وے میں ایک ایمبولینس اور ایک پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ سائرن کی آواز کا ماخذ یہی گاڑیاں تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں درجن بھر افراد جمع ہو گئے تھے اور ہر کوئی اپنی سوچ کے مطابق تبصرہ کر رہا تھا۔

''لگتا ہے، مس میک نے اپنی اسٹڈی میں خودکشی کر لی ہے۔''

''وہ کل رات ڈنر کے وقت کافی بدلی ہوئی لگ رہی تھی اور ڈھکے چھپے الفاظ میں اس نے اپنی موت کا ذکر بھی کیا تھا کہ..... جب میں اس دنیا میں باقی نہیں رہوں گی تو انہیں مزے دار ڈشز کھانے کو ملتی رہیں گی.....!

''تنہائی بہت بڑا عذاب ہے۔ مس میک نے عمر بھر شادی نہیں کی اور ملازماؤں کے سہارے وقت کو دھکا دیتی رہی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ اسی بے بسی اور احساس محرومی سے تنگ..... آ کر اس نے اپنی جان لے لی.....!''

''یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ جوانی میں، مس میک نے

بڑا دھانسو قسم کا عشق کیا تھا مگر اس کا محبوب بے وفا نکلا۔ وہ مس میک کو چھوڑ کر کسی اور عورت کا ہو گیا۔ اسی صدمے نے مس میک کو ایک انتہائی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا..... کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ!

الغرض، جتنے منہ اتنی باتیں..... وہاں موجود ہر شخص جو کچھ بھی بول رہا تھا، اس کے تبصرے کا فوکس مس میک کی موت پر ہی تھا۔ ان چہ میگوئیوں اور مختلف آرا کو اس وقت بریک لگ گئے جب دو پولیس والے ایک اسٹریچر اٹھائے مس میک کے گھر سے باہر نکلے۔

اسٹریچر پر موجود جسم کو سفید چادر سے اچھی طرح ڈھانپ دیا گیا تھا۔ پولیس والے اسٹریچر کو لے کر ایمبولینس کی جانب بڑھ گئے۔ وہاں موجود افراد میں سے کوئی بھی نہیں دیکھ سکا کہ مذکورہ اسٹریچر پر کون تھا لیکن سب کا خیال یہی تھا کہ وہ مس میک کی لاش کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

جب اسٹریچر کو ایمبولینس میں رکھ دیا گیا تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسپتال کی جانب روانہ ہو گئی۔ وہاں موجود لوگوں کی نگاہیں ایک بار پھر مس میک کے گھر کے داخلی دروازے کی سمت اٹھ گئیں کیونکہ دو پولیس والے رینی کے ساتھ مذکورہ دروازے سے نمودار ہوئے تھے۔

رینی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور وہ گردن جھکائے پولیس والوں کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس حیرت انگیز صورتِ حال نے لوگوں کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اب اُن کی سوچ کا ملا جلا رجحان کچھ اس طرح تھا۔

''مس میک نے خودکشی نہیں کی بلکہ رینی نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور اس کا سبب ہے، ریسیپر والا چوبی باکس جس پر رینی اپنا حق سمجھتی تھی لیکن مس میک نے وہ باکس کلوٹلڈ کے حوالے کر دیا تھا..... اب رینی کی باقی زندگی جیل میں گزرے گی اور مس میک کی تمام جائداد کلوٹلڈ کے حصے میں آئے گی.....!

لوگوں کی یہ سوچ اس وقت باطل ہو گئی جب انہوں نے مس میک کو زندہ سلامت گھر سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس کے پہلو میں ایک پولیس آفیسر بھی تھا۔ مس میک نے وہاں جمع لوگوں پر طائرانہ نظر ڈالی۔ ان میں سے بہت سوں کو وہ جانتی تک نہیں تھی۔ پولیس آفیسر نے مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے مس میک کا بیان قلم بند کرنا ہے۔ اس موقع پر پڑوسیوں میں سے کسی کا موجود رہنا ضروری ہے۔ تم میں سے کوئی ایک اندر آ جائے۔''

لورین بارٹل اسکول کی پرنسپل ایمریٹا نے پہل کی۔ پھر وہ تینوں اندر اسٹڈی میں جا بیٹھے۔ ایمریٹا نے سب کے لیے چائے بنائی تھی۔ مس میک نے پولیس آفیسر کو جو بیان دیا، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

''رینی اور کلوٹلڈ مہمانوں کے جانے کے بعد کچن میں مصروف ہو گئی تھیں۔ میں بہت زیادہ تھک گئی تھی اس لیے مہمانوں کے جانے کے بعد میں آرام کرنے اپنے بیڈروم میں چلی گئی تھی لیکن میں نے ان دونوں کو ہدایت کر دی تھی کہ سونے سے پہلے کچن کو لازمی کلیئر کرنا ہے۔ جھوٹے برتنوں کو سنک میں پڑا دیکھنا مجھے بالکل پسند نہیں ہے اور میری اس عادت سے وہ دونوں اچھی طرح واقف تھیں اس لیے وہ برتن دھونے میں جُت گئی تھیں۔ گاہے بگاہے، مجھے برتنوں کے ٹکرانے اور ٹوٹنے کی آوازیں آتی رہیں اور مجھے یقین تھا کہ چینی کے قیمتی برتنوں کی یہ توڑ پھوڑ رینی ہی کا کارنامہ ہو گا۔ جب سے میں نے ریسیپر والا باکس کلوٹلڈ کو دینے کی بات کی تھی، رینی کے تیور ہی بدل گئے تھے۔ وہ مجھ سے خفا نظر آ رہی تھی۔ میں یہ سوچ کر سو گئی کہ صبح رینی کو بتاؤں گی کہ جن نایاب فرانسیسی برتنوں کا تم نے کباڑا کیا ہے، وہ تو میں نے تمہیں گنٹ کرنے کا سوچ رکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک تگڑی رقم بھی..... مگر..... مگر مجھے کیا پتا تھا کہ..... اس رات کی صبح کتنی بھیانک ہو گی۔ ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ حسد اور جلاپے کے احساس سے مغلوب ہو کر رینی، کلوٹلڈ کو موت کے گھاٹ اتار دے گی..... مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ رینی کا مجرم ذہن اس انتہا کو بھی چھو سکتا ہے.....!''

بولتے بولتے مس میک کی آواز رُندھ گئی۔ اس موقع پر ایمریٹا نے اسے جذباتی سہارا دیا۔ پولیس آفیسر نے اپنی نوٹ بک بند کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مجرم ذہن شعوری اور لاشعوری طور پر جرم کے بارے ہی میں سوچتا ہے۔ چاہے وہ معمولی اشیا کی چوری ہو یا پھر کسی انسان کی جان لینا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا.....!

❖❖❖

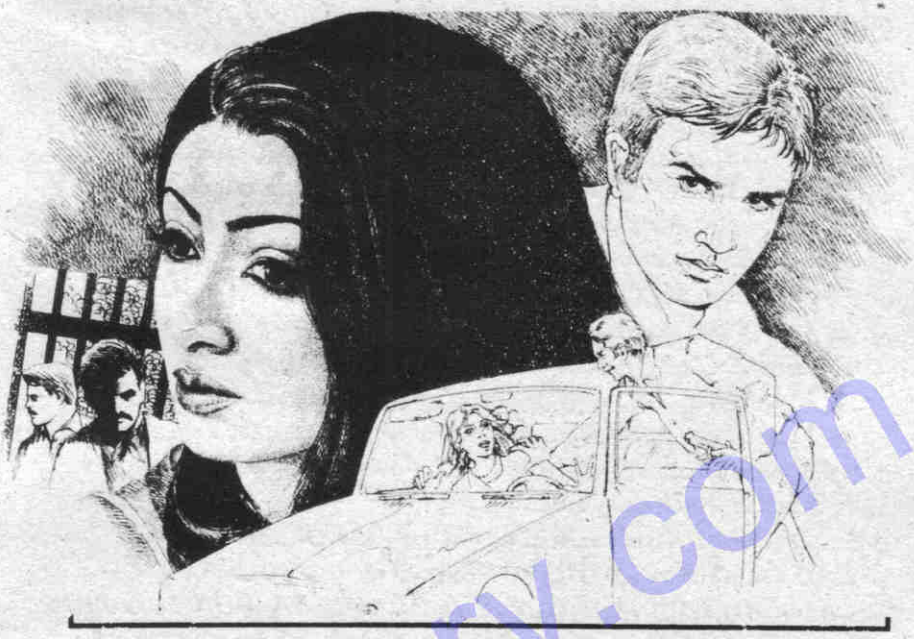

قسط نمبر 16

دہر

حسام بٹ

کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانۂ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے ان مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا بحرِ بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصدِ حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کارزارِ فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیقِ سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ذہن دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار ذہنوں کی ہوش ربا حیلہ سازیاں

pklibrary.com

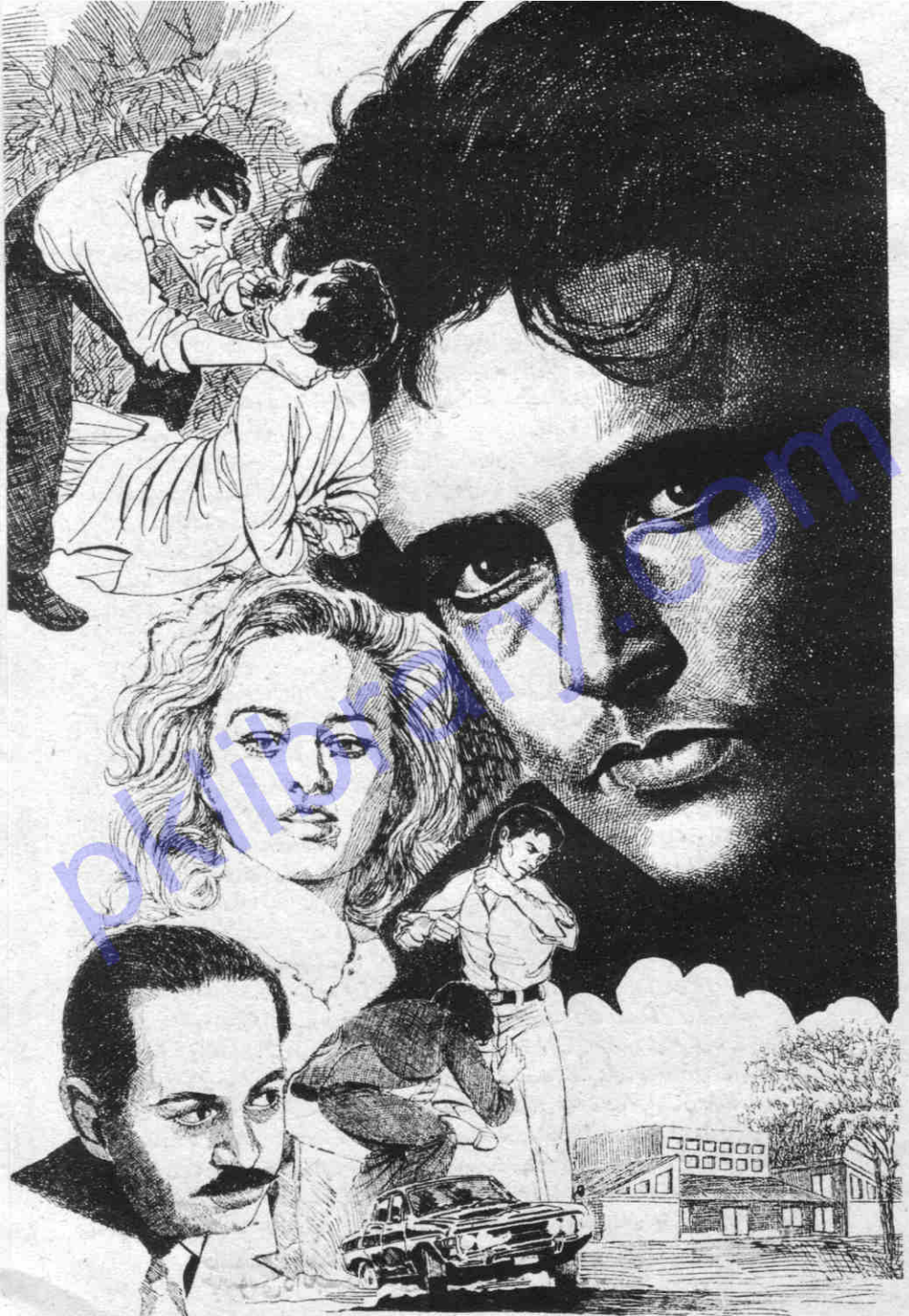

pklibrary.com

جاسم کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ لڑکپن میں قدم رکھنا قیامت صغریٰ کا پیغام بر ثابت ہوا۔ اس کے والد قاسم باری نے مقامی غنڈوں کے خلاف پولیس کی مدد کی تو یہ چھوٹی سی ٹیلی طوفان کی زد میں آگئی۔ ایک رات اسی گینگ کے چند لوگوں نے گھر میں گھس کر جاسم کی والدہ اور والد پر قاتلانہ حملہ کر دیا جس میں ماں ہلاک ہوگئی اور شدید زخمی باپ کو پرائیویٹ اسپتال پہنچا دیا گیا۔ قاسم کا علاج شروع کرنے کے لیے پانچ لاکھ کی ضرورت تھی۔ جاسم نے مدد کے لیے اپنے اکلوتے ماموں جلیل کی طرف دیکھا۔ جلیل نے اس شرط پر رقم کا انتظام کر دیا کہ جاسم کو ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں کچھ عرصے کے لیے جیل جانا پڑے گا۔ جاسم کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے ماموں کی بات مان لی۔ اپنے باپ کی زندگی بچانے کے لیے وہ تیرہ سال کی عمر میں آٹھ سال کے لیے جیل چلا گیا۔ قید و بند کی اس زندگی میں دو افراد نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش مراد علی تھا جسے سب دادا کہتے تھے۔ دوسرا کارل مارکس کا پیروکار ایک صحافی انور بیگ تھا جو کامریڈ کہلاتا تھا۔ دادا اور کامریڈ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن دونوں ہی کی جاسم پر گہری نگاہ تھی۔ وہ جاسم کی پتا سے واقف تھے اس لیے وہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق اس کی ذہنی اور جسمانی تربیت میں لگ گئے۔ کامریڈ نے جاسم کی زبان کو تلوار اور دادا نے اس کے ہاتھ پاؤں کو موت کی للکار بنا دیا۔ دادا نے اپنے بندوں کے ذریعے پتا لگا لیا تھا کہ جاسم کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے پیچھے راجو نامی ایک گینگسٹر کا ہاتھ ہے اور یہ بھی کہ جلیل ماموں نے جاسم کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس نے پانچ لاکھ اپنی جیب میں ڈالے اور قاسم باری کو مرنے کے لیے چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ دادا اتنا طاقتور بدمعاش تھا کہ وہ جیل میں بیٹھ کر بھی باہر کے معاملات کو چلاتا رہتا تھا۔ جلیل تو منظر سے ہٹ چکا تھا لیکن راجو تک پہنچنے کے لیے دادا نے جاسم کی مدد کی۔ اسے اپنے معتمد خاص کامل کے ساتھ چند گھنٹے کے لیے جیل سے باہر بھیجا۔ جاسم نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجو کو زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا محتاج بنا دیا۔ دادا کا جیل سے باہر جانا لگا رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے گیا تو اس کے ایک دیرینہ دشمن شعیب چاچا نے اسے اور اس کی بیٹی و بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دادا کی موت نے جاسم کو حد درجہ افسردہ کر دیا۔ بہرحال وہ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد جیل سے باہر آیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک تربیت یافتہ کڑیل جوان تھا اور اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا اور اسی آغاز پر ایک مہ جبیں سے اس کا تعارف ہوگیا۔ ناجیہ ایک پروڈکشن ہاؤس میں ایسوسی ایٹ پروڈیوسر تھی۔ وہ جاسم کی فائٹنگ اسکلز سے حد درجہ متاثر ہوئی اور اس نے جاسم کو رنگ و نور کی دنیا سے روشناس کرا دیا۔ جاسم کو پتا چلا کہ شعیب چاچا معاشرے میں ایک کامیاب ایکسپورٹر کی حیثیت سے عزت کی زندگی گزار رہا ہے لیکن در پردہ وہ ڈرگز، ناجائز اسلحہ، انسانی اعضا کی فروخت اور نوعمر لڑکیوں کے اغوا جیسے مذموم کاموں میں ملوث ہے۔ اس مکروہ کاروبار میں بعض بااثر افراد اس کے ساتھ ہیں اور اسے بین الاقوامی کارٹلز کا تعاون بھی حاصل ہے۔ دونوں دوستوں نے مضبوط منصوبہ بندی سے شعیب چاچا کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ دوسری سمت جاسم کا شوبز کا کام بھی جاری تھا اور اسے چند روز کے بعد ایک سیریل کی شوٹ کے لیے استنبول جانا تھا اس سے پہلے اس نے راجو کو بھی حسرت ناک موت سے ہمکنار کیا تھا۔ یہ سنسنی خیز ہنگامے چل رہے تھے کہ کسی ڈیوڈ نامی شخص نے بڑے پراسرار انداز میں جاسم سے رابطہ کیا اور اسے اپنے کسی ری ایلیٹی ٹی وی میں، بھاری معاوضے پر شرکت کی دعوت دی۔ یہ وہی وقت تھا جب جاسم اپنے یونٹ کے ساتھ استنبول جانے والا تھا۔ ڈیوڈ کا رویہ اتنا پراسرار اور خطرناک تھا کہ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ کوئی مخالف پروڈیوسر ڈیوڈ بن کر جاسم کو اپنے ٹریک سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جلد ہی جاسم کو اندازہ ہوگیا کہ ڈیوڈ ایک انتہائی طاقتور اور بااختیار شخص ہے۔ ڈیوڈ نے ناجیہ کو اغوا کر کے جاسم کو اپنے ری ایلیٹی ٹی وی میں کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ دونوں کی ملاقات استنبول میں طے ہوگئی۔ جاسم کا پروڈیوسر تمام حالات سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ اس نے اپنے سیریل میں جاسم کا رول ایک دوسرے کردار حمیم کو دیا اور جاسم کو یونٹ کے ساتھ استنبول روانہ کر دیا۔ پروڈیوسر سرمد صدیقی ناجیہ کے باپ غفار داؤد کا دوست تھا اس لیے صدیقی کی نظر میں اپنے سیریل سے زیادہ ناجیہ کی زندگی اور اس کی محفوظ واپسی کی اہمیت تھی۔ ڈیوڈ نے جاسم کو ہدایت کی تھی کہ جب وہ استنبول میں ری ایلیٹی ٹی وی کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دے گا تو اس کی دوست نما محبوبہ کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈیوڈ کا وہ ری ایلیٹی ٹی وی ایک میگا پروجیکٹ تھا جس کی تمام تر شوٹنگ پراسرار سرزمین مصر میں ہونے والی تھی۔ ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق، جاسم کو استنبول پہنچ کر اس کے خاص آدمی بن عرفات سے ملاقات کرنا تھی۔ جاسم استنبول کے ایک معروف مقام گلاتا برج کے نیچے بنے ہوئے زینان نامی ایک یونانی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں بن عرفات ماسٹر شیف کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بن عرفات نے جاسم کے خون سے مذکورہ کنٹریکٹ پر دستخط کرا لیے اور وعدے کے مطابق، اسے ناجیہ کی رہائی کی خوش خبری سنا دی۔ جاسم نے فون پر ناجیہ سے بات کر کے اس امر کی تسلی کر لی کہ وہ بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ اب وہ محفوظ سائڈ پر تھا لہٰذا اس نے ڈیوڈ کے پروجیکٹ میں کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ڈیوڈ نے بن عرفات کے توسط سے جاسم کو اٹا غفیل کر کے ایک کروز شپ پر پہنچا دیا۔ جب جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بڑے بحری جہاز پر پایا۔ بعد ازاں ڈیوڈ نے ایک مرتب پھر جاسم

سے پُراسرار انداز میں سیلولر رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ کروز شپ استنبول سے مصر کی بندرگاہ، پورٹ سعید تک جائے گا۔ پھر اس کے آدمی جاسم کو پورٹ سعید سے بہ ذریعہ جیپ قاہرہ پہنچا دیں گے جہاں پر اس ری ایلیٹی ٹی وی کی افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا جائے گا۔ ڈیوڈ نے ری ایلیٹی ٹی وی کی شوٹنگ سے پہلے ہی جاسم کے ساتھ شکار اور شکاری کا جو کھیل شروع کر دیا تھا، جاسم اسے انجوائے کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ڈیوڈ کی ہوشیاری کے سبب جاسم اس کا کھیل سمجھنے سے قاصر تھا۔ ڈیوڈ نے ہر ٹیم کو بریف کر دیا تھا۔ مصر کے حرم سے انہیں ایک صندوق حاصل کرنا تھا۔ جاسم کی مدد ایک جن زادی کر رہی تھی۔ کچھ ممبران زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور باقی ہارنے والے تھے۔ جاسم کا رخ استنبول کی جانب تھا۔ دوران سفر انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا جہاز ہائی جیک کر لیا گیا ہے۔ جاسم اس صورت حال سے نمٹنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنی خفیہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہائی جیکرز کو زیر کرتے ہوئے صورت حال کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ہائی جیکرز کا ٹارگٹ استنبول کے جسٹس طلال حسنی تھے۔ جن سے وہ اپنی مرضی کا فیصلہ لینا چاہتے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ بڑے نازک اور سنسنی خیز لمحات تھے۔ دروازہ بجانے والے نے راشد فیضی کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کر کے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ اس کے بعد استنبول کی پولیس کو ذمے داری کا ثبوت دینا تھا اور وہ اس ''کام'' میں تندہی سے جتے ہوئے تھے۔ ان کے، فیضی کے فلیٹ تک پہنچنے سے پہلے جاسم کو بھی ایک اہم کام سرانجام دینا تھا..... استنبول پولیس کو خود سے دور رکھنے کا کام۔

جاسم نے طلال حسنی کو فون کرنے کے لیے سیل فون پکڑا ہی تھا کہ اس کے سیل پر حسنی کی کال آنے لگی۔ اس نے فوراً کال پک کر لی۔

''یس سر!'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔

''مائی سن! تم لوگ کافی دیر سے نکلے ہوئے ہو اور اب آدھی رات ہو رہی ہے۔'' حسنی نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''ہم دونوں عافیت سے ہیں سر!'' جاسم نے کہا۔ ''ایک دوست نما دشمن سے کچھ حساب کرنا تھا اس لیے گلاٹا برج کے قریب والے سلم ایریا میں آئے ہوئے ہیں۔ اچھا ہوا، آپ نے فون کیا۔ ہمیں قاموس صاحب کی فیور چاہیے۔ کیا میں انہیں کال کر سکتا ہوں؟''

''تمہیں کال کرنے کی ضرورت نہیں مائی سن۔ قاموس ترک اس وقت میرے پاس ہی بیٹھا ہوا ہے۔'' حسنی نے توانا لہجے میں جواب دیا۔ ''لو، ان سے بات کر لو۔''

اگلے ہی لمحے جاسم کی سماعت سے قاموس ترک کی آواز ٹکرائی۔ ''ہاں، پاکستانی جاں باز! بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''سر! کیا گلاٹا برج کے نواحی سلم ایریا (جھونپڑ پٹی) میں پولیس کا سرچ آپریشن چل رہا ہے؟'' جاسم نے پوچھا۔

''بالکل!'' قاموس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''صرف گلاٹا برج ہی نہیں بلکہ استنبول کے تمام سلم ایریاز میں پولیس بیک وقت کریک ڈاؤن میں مصروف ہے اور یہ ہنگامی کارروائی عدنان طوسی کے حوالے سے ہے۔ اس کی پھانسی کے بعد گینگ کے اندر خاصی بدامنی اور اشتعال دیکھنے کو مل رہا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ استنبول میں ان کی طرف سے امن و امان کے لیے کسی قسم کا خدشہ پیدا ہو اسی لیے ''ریڈ'' کا یہ عمل جاری ہے۔ خیر.....!'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ان استفسار یہ الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کروں؟''

''میں اور کامل اس وقت گلاٹا برج کے نزدیک ایک سلم ایریا میں ہیں جہاں پولیس گھر گھر گھس کر خانہ تلاشی کے عمل میں مصروف ہے۔'' جاسم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''پندرہ بیس منٹ میں ہمارا کام نمٹ جائے گا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ پولیس ہمارے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ اس بات کا اطمینان رکھیں کہ ہم کسی غلط کام میں مصروف نہیں ہیں۔''

''مجھے تم دونوں پر پورا بھروسا ہے۔'' قاموس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''صاحب خانہ کا نام کیا ہے؟''

''راشد فیضی'' جاسم نے بتایا۔ ''فیضی کا تعلق بھی کراچی سے ہے۔ کامل اسی کے پاس ٹھہرنے والا تھا اور یہ بدبخت کامل اور ناجیہ کو دو لاکھ مصری پاؤنڈز کے عوض ایک بردہ فروش کے ہاتھ فروخت کرنے والا تھا۔ میرے ساتھیوں کی خوش قسمتی کہ وہ اس کمینے کے چنگل سے نکل آئے۔ اب آپ ہی بتائیں سر! راشد فیضی کو تھوڑا بہت سبق سکھانا تو بنتا ہے نا؟''

''تم لوگ وہ نیک کام جاری رکھو۔'' قاموس نے

pklibrary.com

''ہم ایک سُپر پاور کو اپنا آلہ کار بنا کر دوسری سُپر پاور کی عوام کے اندر ایک خطرناک وائرس کو پھیلا دیں گے۔''
سلور کوئین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مذکورہ وائرس انسان کے پھیپھڑوں میں پہنچ کر اس کی سانس کو روک دے گا جس کے نتیجے میں سیکڑوں نہیں، بلکہ ہزاروں اموات ہونے لگیں گی لیکن متاثرہ ملک جلد ہی اس وبا پر نہ صرف قابو پالے گا بلکہ اس کی ویکسین تیار کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے گا لیکن اس دوران میں پھیپھڑوں کا یہ پُراسرار مرض پوری دنیا میں پھیل چکا ہوگا، سوائے بارہ ملکوں کے۔ ان بارہ ممالک میں سے دس جزیرہ ملک بحرالکاہل میں، ایک جزیرہ ملک بحراوقیانوس میں اور ایک ایشیا میں، خشکی پر پایا جانے والا ملک ہوگا۔ ایسا کیوں اور کیسے ہوگا..... اس راز کو جاننے کے لیے آپ کو پہلے مرحلے کی تکمیل تک انتظار کرنا ہوگا۔ ابھی میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتانا چاہوں گی۔'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

''وہ سُپر پاور جسے ہم آلہ کار بنا کر اپنی اس مہم کے پہلے مرحلے کا آغاز کریں گے، سب سے زیادہ اموات اسی ملک کے حصے میں آئیں گی یعنی یہ خطرناک وائرس اس سُپر پاور کے پندرہ لاکھ انسانوں کی جان لے گا۔ ایک بات ذہن نشین کرلیں کہ ہماری مہم کے پہلے مرحلے میں ہلاک ہونے والے یہ ایک کروڑ افراد اپنی ذات، اپنے ملک اور اپنی فیملی کے لیے چاہے کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں مگر ہماری نظر میں یہ کیڑے مکوڑوں سے زیادہ وقعت کے حامل نہیں ہیں۔ کسی بھی بُرے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جانوں کی قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ جان آپ کی ہے یا آپ کے دشمن کی.....!'' وہ ایک مرتبہ پھر تھمی، گہری نظر سے اولیور، نارمن اور جیکب کو دیکھا پھر چٹانی لہجے میں کہا۔

''گریٹر اسرائیل بن کر رہے گا۔ ڈیوڈ کنگڈم (سلطنتِ داؤدی) کا قیام ناگزیر ہے۔ ہم اپنے مسیحا سے وعدہ کرتے ہیں کہ ان کی توقعات پر پورا اتریں گے اور..... اس کے ساتھ ہی یہ مجلس برخاست کی جاتی ہے۔''

سلور کوئین نے جو کہنا اور سننا تھا، وہ اپنا کام کر کے اس مجلس سے اٹھ گئی تھی۔ اس کی طاقت، اختیار اور بندگیِ دجال میں تو کوئی کلام نہیں تھا لیکن اس کے یہ تین کھوسٹ معاونین بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ یہ اتنے زیرک، ذہین اور پہنچے ہوئے تھے کہ انہوں نے جاسم کے معاملے میں اس کے کسی نادیدہ اور پُراسرار مددگار کا سراغ لگا لیا تھا..... چاہے سوچ کی حد تک ہی سہی۔

☆☆☆

اتوار چوبیس تاریخ کی صبح لگ بھگ پانچ بجے جاسم کی آنکھ کھل گئی۔ گزشتہ رات وہ بہت دیر سے سویا تھا اور ارادہ یہی تھا کہ اگلی صبح تاخیر سے بیدار ہوگا۔ ہفتے کا دن کامل اور جاسم کے لیے حد درجہ مصروف اور مار دھاڑ سے بھرپور گزرا تھا جس نے جاسم کو بُری طرح تھکا دیا تھا۔ اس پر مستزاد، پچھلی رات اس کی نیند بھی پوری نہیں ہو پائی تھی۔ اسی صورتِ حال نے اسے دیر تک سو کر اپنی تھکن اتارنے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن دو، ڈھائی گھنٹے کے بعد ہی جب اس کی آنکھ کھل گئی تو اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ اس دماغی کیفیت کا سبب کچی نیند سے اٹھ جانا نہیں تھا بلکہ وہ پُرمعنی، عجیب و غریب اور سنسنی خیز خواب تھا جو اس نے اس مختصر سی نیند کے دوران میں دیکھا تھا۔

جاسم، ہابو ٹیمپل کے دور اُفتادہ حصے میں واقع، اونچی چھت والے ایک پتھر زاد کمرے میں ایشتار کے گرو ''ظل ہطیا'' کے رُوبرو سنگی فرش پر براجمان تھا۔ وہ پہلے بھی یہاں آچکا تھا۔ ایشتار اسے اپنے ساتھ کرشماتی سفر کراتے ہوئے ہوٹل فیروز (فے روز) سے اس کمرے تک لائی تھی جہاں ظل ہطیا نے جاسم کو ٹریکنگ ڈیوائس سے نجات دلائی تھی۔

اس وقت ایشتار آس پاس کہیں بھی موجود نہیں تھی۔ جاسم کے سامنے ساڑھے چار سو سالہ جوان بزرگ، ظل ہطیا گوتم بدھ کی پوزیشن میں بیٹھا ٹھہری ہوئی مہربان نظر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جاسم پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''ایش کہاں ہے.....؟''

''ایشتار ایک اہم کام میں مصروف ہے اس لیے میں تم سے بات کر رہا ہوں۔'' ظل ہطیا نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''ویسے بھی کچھ معاملات ایسے ہیں جن میں ایشتار کو بات کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اب میں تم سے جو کہنے جا رہا ہوں، اسے توجہ سے نہ صرف سننا بلکہ ذہن نشین بھی کرنا ہے۔''

''جی گرو!'' جاسم نے فرمانبرداری سے کہا۔

جاسم جب چند روز پہلے ایشتار کی ''ہمراہی'' میں یہاں آیا تھا تو اس نے ظل ہطیا کے چہرے پر جھریوں کا جال دیکھا تھا اور اس کی کمر بھی قدرے جھکی ہوئی تھی لیکن اس وقت وہ تروتازہ اور صحت مند دکھائی دے رہا تھا۔ اگر یہ ''باباجی'' ساڑھے چار سو سال کے تھے تو اس حساب سے وہ

آٹھ، نو سال کی نظر آنے والی ایشتار کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو سال کی تو ہوگی۔ پتا نہیں، یہ بادی مخلوق کون سی بُرودت اور مقوی غذائیں کھاتے تھے کہ بڑھتی ہوئی عمر ان پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔

''ایشتار نے تمہیں، ہمارے بارے میں ابتدائی معلومات تو دے دی ہیں لیکن میں آج چند اہم راز تم پر آشکار کرنے جا رہا ہوں۔'' ظل ہطیا کی مخصوص آواز جاسم کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''ہمارا تعلق دراصل فیٹن (فے ٹن) نامی ایک سیارے سے ہے۔ فیٹن لاکھوں سال پہلے تمہارے سیارے زمین اور سیارہ مشتری کے درمیان اپنی مخصوص گردش جاری رکھے ہوئے تھا۔ آج تم لوگ جس سیارے کو مریخ کہتے ہو، یہ درحقیقت ہمارے فیٹن کا چاند ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں تم لوگ اپنے اور ہمارے چاند پر آباد ہونے کی خلائی کوششوں میں مصروف ہو۔ ہمیں تمہاری ان کارروائیوں پر کوئی اعتراض نہیں۔ سارے سیارے اسی مالک کی تخلیق ہیں جو ہم سب کا معبود اور خالق ہے۔ ہم یعنی ہمارے اجداد بھی کبھی فیٹن کو چھوڑ کر تمہاری اس زمین پر آبسے تھے اور یہ اُس وقت کی ہماری سب سے بڑی مجبوری تھی۔''

ظل ہطیا سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما تو جاسم نے فوراً سوال داغ دیا۔ ''آپ نے جس فیٹن نامی سیارے کا ذکر کیا ہے، وہ آج ہمارے نظام شمسی میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ میں جاننا چاہوں گا کہ آپ کا فیٹن کہاں غائب ہو گیا؟''

''میں یہی سب تمہیں بتانے والا ہوں اس لیے تم خاموشی سے سنو۔ اگر تم بیچ میں سوال اٹھاتے رہو گے تو اس سے وقت برباد ہوگا اور میرے پاس وقت ہی تو نہیں ہے۔ اپنی آسانی کے لیے سمجھ لو کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔''

بات کے اختتام پر ظل ہطیا کا چہرہ متغیر ہو گیا جیسے کسی اندرونی تکلیف نے اسے بے چین کر دیا ہو لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''آئی ایم سوری!'' جاسم نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ کی بات مکمل ہونے سے پہلے نہیں بولوں گا۔''

''شاباش! تم بہت اچھے ہو اسی لیے ہم نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔'' ظل ہطیا نے ستائشی نظر سے جاسم کو دیکھا۔ ''ہمیں یقین ہے کہ ہمارا یہ انتخاب صد فیصد درست ہے۔ تم بھاری ذمے داری اٹھانے کے اہل ہو۔ ہمارا فیصلہ غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تمہیں بھی سوال کرنے کا پورا موقع دوں گا لیکن اُس وقت جب تمہارے موجودہ حالات کا ذکر ہوگا۔ فی الحال، تمہیں ہسٹری کو توجہ سے سننا اور اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا ہے۔''

''سمجھ گیا.....'' جاسم نے مختصراً کہا۔

''ہم لوگوں میں جھوٹ بولنے کی عادت بہت پختہ ہو گئی تھی۔'' ظل ہطیا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لہٰذا ہم پر اللہ کا عذاب نازل ہوا اور ہمارے سیارے فیٹن کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ تم خاکی مخلوق تو قسمت والے ہو کہ آج سے پہلے کی تمام اقوام کے خصائل بدمجموعی طور پر تمہارے اندر موجود ہیں لیکن پھر بھی تم صحیح سلامت جیے جا رہے ہو، خیر.....'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا

''یہ جو آج تمہیں مریخ اور مشتری کے بیچ کوہ ہمالیہ کے سائز سے بھی کہیں بڑے ایسٹرونڈز خلا میں تیرتے نظر آتے ہیں، یہ سب ہمارے سیارے فیٹن ہی کے ٹکڑے ہیں۔ ہمارا پلینٹ تو تباہ ہو گیا مگر یہ ایسٹرونڈز (کشودر گرہیں) اپنے خالق و مالک کے حکم پر محوِ گردش ہیں۔ ان میں سے اگر ایک بھی ''ٹکڑا'' سیدھا آ کر زمین سے ٹکرا گیا تو سمجھ لو، تمہاری کہانی ختم.....!''

جاسم نے ایسٹرونڈز وغیرہ کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔ اس کے ذہن میں درجنوں سوالات سر اٹھا رہے تھے مگر چونکہ فی الحال اس کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ خاموش رہا۔

''جب ہمارے سیارے پر اللہ کا قہر نازل ہوا تو اٹھانوے فیصد سے زیادہ لوگ لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ جو دو فیصد موت کو غچا دینے میں ''کامیاب'' رہے، ان میں سے بعض نے مشتری کا رخ کیا اور بعض ہماری طرح اس کرۂ ارض پر آ گئے۔ یقیناً تمہارے دماغ میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ ہمارے پاس، ایک سیارے سے دوسرے سیارے تک سفر کرنے کا کیا ''بندوبست'' تھا؟ تو سن لو کہ آج تم ترقی کے جس مقام کو اوجِ ثریا سمجھ رہے ہو، یہ تو ہمارے قدموں کی دھول ہوا کرتا تھا۔ ہماری قوم کو انٹرڈائمینشن (بین السیارگان) سفر کے لیے راکٹس وغیرہ کی ضرورت نہیں آتی تھی بلکہ ہم یہ کام پورٹلز کے ذریعے بہ آسانی کر لیا کرتے تھے۔ خیر ہم نے تمہاری اس زمین پر آنے کے بعد اپنے لیے ان علاقوں کا انتخاب کیا جہاں ماضی کی قدیم تہذیبیں اپنے

pklibrary.com

گہرے اثرات چھوڑ کر گئی تھیں۔ میرا اشارہ میسوپوٹیمیا، اسیریا، مایین، ہیلون، انکا، ایبیشن انڈین، رومن اور انڈس ویلی (وادی سندھ) جیسی تہذیبوں کی جانب ہے۔ ہم تعداد میں بہت کم ہیں لیکن ہر لمحہ طاغوت کے خلاف برسرپیکار رہتے ہیں، اس امید کے ساتھ کہ خالقِ کائنات ہماری ماضی کی غلطیوں کو معاف فرمائے۔ اب بات کرتے ہیں تمہارے تازہ ترین حالات کی.....!''

ظل ہطیا چند لمحات کے لیے تھما تو جاسم نے سکھ کی سانس لی۔ اب اس پر سوال پوچھنے کی ممانعت نہیں رہی تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ حاضر دماغی کے ساتھ اس بادی مخلوق کے نمائندے کو دیکھنے لگا جس کے بقول جاسم سے وہ آخری بار مل رہا تھا۔

آئندہ چند منٹ میں ظل ہطیا نے مختصر مگر جامع الفاظ میں جاسم کو سلور کوئین کے ہنگامی اجلاس کے بارے میں بتایا اور آخری میں کہا۔

''تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری ساتھی ناجیہ کو بہ حفاظت آیل آف مین کے شہر ''کاسل ٹاؤن'' پہنچا دیا گیا ہے۔ ایک دو روز میں آئل آف مین کے کیپٹل ''ڈگلس'' کی ایک یونیورسٹی میں اس کا ایڈمیشن ہو جائے گا۔ وہ وہاں پر پی ایچ ڈی کی ایک اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے محفوظ زندگی گزار سکے گی۔''

''محفوظ زندگی.....!'' بے ساختہ جاسم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''کاسل ٹاؤن جیسا کہ آپ نے بتایا ہے، سلور کوئین کا ہیڈ کوارٹر ہے اور آج کل میں اور ناجیہ دجال کی اس مریدن کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔ پھر ناجیہ اس کے گردونواح میں حفاظت سے کیونکر رہ سکتی ہے؟''

''ناجیہ کاسل ٹاؤن میں قیام کرے گی، یہ بات میں نے تمہیں بتائی ہے، سلور کوئین کو نہیں۔'' وہ جاسم کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اگر دشمن کے شر سے بچنا ہو تو ہمیشہ اس کے قریب تر رہنا چاہیے کیونکہ وہ بھولے سے بھی نہیں سوچ سکتا کہ اس کا ٹارگٹ خود چل کر اس کے پاس آجائے گا۔ سلور کوئین دنیا بھر میں تم دونوں کو تلاش کرے گی مگر کاسل ٹاؤن یا ڈگلس کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔''

ظل ہطیا کی بات میں دم تھا لہٰذا جاسم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اس سے اتفاق کرلیا اور پوچھا۔

''کیا واقعی دنیا میں کوئی ایسی خطرناک وبا پھوٹنے والی ہے جو ایک کروڑ انسانوں کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالے گی؟''

''ہاں، یہ درست ہے۔'' ظل ہطیا نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن میں سلور کوئین کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ سب سے زیادہ نقصان اس ملک کا ہوگا جو اپنے حریف ملک میں اس بیماری کا بیج بوئے گا۔ میرے خیال میں، یہ دو تین سال سلور کوئین اور اس کے طاغوتی عزائم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچائیں گے۔''

''وہ کیسے؟'' جاسم پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''دجالیوں نے ''نی یوم'' کی مکمل تعمیر کے لیے جو بجٹ رکھا ہے، وہ آج کے حساب سے تو ٹھیک ہے مگر یہ منصوبہ کوئی راتوں رات پایۂ تکمیل تک تو پہنچنے والا ہے نہیں۔ اس کام میں پورے پندرہ سال اور سات سو بلین یو ایس ڈی خرچ ہونا ہیں۔ وہ وائرس والی اس خطرناک وبا کو پھیلا کر دنیا کی آبادی میں ایک کروڑ کی کمی تو کرلیں گے لیکن ان دو تین سالوں میں پوری دنیا کا نظام ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔ جب دوسرے ملکوں کی معیشت گرے گی تو ڈالرز کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہوگا۔ آج اگر ڈالر تمہارے ملک میں ایک سو ساٹھ کا ہے تو اس وبا کے خاتمے تک تین سو روپے سے اوپر چلا جائے گا۔ سعودی عرب کی آمدنی کے دو بڑے ذرائع ہیں۔ تیل اور حج وعمرہ۔ یہ دونوں شعبے دو سال تک ''خاموشی'' اختیار کیے رہیں گے تو ملک کی معیشت کو تاریخ کا بدترین دھچکا لگے گا جس کے نتیجے میں ''نی یوم'' کا بجٹ ایک ٹریلین یو ایس ڈی سے بھی اوپر چلا جائے گا جو کہ خاصا تشویشناک ہوگا۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ''نی یوم'' کا کام کھٹائی میں پڑ جائے گا؟'' جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''جن لوگوں کا یہ منصوبہ ہے وہ اسے کھٹائی میں نہیں پڑنے دیں گے۔ ہاں، البتہ اس میں تاخیر ہوسکتی ہے۔ اس کی تکمیل میں سات آٹھ سال مزید لگ سکتے ہیں اور ہم نے ابھی دو سالوں کا فائدہ اٹھانا ہے۔ جب پوری دنیا کا کاروبار ایک مقام پر ٹھہر جائے گا یعنی ہر طرف مکمل لاک ڈاؤن ہوگا تو اختیار تمہیں اپنے ساتھ نی یوم لے جائے گی۔ تم دونوں سکون سے اپنا کام کر سکو گے اور..... تمہاری روانگی میں زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہر لمحہ تیار رہنا۔''

''میں تیار ہوں۔'' جاسم نے مضبوط لہجے میں کہا پھر اس کے ذہن میں اسد حسنی کا خیال آیا۔ ''کیا آپ، ایک

pklibrary.com

شخص کو تلاش کرنے میں میری مدد کریں گے؟''

''تمہاری مدد کی جا چکی ہے۔'' ظل ہطیا نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

جاسم نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں کچھ بھی نہیں سمجھا.....؟''

''تم طلال حسنی کے بیٹے اسد حسنی کو ڈھونڈ نکالنا چاہتے ہو نا.....!'' ظل ہطیا نے جاسم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''طلال حسنی نے تمہیں اپنے بیٹے کی تصاویر کا جو البم دیا ہے، اس میں فوٹو نمبر سات کے پیچھے اسد حسنی کی لوکیشن کے حوالے سے اشارہ درج ہے۔ اس کے بعد تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔''

جاسم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کن الفاظ میں ظل ہطیا کا شکریہ ادا کرے۔ پچھلے چھ سال سے طلال حسنی اپنے بیٹے کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسد زندہ ہے اور ایک دن وہ ضرور اس کے پاس آ جائے گا۔ ظل ہطیا نے طلال حسنی کے یقین کی توثیق کر دی تھی اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

جاسم ان لمحات میں اس قدر خوش تھا کہ بے ساختہ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ ''کاش..... ایشار اور ظل ہطیا کی طرح میں بھی پورٹل کے استعمال کے قابل ہو جاؤں۔ پھر مجھے ویزا، پاسپورٹ کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی فاصلے میرا وقت خراب کر سکیں گے..... اے کاش.....!''

''البم کی فوٹو نمبر اٹھارہ الٹ کر دیکھو۔'' ظل ہطیا نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری اس خواہش کی تکمیل کے لیے ''تھیوری'' وہاں موجود ہے۔ پریکٹیکل کے لیے آئندہ نیند تک انتظار کرنا ہوگا۔''

ادھر ظل ہطیا نے اپنی بات پوری کی، ادھر جاسم کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا اور بدن پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس نے جو خواب دیکھا تھا، اس میں ظل ہطیا نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

''یہ محض ایک خواب ہے۔'' اس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔''

''مسئلہ پریشان ہونے یا نہ ہونے کا نہیں ہے۔'' اس کے اندر سے ایک آواز آئی۔ ''چیک کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر ظل ہطیا نے خواب کے ذریعے میری راہ نمائی کی ہے تو البم کی تصویر نمبر سات اور اٹھارہ کے پیچھے کوئی اہم پیغام ضرور درج ہوگا۔''

یہ خیال اتنا توانا، قوی اور سمجھ میں آنے والا تھا کہ اس

سنسنی خیز، لاجواب، روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ اکتوبر 2023ء

خاص تحریریں

آخری خواہش

عالمی شہرت یافتہ ناول نگار کی حیرت انگیز سوانح حیات جسے پڑھ کر آپ بھی حیران رہ جائیں گے

جاکلین ہیرو

اس معروف شخصیت کی دلچسپ داستان جس پر لڑکیاں واری بلہاری جاتی تھیں

دو چہرا چہرہ

اس کے دو چہرے تھے، ایک آگے اور دوسرا پیچھے۔ پہلا چہرہ شفقت کا پرتو اور دوسرا چہرہ شیطانی

بے قدری

ایسی سچ بیانی کہ آپ سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔ ہمارا معاشرہ کس رخ پر چل پڑا ہے۔

اور بھی عمدہ تحریریں

ندیم اقبال کا دلچسپ سفرنامہ
سمندروں پار اک جزیرہ

غلام قادر کی طویل کہانی ریگ رواں کا آخری حصہ..... اور بھی بہت سی سچ بیانیاں، سچے واقعات جو سرگزشت کی پہچان ہیں

نے بستر چھوڑ دیا۔ طلال حسنی نے ان تینوں کے آرام کے لیے تین الگ بیڈ روم دے رکھے تھے۔ جاسم سونے سے پہلے، طلال حسنی سے اسد کا فوٹو البم لے تو آیا تھا لیکن دماغ پر تھکن اور نیند کا غلبہ اس قدر تھا کہ اس نے یہ سوچ کر مذکورہ البم کو بیڈ سائڈ ٹیبل پر چھوڑ دیا کہ صبح اطمینان سے اسے دیکھے گا لیکن سوئے اتفاق، اس کی صبح متوقع وقت سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل پر سے وہ البم اٹھالیا اوسب سے پہلے، البم میں لگی ہوئی فوٹو نمبر سات کو باہر نکال کر الٹ دیا۔ مذکورہ فوٹو کی پشت پر تین الفاظ درج تھے جن کی ترتیب کچھ اس طرح تھی۔

''اسٹائرس..... ہیماٹو پیتھالوجسٹ..... انقرہ!''

جاسم نے اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑائے تو اس کے ذہن میں موجود معلومات کے مطابق، اسٹائرس کسی شخص یا کمپنی اور یا پھر برانڈ کا نام ہوسکتا تھا۔ انقرہ، ترکی کا کیپٹل تھا۔ یہ شہر ایشین ترکی یعنی ''اناطولیا'' میں واقع ہے اور ہیماٹو پیتھالوجسٹ کا مطلب تھا، خون اور اس سے متعلق بیماریوں پر ریسرچ کرنے والا ڈاکٹر۔ سو، اس سہ لفظی تحریر سے یہی سمجھ میں آتا تھا کہ اسد حسنی کو تلاش کرنے کے لیے انقرہ کا رخ کرنا ہوگا اور وہاں ''اسٹائرس'' نام کے کسی شخص یا لیبارٹری اور یا پھر ریسرچ سینٹر وغیرہ میں ''جھانک'' کر اپنا مقصد حاصل کرنا ہوگا۔

جاسم نے اس فوٹو کو ایک طرف رکھ کر البم کے اندر سے فوٹو نمبر اٹھارہ باہر نکال لیا۔ اس تصویر کے پیچھے یک سطری تحریر تھی..... ج عنقی ظوم لحطیم عن فوادر!

وہ ''ج عنقی ظوم لحطیم عن فوادر'' کو زیرِ لب دہراتے ہوئے، ذہن پر زور ڈال کر یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ آخر یہ کون سی زبان ہے؟

چند منٹ کی دماغ سوزی کے بعد بھی جاسم ان الفاظ کے معانی یا اس زبان کے بارے میں حتمی کچھ بھی معلوم نہ کر سکا البتہ، اس وِرد کی بدولت وہ ''ج عنقی ظوم لحطیم عن فوادر'' کو حفظ کرنے میں ضرور کامیاب ہوگیا۔

''البم کی فوٹو نمبر اٹھارہ کو الٹ کر دیکھو.....'' ظل ہطیا کے الفاظ نے جاسم کے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ ''تمہاری خواہش کی تکمیل کے لیے تصویری وہاں موجود ہے۔ پریکٹیکل کے لیے آئندہ نیند تک انتظار کرنا ہوگا۔''

''اس تصویری کوتو میں نے ازبر کرلیا ہے۔'' جاسم نے اضطراری لہجے میں خود کلامی کی۔ ''اور پریکٹیکل کی سائنس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میں اگلی رات کا انتظار ہرگز نہیں کروں گا۔ ظل ہطیا نے آئندہ نیند کی شرط عائد کی تھی، آئندہ رات کی نہیں۔ اگر میں ابھی دوبارہ سو جاؤں تو یہ آئندہ نیند ہی تو ہوگی..... یس!''

ان لمحات میں جاسم اس قدر ایکسائیٹڈ ہو رہا تھا کہ اس نے اس سے پہلے خود کو کبھی اتنا پُرجوش اور تاولا نہیں پایا تھا۔ ''نادیدہ سفر'' کا خیال ہی ایسا ہیجان خیز اور ولولہ انگیز تھا کہ مردہ دماغ کی بتی جلا دے۔ جاسم تو پھر بھی ایک بیدار مغز اور پُرجوش نوجوان تھا۔

اس نے فوٹو نمبر سات اور اٹھارہ کو اپنے پاس محفوظ کرنے کے بعد البم کو واپس بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے بستر پر دراز ہو کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ دو چار گہری سانسیں لینے کے بعد اس نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا پھر بہ زبانِ خامشی وہ اپنے دماغ کو ہدایات دینے لگا۔

''اے میرے دماغ! تم میرے سب سے خاص دوست ہو۔ تمہیں میرے ہر معاملے کی اچھے سے خبر ہے اور تم نے ہر مشکل وقت میں میری مدد کی ہے۔ اس وقت بھی مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔ میں پُرسکون اور گہری نیند سونا چاہتا ہوں..... گہری اور میٹھی نیند..... میٹھی اور سہانی نیند..... سہانی اور.....!''

اس کی سوچ تھم گئی۔ اس کے حواسِ خمسہ نے ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ وہ سو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک تیز رفتار جدید طرز کی ٹرین تھی۔ جاسم اس ٹرین کے ایک ڈبے میں محوِ سفر تھا۔ وہ اس بات پر حیرت زدہ تھا کہ اس کے سوا ڈبے میں کوئی اور مسافر دکھائی کیوں نہیں دے رہا؟ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کہاں سے آیا ہے اور اس کی منزل کون سی ہے.....

وہ ٹرین کسی بھی اسٹیشن پر رک نہیں رہی تھی۔ جاسم نے متعدد بار کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑا کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس کا گزر کہاں سے ہو رہا ہے مگر کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ٹرین کی رفتار اتنی طوفانی تھی کہ کوئی بھی بیرونی منظر آنکھ میں سما نہیں پاتا تھا۔

جاسم اس اچینبک صورتِ حال پر غور کر ہی رہا تھا کہ دھیرے دھیرے ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی۔ اس نے شکر ادا کیا کہ اگلے اسٹیشن پر وہ ٹرین لازمی رکے گی اور..... وہ یہ جاننے میں کامیاب ہو جائے گا کہ وہ کس ملک کے کس شہر

میں ہے۔ اس کے ذہن میں ایسا کوئی خیال سرے سے موجود نہیں تھا کہ ٹرین کے رکنے پر اسے اتر جانا ہے۔

پوری طرح رکنے سے پہلے ہی ٹرین نے دوبارہ اسپیڈ پکڑ لی۔ جاسم ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی نگاہ ایک آٹھ دس سال کی لڑکی پر پڑی تو وہ چونک گیا۔ اس نے فوراً سے پیشتر اس لڑکی کو پہچان لیا۔ وہ ایشتار تھی۔

ایشتار سبک قدموں سے چلتے ہوئے جاسم کے نزدیک پہنچی پھر اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ کافی اداس اور بجھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس کا چہرہ حزن وملال کی آماج گاہ بنا ہوا تھا اور آنکھوں سے ویرانی ٹپکتی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے ایش؟'' جاسم نے ہمدردی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''میں نے اس سے پہلے کبھی تمہاری ایسی حالت نہیں دیکھی۔''

''گرو غل ہطیا چل بسے ہیں۔'' اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

''اوہ.....'' جاسم ایک افسردہ سانس لے کر رہ گیا۔

غل ہطیا کے الفاظ جاسم کے دماغ میں چکرانے لگے خصوصاً یہ دو جملے ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے'' ..... اور ''سمجھ لو کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔''

''یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے ایش!'' جاسم نے اپنائیت بھری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہر انسان کی باری لگی ہوئی ہے۔ سب ہی کو اپنے مقررہ وقت پر اس دنیا سے چلے جانا ہے۔''

ایشتار نے جاسم کے ہمدردی بھرے تعزیتی الفاظ کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر استفسار کیا۔

''تم نے فوٹو نمبر اٹھارہ کو چیک کرلیا ہے؟''

''ج عنغی غلوم تحکیم عن فوادر.....!'' جاسم نے بڑی روانی سے اس عجیب وغریب لائن کو پڑھنے کے بعد کہا۔ ''یہ تو خود بہ خود میری یادداشت میں محفوظ ہوگئی ہے۔ غل ہطیا نے بتایا تھا کہ یہ تھیوری ہے اور اس کا پریکٹیکل اگلی نیند میں مجھے تعلیم کیا جائے گا جس کے بعد میں بھی نادیدہ اُڑان بھرنے کے قابل ہوجاؤں گا لیکن باوجود کوشش کے بھی میں یہ سمجھ نہیں پایا کہ یہ کس زبان کے الفاظ ہیں حالانکہ میں خود اردو، عربی اور انگریزی اچھے سے جانتا ہوں۔ بس، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں عربی کا ٹچ ہے۔''

''تم نے ایک ہی سانس میں متعدد سوال پوچھ ڈالے ہیں لیکن فکر نہیں کرو، میں جواب دینے کے لیے ہی یہاں آئی ہوں مگر سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہوں گی کہ تم بہت ''تیز'' ہو۔'' لفظ تیز پر اس نے خصوصی دباؤ ڈالا تھا۔ ''تم نے نہ صرف اس ''کی نوٹ'' کو دیکھتے ہی ذہن نشین کرلیا ہے بلکہ اس کے استعمال کی سائنس تک پہنچنے کے لیے اگلی رات کا انتظار کرنے کے بجائے اپنے دماغ کو ''ہدایت'' دے کر نیند کی وادی میں پہنچ گئے۔''

ایشتار لمحے بھر کو تھمی تو جاسم اُس کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ اس کی تعریف کررہی تھی یا پھر مہذب انداز میں اس کا تمسخر اُڑانے کے موڈ میں تھی؟ وہ کوئی بھی اندازہ قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

''اگر تم نے اس ''کی نوٹ'' کا کورس، میرے بتائے ہوئے طریقے سے مکمل کرلیا تو تمہیں اپنے مقصد میں ضرور کامیابی ملے گی۔''

''یعنی میں ٹائم ٹریول کے قابل ہوجاؤں گا.....؟''

ایشتار کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جاسم نے سوال جڑ دیا۔

''ہرگز نہیں!'' وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے خفگی بھرے لہجے میں بولی۔ ''پہلے تم اس ''کی نوٹ'' کی فلاسفی کو اچھی طرح سمجھ لو۔ پھر میں بتاؤں گی کہ تم کس قابل ہوسکتے ہو اور..... امید کرتی ہوں کہ اب تم بیچ میں بول کر میرا دماغ خراب نہیں کرو گے.....!''

''ٹھیک ہے۔'' جاسم نے بے دلی سے کہا۔

غل ہطیا نے بھی ایک دو بار اسے ڈانٹا تھا لیکن جاسم کو اس کا ڈانٹنا برا محسوس نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی عمر اور تجربے کا لحاظ کرتے ہوئے جاسم نے اسے ایک اتالیق سمجھ لیا تھا لیکن ایشتار کا ٹوکنا اسے ناگوار گزرا تھا۔

''یہ ''کی نوٹ'' تین زبانوں سمیرین، مایَن اور عربی کا کمبی نیشن ہے۔ تمہاری قوانٹم فزکس، بائیو، کیمسٹری اور برین میپ کو نظر میں رکھتے ہوئے، ایک مخصوص الگوردم (ریسپی) کی روشنی میں اسے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ تم نے اس لائن کو زبانی یاد کرلیا ہے۔ اب آگے تمہیں یہ کرنا ہے.....'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوئی۔ اس کے بعد گہری سنجیدگی سے بتانے لگی۔

''میں نے تھوڑی دیر پہلے جس کورس کا ذکر کیا ہے، وہ محض تین دن بلکہ تین راتوں کا ہے اور وہ بھی رات کے ایک مختصر حصے کا۔ اس کائنات میں ''تھری، سکس، نائن'' یعنی

تھری سکسٹی نائن (369 کی بڑی اہمیت ہے۔ آدھی رات کے بعد، کسی بھی مخصوص وقت میں تمہیں اس ''کی نوٹ'' کو پہلی رات تین مرتبہ، دوسری رات چھتیس مرتبہ اور تیسری رات تین سو انہتر مرتبہ پڑھنا ہے۔ بس، تمہارا کورس مکمل ہوا۔ ایک بات کا خیال رہے کہ اس کام میں ناغہ نہیں ہونا چاہیے اور اس کا وقت بھی ایک ہی ہو، یعنی شروع کرنے کا وقت۔ باقی تینوں راتوں کی تعداد چونکہ مختلف ہے اس لیے پہلی رات کم، دوسری رات اس سے زیادہ اور تیسری رات اس سے بھی زیادہ وقت لگے گا۔ یہاں تک سمجھ میں آ گیا ہے نا.....؟''

ایشتار نے سوالیہ نظر سے جاسم کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اس سائنس کے پریکٹیکل کے بارے میں، میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی لیکن اس سے پہلے تمہارے لیے چند اہم باتوں کو جان لینا ضروری ہے۔ نمبر ایک..... یہ ''کی نوٹ'' صرف تمہارے لیے ہے۔ اگر کوئی اور شخص اس سے استفادہ کرنا چاہے گا تو اسے خاک بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ نمبر دو..... اس سائنس کو تجربے میں لانے کے لیے تمہاری عمر پچیس سال سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ اس وقت تم بائیس سال کے ہو۔ اب تمہارے سامنے دو راستے ہیں یا تو تم تین سال تک انتظار کی سولی پر سانس لینے کا فیصلہ کر لو اور یا پھر تم تین سال کا جمپ لے کر تین سال آگے یعنی دو ہزار تیئس میں چلے جاؤ.....''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' جاسم نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''ممکن اور ناممکن کی بحث میں پڑنا ہم دونوں کے حق میں مناسب نہیں ہوگا۔'' ایشتار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہت سارے کام جو خاکی مخلوق کو ناممکن نظر آتے ہیں، انہیں ہم بادی لوگ چٹکی بجاتے میں ممکن کر دکھاتے ہیں۔ خیر، اگر تمہارا ارادہ بن جائے تو میں تمہاری اس مشکل کو آسان بنا دوں گی۔ تین سال کا ''ٹائم لیپس'' میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس میں تمہارا یہ فائدہ ہوگا کہ اس دوران میں وہ وائرس والی وبا آ کر جا چکی ہوگی اور ناجیہ کا سوشل سائنسز میں ''پی۔ ایچ۔ ڈی'' بھی مکمل ہو جائے گا۔''

''میں ضرور تین سال کا جمپ لینا چاہوں گا۔'' جاسم نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''لیکن پھر اس کام کا کیا ہوگا جو اس دوران میں ہم دونوں نے ''نی یوم'' میں سرانجام دینا ہے؟''

''وہ کام ایک دن یا ایک ماہ یا ایک سال پر محیط نہیں ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''ہم اسے مرحلہ وار انجام دیں گے۔ پہلا مرحلہ صرف پانچ دن کی دوری پر ہے۔ تم یکم تاریخ کو میرے ساتھ ''نی یوم'' جا رہے ہو۔ ہم چند روز میں، اپنا کام نمٹا کر واپس آ جائیں گے۔ اس کے بعد ہی میں تمہیں تین سال کا جمپ دے کر مستقبل میں لے جاؤں گی۔ ہمارے اس خاص الخاص مشن کا دوسرا مرحلہ دو ہزار تیئس میں درپیش ہوگا اور تمہارے لیے تو یہ چند روز یا چند ماہ بعد ہی کی بات ہوگی، اس لیے کہ تم میرے توسط سے اس ٹائم لیپس کا فائدہ اٹھا چکے ہو گے۔ میری باتیں تمہیں پریشان تو نہیں کر رہی ہیں نا.....؟''

''بالکل نہیں!'' جاسم نے توانا لہجے میں جواب دیا۔ ''تم جو بھی بتا رہی ہو، اسے سمجھنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں۔''

''ویری گڈ!'' ایشتار نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تم سے یہی امید ہے.....!''

''میں تمہاری امید پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا ایش.....!'' جاسم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ ''مجھے یقین ہے۔''

''اگر ہمیں ایک ساتھ کام کرنے کا موقع ملے گا تو ہماری زندگی میں وہ پر بہار اور دل دار لمحات بار بار آتے رہیں گے جو ہم بابو ٹیمپل کے مختلف مقامات پر اجوائے کر چکے ہیں.....'' جاسم نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

ایشتار نے نیم خشم گیں نظر سے اسے گھورا اور اس کے جذبات کے اظہار کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں پوچھا۔

''ظل ہطیا نے تمہیں ''نی یوم'' والے دجالی منصوبے کی تاخیر کے بارے میں تو بتا دیا ہے نا.....؟''

''ہاں!'' جاسم نے مختصر جواب دیا۔

''اس سے پہلے روئے زمین پر ایسا ناممکن شہر آباد کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔'' ایشتار نے معتدل انداز میں کہا۔ ''دنیا کے بڑے بڑے ماہرِ تعمیرات اس منصوبے کی تکمیل کو ناممکن سمجھ رہے ہیں۔''

''ناممکن کن معنوں میں؟'' جاسم نے پوچھا۔

''چھبیس ہزار پانچ سو مربع کلومیٹرز پر پھیلے ہوئے تبوک نامی علاقے کے قلب میں سولہ ہزار مربع کلومیٹرز

زمین پر ایک ''دیوہیکل دیوار'' کی صورت ''نی یوم'' کو تعمیر کیا جائے گا۔ اس شہر کی لمبائی ایک سو ستر کلومیٹرز، چوڑائی نصف کلومیٹر اور اونچائی ایک کلومیٹر ہوگی یعنی برج خلیفہ سے بھی کئی میٹرز بلند.....'' ایشتار نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''اس تھری ڈی میگا سٹی ''نی یوم'' کی حفاظت کے لیے اس کے اطراف میں، اس کی بلندی تک ایک ناقابلِ تسخیر شیشے کی دیواریں اٹھائی جائیں گی جن پر کوئی بم اثر انداز نہیں ہوگا۔''

''مجھے تو یہ منصوبہ ہالی ووڈ کی کوئی سُپر نیچرل فکشن مووی کی طرح لگ رہا ہے۔'' جاسم نے دل کی بات کہنے میں کوئی عار محسوس نہ کیا۔ ''ظل ہطیا نے بتایا ہے کہ اوور بجٹ کے باعث ''نی یوم'' کا پروجیکٹ چار، چھ سال آگے جا سکتا ہے لیکن مجھے تو ایسا لگتا ہے، یہ دجالی شہر کبھی بھی تکمیل نہیں پائے گا۔''

''تبوک کی تاریخ، ماضی میں بھی ایسی ہی ناقابلِ یقین اور حیران کن رہی ہے۔'' ایشتار نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''کیا تم غزوۂ تبوک کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

''مجھے ہسٹری سے کبھی زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔'' جاسم نے سرسری انداز میں کہا۔ ''ہاں، میں نے اس غزوہ کا نام ضرور سنا ہے۔''

''آفرین ہے، تمہارے مسلمان ہونے پر.....'' وہ حد درجہ کڑوے لہجے میں بولی۔ ''ہم صرف جھوٹ بولتے تھے اور ہم پر اللہ کا قہر نازل ہوا اور تم لوگ.....'' اس کے چہرے پر غصہ جھلکنے لگا۔ ''تم ہر پُراسرار علم کو حاصل کرنے کے لیے در بدر، خاک چھانتے مارے مارے پھرتے ہو لیکن ہم سب کے پیارے نبی ﷺ کی سیرت سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ عظیم ہستی جن کی رحمت کے طفیل، ہزاروں برائیوں اور خامیوں کے باوجود بھی تم زندہ سلامت اور کھاتے پیتے خوش باش نظر آتے ہو.....''

''میں اپنی کم علمی پر شرمندہ ہوں۔'' جاسم نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مزید ذلیل کرنے کے بجائے تم مجھے غزوۂ تبوک کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''نہیں بتاؤں گی۔'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم نے میرا موڈ خراب کر دیا ہے۔''

''پلیز.....!'' جاسم نے منت ریز نظر سے اسے دیکھا۔

وہ چند لمحات تک جاسم کو، خفگی بھری نظر سے تکتے ہوئے بُرے بُرے منہ بناتی رہی پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور عجیب سے لہجے میں بولی۔

''مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔''

''کیا نہیں ہو سکے گا؟'' جاسم نے پوچھا۔

''ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔'' ایش، جاسم کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ہی دُھن میں بولتی چلی گئی۔ ''تم یہ تین دن کی ذمے داری میرے بتائے ہوئے طریقے سے نبھا کر دکھاؤ۔ اس کے بعد میں تمہیں ''ٹیلی پورٹیشن'' کی سائنس کے بارے میں بتاؤں گی.....!''

''ٹیلی پورٹیشن؟'' جاسم حیرت بھری نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

''ہاں، ظل ہطیا نے اسی ٹیکنیک کی تمہیں اجازت دی ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آج کل تمہاری دنیا کے آسٹرو فیزیسٹ اس سائنس پر قدرت حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں مگر تا حال انہیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور ہم نے نادیدہ سفر کے اس ''طریقہ کار'' کو صدیوں پہلے تیاگ دیا تھا۔ خیر.....'' وہ لمحے بھر کو رکی۔ ابھی تک اس کی برہمی میں خاطر خواہ کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس کی نگاہ جاسم ہی پر جمی ہوئی تھی۔ اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''تمہیں اندر باہر سے ناپنے تولنے کے بعد جو حاصل جمع ہمارے ہاتھ لگا ہے، وہ ٹیلی پورٹیشن کی ٹیکنیک کی جانب ہی اشارہ کرتا ہے چنانچہ اسی الگوردم کی راہنمائی میں تمہارے لیے ایک موثر ''کی نوٹ'' ترتیب دیا گیا ہے۔ اگر جم کر تین راتیں اس کام کو کر گزرو گے تو اس پلینٹ ارتھ کے آسٹرو فزیسسٹس (ماہرین فلکیات) کی کامیابی سے پہلے تم ''ٹیلی پورٹر'' بن جاؤ گے۔ چلتی ہوں.....''

اس سیشن میں وہ بادی مخلوق ایشتار، جاسم پر اس قدر غصہ ہوگئی تھی کہ جب اس نے بے مروتی سے کہا کہ چلتی ہوں تو جاسم اسے روکنے کے لیے اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکال سکا۔

☆☆☆

صبح کے دس بجے تھے۔ آج چوبیس تاریخ، اتوار کا دن تھا۔ گزشتہ رات جاسم، کامل، حسنی، نشا..... وغیرہ سب دیر سے سوئے تھے اسی لیے سب کی آنکھ بھی تاخیر ہی سے کھلی تھی تاہم جاسم کے ساتھ معاملہ قدرے مختلف تھا۔ پچھلی رات حالتِ نیند میں اس نے پہلے ظل ہطیا اور بعد میں ایشتار سے ''ملاقات'' کی تھی اور وہ بھی الگ الگ وقت میں

pklibrary.com

اور یہ دونوں ملاقاتیں اپنی جگہ گراں قدر اہمیت کی حامل تھیں اور ان کا شمار رویائے صادقہ میں ہوتا تھا۔ البم میں موجود اسد حسنی کے فوٹو نمبر سات اور اٹھارہ نے جاسم کے اندر سنسنی پھیلا دی تھی۔ گویا، آئندہ چند روز میں وہ دو بڑے کام کرنے جا رہا تھا۔ نمبر ایک..... اسد حسنی کی بازیابی۔ نمبر دو..... نادیدہ سفر کی تکنیک سے روشناسی.....!

بیدار ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر ان دونوں فوٹوز کو پلٹ کر دیکھا۔ فوٹو نمبر سات کی پشت پر درج اسد حسنی کی لوکیشن میں ایک لفظ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ جاسم کو اچھی طرح یاد تھا کہ پہلی نیند کے بعد جب اس نے اس فوٹو کو دیکھا تھا تو وہاں صرف تین الفاظ..... اسٹائرس، ہیماٹو پیتھالوجسٹ اور انقرہ لکھا ہوا نظر آیا تھا لیکن اب ہیماٹو پیتھالوجسٹ سے پہلے ایک نام ''حکیل'' بھی دکھائی دے رہا تھا۔ بلاشبہ ''حکیل'' اسی ہماٹو پیتھالوجسٹ کا نام تھا جو انقرہ میں واقع ''اسٹائرس'' نامی کسی سینٹر سے تعلق رکھتا تھا۔ ''حکیل'' نام سامنے آنے کے بعد، جاسم کے لیے اسد حسنی تک پہنچنے کا راستہ بہت واضح ہو گیا تھا۔

گزشتہ روز کے ترتیب شدہ پروگرام کے مطابق، آج رات کی فلائٹ سے جاسم، کامل اور نشا کراچی جانے والے تھے لیکن اب جاسم کا ارادہ بدل گیا تھا۔ وہ اسد حسنی کو اس کے باپ تک پہنچانے سے پہلے ترکی سے باہر قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور ویسے بھی ناجیہ کراچی سے کاسل ٹاؤن (آیل آف مین) شفٹ ہو چکی تھی۔ وہ تو ناجیہ ہی کی خاطر کراچی جانے والا تھا.....

کامل اور ناجیہ کو جاسم نے ایشنار کے بارے میں کافی کچھ بتا رکھا تھا لیکن نشا ''ایش'' کے حوالے سے کچھ بھی نہیں جانتی تھی چنانچہ جاسم نے پہلے کامل سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کامل کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد ٹھوس انداز میں کہا۔

''میں ابھی چند روز مزید استنبول میں قیام کرنا چاہتا ہوں۔ اس بات کو تم بھی پسند کرو گے بروکہ ایک باپ کو، چھ سال سے بچھڑا ہوا اس کا اکلوتا بیٹا ضرور ملنا چاہیے۔''

جاسم نے دانستہ ابھی کامل سے ٹیلی پورٹیشن وغیرہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس میں جاسم کی بدنیتی شامل نہیں تھی۔ یہ ایسا موضوع تھا کہ اس پر سرسری انداز میں بات ہو نہیں سکتی تھی اور ویسے بھی ابھی اس پروجیکٹ کی تکمیل میں کافی وقت پڑا تھا۔

''جگر.....!'' جاسم کی بات کو توجہ سے سننے کے بعد کامل نے کہا۔ ''میں ایشنار اور اس کے گرو ظل ہطیا کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں جو تم نے مجھے بتایا ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے اسد حسنی کی بازیابی کے سلسلے میں تمہاری درست راہنمائی کی ہے؟''

''ہاں، مجھے ان دونوں پر پورا بھروسا ہے۔'' جاسم نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''وہ میرے ساتھ کسی قسم کی دو نمبری نہیں کریں گے۔''

''تب تو ٹھیک ہے۔'' کامل ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے کراچی بھیج کر خود یہاں رکنا چاہتے ہو۔ کیا یہ زیادہ مناسب نہیں ہو گا کہ ہم دونوں مل کر ''انقرہ'' مشن کو انجام دیں.....؟''

''تمہاری بات میں وزن ہے جگر!'' جاسم نے کہا۔ ''لیکن اس کے باوجود بھی میری یہی خواہش ہے کہ تم آج رات کراچی چلے جاؤ اور..... یہ بات میں ایک خاص وجہ سے کر رہا ہوں۔''

''میں وہ وجہ جاننا چاہوں گا۔'' کامل نے کہا۔

''شعیب چاچا کا ہم نے جو حشر نشر کیا ہے، اس کے بعد کراچی میں اس کا نیٹ ورک بہت کمزور پڑ جائے گا۔'' جاسم وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور اس چیز کا فائدہ اٹھانے کے لیے تمہارا کراچی میں موجود رہنا از حد ضروری ہے۔ ہم دونوں کے استاد اور سرپرست مراد علی عرف ''دادا'' اور ان کی فیملی کی دردناک موت کا ذمے دار یہی شیطان شعیب چاچا تھا۔ تم کو اس کی ٹوٹی ہوئی طاقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کراچی پر اپنا قبضہ جمانا ہے جیسا کہ دادا کی زندگی میں ہوا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں ایس پی احسان الحق کے ہاتھ مضبوط کرنا بھی تمہاری ذمے داری ہے۔ وہ ایمان دار اور فرض شناس پولیس آفیسر طویل عرصے سے شعیب چاچا کے تعاقب میں تھا۔ اس موقع پر اگر تمہارے توسط سے، شعیب چاچا کے خلاف ثبوت اکٹھا کرنے میں ایس پی صاحب کے لیے آسانی پیدا ہو جائے تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں ہو گی۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔'' کامل نے بُردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس ائرہوسٹس کا کیا کرو گے۔ وہ تو تمہاری ہی وجہ سے کراچی جا رہی تھی۔ تم نہیں جاؤ گے تو وہ بھی اِدھر ہی رکنے کو ترجیح دے گی۔ کیا تم اس کی موجودگی میں انقرہ والا کام ٹھیک سے کر پاؤ گے؟''

کامل کے استفسار میں چھپی ہوئی ٹھٹھی چھیڑ چھاڑ کو محسوس کرتے ہوئے جاسم نے کہا۔ ''میں کوئی ایسا چکر

چلاؤں گا کہ وہ تمہارے ساتھ کراچی چلی جائے تاکہ میں اسد حسنی کی بازیابی کے لیے ایک مؤثر منصوبہ ترتیب دے سکوں۔''

''اور اگر وہ نہیں مانی تو.....؟'' کامل نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''پھر کیا کرو گے جگر.....!''

''پھر دادا کے اس جگر کی تم مدد کرنا برو.....'' جاسم نے کامل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جیسا کہ ہمیشہ سے کرتے آئے ہو۔''

''اوکے۔'' کامل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ناشتے پر بات ہوگی۔''

ناشتے کی ٹیبل پر جانے سے پہلے جاسم نے طلال حسنی کو اپنے اعتماد میں لے کر ایسے پٹی پڑھائی کہ اس مرحلے کے بہ خیر و خوبی گزر جانے کے قوی اور روشن امکانات پیدا ہوگئے۔

اس روز کامل، جاسم اور نشا کو پولیس کمشنر قاموس ترک کے گھر لنچ کی دعوت اٹینڈ کرنے جانا تھا۔ یہ دعوت دراصل جاسم اور کامل کے اعزاز میں دی جارہی تھی اور نشا ان دونوں کی ایک ساتھی کی حیثیت سے اس تقریب میں شرکت کرنے والی تھی۔

ناشتے کی میز پر جب سب جمع ہوگئے تو ان کے میزبان طلال حسنی نے جاسم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''مائی سن! تم نے ہوائی جہاز میں، اپنی جان کو خطرات میں ڈال کر جس طرح میری جان بچائی تھی، میں تمہارا وہ احسان زندگی بھر بھول نہیں پاؤں گا۔ اُس وقت تم میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن گئے تھے۔''

''سر! آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔'' جاسم نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہا۔ ''میں نے جو بھی کیا، وہ میرا فرض تھا۔ اُس وقت آپ کی جگہ اگر کوئی اور بھی ہوتا تو میں اسی قسم کے جرأت مندانہ ردِعمل کا مظاہرہ کرتا اور پھر.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس سنسنی خیز صورتِ حال میں اکیلا میں ہی مجرموں کے خلاف برسرِ پیکار نہیں تھا سر..... نشا صباحی بھی میرے شانے سے شانہ ملا کر ہائی جیکرز کے خلاف مصروفِ کار تھی اور ایک شامی شہید جمشید کریم کی بیوہ ام کلثوم نے بھی کمالِ بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری مدد کی تھی۔''

''میں تم سب لوگوں کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔'' حسنی نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس وقت میں صرف تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے، تم انکار نہیں کرو گے۔''

''سر! آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔'' کامل نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں جاسم کو سالوں سے جانتا ہوں۔ اس کی دوستی اور دشمنی روزِ روشن کے مانند عیاں ہے اور یہ اپنے محسنوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے، یہ دل سے آپ کی بہت عزت کرتا ہے۔ آپ اس سے جو بھی کہیں گے، یہ مان جائے گا۔''

''آپ حکم کریں سر!'' جاسم نے حسنی کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے بس میں جو بھی ہوا، ضرور کروں گا۔''

ان چار افراد کے اس ''کھیل'' میں تین مرد کھلاڑیوں کی ٹیم ایک تنِ تنہا عورت سے نفسیاتی جنگ میں مصروف تھی اور مقصد صرف یہ تھا کہ جاسم آج رات کی فلائٹ سے کراچی نہ جائے۔

''تمہارے بس میں ہے، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔'' حسنی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میری خواہش ہے کہ تم مزید چند دن کے لیے میرے پاس رک جاؤ.....''

''سب خیریت تو ہے نا سر.....؟'' کامل نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

جب جاسم نے حسنی کو اس معاملے میں تعاون کرنے کے لیے کہا تھا تو حسنی نے اس تبدیلی کی وجہ دریافت کی تھی اور جاسم نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کردیا تھا کہ وہ آج رات میں اس سے بہت اہم اور ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے اور یہ کوئی جھوٹ بھی نہیں تھا۔ جاسم واقعتاً اسد حسنی کے معاملے پر اس سے سنجیدہ گفتگو کرنے والا تھا۔

کامل کے استفسار کے جواب میں حسنی نے جاسم کا بیان اسی پر لوٹا دیا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں اپنی نجی زندگی کے حوالے سے، جاسم کو چند اہم راز بتانا چاہتا ہوں اور اس کام میں تاخیر نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔''

''میں رک جاتا ہوں سر.....'' جاسم نے جلدی سے کہا۔ ''اگر معاملہ آپ کی زندگی کا ہے تو میں کراچی جانے کا پروگرام ملتوی کردیتا ہوں۔'' پھر وہ کامل اور نشا کی طرف دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں بولا۔ ''تم دونوں اپنا سفر کھوٹا نہ کرو۔ دو، چار دن میں، میں بھی کراچی میں تمہیں جوائن کرلوں گا۔''

نشا نے متذبذب نظر سے جاسم کی طرف دیکھا۔ کامل

pklibrary.com

نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''جگر! جیسا تم مناسب سمجھو۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نشا میرے ساتھ کراچی جانے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرے گی۔''

''میں نشا کو کافی حد تک سمجھنے لگا ہوں برو۔'' جاسم نے کامل سے کہا۔ ''یہ ''پاک، ترک'' دوستی کی خواہاں ہے۔ اسے وہاں بہت مزہ آئے گا۔''

ناشتے کے بعد حسنی نے کہا۔ ''مجھے تو قاموس نے گویا گھر میں ''نظر بند'' کر دیا ہے لیکن تم لوگوں کو آج دن میں اس کے گھر دعوت پر جانا ہے اس لیے تیاری شروع کر دو۔ قاموس وقت کا بڑا پابند ہے۔''

وہ تینوں اٹھ کر اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ راہداری میں نشا نے جاسم سے کہا۔

''تمہارے یہاں رکنے کی بات حسنی سر نے کی ہے۔ اس لیے میرا دل مطمئن ہے لیکن اگر یہ ''منصوبہ'' تمہاری طرف سے آیا ہوتا تو میرے ذہن میں پہلا خیال یہی ابھرنا تھا کہ..... کہیں تم کائرو جانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے.....''

''کائرو جانے کا میرا ارادہ سرے سے تھا ہی نہیں!'' جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ بکنگ ایک خاص مقصد کے تحت تھی۔ درحقیقت، میں اپنے ایک چالاک دشمن کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں نے کراچی جانے کے بجائے کائرو کا رخ کیا ہے.....''

''ہاں، میں جانتی ہوں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تم نے کل بھی یہ ذکر کیا تھا۔''

''فکر نہیں کرو، تمہیں میرا وطن اور وہاں کے لوگ بہت پسند آئیں گے۔'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''کامل تمہیں ایک لمحہ بھی بور نہیں ہونے دے گا۔'' پھر جاسم نے کامل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''برو! نشا پہلی مرتبہ پاکستان جا رہی ہے۔ اپنی مہمان کو کراچی تک ہی محدود نہیں رکھنا۔ اسے شمالی علاقہ جات کی سیر بھی کرانا۔''

''ٹھیک ہے جگر!'' کامل نے سر کو تائیدی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''تم اطمینان رکھو۔ تمہاری یہ دوست اب میری ذمے داری ہے۔''

اس کے بعد، وہ لنچ میں جانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

قاموس ترک نے ان کے لیے ایک پُرتکلف اور خوش ذائقہ دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ وہ لگ بھگ دو گھنٹے اس کے گھر میں رہے تھے۔ پولیس کمشنر نے انہیں اپنی اکلوتی بیٹی دیریا سے بھی ملوایا۔ وہ اپنے باپ کی بہ نسبت کوتاہ قامت تھی۔ اس کا قد بہ مشکل پانچ فٹ رہا ہوگا۔ شاید وہ اپنی ماں آکسن پر گئی تھی۔ بہرکیف، وہ ایک پُرکشش اور جاذبِ نظر لڑکی تھی۔ دیریا اس وقت میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی تھی اور ''ایم بی بی ایس'' کے فائنل ایئر میں تھی۔

قاموس کو جب پتا چلا کہ حسنی نے جاسم کو چند روز کے لیے استنبول میں روک لیا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔'' قاموس نے توانا لہجے میں کہا۔ ''حسنی نے تمہیں اپنے جس کام کے لیے روکا ہے، میں اس کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا لیکن تمہاری یہاں موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں بھی تم سے ملاقات میں رہوں گا۔''

''شیور سر!'' جاسم نے کہا۔ ''اس دوران میں، میں خود بھی آپ سے ملنا چاہوں گا، خصوصاً آپ کی صاحب زادی دیریا سے۔ میں اس سے، میڈیکل کے شعبے کے حوالے سے تھوڑی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں نہیں..... ضرور۔'' قاموس نے خوش دلی سے کہا۔ ''تمہارا جب بھی ملاقات کا ارادہ ہو، مجھے کال کرنا۔ میں تمہارے لیے گاڑی بھجوا دوں گا۔''

''تھینک یو سر!'' جاسم نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

انسان کی زندگی میں، اس کی سوچ کی بہت اہمیت ہے اور انسان ہمیشہ اپنے متعلقات کی روشنی ہی میں سوچتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ جاسم نے دیریا سے ملاقات کا جو سبب بتایا تھا، اس کا مطلب کامل اور نشا نے اپنے اپنے انداز میں اخذ کیا تھا۔

کامل جانتا تھا کہ جاسم کے، استنبول میں رکنے کا مقصد حسنی کے کھوئے ہوئے بیٹے کو بازیاب کرانا ہے۔ جاسم اس ذیل میں انفرہ، اسٹائرس اور حلیل نامی ہیمانٹو پیتھالوجسٹ کے اشارے پا چکا تھا لہٰذا وہ دیریا سے مل کر اپنے کام کو آسان بنانا چاہتا تھا لیکن نشا کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ طلال حسنی کا بیٹا چھ سال پہلے اچانک لاپتا ہو گیا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ جاسم، اسد حسنی کی لوکیشن کا پتا لگا چکا ہے لہٰذا اس کے ذہن میں یہ سوچ پیدا ہوئی کہ میڈیکل کی معلومات کو بہانہ بنا کر جاسم، دیریا سے

راہ و رسم بڑھانے کے چکر میں ہے..... وہ خود چونکہ جاسم کے چکر میں تھی اس لیے اس انداز میں سوچنا اس کی نفسیاتی مجبوری تھی۔

اسی رات جب جاسم، نشا اور کامل کو رخصت کر کے ائرپورٹ سے واپس آیا تو طلال حسنی نے اسے ''گھیر'' لیا اور اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''مائی سن! اب بتاؤ، تم مجھ سے کون سی ضروری باتیں کرنے والے ہو؟''

''سر! آپ مجھے صرف دو چیزیں دے دیں۔'' جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''پھر ہم اطمینان سے بیٹھ کر گفتگو کریں گے۔''

ائرپورٹ کی طرف جانے سے پہلے جاسم نے لائٹ ریفریشمنٹ لے لیا تھا اس لیے فی الحال بھوک کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

''کون سی دو چیزیں مائی سن؟'' حسنی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نمبر ایک، گھنٹے بھر کی مہلت۔'' جاسم نے جواب دیا۔ ''نمبر دو، ایک لیپ ٹاپ.....''

''ٹھیک ہے!'' حسنی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں ابھی تمہاری یہ خواہش پوری کر دیتا ہوں۔''

آئندہ چند منٹ میں حسنی نے جاسم کی مطلوبہ دونوں چیزیں اسے فراہم کر دیں اور یہ کہتے ہوئے اس کے کمرے سے نکل گیا۔

''ایک گھنٹے کے بعد ڈنر پر ملاقات ہوگی۔''

''او کے سر!'' جواب میں جاسم نے کہا۔

حسنی کے جانے کے بعد جاسم اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ سب سے پہلے اس نے ''اسٹائرس'' کو، انقرہ میں پائی جانے والی فارماسیوٹیکل کمپنیز کے ذیل میں گوگل کیا۔ گوگل چاچا نے صاف ''الفاظ'' میں معذرت کر لی۔ اس کے بعد وہ اسٹائرس نام کی ٹیسٹ لیبارٹریز کی کھوج میں لگ گیا۔ اس بار بھی نتیجہ صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔ بالآخر اس نے میڈیکل ریسرچ سینٹرز پر طبع آزمائی کی اور اس مرتبہ کامیابی نے اس کے قدم چوم لیے۔ انقرہ کے ''چانکایا'' نامی انڈسٹریل ایریا میں ''اسٹائرس'' نام کا ایک پرائیویٹ ریسرچ سینٹر موجود تھا۔

اس کے بعد جاسم کا کام آسان ہوگیا۔ اس نے مذکورہ ریسرچ سینٹر کے اسٹاف کو وزٹ کیا تو اس لسٹ میں خلیل ہیماٹو پیتھالوجسٹ کا نام سرفہرست تھا۔ مزید معلومات کے لیے وہ خون کی بیماریوں وغیرہ کی اسٹڈی کرنے لگا تو ایک کے بعد ایک فائل کھلتی چلی گئی اور انہی فائلوں میں ایک ایسی بھی تھی جس نے جاسم کے دماغ کی بتی جلا دی۔ دراصل وہ آرٹیفیشل بلڈ (مصنوعی خون) کے حوالے سے ایک رپورٹ تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ دنیا کی بعض لیبارٹریز میں غیر قانونی طور پر مصنوعی خون تیار کر کے لاوارث لوگوں پر اس کے بھیانک تجربات کیے جا رہے ہیں۔ ایسا کوئی تجربہ ابھی تک کامیاب نہیں ہوا لیکن نہایت ہی رازداری کے ساتھ یہ کام جاری ہے۔ سائنس دانوں کے اس انتہائی مہلک تجربے کا نشانہ بننے والے افراد میں زیادہ تر ''مسنگ پرسنز'' تھے جو اچانک کہیں غائب ہوگئے تھے۔

جاسم کے دماغ کی بتی تو جل ہی چکی تھی۔ اس ''مسنگ پرسنز'' والی لائن نے اس کی سوچ کو اُجال دیا۔ آپوں آپ اس کا دھیان اسد حسنی کی طرف چلا گیا تھا جو چھ سال پہلے اچانک کہیں غائب ہوگیا تھا۔ اگر ظل ہمایا نے اپنے وصال سے پہلے اسد حسنی کو ''اسٹائرس'' کے ساتھ ''جوڑا'' تھا تو اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ اسد حسنی کو اسٹائرس سینٹر ہی سے ملنا تھا اور وہ بھی خلیل نامی اس ہیماٹو پیتھالوجسٹ کے توسط سے.....!

جاسم نے طلال حسنی سے ایک گھنٹے کی مہلت مانگی تھی لیکن وہ آدھے گھنٹے کے بعد ہی اس کے پاس جا پہنچا اور فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''سر! کھانا لگوائیں۔ بڑی کڑاکے کی بھوک لگی ہے۔''

حسنی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اس نے پورے تیقن کے ساتھ کہا۔ ''لگتا ہے، تمہارا کام ہو گیا.....؟''

''یس سر.....'' جاسم بڑے اعتماد سے بولا۔

ان دونوں نے ڈٹ کر ڈنر کیا اور ایک کمرے میں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ حسنی کی سوچتی ہوئی نگاہ جاسم پر جمی ہوئی تھی اور وہ بڑے تحمل سے، اس کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔

''سر! آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نشا اور کامل کے ساتھ کراچی کیوں نہیں گیا.....'' جاسم نے حسنی کے چہرے پر نظر جما کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں نے اسد کا پتا لگا لیا ہے اور..... میں اُسے آپ کے حوالے کرنے کے بعد ہی کہیں جانے کے بارے میں سوچوں گا.....!''

''کک..... کیا.....!'' حسنی پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ''کہیں..... میری سماعت کو..... کوئی دھوکا تو نہیں ہوا.....'' وہ لکنت زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کیا واقعی تم نے..... اسد کو ڈھونڈ نکالا..... ہے.....؟''

بات مکمل کر کے وہ بے یقینی سے جاسم کو تکنے لگا۔ جاسم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے توانا لہجے میں کہا۔

''یس سر! آپ کی سماعت کو کوئی دھوکا نہیں ہوا۔ آپ نے وہی سنا جو میں نے کہا ہے۔ میں نے آپ کے گمشدہ بیٹے اسد حسنی کا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ اس وقت انقرہ کے ایک میڈیکل ریسرچ سینٹر میں ہے.....''

وفورِ مسرت سے حسنی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اسے اپنے جذبات پر اختیار نہ رہا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے دو قدم آگے بڑھ کر جاسم کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

وہ بڑے رقت انگیز اور ہیجان آمیز لمحات تھے۔ حسنی کی لرزاں شادمانی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے جاسم کو اتنا کس کر بھینچ رکھا تھا کہ جیسے خدشہ ہو، اگر اس کی گرفت ذرا سی بھی ڈھیلی پڑی تو اس کے لاپتا بیٹے کا کھوج لگانے والا یہ پاکستانی نوجوان سراغ رساں یکایک غائب ہو جائے گا.....!

جذبات کا ریلا گزرا تو وہ دونوں ایک مرتبہ پھر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ جاسم نے مختصر، پُرمعنی اور جامع الفاظ میں طلال حسنی کو حالات کی صورت سے روشناس کرانے کے بعد معتدل انداز میں کہا۔

''مجھے اپنی اس تحقیق کے صد فیصد درست ہونے میں رتی برابر بھی شک نہیں ہے.....''

''مائی سن! میں تمہارے سورس آف انفارمیشن پر کوئی سوال نہیں اٹھاؤں گا۔'' حسنی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ اسد اس ریسرچ سینٹر میں کب سے ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ وہ اپنے ماں باپ کو کیوں بھول گیا ہے؟ پچھلے چھ سال میں اُسے ایک بار بھی گھر کی یاد کیوں نہیں آئی.....؟''

''سر! یہ ایک نہیں، متعدد سوالات ہیں جن میں سے ہر ایک کا درست جواب یا تو اسد خود دے سکتا ہے اور یا پھر اس ریسرچ سینٹر کا ہیمانو پیتھالوجسٹ حلیل.....!'' جاسم نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''میں کل صبح انقرہ جا رہا ہوں۔''

''وہ کس لیے؟'' حسنی نے غیر ارادی طور پر ایک ایسا سوال کر دیا جس کی کوئی تُک تھی اور نہ ہی ضرورت۔

''حلیل کا ٹینٹوا دبانے.....'' جاسم نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''تاکہ اس کے اندر سے آپ کے ہر سوال کا جواب باہر نکالا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سینٹر میں کس نوعیت کی ریسرچ کا کام جاری ہے۔ لوکیمیا، ہیموفیلیا یا پھر آرٹیفیشل بلڈ ٹرانسفیوژن.....'' وہ لمحے بھر کو تھما، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں اپنی معلومات کے ذرائع آپ کو ضرور بتاؤں گا لیکن اسد کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دینے کے بعد اور اس انمول گھڑی کی آمد میں زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''میرے خیال میں، قاموس کو اس معاملے میں شریک کرنا بہت ضروری ہے۔'' طلال حسنی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ بھی میری طرح بڑی شدت سے اسد کی راہ دیکھ رہا ہے کیونکہ چھ سال پہلے اس نے اسد کو اپنا داماد بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ ابھی تک اس فیصلے پر ڈٹا ہوا ہے۔''

''اوہ.....!'' جاسم ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''ٹھیک کہا آپ نے سر..... اس وقت کمشنر صاحب کا یہاں موجود ہونا ناگزیر ہے۔ آپ انہیں بلا لیں مگر اسد والی خوش خبری تب دیں جب قاموس ترک ہم دونوں کے ساتھ بیٹھ چکے ہوں۔''

طلال حسنی نے اثبات میں گردن ہلائی اور فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

☆☆☆

جاسم پچھلے دو روز سے ''چانکایا'' میں واقع ایک فور اسٹار ہوٹل ''کنگ'' میں قیام پذیر تھا۔ اس دوران میں اس نے ''اسٹائرس'' کے معاملات پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس ریسرچ سینٹر کے آفیشل اوقات کار تو ''نائن ٹو فائیو'' ہی تھے لیکن دیکھنے میں یہی آیا تھا کہ آف ٹائم میں بھی اسٹاف کے چند لوگ وہاں رک جایا کرتے تھے جن کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا اور انہی میں ''ہیمانو پیتھالوجسٹ'' حلیل بھی شامل تھا۔ جاسم نے حلیل کو ایک بھی بار اس سینٹر سے باہر جاتے نہیں دیکھا اور بالکل ایسا ہی معاملہ اسد حسنی کا بھی تھا۔ جاسم ابھی تک طلال حسنی کے بیٹے کی جھلک نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اسے ظل ہطیا کی فراہم کردہ اطلاعات پر اندھا بھروسا تھا۔ اسد یقیناً اس ریسرچ سینٹر میں موجود تھا اور اس تک رسائی حاصل کرنے والے زینے کا نام تھا..... حلیل!

دو روز قبل جاسم، حسنی اور قاموس کے مابین جو سنجیدہ گفتگو ہوئی تھی، اس میں طے پانے والی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے جاسم اس وقت انقرہ کے انڈسٹریل ایریا ''چانکایا'' میں واقع ''کنگ ہوٹل'' میں موجود تھا۔ اس نے اپنے حصے کا آدھا کام نمٹا ڈالا تھا۔ باقی کا آدھا کام آج رات میں نمٹ جانا تھا۔

طلال حسنی کی خواہش تھی کہ اس مشن کو جاسم لیڈ کرے اور انقرہ کی پولیس کو اس معاملے کی بھنک بھی نہ پڑنے دی جائے مگر قاموس کا مشورہ اس کے بالعکس تھا۔ وہ قانون کو مائنس کر کے اس کام کو سرانجام دینے کے حق میں نہیں تھا۔ قانون داں ہائی کورٹ کا جج طلال حسنی محض اپنے بیٹے کی محبت اور حفاظت کے تحت صرف اور صرف جاسم پر اعتماد کرنا چاہتا تھا لیکن جب قاموس نے اسے اس معاملے کی نزاکت اور اہمیت کے بارے میں بریف کیا تو وہ قاموس کی بات ماننے پر تیار ہو گیا تھا۔

اسی ملاقات میں، قاموس نے انقرہ کی پولیس کے ایک آفیسر گالپ کو کال کر کے اس مشن کے بارے میں بتا دیا تھا اور یہ درخواست کی تھی کہ پولیس کے جو اہلکار ''اسٹائرس'' پر ریڈ کریں گے، ان میں جاسم بھی شامل ہوگا۔ کسی سویلین کی، پولیس کارروائی میں شمولیت پر گالپ تذبذب کا شکار دکھائی دیا تو قاموس نے کہا۔

''جاسم وہی پاکستانی نوجوان ہے جس کے تعاون سے استنبول پولیس، بدنامِ زمانہ بلغارین کارٹل مسٹر برانڈو کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ ہم اس پر بھروسا کر سکتے ہیں۔''

''قاموس! مجھے تم پر بھروسا ہے لہٰذا تمہارے تجویز کیے ہوئے بندے پر بھی میں اعتماد کر سکتا ہوں لیکن ایک سوال مجھے پریشان کر رہا ہے۔''

''کون سا سوال گالپ؟'' قاموس نے پوچھا۔

''اس لڑکے میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ انتہائی حساس نوعیت کی معلومات اسے آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں۔'' گالپ نے اپنے تحفظات کا برملا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے کیسے پتا چلا تھا کہ استنبول کے ''سوکسوٹل۔ دی باسفورس'' ہوٹل میں مسٹر برانڈو قیام کرنے والا ہے اور اب وہ طلال حسنی کے گمشدہ بیٹے کو ''اسٹائرس'' کے اندر سے برآمد کرنے کی بات کر رہا ہے۔ میں ذاتی طور پر حسنی سر کو جانتا ہوں اور میری بھی یہی خواہش ہے کہ اسد حسنی صحیح سلامت بازیاب ہو جائے مگر جاسم کی ذات کے حوالے سے تو یہ سوال بنتا ہے نا.....؟''

انقرہ پولیس کی طرف سے اس سوال کا قوی امکان تھا لہٰذا باہمی مشاورت سے اس کا جواب بھی سوچ لیا گیا تھا اور اسی پالیسی بیان کے تحت قاموس نے گالپ کی تسلی کی خاطر کہا۔

''گالپ! میں تمہاری اُلجھن کو سمجھ سکتا ہوں۔ اطمینان رکھو کہ جاسم مکمل طور پر قابلِ اعتبار شخص ہے۔ یوں سمجھو کہ وہ ایک سائیکک پرسن ہے۔ اللہ نے اسے ایک خاص صلاحیت عطا کر رکھی ہے۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کر کے مراقبہ کرتا ہے تو مستقبل کا احوال اس پر کھلنے لگتا ہے۔ مراقبے ہی کے ذریعے وہ ماضی میں بھی جھانک لیتا ہے۔ جب میرے دوست حسنی نے جاسم سے اپنے بیٹے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے چند منٹ تک آنکھیں بند رکھنے کے بعد کہا..... اسد حسنی اس وقت حلیل نامی ایک ہیمانو پیتھالوجسٹ کی کسٹڈی میں ہے اور وہ لوگ اسٹائرس

خاموشی

پوری محفل بات چیت اور بحث و مباحثے کی آماج گاہ بنی ہوئی تھی لیکن ان میں چند ایسے بھی تھے جنہوں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ بولنے والوں نے ان کا مذاق اُڑایا۔ ''صاحبان اس محفل میں چند گونگے بھی آ گئے ہیں، ان کی خاموشی نے اس باغ و بہار محفل میں قدرے بدمزگی اور بوریت سی پیدا کر دی ہے۔''

ایک کم گو نے محفل میں پہلی بار زبان کھولی، بولا۔ حضرات! ان صاحب کا فرمانا بجا، جواب میں، میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ خاموشی سے خرابیاں نہیں پیدا ہوتیں اور اگر کہیں پیدا ہو بھی جائیں تو ان کا تدارک آسان ہوتا ہے مگر گفتگو اور زیادہ بولنے سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے اس کا تدارک مشکل ہوتا ہے۔'' پھر حاضرینِ محفل سے سوال کیا۔ ''کیا آپ نے پانی سے بھری ہوئی مشک دیکھی ہے۔''

حاضرین میں سے چند آوازیں بلند ہوئیں۔ ''ہاں دیکھی ہے۔''

اس شخص نے کہا۔ ''تب پھر آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ مشک کا منہ باندھ کر ہی اس کا پانی روکا جاتا ہے۔''

روبینہ حمید..... راول پنڈی

pklibrary.com

میں کوئی تحقیقاتی کام کر رہے ہیں۔ جاسم نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اس ریسرچ سینٹر میں نہایت ہی خفیہ طریقے سے کوئی غیر قانونی کام بھی ہو رہا ہے۔''

''اوہ..... تو یہ بات ہے۔'' گالپ نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو میں ضرور اس پاکستانی جوان سے ملنا چاہوں گا۔''

''تمہیں اس سے مل کر خوشی ہو گی گالپ.....!'' قاموس نے معتدل انداز میں کہا۔ ''استنبول پولیس جاسم کی اس خداداد صلاحیت سے فائدہ اٹھا چکی ہے اور اب تمہاری باری ہے۔ مجھے یقین ہے، اس ریسرچ سینٹر سے کچھ ایسا ضرور برآمد ہو گا جو تمہاری ترقی کا باعث بن جائے گا۔''

اس کے بعد کے تمام معاملات بہ سہولت طے پا گئے تھے۔ جاسم نے چانکایا (انقرہ) آ کر اپنا ہوم ورک اچھے سے کر لیا تھا اور آج رات پریکٹیکل کی باری تھی۔ اس ''ارلی نائٹ آپریشن'' کی حکمتِ عملی ترتیب دی جا چکی تھی۔ ٹھیک نو بجے رات، پولیس کی یونیفارم میں ملبوس جاسم نے دو اہلکاروں کی معیت میں ''اسٹائرس'' پر دھاوا بولنا تھا۔ ریسرچ سینٹر کے باہر، تھوڑے فاصلے پر گالپ کو چار مستعد پولیس اہلکاروں کے ساتھ ایک دم چوکنا اور کسی بھی ہنگامی کارروائی کے لیے تیار موجود رہنا تھا۔

پروگرام کے مطابق جاسم اور دو پولیس والے اسٹائرس میں داخل ہوئے۔ ان پولیس والوں کو گالپ نے سمجھا دیا تھا کہ انہیں جاسم کے آرڈرز کو فالو کرنا ہے۔ جاسم کی ''ریسرچ'' کے مطابق، اس سینٹر پر کُل چار سیکیورٹی گارڈز تھے۔ دو گاڈز باہر گیٹ پر تعینات تھے اور باقی کے دو سینٹر کے اندر موجود رہ کر سیکیورٹی کے معاملات پر نظر رکھتے تھے۔

گیٹ پر متعین گارڈز کو جب جاسم نے یہ بتایا کہ وہ حلیل سے ملنے آئے ہیں تو ان میں سے ایک نے کہا۔

''حلیل سر تو اس وقت سینٹر میں موجود نہیں ہیں۔ وہ پانچ بجے آف کر جاتے ہیں.....''

وہ گارڈ صریحاً غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ جاسم نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے میری حلیل سے فون پر بات ہوئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ سینٹر ہی میں ہے لہٰذا میں اس سے ملنے آ جاؤں.....'' ذرا دیر رک کر اس نے خفگی بھری نظر سے ان گارڈز کو گھورا اور سپاٹ آواز میں اضافہ کر دیا۔ ''یہ بہت ہی حساس معاملہ ہے۔ ہم حلیل کی مدد کرنے آئے ہیں۔''

ایک گارڈ نے اپنے ساتھی گارڈ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی خاموش اشارہ کیا اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم اِن آفیسرز کو اندر لے جاؤ۔ میں اِدھر کے معاملات دیکھ لوں گا۔''

گیٹ سے اندر داخل ہوتے وقت، جاسم نے پولیس اہلکاروں سے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تم لوگوں کو ان مسلح سیکیورٹی گارڈز پر گہری نگاہ رکھنا ہے۔ اس بات کے امکانات بہت کم ہیں کہ یہ لوگ پولیس پر گولی چلانے کی حماقت کریں لیکن اگر ایسی کوئی صورتِ حال بن بھی گئی تو تم نے اپنے بچاؤ میں، ان پر اسٹریٹ فائر کرنے کی غلطی ہرگز نہیں کرنا۔ اس سینٹر میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ یہ بے چارے تو اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں۔''

''سمجھ گئے سر!'' وہ دونوں بہ یک زبان بولے۔

''یہ کُل چار ہیں۔ دو اندر اور دو باہر.....'' جاسم نے بہ دستور نیچی آواز میں کہا۔ ''چلے گا نا.....؟''

''دوڑے گا سر!'' ایک پولیس والے نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''آپ بے فکر ہو کر اپنا کام کریں۔ ہم انہیں سنبھال لیں گے۔''

''گڈ!'' جاسم نے کہا۔

باہر سے ساتھ آنے والا سیکیورٹی گارڈ انہیں اندرونی حصے میں ریسیپشن تک پہنچانے کے بعد واپس چلا گیا۔ اندر دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ وہ انہیں دیکھتے ہی چاق و چوبند ہو گئے۔ جاسم کے حواری پولیس والوں نے بھی مناسب پوزیشن تاک لیں۔ ان کی چوکنا جسمانی حرکات و سکنات سے جاسم مطمئن ہو گیا۔ وہ سیکیورٹی گارڈز کو یہی تاثر دے رہے تھے کہ جاسم ان کا سینئر آفیسر ہے۔

جاسم نے ریسیپشن پر موجود شخص کے پاس پہنچ کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''حلیل سے ملنے آیا ہوں۔ بہت ہی اہم کام ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے مجھے فون کیا تھا۔ تم حلیل کو میری آمد کی اطلاع دو گے یا میں خود ہی اس کے پاس چلا جاؤں.....؟''

یہ بات جاسم کے دھیان میں تھی کہ اسٹائرس کے اندر اور باہر ہر جگہ سی سی ٹی وی کیمرا ز لازمی نصب ہوں گے لیکن ان لمحات میں اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ وہ اس وقت خاصے خطرناک اور کچھ کر گزرنے کے موڈ میں دکھائی دیتا

تھا۔

''سر! آپ نے اپنا نام کیا بتایا ہے.....؟''

ریسپشنسٹ نے فون کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''قانون کا کوئی نام نہیں ہوتا۔'' جاسم نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''لگتا ہے، میری بات تمہارے بھیجے میں نہیں اتری۔ تمہیں دوسرے طریقے سے ہی سمجھانا پڑے گا۔''

''سر..... دراصل..... حلیل سر نے آپ کے بارے میں مجھے بتایا نہیں ہے..... اس لیے.....!'' ریسپشنسٹ نے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی غرض سے کہا پھر ایک سیکیورٹی گارڈ کو اشارے سے اپنی طرف بلانے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''پولیس آفیسر کو حلیل سر کے پاس لے جاؤ۔''

جاسم نے ایک جوان کڑک اور غصیلے پولیس والے کا کردار اتنا اچھے سے نبھایا تھا کہ ریسپشنسٹ انٹرکام پر حلیل کو اطلاع دینا بھول کر سیکیورٹی گارڈ کی مدد لینے پر مجبور ہوگیا تھا۔

اب اس سینٹر کے ریسپشن ایریا میں ایک ہی سیکیورٹی گارڈ رہ گیا تھا۔ دوسرا گارڈ جاسم کے ساتھ حلیل کے پاس جارہا تھا۔

''اس طرف سر.....!'' گارڈ نے لفٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ادب سے کہا۔ ''ہمیں بیسمنٹ میں جانا ہے۔ حلیل سر اُدھر ہی ملیں گے۔''

جاسم نے سر کو اثباتی جنبش دی اور گارڈ کے ساتھ لفٹ میں داخل ہوگیا۔

''تم کب سے اس سینٹر میں ڈیوٹی کررہے ہو؟'' جاسم نے دوستانہ انداز میں استفسار کیا۔

''دو سال سے سر!'' گارڈ نے جواب دیا۔

جاسم نے پوچھا۔ ''کیا تمہاری شادی ہوگئی؟''

''یس سر..... میرے دو بچے بھی ہیں۔''

''اپنے بیوی بچوں کو رزق حرام کھلانا کیسا لگتا ہے؟'' جاسم نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''ضمیر تو ملامت کرتا ہی ہوگا..... ہیں نا!''

''میں سمجھ نہیں پارہا ہوں سر.....!'' گارڈ نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں؟''

''کیا تم جانتے ہو کہ اس سینٹر میں ریسرچ کی آڑ میں اور کیا کیا ہورہا ہے؟'' جاسم نے اس کی اُلجھن کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔

''یہاں پر تو صرف ریسرچ ہی ہوتی ہے سر!'' اس نے بتایا۔ ''اس کے علاوہ خون کی مختلف بیماریوں میں مبتلا مریضوں کا علاج بھی ہوتا ہے۔''

''کیا.....؟'' جاسم نے سرد مہری سے پوچھا۔

''یس سر!'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''ہم نیچے پہنچ گئے ہیں۔ میں آپ کو دکھاؤں گا، بیسمنٹ میں اس وقت بھی کئی مریض زیرِ علاج ہیں۔''

لفٹ رکی تو باہر نکلنے سے پہلے جاسم نے اپنی جیب میں سے اسد حسنی کی ایک پوسٹ کارڈ سائز فوٹو نکال کر گارڈ کو دکھاتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا یہ جوان بھی ٹریٹ منٹ کے لیے یہاں موجود ہے۔ اسے خون کی ایک خطرناک اور لاعلاج بیماری ہے۔ اسپتال والوں نے اسے جواب دے دیا تھا۔''

یہ کہانی جاسم کے ذہن کی فوری اختراع تھی۔ فوٹو پر نگاہ پڑتے ہی سیکیورٹی گارڈ کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہوئی پھر اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''جی ہاں۔ اس کا نام آئیڈن ہے۔ اسے کچھ عرصہ پہلے ہی اس سینٹر میں لایا گیا ہے۔ ڈاکٹر حلیل بڑی توجہ سے آئیڈن کا علاج کررہے ہیں۔''

جاسم نے آئیڈن اور اسد کی بحث کا دروازہ کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور لفٹ سے باہر آنے کے بعد سیکیورٹی گارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''حلیل سے ملوانے سے پہلے تم مجھے آئیڈن کے پاس لے چلو۔ میں ایک نظر اس مریض کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد حلیل سے ملاقات کروں گا۔''

لمحاتی تذبذب کے بعد وہ سیکیورٹی گارڈ جاسم کو بیسمنٹ کے ایک دور اُفتادہ حصے میں لے گیا۔ اس طرف لگ بھگ دس چھوٹے چھوٹے وارڈ بنے ہوئے تھے جو سب کے سب ''مریضوں'' سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی سو رہا تھا اور کوئی نیم بیدار تھا۔ اکثر مریضوں کو ڈرپس بھی لگی ہوئی تھیں۔ بیس منٹ کا درجہ حرارت ایک دم ٹھنڈا ٹھار اور خوش گوار تھا۔

جاسم کی متلاشی نگاہ اسد کو ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ سیکیورٹی گارڈ کی سرسراتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''سر! وہ رہا آئیڈن.....!''

جاسم نے اس بیڈ کی طرف دیکھا جہاں گارڈ نے انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی نظر اسد حسنی کے چہرے پر پڑی۔ جاسم نے البم کے اندر لگی ہوئی اسد کی اتنی

pklibrary.com

زیادہ تصاویر دیکھ رکھی تھیں کہ اسے پہچاننے میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگا۔ اسد حسنی اپنے اسپتالی بیڈ پر دراز چپ چاپ سو رہا تھا۔

جاسم نے ایک سکون آور گہری سانس خارج کی اور اپنی اندرونی کیفیات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے سیکیورٹی گارڈ سے کہا۔

''میں اپنے عزیز آئیڈن کو زندہ سلامت دیکھ کر مطمئن ہوگیا ہوں۔ اب تم مجھے حلیل کے پاس لے چلو تاکہ میں اس کا بھی شکریہ ادا کرسکوں۔''

''سر! اب تو آپ کو یقین آگیا ہے نا کہ اس سینٹر میں کوئی ایسا کام نہیں ہو رہا جس پر انسان کا ضمیر ملامت کرے؟'' سیکیورٹی گارڈ نے ایک جانب بڑھتے ہوئے شکایتی لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں..... بالکل.....!'' جاسم نے مصنوعی ندامت کا اظہار کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔

''وہ سامنے رہا حلیل سر کا آفس.....'' سیکیورٹی گارڈ نے کوریڈور کے آخری سرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جاسم کو بتایا۔ ''آپ اُن سے ملاقات کریں۔ میں اوپر جاتا ہوں۔''

''تم واپس جانے کے لیے نہیں بھی کہتے تو میں تمہیں ایسا ہی کہنے والا تھا.....'' جاسم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''بہرحال تمہارے تعاون کا بہت شکریہ۔ اب تم جاسکتے ہو۔''

سیکیورٹی گارڈ جانے کے لیے پلٹا تو جاسم کا دایاں ہاتھ برقی رفتار سے حرکت میں آیا۔ گارڈ کی پشت جاسم کی طرف تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا تھا۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں جاسم کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور ایک کاری ضرب لگانے کے بعد اپنی ''جگہ'' پر واپس آگیا۔

جاسم نے کھڑے ہاتھ سے سیکیورٹی گارڈ کی گردن کے مخصوص حصے کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ ایسا پرفیکٹ اٹیک تھا کہ وہ گارڈ منہ سے ''اوں'' کی آواز نکالتے ہوئے، اناج سے بھری ہوئی بوری کے مانند ''دھپ'' سے بیسمنٹ کے چکنے فرش پر جاگرا۔ اب کم از کم آدھے گھنٹے سے پہلے وہ اس انٹاغفیلی کیفیت سے باہر آنے والا نہیں تھا۔

جاسم، بے ہوش سیکیورٹی گارڈ کو کوریڈور میں چھوڑ کر حلیل کے کمرے کی سمت بڑھ گیا۔ مذکورہ کمرے میں داخل ہونے کے لیے جاسم نے ''ناک'' کے تکلف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے من مانی کی۔ اگلے ہی لمحے وہ حلیل کے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھا ہوا تھا۔

حلیل بھیانو پیتالوجسٹ ایک عمر رسیدہ اور لمبے بالوں والا شخص تھا۔ جاسم کی اس ہنگامی کارروائی پر وہ حیرت اور خفگی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اُچھلا اور برہمی سے پوچھا۔ ''کون ہو تم.....؟''

جاسم نے اسد حسنی کا فوٹو اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے درشت لہجے میں جواب دیا۔ ''میں اس جوان مریض اسد حسنی کا چھوٹا بھائی ہوں۔'' وہ اپنی انگلی سے اسد کے فوٹو پر دستک دیتے ہوئے جارحانہ انداز میں بولا۔ ''مجھے بتاؤ، اسد کو کس نے تمہارے سینٹر میں داخل کرایا ہے اور..... تم اس کے کون سے مرض کا علاج کر رہے ہو.....؟''

جاسم کے خطرناک تیور دیکھ کر حلیل کا حلق خشک ہو گیا اور اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی۔ وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''یہ اسد حسنی نہیں..... آئیڈن..... تم کون ہو..... اور تم اندر..... کیسے آگئے..... میں ابھی سیکیورٹی کو بلاتا.....''

جاسم کے ایک زناٹے دار تھپڑ نے اس کی خوف سے لرزتی ہوئی آواز کو بریک لگا دیے۔ وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے سہمی ہوئی نظر سے جاسم کو تکنے لگا۔

''میں یہاں تمہاری بکواس سننے نہیں آیا.....'' جاسم نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ''فضول باتوں کے لیے اپنا منہ بند رکھو ورنہ میں اسے ہمیشہ کے لیے بند کردوں گا۔''

حلیل نے تھوک نگل کر اپنے حلق کو تر کیا پھر پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ''میں..... سچ..... کہہ رہا ہوں۔ اس مریض..... کا نام..... آئیڈن ہی ہے..... یہاں جو بھی لوگ لائے جاتے ہیں، میں اُن کے بارے میں..... زیادہ نہیں جانتا..... میرا یقین کرو.....''

قبل اس کے کہ حلیل کی وضاحت کے جواب میں جاسم اُس کے دوسرے گال پر بھی ایک زوردار طمانچہ رسید کرتا، اچانک لائٹ چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس ریسرچ سینٹر کے بالائی حصے میں فائرنگ کی آواز سنائی دی۔

سردست جاسم یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ وہ فائرنگ اس کے ساتھ آنے والے پولیس اہلکاروں نے کی تھی یا اس سینٹر کے سیکیورٹی گارڈز نے۔ وہ ہر دو صورت میں سنسنی خیز حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوگیا.....

حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے

pklibrary.com

واقعات اور سانحات اس قدر تیزی سے رونما ہوتے ہیں کہ سوچنے والے سوچتے رہ جاتے ہیں... اور دغابازی کرنے والے اپنی چال چل جاتے ہیں... جب تیر کمان سے نکل چکا ہو تو افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں... جیسے کسی کیس کی باریکی میں جائو تو ایسی باتیں سامنے آتی چلی جاتی ہیں جیسے کہ پرانے زخم پھر ہرے ہو جائیں... پے در پے مقتول ہو جانے والے مخصوص افراد کا ماجرا... پُراسرار موت ان کا تعاقب کر رہی تھی...

ایک صحافی کی ڈائری کے خون آلود ورق.....

موت کا رقص

علی عباس

میں اپنے وڑبے نما کمرے میں ٹیلی ویژن پر معمول کے مطابق بریکنگ نیوز سن رہا تھا جب ایک خبر نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ یہ ملک کے ایک معروف صحافی اور میرے قریبی دوست کی ناگہانی وفات کی خبر تھی۔ میرے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی تھی۔ یہ عام دن ہوتے تو غالباً میں نہ چونکتا مگر اس وقت ملک میں سیاسی تقسیم عروج پر تھی اور سب سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف مورچا بند تھیں اور حکومت

کی جانب سے بھی میڈیا پر گرفت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ کچھ صحافی منظر نامے سے ایسا غائب ہوئے تھے کہ ان کے گھر والے بھی ان کے بارے میں بات کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ تین ماہ کے اندر چار صحافیوں کا دل کے دورے سے ہونے والے انتقال میں کچھ تو گڑبڑ تھی۔

میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔ مشکل حالات میں صحافت اور ادب سے وابستہ لوگوں کے لیے دباؤ برداشت کرنا آسان نہیں رہتا اور ان صحافیوں اور ادیبوں کے لیے بالخصوص جو صحافت میں یا ادب میں غیر جانبدار رہنے کے قائل ہیں۔

میں نے اپنے اسسٹنٹ کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ وہ مجھے انٹرنیٹ کی مدد سے ان تمام صحافیوں کی فہرست مرتب کر کے دے جو گزشتہ چھ ماہ کے دوران میں دل کا دورہ پڑنے یا پُراسرار طور پر جان سے گئے ہیں۔ اس خبر پر کام کرنا میری کیونٹی کے مفاد میں بھی تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ میری چھٹی حس نے مجھے ایک اشارہ ضرور دے دیا تھا کہ میر حسن تم بھی نشانہ بن سکتے ہو سو محتاط ہو جاؤ۔

میں اگرچہ صحافت میں ایڈونچرازم کا ہمیشہ مخالف رہا ہوں مگر بسا اوقات رسک لیے بنا بات بن نہیں پاتی۔ موجودہ حالات میں بہرحال احتیاط ہی بہتر تھی۔ میرا اسسٹنٹ کام پر لگ گیا اور میں نے مرحوم بشیر چوہدری کے بھائی فیصل چوہدری سے رابطہ کیا جس سے میری بہت اچھی جان پہچان بھی تھی۔ اس سے تعزیت کرنے کے بعد جنازے کے وقت کے بارے میں پوچھا جو نمازِ عصر کے بعد ادا کیا جانا تھا۔

میرے پاس فی الحال کرنے کو کوئی خاص کام نہیں تھا تو میں نے شہر سے ملنے والی لاوارث لاشوں کی خبر پر کام شروع کر دیا جن کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ مرنے والوں کی اکثریت نشہ کرنے کی زیادتی کی وجہ سے ہلاک ہوئی۔ اس خبر پر پہلے بھی کام ہوا تھا مگر وہ سرسری سا تھا اور گہرائی میں اتر کر حقائق باہر نکالنے کی زیادہ کوشش نہیں کی گئی تھی۔ میری تفتیش میں کچھ پولیس افسروں کے نام بھی سامنے آئے تھے جو منشیات کی فروخت میں ملوث تھے۔ اس دوران میرا اسسٹنٹ مجتبیٰ نقوی ہانپتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا اور کہا۔

''سر، میں نے پچھلے چھ ماہ کا ریکارڈ سرچ کیا ہے۔ اس عرصے میں پانچ صحافیوں اور دو ادیبوں کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوا ہے۔''

''شاہ صاحب سانس لیجیے، آپ نوجوان ہیں، بے فکر ہو جایئے۔''

''وہ سر، بات یہ ہے کہ دو یوٹیوبرز بھی دل کا اچانک دورہ پڑنے سے ہلاک ہوئے ہیں جبکہ وہ ابھی نوجوان تھے اور میں یوٹیوبر بھی تو ہوں سر۔''

''اوہ نقوی صاحب، آپ پریشان بہت جلدی ہو جاتے ہیں۔ آپ یہ فہرست میرے حوالے کیجیے اور ہاں، وہ پولیس ہیڈ کوارٹرز کال کیجیے اور میرا حوالہ دے کر متعلقہ افسر سے یہ معلوم کیجیے کہ یہ بے گھر، بے شناخت مرنے والوں کی وجہ نشے کی زیادتی ہی ہے یا کوئی گینگ ان وارداتوں میں ملوث ہے۔''

''جی سر۔'' مجتبیٰ نقوی اب بھی بوکھلایا ہوا تھا۔

وہ دروازہ بند کر کے جانے لگا تو میں نے دوبارہ مخاطب کیا۔ ''نقوی صاحب، یوٹیوب چینل ضرور چلایئے مگر انقلاب لانے کی چنتا سیاست دانوں پر چھوڑ دیجیے۔''

وہ میری بات سمجھا یا نہیں مگر مذاق میں کہے میرے جملے نے اس پر گہرا اثر کیا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور میں پریشان ہو گیا کہ وہ کہیں خوف سے بیمار ہی نہ ہو جائے۔

☆☆☆

میرا اندازہ غلط تھا۔ چھ ماہ کے مختصر عرصے میں نو ایسے افراد دل کا دورہ پڑنے سے جان سے گئے تھے جو سماج میں تبدیلی لا سکتے تھے، وہ اثر و رسوخ کے حامل تھے اور ان کی رائے عوام میں گہرا نفوذ رکھتی تھی اور اس صورتِ حال کا سب سے تشویش ناک پہلو یہ تھا کہ یہ سب لوگ دارالحکومت سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ مرنے والے تمام صحافیوں سے میری اچھی دعا سلام تھی اور میرے علم کے مطابق، ان میں سے کوئی بھی دل کے عارضے میں مبتلا نہیں تھا۔ ان دونوں ادیبوں کے متعلق میں زیادہ تو نہیں جانتا تھا مگر ان کی انقلابی شاعری کے چرچے بہت سنے تھے اور دونوں یوٹیوبرز کی موت پر خوب واویلا مچا تھا کیونکہ وہ دونوں ایک ہی سیاسی پارٹی کو سپورٹ کر رہے تھے۔ وہ اپنا تعارف یوٹیوب انفلوئنسر کے طور پر کرواتے تھے اور یہ اصطلاح مجھے ہمیشہ بودی محسوس ہوئی ہے۔ آپ بطور صحافی اپنے تجربے اور تعلقات کی بنا پر تو حکومت کو کچھ غلط کرنے سے روک سکتے ہیں مگر مکمل طور پر ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

سوال اب یہ تھا کہ اس خبر پر کام کا آغاز کس طرح کیا

pklibrary.com

جائے؟ کیا ان اموات کا آپس میں کوئی تعلق تھا یا موجودہ سیاسی تناؤ کے باعث یہ صحافی پیشہ ورانہ دباؤ برداشت نہیں کر سکے تھے؟ بہت سے سوال تھے جن کے جواب تلاش کیے بنا آگے بڑھنا آسان نہیں تھا۔ کیا ان تمام اموات کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ رائے عامہ بنانے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے یا ان اموات کی گہرائی میں مزید راز بھی پوشیدہ تھے؟ یہ درویش لاوارث لاشوں کی کہانی میں بہت زیادہ گہرائی میں اُتر چکا تھا کیونکہ اپنے ہم پیشہ ساتھیوں کی بے وقت موت نے بے چین کر دیا تھا۔

میں عموماً دو موبائل فون رکھتا ہوں۔ ایک موبائل گھر پر بات کرنے کے لیے جبکہ دوسرا صرف پیشہ ورانہ روابط کے لیے۔ اور ایک اور موبائل بھی میرے پاس ہوتا ہے جو میں کچھ مخصوص لوگوں سے بات کرنے کے لیے رکھتا ہوں کیونکہ آج کے عہد میں صحافت کرنا آسان نہیں رہا۔

میں نے اپنا یہ تیسرا موبائل نکالا اور ایک نمبر پر کال ملائی۔

دوسری بیل پر ہی ایک بھاری مگر پُرجوش آواز سنائی دی، ''میر صاحب، حکم فرمایئے۔ ہم آپ کی کیا سیوا کر سکتے ہیں؟''

یہ ایک حساس ادارے کے میڈیا سیل کے اعلیٰ ترین افسر کا ذاتی نمبر تھا جو اس قسم کے آپریشن کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔

''ہم کون ہوتے ہیں حکم کرنے والے۔ بادشاہ گر تو آپ ہیں جناب۔ یہ بتایئے اس فقیر کا نمبر کب آ رہا ہے؟''

''آپ طنز تو نہ کیجیے، کھل کر بتایئے کیا جاننا چاہ رہے ہیں؟''

''یہی جناب کہ آپ کی فہرست میں ہم کون سے نمبر پر ہیں؟''

''میر صاحب آپ تو ہمارے دل میں بستے ہیں۔ فہرست میں کوئی اور لوگ ہوتے ہیں۔''

''کیا اس فہرست میں نواز چٹھہ، راشد خان، بشیر چوہدری، نذیر احمد اور ثمر خان بھی شامل تھے۔''

''کیا بات کر رہے ہیں میر صاحب، یہ سب بہت قابلِ قدر صحافی تھے۔ یہ درست ہے کہ میرا نواز چٹھہ اور بشیر چوہدری سے قریبی رابطہ تھا۔ یہ لوگ فہرست میں بھی موجود تھے اور ان کی سرگرمیوں کی تمام تفصیل کا ریکارڈ محفوظ ہے۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔

''ورک صاحب، کیا آپ کو ان اموات میں کچھ عجیب تو نہیں لگا۔''

''میر صاحب، یہ تو میں نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی ان لوگوں کے گھر والوں میں سے کسی نے ایسا کوئی دعویٰ کیا ہے لیکن میں یہ وثوق سے ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میرے ادارے کا ان تمام معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔''

''ایک اور بات، کیا آپ مجھے ان سے متعلق اپنی بنائی گئی فائل بھجوا سکتے ہیں؟''

''میر صاحب، یہ حساس فائلز ہیں مگر آپ کو کبھی انکار نہیں کیا تو اپنے معاون سے کہہ کر ان تمام لوگوں کے ریکارڈ کا ایک خلاصہ بنوا کر آپ کو پرسوں تک بھجوا دیتا ہوں۔''

''ان میں وہ دو یوٹیوبرز عامر راہی اور سلیم جنید کا نام بھی شامل کر لیجیے گا۔''

''میر صاحب، میں ایسے ہی آپ کی قابلیت کا قدرداں نہیں ہوں۔ ان دونوں کی فائل بھی تیار ہے، آپ کو مل جائے گی مگر اپنی فائل مت مانگیے گا۔'' دوسری جانب سے ایک بلند قہقہہ بلند ہوا جس پر میں بھی اپنا قہقہہ نہ روک سکا۔

میں نے اس کے بعد ایک سویلین خفیہ ادارے کے اعلیٰ افسر سے رابطہ کیا۔ ان سے میرا ایک ذاتی تعلق بھی تھا۔ وہ میرے صرف یونیورسٹی فیلو ہی نہیں رہے تھے بلکہ رقیبِ روسیاہ بھی رہے تھے کیونکہ ہم دونوں انگریزی ڈیپارٹمنٹ کی ایک ہی لڑکی کو پسند کرتے تھے جو کوئی تیسرا لے اُڑا۔

انہوں نے فون اٹھاتے ہی سلام دعا کیے بغیر پوچھا۔

''آج میرے رقیب نے مجھے کس طرح یاد کر لیا؟''

''بس یونہی اُس کی گھنی زلفوں کی یاد آئی تو آپ کا چہرہ بھی نظروں کے سامنے دوڑ گیا۔ سوچا بات کر کے اپنے زخموں پر پھایا رکھنے کا کوئی اہتمام ہو جائے۔''

''میر صاحب کم دی گل تے آؤ (کام کی بات کریں) میری یاد اس لیے آئی کہ آپ کے ذہن میں کچھ عجیب پک رہا ہے۔ کھل کر بتایئے، بریانی کی دیگ کو دم دے رکھا ہے یا سادہ چاول ہیں؟''

''ملک صاحب آپ سے باتوں میں کہاں جیتے ہیں۔ یار، ایک معاملہ ہے، یہ چھ ماہ میں پانچ صحافی، دو یوٹیوبرز اور دو ادیبوں کی ہارٹ اٹیک سے موت ہوئی ہے جبکہ وہ بیمار بھی نہ تھے۔ کیا یہ آپریشن آپ کی سرپرستی میں تو انجام نہیں دیا جا رہا؟''

''یار بونگیاں نہ مارا کر۔ ہم ہارٹ اٹیک کروائیں گے۔ موت کا فرشتہ جب بھی آ جائے۔ ہم تو بندے کو

ڈائریکٹ اٹھا کر اس کی ایسی ٹیوننگ کرتے ہیں کہ وہ گھر کا رستہ بھی بھول جاتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک کہا ملک صاحب آپ نے مگر کیا آپ کو ان موات میں دال میں کچھ کالا نظر نہیں آرہا۔"

"یار مجھے تو یہ پوری زندگی ہی کالی نظر آرہی ہے۔"

"ملک صاحب کدے تے (کبھی تو) سنجیدہ ہو جایا کرو۔ کیا ان اموات کے پسِ پردہ کوئی سازش ہو سکتی ہے؟"

"میر حسن صاحب، میرے علم میں تو ایسی بات نہیں ہے۔ ان تمام اصحاب کا ریکارڈ ضرور موجود ہے، وہ آپ کے کہے بغیر کل آپ کی میز پر پہنچ جائے گا۔"

عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ مجھے بشیر چوہدری کے جنازے پر جانا تھا۔ میں نے مجتبیٰ کو بلایا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور وہ باقاعدہ کانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا شاہ صاحب۔ ہم ہیں نا۔ آپ چنتا نہ کیجیے۔ وہ دونوں یوٹیوبرز بھلا سا نام تھا ان کا۔" میں نے ذہن پر زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"جی سر عامر راہی اور سلیم جنید۔"

"ان سے کبھی ملے بھی تھے یا صرف ان کی بونگیاں ہی سنا کرتے تھے؟"

"سر سلیم جنید تو میرا ہم جماعت تھا اور عامر راہی اس کا قریبی دوست تو میرا بھی دوست ہوا۔" مجتبیٰ اپنی عادت سے مجبور ہو کر شومارنے سے باز نہیں آیا۔

میں نے اس سے کہا۔ "میں کچھ دیر میں واپس آرہا ہوں۔ ان دونوں کے خاندانوں سے بات کرو اور معلوم کرو کہ وہ کیا ہارٹ اٹیک ہونے سے قبل بیمار رہے تھے، یا کسی بیماری کا علاج تو نہیں کروا رہے تھے۔"

"جی سر، میں ان کا ریکارڈ نکلواتا ہوں۔"

"شاہ جی، آپ مہربانی کیجیے اور ان اصحاب کے بارے میں یہ معلومات حاصل کیجیے۔ ریکارڈ میں نکلوا لوں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے میز سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر کی جانب دوڑ لگا دی کیونکہ جنازے میں زیادہ وقت نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

بشیر چوہدری مرحوم کے جنازے میں صحافیوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ کچھ سیاست داں بھی حاضری لگوانے کے لیے وہاں پر موجود تھے اور کچھ مرحوم کے رشتے دار تھے۔ میری مرحوم کے بھائی سے اچھی سلام دعا تھی۔ میں نے ان سے تعزیت کی اور آگے بڑھ گیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ان سے آج اس بارے میں بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ میری کچھ صحافی دوستوں سے بھی بات ہوئی مگر کسی کی گفتگو سے ایسا محسوس نہیں ہوا کہ وہ بشیر چوہدری کی موت پر حیرت زدہ ہو بلکہ وہ مرحوم کی وہ وہ صفات بیان کر رہے تھے جن کے بارے میں مرحوم زندہ ہوتے تو ضرور اپنا سر پکڑ لیتے۔ میں حیران تھا کہ کیوں اس حساس معاملے پر ایسی بے حسی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے یا میں ہی بال کی کھال اتار رہا ہوں لیکن یہ ضروری بھی تھا۔ اس دوران نمازِ جنازہ کے لیے صف بندی کرنے کا اعلان ہوا۔ میں بھی صف میں کھڑا ہو گیا اور نمازِ جنازہ ادا کرنے کے بعد دوبارہ دفتر کی راہ لی کیونکہ شام کو بھی رپورٹرز کی میٹنگ میں شریک ہونا ضروری تھا جو اخبار کے چیف رپورٹر کے طور پر میری ذمے داری تھی تاکہ یہ جان پاتا کہ میرے رپورٹرز نے فیلڈ میں کوئی کام کیا یا صرف فون پر ہی اپنے سورسز سے بات چیت کر کے خبریں مجھ تک پہنچا دی ہیں۔ وہ سب بھی جانتے تھے کہ میں ایک ورکر دوست باس ہوں جو اُن کے حق کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے مگر پیشہ ورانہ اصولوں پر بھی کوئی سمجھوتا نہیں کرتا جس کے باعث وہ بھی دل لگا کر کام کیا کرتے تھے۔

وقت مقررہ پر میٹنگ ہوئی۔ میں واپس اپنے دفتر میں آیا، کچھ چیزوں کو لائن اَپ کیا تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ محض ایک اتفاق ہے یا اس خبر میں کوئی دم بھی ہے۔ میں نے دوبارہ ایک نمبر پر کال کی، یہ شہر کے پولیس چیف کو کی تھی۔ ان سے شہر کے موسم، امن و امان کے حالات پر بات ہوئی اور میں پھر اشارتاً ان کے علم میں یہ لایا کہ پانچ صحافی، دو ادیب اور دو یوٹیوبر چھ مہینے میں دل کا دورہ پڑنے سے ہلاک ہوئے ہیں۔ کیا ان کو اس میں کچھ عجیب دکھائی دیتا ہے؟

باتوں باتوں میں بات نکلی تھی۔ انہوں نے بے تکلفی میں کہہ دیا، میں بھی آج یہی سوچ رہا تھا، پھر انہوں نے اس خیال سے کہ وہ ایک صحافی سے بات کر رہے ہیں، کہا، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ایک اتفاق ہی ہے۔ ایک افسوس ناک اور پریشان کن اتفاق۔ اور میر صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پولیس ایسے آپریشن انجام نہیں دیتی۔ انہوں نے بہت آسانی سے میرے کہے بغیر خود کو بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔ اُن سے بات کرنے کے بعد میرے دل کے نہاں

pklibrary.com

خانوں میں یہ احساس ضرور جاگزیں ہوا کہ شہر کا پولیس چیف اگر ایسا سوچ سکتا ہے تو ضرور دال میں کچھ کالا ہے یا پوری کی پوری دال ہی کالی ہے۔

میں دفتر سے نکلنے لگا تو مجتبیٰ پُرجوش انداز میں میری جانب بڑھا۔

''شاہ صاحب آپ ابھی تک دفتر میں ہیں؟'' میں نے استعجابیہ لہجے میں استفسار کیا۔

''سر، میری دونوں یوٹیوبرز کے گھر میں بات ہوئی ہے اور ایک حیرت انگیز بات معلوم ہوئی ہے۔ ان دونوں کو ہارٹ اٹیک ہونے سے قبل بخار ہوا تھا جس کے بعد ان دونوں نے ایک ہی جنرل فزیشن سے اپنا چیک اَپ کروایا جس کے بعد ان کی طبیعت ٹھیک بھی ہوگئی تھی اور پھر چند روز بعد ہی ان کی وفات ہوگئی۔''

میں نے مجتبیٰ کا کندھا تھپتھپایا اور یہ اہم معلومات حاصل کرنے پر اسے شاباشی دی اور کہا کہ وہ مجھے ڈاکٹر کا نام لکھ دے۔

☆☆☆

اگلے روز صبح سویرے ہی میں نے واٹس ایپ پر رپورٹرز کے ساتھ میٹنگ کرلی کیونکہ میرا خیال تھا کہ آج کا دن بھاگ دوڑ میں ہی گزرے گا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ میں نے ڈاکٹر کے کلینک کا نمبر ملایا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح دس سے بارہ بجے تک مریضوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی اپائنٹمنٹ بک کروالی۔

میرے گھر سے ڈاکٹر صاحب کے کلینک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ میں نے فوراً اُن کے کلینک کا رخ کیا۔ ڈاکٹر کا نام کچھ جانا پہچانا محسوس ہو رہا تھا جو کلینک کے بورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا، 'ڈاکٹر فراست علی خان، جنرل فزیشن۔' نام کے ساتھ ڈگریوں کی تفصیل بھی درج تھی اور کچھ اسپتالوں کے نام بھی دیے گئے تھے جہاں ڈاکٹر صاحب پریکٹس کرچکے تھے۔ میں اپنی اپائنٹمنٹ سے پانچ منٹ پہلے پہنچ گیا تھا۔ فیس جمع کروائی اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ میں جب ڈاکٹر فراست علی خان کے کمرے میں داخل ہوا تو موصوف کا چہرہ بھی جانا پہچانا سا لگا لیکن اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ڈاکٹر صاحب نے میری طرف دیکھا اور اپنی نشست سے کچھ یوں اُچھلے گویا کرنٹ لگا ہو۔

''میر حسن صاحب، بہت عرصے بعد دیدار ہوا۔''

میں حیرت و استعجاب کی مجسم تصویر بنا ڈاکٹر صاحب کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا میر صاحب، پریشان کیوں ہوگئے؟ میں ڈاکٹر فراست۔ آپ بھول گئے غالباً۔ بھئی نوجوانی کے دنوں میں پریس کلب کے کلینک پر بھی کچھ گھنٹوں کے لیے جایا کرتا تھا۔''

اور پھر پوری فلم میری نظروں کے سامنے دوڑ گئی۔

''اوہ ڈاکٹر صاحب، وقت نے ہم سب کو بدل دیا۔ کیا حال ہیں آپ کے؟''

''میں تو ٹھیک ہوں، آپ بتایئے کیا بیماری میرے پاس لے آئی؟''

''بیماری تو نہیں۔ ایک خبر کی تلاش میں آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''میں آپ کو کیا خبر دے سکتا ہوں؟'' انہوں نے حیرت سے استفسار کیا۔

''آپ ہی یہ خبر دے سکتے ہیں۔'' میں نے اُن کی حیرت میں مزید اضافہ کیا جس پر انہوں نے اپنا فون اٹھایا اور دوسری جانب موجود ریسیپشن سے مریضوں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا، ایک ہی مریض ہیں اور دو نے ٹائم لے رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں ان مریض کو دیکھ لیتا ہوں اور باقی دو مریضوں سے کہہ دیجیے کہ مجھے ایمرجنسی میں جانا پڑ گیا ہے اور میں ان کو شام کو دیکھ لوں گا اور فون بند کرنے کے بعد مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میر صاحب، ابھی دس بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔ میں یہ مریض دیکھ لوں۔ اس کے بعد ہمارے پاس شام سات بجے تک وقت ہی وقت ہوگا خوب گپیں ماریں گے میر صاحب۔''

میں نے ڈاکٹر فراست کا شکریہ ادا کیا اور باہر انتظار گاہ میں آگیا۔

ڈاکٹر صاحب نے وعدے کے مطابق مریض کا چیک اَپ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور مریض کے ڈاکٹر کے کمرے سے برآمد ہونے کے چند ہی لمحوں بعد ڈاکٹر صاحب چہرے پر مسکراہٹ سجائے باہر آئے اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے کلینک سے باہر لے گئے۔ ہم نے قریب ہی ایک ریستوران کا رُخ کیا۔

''میر صاحب، بے تکلف ہوکر بتایئے کیا کھائیں گے؟ یہاں کا نشا بہت مشہور ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب اس عمر میں باہر کا کھانا کھانے سے بچنا ہی چاہیے۔''

pklibrary.com

''اوہ میر صاحب، یوٹیوبرز بس ریٹنگ کے لیے ایسی باتیں کر دیتے ہیں۔ ورزش کیا کریں، زیادہ سوچا نہ کریں اور پھر جو چاہے، کھائیں۔''

''آپ کے اصرار پر بس ایک کپ چائے۔''

''چائے تو پئیں گے مگر آج آپ کو پوڑی چنے کا ناشتا کھلائے بغیر نہیں جانے دیں گے۔ آپ نے ایسا ناشتا اس سے پہلے بھی نہیں کیا ہوگا۔''

میں نے کہا بھی کہ میرا کولیسٹرول ہائی رہتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مگر مجھے لاجواب کر دیا۔ ''ہم یہاں سے نکل کر نصف گھنٹا چہل قدمی کریں گے۔ آپ کا کولیسٹرول نارمل ہو جائے گا۔ کیا کہا تھا زیادہ سوچا نہ کریں۔''

انہوں نے ویٹر کو ناشتے کا آرڈر دیا اور میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔ ''کون سی ایسی کہانی ہے جو آپ کو میرے پاس لے آئی۔''

میں نے جب ان سے سلیم جنید اور عامر راہی کے بخار اور پھر ہارٹ اٹیک کے بارے میں بات کی تو ان کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

انہوں نے کہا کہ ''وہ دونوں اتفاق سے میرے پاس آئے تھے کیونکہ پریس کلب کے اکثر دوست میرا حوالہ دے دیتے ہیں۔ ان کو عام موسمی بخار تھا اور میں نے ان کے تمام ٹیسٹ بھی کروائے تھے جو نارمل تھے اور ایسی کوئی علامت نہیں تھی کہ وہ یوں اچانک دل کا دورہ پڑنے سے موت کے منہ میں چلے جاتے۔ میر صاحب خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔'' میں نے ایسے لہجے میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب سٹپٹا گئے اور وہ مجھ سے سوال کرنے ہی والے تھے کہ میں نے ناموں کی ایک فہرست ان کے سامنے رکھ دی اور پوچھا کہ ''کیا ان میں سے کوئی آپ کا مریض رہا ہے؟''

انہوں نے دو ناموں پر کہا کہ ''یہ دونوں بھی میرے مریض رہ چکے ہیں۔ ایک موصوف کو موسمی فلو ہوا تھا جبکہ دوسرے صاحب کو غالباً ملیریا ہوا تھا۔''

''ڈاکٹر صاحب کیا آپ کو اپنے سارے مریضوں کے نام اور بیماریاں یوں یاد رہ جاتی ہیں۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر صاحب نے بہت نپے تلے انداز میں جواب دیا۔ ''دیکھیے میر صاحب، ایک اچھے صحافی اور ڈاکٹر کی یادداشت ہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔ میں نے آپ کو پہلی نظر میں پہچان لیا مگر آپ نے نہیں پہچانا۔''

''تو کیا آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میں ایک ناکام صحافی ہوں؟'' میں نے ڈاکٹر صاحب کے طنز کو سمجھتے ہوئے سوال داغ دیا۔

''نہیں، نہیں میر صاحب۔ میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا۔ آپ سے تو پرانا یارانہ ہے۔'' ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر میرے مذاق سے قدرے اطمینان کی جھلک لوٹ آئی تھی۔

اسی اثنا میں میز پر ناشتا لگایا جا چکا تھا۔ میں نے اس قدر خستہ پوڑی نہیں کھائی تھی اور چنوں کا تو جواب ہی کوئی نہیں تھا۔ اس پر حلوے نے مزہ دوبالا کر دیا۔ میں نے جی بھر کر ناشتا کیا۔ ڈاکٹر صاحب خوشگوار حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''میر صاحب، کیسا رہا ناشتا؟''

''بہت خوب ڈاکٹر صاحب، ایسا ناشتا نصیبوں والوں کو ہی ملتا ہے۔'' میں نے دل سے تعریف کی۔

ہم ناشتا کر چکے تو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ وعدے کے مطابق چہل قدمی کرنے کے لیے قریبی سیکٹر کے پارک کا رُخ کیا۔

''ڈاکٹر صاحب کیا ایسا کوئی زہر ہے جسے کھا کر ہارٹ اٹیک ہو جائے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں ایسا ممکن ہے، زہر نہیں مگر ادویات کا نسخہ اس طرح کا بنایا جا سکتا ہے جس سے دل کی شریانیں سکڑ جائیں یا بلڈ پریشر بہت زیادہ ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ خون کے لوتھڑے بن جائیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کیا آپ ایسا نسخہ بنا سکتے ہیں؟'' میں نے بہت سنجیدگی سے سوال کیا مگر ڈاکٹر صاحب گرتے گرتے بچے۔ میں نے فوراً ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ تھاما اور ہم دونوں نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔

''میر صاحب میں نے کبھی ایسا نسخہ نہیں بنایا۔ اس کے لیے ادویات کی معلومات ہونی چاہئیں۔ اس معاملے میں فارماسسٹ زیادہ ماہر ہوتے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے بہت سوچ کر جواب دیا۔

''یہ چار افراد جو آپ کے مریض رہے جن میں دو یوٹیوبر تھے اور دو نامور صحافی۔ وہ عام سی شکایت لے کر آپ کے پاس آئے اور چند روز بعد ہارٹ اٹیک سے چل بسے۔ کیا ادویات کے منفی اثرات ان اموات کی وجہ تو

pklibrary.com

نہیں؟''

''میر صاحب، میں آپ کی صحافتی صلاحیتوں کا قائل تو ہوں ہی مگر آپ ایسا ذہین صحافی شاذ و نادر ہی دیکھا ہے۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے مگر میں نسخہ لکھتے ہوئے عموماً بہت محتاط رہتا ہوں جس کے باعث ایسا امکان نصف ہی ہے۔ میں پھر بھی ان مرحومین کے طبّی ریکارڈ کی جانچ کروں گا اور آپ کو بھی ایک کاپی بھجوا دوں گا۔'' ڈاکٹر صاحب نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

اور ہم یوں ہی گفتگو کرتے ہوئے ایک بار پھر ڈاکٹر صاحب کے کلینک تک آ گئے۔

''میر صاحب، مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ سے پہلے بھی مجھ سے اسی نوعیت کا سوال پوچھا جا چکا ہے مگر یہ میری جوانی کی بات ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ سوال پوچھنے والا کون تھا؟ کیا پتا، آپ کی خبر کا سرا یہیں کہیں پر موجود ہو۔''

''ڈاکٹر صاحب آپ کو کچھ بھی یاد آئے تو مجھ سے ضرور رابطہ کیجیے گا۔'' میں نے تاکیداً کہا اور ساتھ میں اپنا وہ نمبر بھی دیا جو عموماً میں اس وقت دیا کرتا تھا جب میں کسی حساس کہانی پر کام کر رہا ہوتا۔

میں خود بھی گومگو کا شکار ہو چکا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے پریشان کیے دے رہی تھی کہ کچھ اور ایسی اموات بھی ہونے جا رہی ہیں مگر ان اموات کا ذمے دار کون تھا یا یہ محض اتفاق تھا؟ میرے لیے حقیقت تک پہنچنا آسان ثابت نہیں ہونے جا رہا تھا۔

میں گاڑی اسٹارٹ کرنے ہی لگا تھا کہ سوچا ایک دو کالز ہی کر لی جائیں۔ میں نے پولیس کے ڈپٹی چیف کو کال کی، جو میرا بہت زیادہ احترام کرتے تھے کیونکہ سی ایس ایس کرنے کے بعد اے ایس پی کے طور پر ان کی تعیناتی کے دنوں سے میری ان سے یاد اللہ تھی اور وہ اب ایک سینئر پولیس افسر تھے اور اس دوران ہم دونوں کا تعلق اس لیے بھی قائم رہا تھا کہ وہ ایک سلجھے ہوئے اور ایماندار پولیس افسر تو تھے ہی بلکہ دوستوں کے دوست بھی تھے۔

انہوں نے دوسری بیل پر ہی میری کال اٹینڈ کر لی اور چھوٹتے ہی پوچھا۔

''میر صاحب، کیا حال احوال ہیں آپ کے۔ بہت دنوں سے آپ کو ہی یاد کر رہا تھا۔ وہ آپ کے اسسٹنٹ کی کال آئی تھی۔ میں نے اسے متعلقہ افسر کا نمبر دے دیا تھا اور کچھ اہم اعداد و شمار بھی فراہم کر دیے تھے۔''

''راول صاحب، آپ سنائیے کیسے ہیں؟ پیشہ ورانہ بات بھی ہو جائے گی۔ ایک عرصہ ہوا آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کیا آج آپ سے ملاقات کا کوئی امکان ہے؟''

''کیوں نہیں۔ شام کو چار بجے فارغ ہوں گے آپ؟'' انہوں نے مجھ سے استفسار کیا۔

مجھے شام کے چار بجے فی الحال کوئی خاص کام نہیں تھا۔ میں نے ملاقات کی ہامی بھر لی اور پولیس ہیڈ کوارٹرز سے کچھ فاصلے پر ایک نئے کھلنے والے کیفے پر ملاقات کے لیے کہا اور یہ درخواست بھی کی کہ وہ اس ملاقات میں تنہا ہوں کیونکہ مجھے کچھ ذاتی نوعیت کا کام ہے۔

راول چوہدری سے چونکہ کیمسٹری میچ کرتی تھی چنانچہ انہوں نے کیفے میں تنہا آنے کی ہامی بھر لی۔

میں پُرامید تھا، اور میری خبروں کو سونگھنے کی حس بھی میرے کام آ رہی تھی۔ میں ابھی پارکنگ میں ہی موجود تھا جب میں نے دوبارہ ڈاکٹر فراست کا نمبر ڈائل کر دیا۔

وہ غالباً مجھ سے ملاقات کرنے کے بعد گھر جانے کے لیے روانہ ہو گئے تھے کیونکہ انہوں نے جب فون کال اٹینڈ کی تو وہ گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔

''خیر ہے میر صاحب؟''

''ڈاکٹر صاحب مجھے یہ بتائیے کہ کیا آپ کے پاس کوئی اور ایسے مریض بھی آئے جنہیں شکایت تو کوئی اور تھی مگر ان کی موت ہارٹ اٹیک کی وجہ سے ہوئی؟'' یہ سوال تو کچھ عجیب تھا مگر اس کا جواب میرے لیے ایک راستہ ضرور کھول سکتا تھا۔

''دیکھیے میر صاحب، ان چار بندوں کی موت کا بھی مجھے اس لیے معلوم ہوا کیونکہ یہ جانے پہچانے لوگ تھے اور ان کے مرنے کی خبر ٹیلی ویژن پر چلی تھی۔ میرے علم کے مطابق تو میرے مریضوں میں سے کسی اور کی یوں موت نہیں ہوئی۔''

''آپ ایک کام کیجیے۔ زحمت ہی دے رہا ہوں مگر ہو سکتا ہے، تیر نشانے پر لگ جائے۔ آپ کے پاس علاج کے لیے آنے والے مریضوں میں ایسے مریضوں کا ریکارڈ بھی ضرور موجود ہو گا جو چھ ماہ کے دوران ایک بار یا دو بار آنے کے بعد دوبارہ نہیں آئے ہوں گے اور وہ چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کے لیے بھی آپ کے پاس ہی آتے ہوں گے۔ کیا آپ مجھے ایسے مریضوں کا ریکارڈ فراہم کر سکتے ہیں؟''

''دیکھیے میر صاحب، میں اپنے مزید مریضوں کا ریکارڈ تو آپ سے کسی طور پر شیئر نہیں کر سکتا۔ آپ کی یہ مدد

pklibrary.com

ضرور کرسکتا ہوں کہ ایسے مریضوں سے رابطہ کروں جنھوں نے ان چھ ماہ کے دوران مجھ سے رُجوع نہیں کیا۔'' ڈاکٹر صاحب نے قطعیت سے جواب دیا۔

ڈاکٹر صاحب کی اس مدد پر دل کھول کر ان کا پیشگی شکریہ ادا کیا۔

مجھے علم تو نہیں تھا مگر میرا آج کا دن بہت مصروف ہونے جارہا تھا۔ میں نے اگلی کال اپنے ہیلتھ رپورٹر مشتاق عباسی کو کی جو میرا شاگرد بھی تھا۔ میں نے اس سے صرف یہ کہا کہ مجھے آج شام تک پچھلے چھ ماہ میں ہارٹ اٹیک سے مرنے والے مریضوں کا مکمل ڈیٹا چاہیے۔

''سر، دوپہر کا ایک بج رہا ہے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ ان چند گھنٹوں میں یہ کام آسان نہیں ہوگا۔''

''میرے بچے۔ تم میرے شاگرد ہو۔ شام کے چار بجے بھی تم یہ تمام ریکارڈ نکلوا سکتے ہو کیوں کہ اب یہ سارا ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ کیا جاچکا ہے۔ اس لیے فوراً اس کام پر جُت جاؤ۔ ہوسکتا ہے آج کا دن تمہارے لیے خاص ہو۔''

میں نے توقف کیا اور کہا۔ ''شام میں ملاقات ہوتی ہے۔'' اور یہ کہہ کر فون بند کردیا۔

میں نے ایک اور سویلین ادارے کے اعلیٰ افسر کو کال کی۔ وہ میرے پرانے شناسا تھے اور بہت سی گتھیوں کو میں نے ان کے ذریعے ہی سلجھایا تھا۔ وہ میرے لیے مددگار ثابت ہوسکتے تھے۔

انہوں نے ہمیشہ کی طرح ایک اہم میٹنگ میں مصروف ہوتے ہوئے بھی میری فون کال اٹینڈ بھی کی اور میری پوری بات گوش گزار کرنے کے بعد مجھ سے دوبارہ رابطہ کرنے کا وعدہ کیا۔

میں اب حقیقت تلاش کرنے کے لیے بہت زیادہ مسافت طے کرچکا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں اگر غلط سمت میں نہیں جارہا تو ضرور اس کہانی کے لکھنے والے مصنف تک پہنچ جاؤں گا۔

دوپہر کے دو ہی بجے تھے۔ میں نے سوچا کیوں نا بشیر چوہدری مرحوم کے چھوٹے بھائی فیصل چوہدری سے ملاقات ہی کرلی جائے۔

میں نے فیصل چوہدری کا نمبر ڈائل کیا، مگر اس نے کال پک نہیں کی۔ میں تمام معلومات کو جوڑ رہا تھا تو میرے ذہن میں کچھ چیزیں تو واضح ہورہی تھیں مگر کوئی دھندلا سا خاکہ بھی نہیں بن رہا تھا اور میں رہا ہمیشہ کا جلد باز۔ میرے ذہن میں جب کھلبلی ہوتی تو پھر میں کچھ بھی کر گزرتا تھا اور صحافتی اقدار بھی بھول جایا کرتا تھا۔

میں نے اس وقت فیصل چوہدری کی کال کا انتظار کرنا حماقت خیال کیا اور گاڑی کا رُخ بشیر چوہدری کے گھر کی جانب کردیا۔ میرا جلد بازی میں لیا گیا یہ فیصلہ درست ثابت ہوا کیونکہ میں ابھی مرکزی شاہراہ پر ہی پہنچا تھا کہ مجھے فیصل چوہدری کی کال آگئی۔

''حسن بھائی آپ کی کال آرہی تھی۔ میں ذرا تعزیت کرنے والوں کے ساتھ مصروف تھا۔ بتائیے؟''

''فیصل کیا ابھی ملاقات ہوسکتی ہے۔ میں گھر سے زیادہ دور نہیں ہوں۔''

''بھائی آپ کو کیسے انکار کرسکتا ہوں۔ آپ آیئے، میں آپ کا منتظر ہوں۔''

مجھے بشیر چوہدری مرحوم کے گھر پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگی۔

بشیر چوہدری دوستوں کا دوست تھا۔ وہ ایک زندہ دل انسان تھا اور اس کی بیٹ بھی بے ضرری تھی کہ اس کا کسی سے کوئی سیاسی اختلاف ہونے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ شہر کا ایک سینئر اکنامک رپورٹر تھا اور صرف ایک ہی معاملہ ہو سکتا تھا کہ اس نے کسی بڑے بزنس ٹائیکون کے خلاف خبر چھاپ دی ہو۔ مگر میں مفروضوں پر آگے نہیں بڑھنا چاہتا تھا۔

میں نے گاڑی گھر کے سامنے خالی پلاٹ میں کھڑی کی اور دیکھا کہ فیصل گھر کے باہر کھڑا میرا منتظر تھا۔

فیصل چوہدری شہر کا ایک ابھرتا ہوا قانون داں تھا۔ وہ ایک طرح سے میرے سامنے جوان ہوا تھا۔

میں اور بشیر چوہدری کسی دور میں یک جان دو قالب رہے تھے۔ میری اب بھی اس سے دوستی میں کمی نہیں آئی تھی مگر زندگی کی مصروفیات میں ہم یوں گم ہوگئے تھے کہ کئی کئی مہینے گزر جاتے مگر رابطہ نہ ہوپاتا اور اس کہانی پر کام کرنے کی لاشعوری وجہ بھی غالباً یہی تھی کیوں کہ بشیر چوہدری اپنی صحت کا بہت زیادہ دھیان رکھتا تھا۔ وہ بے پروائی کرتا تو تھا مگر احتیاط کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑتا تھا۔

فیصل میری اور بشیر کی دوستی سے آگاہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ گاڑی تک آئے۔

اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور تعزیت کرنے والوں سے معذرت کرتا ہوا میرے ساتھ گاڑی میں آگیا۔ میں نے بات کو زیادہ اُلجھانے کے بجائے فیصل سے براہ

pklibrary.com

راست سوال پوچھا۔

''فیصل کیا بشیر کو حالیہ دنوں میں جان سے مارنے کی کوئی دھمکی تو نہیں ملی تھی؟''

''نہیں حسن بھائی۔ مجھ سے زیادہ تو آپ بھائی کو جانتے ہیں کہ وہ ایک زندہ دل انسان تھے اور دوستوں کے دوست تھے۔''

''ہاں ایسا ہی ہے لیکن میں اس کی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔''

''حسن بھائی یہی بات میری بھی سمجھ میں نہیں آرہی۔ انہوں نے اپنی بے وقت موت سے کچھ روز قبل ہی اپنے سارے ٹیسٹ کروائے تھے مگر وہ نوجوانوں کی طرح تندرست تھے۔ بس اللہ کی رضا تھی۔''

''بشیر نے مگر ٹیسٹ ہی کیوں کروائے۔''

''ان کو غالباً وائرل بخار ہوا تھا۔''

''اچھا، کیا تم مجھے ان ڈاکٹر صاحب کا نام بتا سکتے ہو جن سے وہ علاج کروا رہا تھا؟''

''ڈاکٹر راجہ محبوب صابر۔ شہر کے معروف جنرل فزیشن ہیں۔ یہ قریب ہی سیکٹر مارکیٹ میں ان کا کلینک ہے۔''

''اوہ ڈاکٹر محبوب صابر۔ ان سے میرا بہت اچھا تعلق رہا ہے۔ وہ ایک بہترین جنرل فزیشن ہیں۔ بشیر کو جب ہارٹ اٹیک ہوا تو اس کو کہاں لے کر گئے تھے؟''

''ان کو ہارٹ اٹیک ہوا تو ڈاکٹر انوار مرزا کے پاس لے کر گئے۔ وہ بھی غالباً آپ کے اچھے دوست ہیں۔''

''اوہ ڈاکٹر انوار۔ ہاں وہ بشیر کا بچپن کا دوست تھا۔ کیا تمہارے پاس ڈاکٹر انوار کا نمبر ہے؟''

''جی حسن بھائی۔'' میں نے فیصل سے ڈاکٹر انوار کے علاوہ ڈاکٹر محبوب صابر کا موبائل نمبر بھی لے لیا اور اس سے اجازت طلب کی۔

''فیصل، میں میر حسن تمہارا بڑا بھائی ہی ہوں۔ تم مجھے کسی بھی وقت بلا جھجک کال کر سکتے ہو۔ میرے گھر آسکتے ہو۔''

''بھائی میں جانتا ہوں۔ آپ کی بے لوث محبت کا بہت شکریہ۔''

اور میں نے گاڑی کا رُخ دفتر کی طرف کرلیا۔ تین بج رہے تھے اور چار بجے میری پولیس کے ڈپٹی چیف راول چوہدری سے ایک کافی شاپ میں ملاقات تھی جو میرے دفتر سے زیادہ دور نہیں تھا اور راستے میں ہی پانچ منٹ کی

اکتوبر 2023ء کا شمارہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

مخطوط کی محفل،
محفل شعر و سخن
اور
مرزا امجد بیگ کی دلیلوں کا سحر

آخری شام سے پہلے
کبھی جس کے صحرا میں..... کبھی ہجر کے کانٹوں میں.....
دھنک رنگ موسموں کو تلاش کرنے والے دیوانوں کی داستان **طاہر جاوید مغل** کے قلم کا جادو

شعلہ شب گیر
ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات **ایے آر راجپوت** کے قلم کا شاہکار

شہ زور
عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال **اسما قادری** کے قلم کا کمال

جنگ باز
معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم کی جادوگری

اس کے علاوہ
عیوق بخاری، زویا صفوان، آصفہ ضیا احمد، عاطر شاہین، خالد شیخ طاہری، علی امجد، شاہ زین رضوان، نازیہ کامران کاشف و دیگر کی خوب صورت تحریریں

pklibrary.com

مسافت پر ڈاکٹر راجہ محبوب صابر کا کلینک تھا۔ میں نے ان کے فون پر کال کی اور اپنا تعارف کروایا تو ان کے لہجے سے حیرت صاف جھلک رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب یہ بتایئے آپ سے اس وقت کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟'' میں نے سلام دعا کیے بنا براہِ راست سوال کیا۔

''میر صاحب کلینک تشریف لے آیئے۔'' ڈاکٹر صاحب نے بھی فوری جواب دیا، وہ غالباً جان گئے تھے کہ میں جلدی میں ہوں یا کسی پریشانی میں۔

''میں دو منٹ میں حاضر ہو رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا اور پورے دو منٹ بعد میں ڈاکٹر محبوب صابر کے خوب صورتی سے آراستہ کیے گئے کمرے میں موجود تھا۔

''خیریت تو ہے میر صاحب۔ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔''

''نہیں، نہیں۔'' میں ہڑبڑا گیا۔ ''ڈاکٹر صاحب مجھے تو آپ اب بھی نوجوان دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا کوئی خاص دوا تو استعمال نہیں کر رہے؟''

میری بات سن کر ڈاکٹر محبوب صابر نے قہقہہ بلند کیا اور کہا۔ ''میر صاحب، کبھی کوئی دوا استعمال نہیں کی۔ ورزش کرنے کی عادت البتہ کبھی نہیں چھوڑی۔''

''ڈاکٹر صاحب، بشیر چوہدری تو آپ کا دوست بھی تھا اور مریض بھی۔ کیا اس کو ایسا کوئی مرض تھا کہ وہ یوں اچانک ہارٹ اٹیک سے چل بستا؟''

میرے اس سوال پر ڈاکٹر محبوب صابر نے سرد سانس لی اور کہا۔ ''میر صاحب، میری تشخیص بالکل درست تھی۔ یہ ہارٹ اٹیک کیوں ہوا؟ میں خود یہ گتھی سلجھانا چاہتا ہوں۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''میرے دو اور مریض بھی معمولی بیماریوں کے علاج کے لیے میرے پاس آئے تھے اور پھر ایک ہفتے بعد ہی چل بسے۔''

''کیا وہ بھی صحافت کے پیشے سے وابستہ تھے؟''

''نہیں، وہ دونوں میرے دوست ہی تھے اور اپنا کاروبار کرتے تھے۔''

''اچھا؟'' میں یوں چونکا گویا کسی نے میرے پیروں تلے بم پھوڑ دیا ہو۔

''کیا ہوا میر صاحب، خیریت تو ہے نا؟''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''رانا گلفام ایک ماہ قبل جسم میں درد کی شکایت لے کر آیا تھا، میں نے تمام ٹیسٹ کروائے۔ طبی رپورٹس میں کوئی مسئلہ نہیں تھا اور محمود آرائیں بھی بخار کی شکایت کے ساتھ آئے تھے لیکن ان دونوں کو ہی ہارٹ اٹیک ہوا اور بشیر چوہدری کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔''

''کیا مجھے ان تینوں مریضوں کے طبی ریکارڈ کی نقل مل سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں۔ یہ اگرچہ طبی اصولوں کے خلاف ہے مگر دوستوں کو انکار... کرنا ممکن نہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے اپنی اسسٹنٹ سے تینوں مریضوں کا ریکارڈ کاپی کر کے لانے کے لیے کہا۔

اس دوران میں ڈاکٹر صاحب سے اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتا رہا۔ گھڑی پر وقت دیکھا تو چار بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے تھے اور یہاں سے کافی شاپ جانے میں بھی دس سے پندرہ منٹ تو لگ ہی جاتے۔

ڈاکٹر صاحب نے ریکارڈ میرے حوالے کیا تو چار بجنے میں دس منٹ تھے۔ میں نے ان سے دوبارہ ملاقات کے وعدے کے ساتھ اجازت چاہی اور کلینک سے نکل کر پارکنگ کی جانب دوڑ لگا دی۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے قبل راول چوہدری کو کال کی تو انہوں نے مصروف کر دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ فی الحال کسی اہم میٹنگ میں مصروف تھے۔ میں نے یہ وقت غنیمت جانا اور گاڑی کو اپنی منزل کی جانب دوڑا دیا۔ میں دس منٹ میں ہی کافی شاپ پہنچ چکا تھا مگر راول چوہدری کی کال نہیں آئی۔

میں نے دوبارہ کال کی تو راول چوہدری نے دو منٹ میں پہنچنے کا وعدہ کیا۔

ڈاکٹر راجہ محبوب صابر سے میری ملاقات نے میری تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا کیونکہ میں اب تک یہ یقین کر کے چل رہا تھا کہ ان اموات کی وجہ سیاسی ہوسکتی ہے مگر دو کاروباری افراد کی ہارٹ اٹیک سے اچانک موت نے بہت سے سوالات پیدا کر دیے تھے اور میں ایک بار پھر ڈیڈ اینڈ پر کھڑا تھا۔

میں کڑیوں سے کڑیاں ملا ہی رہا تھا جب راول چوہدری کافی شاپ میں داخل ہوئے۔ وہ سادہ لباس میں تھے اور سیکیورٹی کے بغیر آئے تھے۔

''جی میر صاحب۔ اس طرح اچانک یاد کیا کہ میں گھبرا ہی گیا۔''

''بس دیکھ لیجیے راول صاحب، کیا بتاؤں میں کیا گزر رہی

pklibrary.com

ہے ہم پر۔"

"کیا ہو گیا میر صاحب۔ بھابی سے ناراضی تو نہیں ہو گئی۔"

"اوہ نہیں۔" میں نے اپنے روایتی پنجابی لہجے میں کہا، اور پھر تمام تفصیل راول کے گوش گزار کر دی۔ وہ میری معلومات پر بھونچکا رہ گیا مگر اس کا بھی یہی کہنا تھا کہ شہر میں ایسا کوئی گینگ سرگرم نہیں جو اس نوعیت کی وارداتوں میں ملوث ہو مگر میں پھر بھی شہر کے تمام تھانوں سے ریکارڈ منگوا لیتا ہوں کہ کہیں کوئی ایسا کیس تو درج نہیں ہوا۔

میں نے راول چوہدری کا زیادہ وقت نہ لینا مناسب خیال کیا، اس کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ ملاقات کے وعدے پر واپس دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔ پانچ بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے اور میں پورے پندرہ منٹ بعد اپنے دفتر میں موجود تھا۔

میں اپنے وڑبے مطلب کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ مجتبیٰ کسی بلا کی طرح نازل ہو گیا۔

"سر یہ فائلیں۔ ایک ملک صاحب نے بھجوائی ہیں اور دوسری کوئی صاحب دے کر گئے تھے مگر انہوں نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

میں جانتا تھا کہ دوسرے ورک صاحب کے بھیجے ہوئے اہلکار ہوں گے کیونکہ مجھے موبائل پر دونوں کا پیغام مل چکا تھا چنانچہ میں نے فائلوں کا جائزہ لینے سے قبل مجتبیٰ سے کہا کہ دفتر کے چپراسی سے ایک تیز دم چائے کا کہو اور تم نے بھی نوش کرنی ہو تو دو کپ چائے کا کہہ دینا۔

"جی سر کیوں نہیں۔ آپ پلا رہے ہیں تو میرا انکار کرنا ممکن ہی نہیں۔ میں چائے خود اپنی نگرانی میں بنوا کر لاتا ہوں۔"

میں زیر لب مسکرا دیا کیونکہ مجتبیٰ کی یہ عادت تھی کہ وہ نمایاں ہونے کی کوشش کرتا رہتا تھا تاکہ مجھے اس کی اہمیت کا احساس رہے۔

میں نے اِدھر اُدھر کی سوچوں سے جان چھڑاتے ہوئے فائلوں کی ورق گردانی شروع کر دی۔ دونوں حساس اداروں کی فائلوں میں موجود معلومات اہم تو تھیں مگر ان میں کچھ ایسا چونکا دینے والا نہیں تھا جو میرے کام کا ہوتا۔ ملک کے حساس ترین ادارے کے میڈیا سیل کی فائل میں حیران طور پر وہ صحافی بھی ادارے کی گڈ بکس میں شامل تھے جنہیں عموماً اس ادارے کے خلاف تصور کیا جاتا تھا جبکہ یوٹیوبرز کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھی جا رہی تھی۔ سویلین ادارے کے ریکارڈ میں کچھ صحافیوں کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا تھا کیونکہ وہ حکومت کی کارکردگی کے بارے میں منفی خبریں دے رہے تھے جن میں بشیر چوہدری بھی شامل تھے مگر اس کے علاوہ ایسی کوئی معلومات دستیاب نہ ہو سکی جو میرے لیے مفید ثابت ہوتی۔

اس اثنا میں چائے آ چکی تھی اور مجتبیٰ میرے سامنے کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے چائے پی رہا تھا۔ میں اس سے بارہا پیشہ ورانہ رویہ اختیار کرنے کا کہہ چکا تھا۔ میں نے اپنے غصے کا اظہار تو نہیں کیا اور مجتبیٰ کو آج کے اخبارات کی فائل لانے کے لیے بھیج دیا اور کچھ انتظامی امور نمٹانے کے لیے کہا۔

میرے روکھے انداز سے وہ میری ناراضی کی وجہ بھی سمجھ گیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی چائے پی اور اپنی ڈیوٹی انجام دینے میں مصروف ہو گیا۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔ میٹنگ کا وقت ہو گیا تھا، میں نے ڈپٹی چیف رپورٹر ملک فہد سے رپورٹرز کی میٹنگ لینے کا کہا اور اپنی جیب سے وہ کاغذات نکالے جن پر ڈاکٹر راجہ محبوب صابر نے ان تین مرحومین کا نسخہ لکھا تھا جو اُن سے علاج کروانے کے چند روز بعد ہی ہارٹ اٹیک ہونے سے چل بسے تھے۔

ان تینوں نسخوں میں ایک ہی دوا مشترک تھی۔ میں طبی ماہر تو تھا نہیں لیکن انٹرنیٹ پر سرچ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ دوا عموماً بیماری کے منفی اثرات جلد از جلد ختم کرنے کے لیے دی جاتی ہے اور یہ ایک معروف کمپنی تیار کرتی ہے۔ میں نیٹ پر مزید تفصیل پڑھ ہی رہا تھا جب مجھے کال موصول ہوئی۔ میں نے کال اٹینڈ کی تو دوسری جانب ڈاکٹر فراست علی خان تھے۔ ان کی آواز میں بوکھلاہٹ نمایاں تھی۔

"میں نے آپ کو اپنے تمام مریضوں کا طبی ریکارڈ بھیج دیا ہے۔ کچھ ہی دیر میں یہ ریکارڈ آپ کی میز پر ہوگا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ڈاکٹر صاحب آپ گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟"

"بات ہی کچھ ایسی ہے۔ میں نے اپنے ریکارڈ کی جانچ کی تو تین اور ایسے مریضوں کا انکشاف ہوا جو مجھ سے دوا لے کر جانے کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر ہارٹ اٹیک ہونے سے چل بسے تھے اور آج ہی میرے زیر علاج رہنے والا ایک اور مریض اچانک ہارٹ اٹیک ہونے سے چل بسا ہے۔ میر صاحب، آپ جب میرے پاس آئے تھے تو میں ان اموات کو اتفاق قرار دے سکتا تھا مگر اب نہیں۔"

pklibrary.com

''ایسا کیا ہو گیا ڈاکٹر صاحب۔''

''میری ایک ہم جماعت ہوا کرتی تھی ڈاکٹر تبسم ملک کے نام سے۔ وہ اکثر یہ کہا کرتی تھی کہ وہ ایک روز ایسی دوا بنائے گی جس سے ہارٹ اٹیک کی وجہ کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں چل سکے گا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے مگر آپ نے اپنے نسخے میں معمول سے ہٹ کر تو کوئی دوا نہیں لکھی تھی؟''

''نہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب پریشان مت ہوئیے۔'' میں نے ڈاکٹر صاحب کو تسلی دی اور ان سے اُس مخصوص دوا کے بارے میں پوچھا جو ڈاکٹر راجہ محبوب صابر نے اپنے مریضوں کو لکھ کر دی تھی۔

''جی، یہ دوا میں اکثر مریضوں کو لکھ کر دیتا ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب آپ یہ دوا کہاں سے منگواتے ہیں؟''

''میر صاحب یہ کیا سوال ہے۔ ظاہر ہے، کمپنی دے کر جاتی ہے۔''

''گزرے چھ ماہ کے دوران کیا ایسا ہوا کہ کبھی کمپنی کے علاوہ کسی فرد نے ذاتی طور پر یہ مخصوص دوا آپ کو ڈیلیور کی ہو۔''

''نہیں ایسا تو نہیں ہوا۔'' میں نے ڈاکٹر صاحب کا اس مدد پر تہِ دل سے شکریہ ادا کر دیا۔

میں ڈاکٹر صاحب سے بات کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ ان کی جانب سے بھیجا گیا مزید مریضوں کا ریکارڈ بھی میری... میز پر موجود تھا جس کے جائزے سے مجھ پر یہ پریشان کن انکشاف ہوا کہ تمام مریضوں کے نسخے میں یہ دوا مشترک تھی۔

میں گہری سوچوں میں گم تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھلا تو دوسری جانب میرا ہیلتھ رپورٹر مشتاق عباسی تھا۔ مجھے معلوم تھا اب وہ یہ ریکارڈ نکلوانے کے حوالے سے اپنی ایک مخصوص داستان سنائے گا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ میں خاموشی سے اس کے چہرے کے تبدیل ہوتے ہوئے زاویوں کا مشاہدہ کرتا رہا اور وہ جب بات ختم کر چکا تو میں نے یوں ہی سوال داغ دیا۔

''عباسی بات ختم ہو چکی ہو تو موضوع کی جانب واپس آجائیے۔''

وہ ہڑبڑا گیا اور بتانے لگا کہ ''گزشتہ چند برسوں کے دوران ہر برس ہارٹ اٹیک سے مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور رواں سال بھی یہ اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ اس ریکارڈ میں صرف ایک بات ہی اہم ہے کہ سرکاری اسپتالوں کی نسبت رواں سال کے ابتدائی نو ماہ کے دوران نجی کلینکوں اور اسپتالوں سے علاج کروانے والے مریضوں کی اموات کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے جو گزشتہ سال سے دوگنا سے بھی زیادہ ہے اور ابھی سال کے تین ماہ باقی ہیں۔''

''یہ صرف ایک اہم بات ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جی سر، یہ بہت ہی اہم انکشاف ہے۔'' اس نے گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا، اس کے چہرے پر اُبھرنے والے تاثرات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میری ذہنی صحت پر شک کر رہا ہو۔

''ایسے مریضوں کی تعداد پچھلے سال کیا تھی اور اب کیا ہے؟''

''پچھلے سال ایسے مریضوں کی تعداد پانچ ہزار تھی جو رواں سال کے ابتدائی نو ماہ کے دوران سولہ ہزار کے لگ بھگ ہو چکی ہے۔''

''کیا؟ اور تم گیارہ ہزار کے عدد کو معمولی خیال کر رہے ہو؟''

''اوہ سر، غلطی ہو گئی۔''

''تم میرے شاگرد ہو۔ اس لیے خبریت کی اہمیت کا ادراک کرنا سیکھو۔ یہ خبر آج کے اخبار میں لیڈ نہیں تو سُپر لیڈ کے طور پر ضرور شائع ہو گی۔ مجھے اس کے لیے ہاشمی صاحب سے اجازت لینی ہو گی مگر یہ ایک بڑی خبر ہے۔''

ہاشمی صاحب اگرچہ اخبار کے مدیر تھے مگر ہماری دوستی برسوں پر محیط تھی اور ان کو اندازہ تھا کہ میں اگر کسی خبر کو نمایاں کر کے گلوا رہا ہوں تو یہ ضرور نہ صرف عوامی مفاد میں ہو گی بلکہ اگلے کئی روز اس خبر کا ہی چرچا رہے گا۔

میں نے ہاشمی صاحب سے بات کی اور اُن کو جب اعداد و شمار کے بارے میں بتایا تو انہوں نے دوسرا سوال نہیں کیا اور کہا کہ آپ خبر بھیج دیجیے۔

اور اس دوران میں نے مشتاق عباسی سے خبر پر بات کرتے ہوئے اپنی عادت سے مجبور ہو کر گلوبل فارما کیئر کے متعلق پوچھا۔

''سر، یہ ایک بہت بڑی فارما کمپنی ہے اور بہت سی ادویات بناتی ہے۔''

''کیا اس فارما کمپنی کی جعلی ادویات بھی مینوفیکچر کی جا

pklibrary.com

رہی ہیں؟'' میں نے سرسری طور پر پوچھا۔

''ممکن ہے مگر اس بارے میں بھی کوئی خبر نہیں سنی۔''

''کیا کسی ڈاکٹر تبسم ملک کو جانتے ہو؟''

''ڈاکٹر رضا ملک اس کمپنی کے مالک ہیں اور فارما ایسوسی ایشن کے روحِ رواں بھی۔ گلو فارما کیئر کی ویب سائٹ پر ان کا نام مل جائے گا۔''

میں نے فارما کمپنی کی ویب سائٹ کھولی اور بورڈ آف ڈائریکٹرز کی فہرست میں حیران کن طور پر تین ملک تھے اور سب ہی ڈاکٹر تھے اور ڈاکٹر رضا ملک منیجنگ ڈائریکٹر تھے جبکہ ڈاکٹر ثی آر ملک اور ڈاکٹر شگفتہ ملک بھی اس فہرست میں شامل تھے۔ کچھ اور ارکان بھی بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل تھے۔

''عباسی، بورڈ آف ڈائریکٹرز میں تو تین ملک ہیں اور ان کی تصاویر بھی ساتھ موجود نہیں۔'' اور میں نے اسے تمام نام بتا دیے۔

''آپ ٹھہریے میں شہباز چوہدری کو کال کرتا ہوں۔'' وہ ایک قومی اخبار کا ہیلتھ رپورٹر تھا اور فارما انڈسٹری سے متعلق گہری معلومات رکھتا تھا۔

وہ شہباز چوہدری سے معلومات اُگلواتا رہا اور اس نے جب فون بند کیا تو اس کا چہرہ حیرت و استعجاب سے چمک رہا تھا۔

''ڈاکٹر ثی آر ملک دراصل ڈاکٹر تبسم رضا ملک ہی ہیں اور وہ کمپنی کے آپریشنز کو دیکھتی ہیں۔''

میں کرسی سے اُچھل پڑا۔

میں نے عباسی کو ہدایت کی کہ وہ اپنی خبر میں یہ شامل کر دے کہ ان ہلاکتوں کی وجہ ایک بڑی فارما کمپنی ہے۔

☆☆☆

اگلی صبح یہ خبر میری توقع کے برعکس ہیڈ لائن کے طور پر شائع ہوئی۔ شہر میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ میرے دفتر میں، میرے اور میرے مدیر کے فون پر فون بج رہے تھے۔ فارما ایسوسی ایشن نے کمپنی کا نام ظاہر کرنے کا مطالبہ کیا تھا اور ہاشمی صاحب مجھ سے اس بارے میں بارہا پوچھ چکے تھے جنہیں میں نے شام تک ٹال دیا۔

میں گزشتہ روز رات کو گھر واپس جاتے ہوئے ڈاکٹر فراست اور ڈاکٹر محبوب صابر کے کلینک سے ان ادویات کے نمونے حاصل کر چکا تھا جن پر مجھے شک تھا اور اس صبح ڈرگ اتھارٹی کے چیئرمین کو، جن سے میری بہت زیادہ سلام دعا تو نہیں تھی لیکن وہ میری صحافتی صلاحیتوں کے قدردان تھے، سے ان ادویات کے نمونوں کی جانچ کے لیے کہہ دیا تھا اور یہ تاکید کی تھی کہ ''ان نمونوں کو ضائع نہ ہونے دیا جائے۔''

میں نے یہ نمونے... دارالحکومت کی ڈرگ اتھارٹی کے علاوہ ملک کے ساحلی شہر کی ڈرگ اتھارٹی کے سربراہ کے حوالے بھی کر دیے تھے جو میرے قریبی عزیز تھے۔

میرے خدشات کے مطابق، دارالحکومت کی ڈرگ اتھارٹی نے ادویات کو کلیئر قرار دے دیا مگر میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ ڈرگ اتھارٹی کے سربراہ کی ڈاکٹر رضا ملک سے گہری دوستی ہے اور انہوں نے کبھی یہ پردہ فاش نہیں ہونے دینا تھا۔

میں بھی کہاں باز آنے والا تھا۔ میں نے وزیرِ صحت سے بات کی جو میرے اچھے دوست تھے اور اس خبر کے باعث شہر میں پھیلی بے چینی پر ناخوش تھے اور مجھ سے ناراض بھی۔ میں نے جب پوری کہانی ان کے گوش گزار کی تو انہوں نے فوراً ادویات کی جانچ بیرونِ ملک سے کروانے کے احکامات جاری کر دیے اور اسی شام یہ ادویات بیرونِ ملک پہنچ چکی تھیں یا مجھ سے ایسا ہی کہا گیا تھا۔

ملک کے ساحلی شہر کی ڈرگ اتھارٹی سے رپورٹ آ چکی تھی جس کے مطابق اس دوا میں ایسے زہریلے کیمیکل موجود تھے جو خون کے گاڑھے پن کی وجہ بن رہے تھے جس کے باعث کوئی صحت مند انسان بھی چند روز سے زیادہ ہارٹ اٹیک سے بچ نہیں سکتا تھا۔

یہ ایک مصدقہ ادارے کی رپورٹ تھی۔ میں نے جب شام کو اس حوالے سے کمپنی کے نام کے ساتھ خبر فائل کی تو مجھ سے کہا گیا کہ اس کمپنی نے آج اخبار کو بہت زیادہ بزنس دیا ہے اور مجھ سے خبر کی اشاعت کے حوالے سے معذرت کر لی گئی۔

میں نے اس بارے میں اپنے اخبار کے مالک سے براہِ راست بات کی۔ وہ کاروباری رموز جانتے تھے۔ انہوں نے اس کمپنی کا اشتہار شائع کرنے سے روک دیا۔

اگلے روز میری خبر شائع ہوئی تو شہر میں گویا بھونچال آ گیا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے فوری طور پر حرکت میں آ گئے جبکہ ملک فیملی کو حراست میں لے لیا گیا۔

فارما ایسوسی ایشن کا تمام تر احتجاج بے سود رہا جبکہ انہوں نے میرے اور اخبار کے علاوہ میرے بہنوئی کے خلاف بھی ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کر دیا اور ہم پر رشوت لینے سمیت بہت سے بے سروپا الزامات عائد کیے۔

☆☆☆

pklibrary.com

اس خبر کی اشاعت کے بعد تین روز کے اندر اندر یہ دوا شہر بھر کے تمام کلینکوں اور نجی ہسپتالوں سے غائب کی جا چکی تھی۔ وزیر صحت کا اسی شام مجھے فون موصول ہوا جنہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ بیرونی لیبارٹری نے بھی اس دوا کو کلیئر کر دیا ہے۔ میں فارما انڈسٹری کی غیر معمولی اور پُراسرار طاقت سے بہ خوبی واقف تھا۔

انہوں نے خاص طور پر ہنگامی پریس کانفرنس کی اور مجھ سمیت میرے اخبار کے خلاف بہت سے بے سروپا الزامات عائد کیے اور ملک فیملی سے انصاف کیے جانے کا مطالبہ کیا۔

میرے مالک مجھ پر غصہ تھے۔ میرے ایڈیٹر کی جان پر بن آئی تھی اور سب سے زیادہ مشتاق عباسی پریشان تھا مگر میں مطمئن تھا اور دو روز تک ہم پر ہر طرف سے یلغار جاری رہی مگر میرے اصرار پر اخبار نے معذرت شائع نہیں کی اور جب مجھے اس روز سہ پہر کے وقت ایک خاکی لفافہ موصول ہوا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔ میں نے حساس ادارے کی مدد سے امریکا کی بہترین لیبارٹری سے ہنگامی بنیادوں پر ان ادویات کی جانچ کروائی تھی جن میں کراچی کی ڈرگ اتھارٹی کے ٹیسٹ کی تصدیق ہوگئی تھی۔

میں نے اس دوران ڈپٹی پولیس چیف راول چوہدری سے کہہ کر جیل میں ڈاکٹر ٹی آر ملک سے خفیہ ملاقات کی۔

'ڈاکٹر صاحب، آپ نے بالآخر اپنے بچپن کا خواب پورا کر دکھایا۔''

''اوہ رپورٹر، کون سا خواب؟'' ڈاکٹر ٹی آر ملک نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔

''ایک ایسی دوا بنانے کا خواب جس سے چلتے پھرتے انسان کو ہارٹ اٹیک آجائے۔''

''یہ کیا اول فول بک رہے ہیں آپ؟''

''آپ کی دوا کھانے سے ہزاروں لوگ مارے گئے۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟''

''یہ سچ ہے مگر آپ اگر مجھے تین کروڑ روپے دے دیں تو آپ کی جان بچ سکتی ہے۔''

''آپ مجھ سے رشوت مانگ رہے ہیں؟''

''آپ کو جیل سے نکلوانے کا ایک حقیر سا نذرانہ۔''

اُس کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار نمایاں ہوئے۔

''میں تین کروڑ دے دوں گی مگر میری شرط یہ ہے کہ آپ مجھے اس حوالے سے معذرت نامہ لکھ کر دیں گے۔''

میں نے شرط مان لی اور اجازت لینے سے قبل دوبارہ پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب یہ دوا تو آپ نے ہی بنائی تھی ہاں؟''

''ہاں، میں دنیا پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ میں اگر کبھی یونیورسٹی میں پوزیشن حاصل نہیں کر سکی تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔''

انہوں نے کچھ دیر توقف کیا اور کہا۔ ''اس دوا کی فروخت کے لیے ایک طاقتور ملک کا خفیہ ادارہ اربوں روپے ادا کرنے کی پیشکش کر رہا ہے۔ یہ معمولی ایجاد نہیں ڈاکٹر صاحب۔'' ڈاکٹر تبسم ملک کے چہرے پر فاتحہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''مگر یہ گفتگو آپ اور میرے درمیان ایک راز ہی رہنی چاہیے۔ آپ سے کیے وعدے پر عمل ہوگا۔''

میں نے رخصت ہونے سے قبل صرف یہ کہا کہ ''ڈاکٹر صاحب اگر آپ کا نام ہی اخبارات میں نہ آیا تو آپ کے اس دعوے کی کوئی اہمیت نہیں کہ یہ دوا آپ نے ایجاد کی تھی۔'' میرے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''آپ کی تمام گفتگو میرے خفیہ وائس ریکارڈر میں ریکارڈ ہو چکی ہے۔''

میں نے یہ کہہ کر واپسی کا رُخ کیا۔ ڈاکٹر ٹی آر ملک کے ہسٹریائی انداز میں چلانے کی آواز جیل میں گونج رہی تھی۔

''دھوکے باز، فراڈ۔ تم کچھ نہیں جانتے۔ یہ جعل سازی ہے۔ میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔''

میں اپنا مقصد حاصل کر چکا تھا۔

ملک فیملی کے خلاف اگلے دن خصوصی ضمیمہ شائع ہوا جس نے ان کی پوری ایمپائر کو زمین بوس کر دیا جبکہ وزیر صحت سمیت ڈرگ اتھارٹی کے بہت سے اعلیٰ حکام کو عہدوں سے فارغ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر رضا ملک کی ملکیتی فارما انڈسٹری کے خلاف مزید تحقیق کی مانگ کی جانے لگی مگر اشتہارات کے لالچ کے باعث اخبارات اور ٹیلی ویژن کچھ ہی عرصے بعد خاموش ہو گئے مگر اس خبر نے ایک بار پھر فارما انڈسٹری کی غیر معمولی طاقت کو ثابت کر دیا تھا۔

ہاشمی صاحب اخبار کی سرکولیشن میں غیر معمولی اضافے اور میری اس کامیابی پر خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ دفتر میں ایک زبردست پارٹی رکھی گئی اور میں خاموشی سے ایک جانب کھڑا لاوارث لاشوں کی کہانی کو منطقی انجام تک پہنچانے پر کام کر رہا تھا۔

❖❖❖

pklibrary.com

کہا جاتا ہے کہ بعض کامیاب لوگ اپنی نجی زندگی میں ناکام ہی رہتے ہیں... بے انتہا محنت... جانفشانی اور جاں نثاری کے جواب میں ناکامیابی کھڑی ملتی ہے... مثلث کے مانند ایک دوسرے سے جڑے دوستی کا رشتہ کھو دینے والے دوستوں کا المیہ...

آگہی کا عذاب جھیلنے والے ایک دردمند کا ملال.....

دوست

ابراہیم عبدالہادی

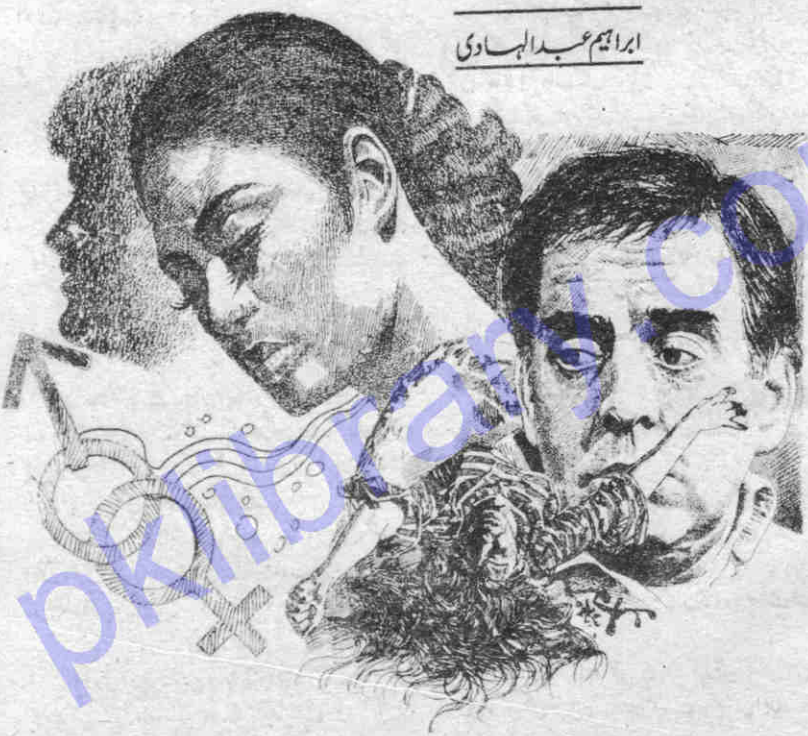

یوراشیما، انوئے سے ملاقات کے لیے اس کے دفتر آیا تو وہ چند کاغذات میں الجھا ہوا تھا۔

''آج ادھر کی راہ کیسے بھول گئے؟'' انوئے نے مسکرا کر دریافت کیا۔

''یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا تم سے بھی ملتا چلوں۔'' یوراشیما کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''اگر میں تم سے واقف نہ ہوتا تو یہ بات تسلیم کر لیتا۔'' انوئے نے تلخی خیزی سے کہا۔ ''اصل بات بتاؤ

مجھے!''

''سُنا ہے ہتوری کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں شہر سے باہر تھا۔ واپس آیا ہوں تو حلقۂ احباب میں یہی بات گردش میں ہے۔ میرا فون بھی نہیں اٹھا رہا وہ۔ سوچا تم سے بات کر کے دیکھوں۔ تم دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہو۔ تمہیں کچھ نہ کچھ تو علم ہی ہوگا۔'' یوراشیما نے بتایا۔

''میری بھی کئی روز سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ آخری ملاقات تمہارے ہمراہ ہی تو ہوئی تھی اس سے۔'' انوئے نے بتایا۔

''اس روز تو وہ کافی بہتر دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اُمید بندھ گئی تھی کہ اب وہ صحت کی جانب گامزن ہو گیا ہے۔'' یوراشیما نے ذہن پر زور دیا۔

''اس رات وہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تو دکھائی دے رہا تھا۔'' انوئے نے بھی پُرسوچ انداز میں کہا۔ ہم وہسکی سے شغل کر رہے تھے لیکن وہ بیئر سے دل بہلا رہا تھا۔ کئی بار... گولیاں بھی نکال کر حلق میں انڈیلی تھیں جو ڈاکٹر نے اسے دی تھیں۔''

''کیا خیال ہے اس سے ملنے چلیں؟'' یوراشیما نے تجویز دی۔

''جانا تو چاہیے۔ ہمارا اچھا دوست ہے وہ۔'' انوئے نے بلا تامل کہا پھر ایک توقف کے بعد گویا ہوا۔ ''کچھ پرانی یادیں ہی تازہ کریں گے۔ کل شام میری طرف آجانا۔ وہسکی کی بوتلیں بھی ساتھ لے لیں گے۔''

یوراشیما نے تائید میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں اپنی پیشہ وارانہ زندگی کے معاملات پر خیال آرائی میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

ہتوری اپنے بستر پر دراز خالی الذہنی کے عالم میں چھت پر ٹکٹکی جمائے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کے مانند سرخ تھیں۔ منتشر بالوں اور مسلے ہوئے لباس سے اس کا شخصی تاثر بے حد پژمردہ محسوس ہو رہا تھا۔ خواب گاہ کے باہر وقتاً فوقتاً ابھرنے والی صدائیں اس کی ذہنی رو میں خلل پیدا کرتیں تو وہ جھنجلاہٹ میں مبتلا ہونے لگتا۔ اسی اثناء میں اسے رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ گہری سانس لیتے ہوئے اٹھا اور کمرے سے ملحقہ باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ فراغت کے بعد دیوار میں نصب آئینے پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں تاسف و ترحم بھرے جذبات اُمڈ آئے۔

''یہ تُو ہے؟ کیا یہ واقعی تُو ہے ہتوری؟'' اس نے آئینے میں دکھائی دینے والی شبیہہ کو مخاطب کیا۔

''ہاں! یہ میں ہی ہوں۔'' شبیہہ نے آزردگی سے جواب دیا۔

''تو ایسا تو نہ تھا۔'' اس نے جھنجلا کر کہا۔

''ہاں! میں واقعی ایسا نہ تھا۔'' شبیہہ کی آزردگی برقرار تھی۔

''تو اب کیا ہو گیا ہے تجھے؟'' ہتوری بھڑک گیا۔

''پتا نہیں اب کیا ہو گیا ہے مجھے؟ میں بالکل گھبرا جاتا ہوں۔ کسی سے بات نہیں کر سکتا۔ دوسروں کی سنتا ضرور ہوں لیکن الفاظ استعمال نہیں کر پاتا۔ بس آنکھیں جھپکاتا رہتا ہوں۔ لوگ مجھ سے باتیں کرتے ہیں لیکن میں انہیں جواب نہیں دے سکتا اور نہ انہیں بتا سکتا ہوں کہ میں کیا محسوس کرتا ہوں۔ میں ہمہ وقت دل کی بس دل میں رکھتا ہوں۔''

''شاباش! کس قدر فخریہ انداز میں اپنی یہ خوبیاں بیان کر رہے ہو۔'' ہتوری نے شبیہہ کو طنزیہ انداز میں کھورا۔

''میں بے بس ہوں۔ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟'' شبیہہ نے اضطراب سے کہا۔

''تم کیوں بے بس ہو؟ تم نے کیا غلط کر دیا ہے؟ غلط تو تمہارے ساتھ ہوا ہے۔''

''کیوں؟ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟''

''بزدلوں کی طرح بستر پکڑ لینے سے کیا ہوگا؟ ہمت کرو۔ وہ رپورٹ غلط بھی تو ہو سکتی ہے۔'' اس نے تحریک دیتے ہوئے شبیہہ کو مخاطب کیا۔

''سچ؟ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ وہ رپورٹ غلط ہو سکتی ہے؟''

''ہاں بالکل! ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹرز بھی انسان ہیں اور غلطی تو کسی بھی انسان سے ہو سکتی ہے۔ کم آن! بہادر بنو!'' ہتوری نے اس کی ہمت بندھائی۔

آئینے میں دکھائی دینے والی شبیہہ اب قدرے پُرسکون دکھائی دینے لگی تھی۔ ہتوری نے اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور کچھ سوچتے ہوئے شیو بنانے کا آغاز کر دیا۔ اس کے ذہن میں متفرق سوچوں کا رقص اب بھی جاری تھا۔

☆☆☆

شیو سے فراغت اور نیم گرم پانی سے غسل کے بعد ہتوری باہر آیا تو ڈرائنگ روم سے آنے والی صداؤں نے

pklibrary.com

اسے چونکا دیا۔ چند ہی لمحے بعد ہتوری کو اندازہ ہو گیا کہ تسوتسومی اور اس کے والد انوئے اور یوراشیما کے ساتھ محو گفتگو ہیں۔

''اپنے دوست کو کچھ سمجھاؤ تم لوگ!'' تسوتسومی نے شاکی انداز میں کہا۔ وہ قدرے فربہی مائل، گول چہرے اور گہری سیاہ آنکھوں کی حامل عورت تھی۔ اس کی شخصیت کا نمایاں تر پہلو سیاہ ریشمی بال تھے جو مقابل کی توجہ پل بھر میں ہی اپنی جانب کھینچ لیتے تھے۔

''کیا سمجھائیں اسے؟ وہ ایک سمجھدار، ذہین اور باصلاحیت انسان ہے۔'' انوئے کہنے لگا۔ ''ہمارے اسٹوڈیو کا بہترین کیمرامین ہے۔ اس نے بہت کم وقت میں اپنا نام بنایا ہے۔''

''وہ بہت بدل گیا ہے۔ وہ پہلے جیسا ہتوری رہا ہی نہیں۔'' تسوتسومی مزید شاکی ہوئی۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہتوری واقعی بہت بدل گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے اسے کوئی چیز اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔'' اس کے والد نے بھی تائید کی۔

''تسوتسومی اس کی بیوی ہے۔ اس سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا اسے۔'' یوراشیما نے ایک توقف کے بعد کہا۔ ''اس کی ذہنی کیفیت صرف وہی بہتر سمجھ سکتی ہے۔''

''وہ کچھ بتائے یا حالِ دل بتائے تو ہی ایسا ممکن ہے نا؟ کئی دن سے تو آنکھیں جھکائے بغیر کسی شیر خوار بچے کی طرح دیکھنے لگتا ہے۔ اپنے گرد و پیش کی اشیاء بالکل فراموش کر دیتا ہے۔ اس کی متورم انگارا آنکھیں ایک ہی جگہ ایسے مرکوز رہتی ہیں جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ مجسمہ ہے۔'' تسوتسومی نے جھنجلا کر کہا۔

''ہاں! پچھلے کچھ عرصے سے اس کی حالت میں انتشار تو آیا ہے۔ گم صم سا رہنے لگا تھا۔ پچھلے ہفتے ہم نے کسی ڈاکیومنٹری فلم پر کام کرنا تھا۔ وہ فلم کے لیے رول نکالتا، کیمرے میں ڈالتا اور پوری احتیاط و انہماک سے عکاسی شروع کر دیتا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی رول صرف کر دیے۔ وہ ہر غیر فروعی چیز، کسی مڑے تڑے گلے سڑے درخت کے کھوکھلے ابھار، کسی شکستہ پرنالے، کسی بچے کی پرانی ٹرائی سائیکل جسے وہ خود بھی کہیں رکھ کر بھول گیا ہوگا، ہوا میں پھڑ پھڑاتے پتوں، پر اپنا کیمرا مرکوز کر دیتا تھا لیکن جس موضوع پر ہمیں فلم بنانے کے لیے بھیجا گیا تھا وہ اس کے قریب بھی نہیں پھٹک رہا تھا۔'' انوئے نے تفصیل بتائی۔

''سمجھ نہیں آ رہی کہ میرے بیٹے کو کیا مسئلہ لاحق ہو گیا ہے؟'' یمایا نے تشویش سے کہا۔ ''ایسے لگتا ہے وہ زندگی سے روٹھنے لگا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ ہم بہت جلد اسے زندگی کی طرف واپس لے آئیں گے۔ پھر سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔'' تسوتسومی کہنے لگی۔

''کہیں دفتر میں اس کے ساتھ کوئی مسئلہ درپیش تو نہیں؟'' یمایا نے ایک اور تشویش ظاہر کی۔

''پہلے تو نہیں تھا لیکن اب کچھ عرصے سے اس کی طبیعت کے باعث اسے نظر انداز کیا جانے لگا ہے۔'' انوئے نے بتایا۔

''لیکن وہ تو صبح سویرے ہی دفتر پہنچ جایا کرتا ہے۔'' یمایا حیران ہوا۔

''آپ کی بات میں کوئی شک نہیں۔ وہ صبح سویرے ہی دفتر آتا ہے۔ پورے آٹھ گھنٹے اپنی ڈیسک پر بھی گزارتا ہے لیکن اب وہ وہاں بیٹھ کر صرف سگریٹوں کا دھواں اڑاتے خلا میں گھورتا رہتا ہے۔ میں یہ بات بتانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن سننے میں یہی آ رہا ہے کہ اس کی ذمے داریاں دھیرے دھیرے نوآموز افراد کو تفویض کر کے اسے غیر اہم کام سونپے جائیں گے۔'' انوئے نے مضطرب ہو کر بتایا۔

یمایا کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔ اسے بیٹے کے لیے شدید کرب و اذیت محسوس ہونے لگی تھی۔

''جانے کیا ہو گیا ہے ایسا؟ وہ تو اپنے پیشے سے بہت خوش و مطمئن تھا۔'' تسوتسومی نے بھی تشویش ظاہر کی۔

''تم نے اسے ٹٹولا تو ہوگا؟ ایک بیوی اپنے شوہر سے کوئی بھی راز اگلوانے کے فن میں قدرتی طور پر ... طاق ہوتی ہے۔'' یوراشیما نے اسے مخاطب کیا۔

''مجھے علم ہوتا تو میں کم از کم تمہیں ضرور بتاتی۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

ہتوری کے لیے اب مزید ضبط ممکن نہ تھا۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے ان کے پاس چلا آیا۔ اس نے چہرے پر حتی الامکان بشاشت طاری کر رکھی تھی تاہم آنکھوں میں ویرانی کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھی۔ یمایا کا دل دکھ سے بھر گیا۔ تسوتسومی بھی شدید اضطراب محسوس کرنے لگی تھی۔ انوئے اور یوراشیما تاسف سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر رہ گئے۔

''کیسے ہو دوست؟'' انوئے نے اپنائیت سے اسے مخاطب کیا۔

''کافی بہتر ہوں۔ کل سے دفتر بھی آؤں گا۔ اگلی

ڈاکیومنٹری پر کام کے لیے وقت بہت کم ہے۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا اور تسوتسومی کو مخصوص اشارہ کر دیا۔ وہ مہمان نوازی کے لیے لوازمات لانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یمایا نے موضوع گفتگو تبدیل کر کے شہر میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی کھیلوں کی جانب موڑ دیا۔

☆☆☆

ہتوری دفتر میں اپنی نشست پر ساکت وصامت بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پھڑ پھڑاتے کاغذ اور منتشر دھڑکنوں کی صدا نے دل و دماغ میں حشر برپا کر رکھا تھا۔ کچھ لمحے بعد وہ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اٹھا اور ایک بغلی دروازہ کھول کر مختصر نیم تاریک کمرے میں چلا آیا۔ کمرے کی فضا میں 'ایسی ٹونی' کی یوبسی ہوئی تھی جو فلم کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑنے والی سرکش سے نکلتی ہے۔ سیبوں سے ملتی جلتی یہ خوشبو ہتوری کو بہت پسند تھی لیکن اس وقت یہ خوشبو بھی اسے شدید گھٹن میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کمرے کے وسط میں ساکت کھڑا ہو گیا۔ اس کا تنفس بے ربط ہونے لگا تھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس میز کا سہارا لے لیا جس پر کیمرا، فلمیں ایڈٹ کرنے والی ایک چھوٹی میز اور فلموں کے خالی ڈبے بکھرے پڑے تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک غلیظ کاؤچ رکھا تھا جس پر اکثر پسوریزنگ کرتے تھے۔ ہتوری ڈگمگاتا ہوا اس کاؤچ پر جا بیٹھا۔ مٹھی میں بھینچا کاغذ پسینے سے نم ہو گیا تھا۔

''تو وہ سب سچ تھا؟'' اس کے لبوں سے ایک سسکاری برآمد ہوئی۔

''کیسے؟ میرے ساتھ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے کہاں بے احتیاطی کر دی؟ اتنی سادہ اور صاف ستھری زندگی کے باوجود مجھے یہ مرض کیسے لاحق ہو سکتا ہے؟'' اس کا ذہن اب اپنے مرض کے ممکنہ امکانات کے متعلق غور و فکر کرنے لگا تھا۔ کہیں کسی غلطی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اگلے دو گھنٹے اس کے دل و دماغ یونہی آندھیوں کی زد میں رہے۔ اس کے بعد وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

تسوتسومی اپنے روزمرہ کام کاج سے فراغت حاصل کر چکی تھی۔ نہا دھو کر تازہ دم ہونے کے بعد اس نے کافی کا ایک کپ تیار کیا اور بالکنی میں بیٹھ کر چسکیاں لینے لگی۔ اسی اثنا میں اس کی نگاہ ایک سمت نصب آئینے پر پڑی۔ قدِ آدم آئینے میں دکھائی دینے والی شبیہہ کو مخمور نظروں سے دیکھتے رہنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ اپنی آنکھوں اور بالوں کی خوب صورتی، جلد کی تازگی و نزاکت کو نکھارا کرتی تھی لیکن اس لمحہ یہ پسندیدگی ایک اضطراب میں ڈھل گئی تھی۔ خوب صورت سیاہ آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے کی پژمردگی نے شخصیت کو عجیب بے رونقی عطا کی ہوئی تھی۔

''لگتا ہے اس بار پارلر سے دوبارہ فیشل کروانا پڑے گا۔'' اس نے بائیں ہاتھ سے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے خود کلامی کی اور حلق میں پیدا ہونے والی خراش کو سکون دینے کے لیے کافی کا ایک بڑا گھونٹ بھر لیا۔

کھانسی کی یہ کیفیت کچھ دنوں سے ہی لاحق رہنی شروع ہوئی تھی۔ اپنی جسمانی ہیئت میں در آنے والی ان تبدیلیوں سے صرف نظر کے لیے اس نے بالکنی سے بیرونی مناظر پر توجہ مبذول کر دی لیکن اضطراب تو وہاں بھی اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ مختلف النوع کھیلوں میں مصروف، والدین کی انگلی پکڑے چہروں پر خوشی سمیٹے بچوں کی دید اس کے وجود میں ایک خلش پیدا کرنے لگی تھی۔ اس نے کافی ختم کر کے آنکھیں موند لیں۔ کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ بیرونی دروازے پر کسی کی آمد کا احساس ہوا۔ اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے کپ ایک تپائی پر رکھا اور چہرے پر بشاشت طاری کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے علم تھا کہ یمایا کو اپنے کسی ضروری کام کے باعث شام ڈھلے ہی واپس آنا تھا۔ دروازے پر یقیناً ہتوری ہی تھا۔

''کہیں پھر سے اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟'' اس نے کھانستے ہوئے سوچا۔

ہتوری اس اثنا میں کمرے تک چلا آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا سا کاغذ تھا جسے اس نے تسوتسومی کے چہرے پر دے مارا۔ تسوتسومی شوہر کی اس حرکت پر پہلے تو سخت بھنائی تاہم اگلے ہی لمحے اس کی نگاہوں سے جھلکنے والی نفرت نے اسے ساکت کر دیا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟ تہذیب بالکل ہی بھول گئے ہو کیا؟'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے تیور دکھائے۔

''خود ہی دیکھ لو، کیا ہے۔'' ہتوری نے اسے سرد مہری سے جواب دیا۔

تسوتسومی نے کاغذ اٹھایا اور مندرجات پر نگاہیں دوڑانے لگی۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔

''ایچ آئی وی پازیٹو۔ تم ایچ آئی وی پازیٹو ہو؟'' اس نے حیرت و بے یقینی سے شوہر کو دیکھا۔

''میں ہی نہیں۔ تم بھی ایچ آئی وی پازیٹو ہو۔ یہ مرض

pklibrary.com

مجھے تمہی سے لاحق ہوا ہے۔'' وہ مزید سرد مہری سے بولا۔

''مجھ سے؟ نہیں..... کیسے؟ یہ ناممکن ہے۔'' وہ شدّ و مد سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''یہ ممکن ہو چکا ہے۔ مجھے علم ہے اب تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہوگا؟ میں گزشتہ دو برس سے معمولی نزلے زکام تک میں مبتلا نہیں ہوا۔ لہٰذا کسی کی استعمال شدہ سرنج سے اس کا پھیلاؤ ممکن ہی نہیں۔ اپنی شیو بھی میں خود ہی گھر میں کرتا ہوں۔''

''مجھے کیا علم کہاں منہ کالا کر چکے ہو تم؟'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے تلخ ہوئی۔

ہتوری کا ذہن یکدم الٹ گیا اس نے بائیں ہاتھ سے تسوتسومی کے چہرے پر طمانچہ جڑ دیا۔

''یہ کیا ذلیل حرکت ہے ہتوری؟ بالکل ہی جانور بن گئے ہو کیا تم؟'' وہ حلق کے بل چلّائی۔ کھانسی میں یکدم ہی اضافہ ہوا تھا۔

''یہی تو میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کیا ذلیل حرکت ہے؟ تم ہمارے رشتے میں خیانت کیسے کر سکتی ہو؟'' وہ بھی اسی انداز میں چلایا اور پھر کھانسنے لگا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ رپورٹ غلط ہے۔'' تسوتسومی نے ہٹ دھرمی سے جواب دیا۔

ہتوری نے جھنجلا کر اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے اور بھرپور قوت سے جھٹکتے ہوئے کہنے لگا۔

''تمہیں اس معاملے کی نزاکت کا رتی بھر بھی احساس ہے کیا؟ تم اتنی اہم بازیٹو ہو۔ موت کی جانب گامزن ہو۔ تمہاری وجہ سے میں بھی اس راہ کا مسافر بن گیا ہوں۔ تمہیں اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہے کیا؟''

ہتوری کے اِن الفاظ نے تسوتسومی کا چہرہ شدید متزلزل کر دیا۔ وہ کھانستے ہوئے گھٹنوں کے بل زمین بوس ہوئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیوں؟ کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا؟'' ہتوری نے کراہ کر دریافت کیا۔

''مجبور ہو گئی تھی میں۔ بے بس ہو گئی تھی۔'' وہ آنسوؤں کے درمیان بولی۔

''کس بات کی مجبوری تھی؟ ایسی کیا بے بسی تھی آخر؟'' وہ چلّایا۔

''یہ بات تم خود سے پوچھو۔ میں نے تم سے کتنی بار کہا تھا کہ یہ ملازمت چھوڑ دو۔ اس ملازمت کی وجہ سے تمہارے شب و روز کی مصروفیات ہی اور تھیں۔ تمہیں وقت

ہنسنا منع ہے

نرس۔ ''تمہارے موٹاپے کا ایک حل ہے۔''

مریض۔ ''وہ کیا؟''

نرس۔ ''تم روزانہ ایک روٹی کھایا کرو۔''

مریض۔ ''یہ روٹی ''کھانے'' سے پہلے کھانی ہے یا بعد میں؟''

☆☆☆

پیر مرید سے۔ ''بیٹا کوئی منت مانگو۔''

مرید۔ ''مجھے اَن میرڈ کر دیں۔''

پیر۔ ''بیٹا منت مانگو، جنت نہیں۔''

☆☆☆

شوہر۔ ''میں آج جو کچھ ہوں، اپنی کوششوں کی وجہ سے ہوں۔''

بیوی۔ ''تو پھر میں ایسے ہی خوامخواہ اللہ تعالیٰ سے تمہاری خرابیوں کی شکایت کرتی رہی۔''

☆☆☆

بیوی۔ ''اگر میں موٹی ہو جاؤں تو تم پھر بھی مجھے اتنا ہی پیار کرو گے؟''

خاوند۔ ''نہیں میں نے تم سے صرف دکھ سکھ میں شریک رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ موٹاپے میں ساتھ دینے کا نہیں۔''

بیوی۔ ''تمہارے بنا میں مر جاؤں گی۔''

شوہر۔ ''ایسا مت کہو، کیونکہ ایسا ہوا تو میں خوشی سے ہی مر جاؤں گا۔''

☆☆☆

بیوی۔ ''میں تمہاری جدائی میں اور یاد میں پندرہ دنوں کے اندر آدھی ہو کر رہ گئی ہوں، تم مجھے لینے کب آؤ گے؟''

شوہر۔ ''مزید پندرہ دنوں کے بعد ایک ہی بار۔''

امریکا سے جاوید کاظمی کی سوغات

pklibrary.com

کا ہوش ہی کہاں رہتا تھا؟ کئی کئی روز گھر سے باہر رہتے تھے۔ تم مجھے وقت ہی کہاں دیتے تھے؟'' وہ بھی صاف گوئی سے چلائی۔

''تو یہ سب کس کے لیے کرتا تھا آخر؟ تمہارے عیش و آرام کے لیے ہی کرتا تھا نا۔'' ہتوری بے یقینی سے کہنے لگا۔ اس کی والدہ نے یمایا سے تنگ دستی کے باعث اس کے بچپن میں ہی علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس لیے ہتوری نے آغاز ہی سے معاشی خوش حالی کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو ہر مادی سہولت فراہم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اسے اپنا بنائے رکھنے میں ناکام ہو گیا تھا، اس عورت کو مادی سہولیات سے زیادہ رومانوی آسودگی درکار تھی۔ تسوتسومی اپنے جذبات کی تشنگی سے اتنی بے بس ہو گئی تھی کہ اسے کسی کے ساتھ ایک غیر اخلاقی تعلق استوار کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ ہوا۔ آہ ری عورت! تُو واقعی ایک پہیلی ہے۔ ایک اسرار بھرا بھید جسے آج تک کوئی سلجھا سکا ہے نہ ہی سلجھا سکے گا۔

''مجھے ایسا عیش و آرام نہیں چاہیے تھا جو میرے تشنہ جذبات کو کچل ملتا۔'' وہ مزید تلخ ہوئی۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں مجھ سے بے وفائی کا لائسنس مل گیا؟ وہ عورتیں بھی تو ہوتی ہیں جن کے شوہر بیرونِ ملک ملازمت کرتے ہیں۔ وہ بھی تو اپنے جذبات کو شریکِ حیات کے لیے سنبھال کر رکھتی ہیں نا؟ تم کیسی عورت ہو؟'' اس نے نفرت سے کہا۔

''میں ایسی ہی عورت ہوں۔ بس ایسی ہی ہوں۔ مجھے اپنے شوہر کا وقت اور توجہ مکمل طور پر چاہیے تھی اور چاہیے ہے۔ بس!'' وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

ہتوری تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے وجود میں رہ رہ کر اُبال پیدا ہو رہا تھا۔

''تو پھر کس نے جگہ لی میری؟ کسے چُنا تم نے میرے متبادل کے طور پر؟'' وہ کراہا۔

تسوتسومی اس سوال کے جواب میں خاموش رہی۔

''بہت چاہتی ہو اُسے؟'' ہتوری نے اذیت سے دریافت کیا۔

''ہاں! بہت۔'' وہ بے باکی سے بولی۔

''ایسا کیا خاص ہے اس میں؟'' ہتوری کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچا۔

''وہ سب کچھ جو مجھے تم میں درکار تھا۔ اس نے میری تنہائی دور کی۔ میرے جذبات کا احترام کیا۔ مجھے کانچ کی گڑیا بنا کر رکھا۔'' تسوتسومی خوابناک سے انداز میں بولی۔

''کب سے دھوکا دے رہی ہو مجھے؟'' ہتوری کے لہجے میں غراہٹ در آئی۔

''میں اسے دھوکا نہیں کہوں گی۔ ہم دونوں نے اپنے جذبات کی تسکین کا ایک راستہ تلاش کیا۔ بس!''

''کب سے تسوتسومی؟ کب سے؟'' اس نے اپنے بال نوچے۔

''ہماری شادی کے اگلے ماہ سے ہی۔''

''تو کیوں بندھی رہیں تم میرے ساتھ اس جبری رشتے میں؟ اسی سے شادی کر لیتی نا؟ میرا یہ گناہ اتنا بڑا تو نہیں تھا کہ تم نے اس مرض کی صورت میں مجھے سزا دے دی۔'' ہتوری کی آنکھیں نم ہوئیں۔

''میں نے کئی بار اس سے کہا تھا کہ ہم اپنی الگ دنیا بسا لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی قربت مکمل طور پر حاصل کر لیتے ہیں لیکن وہ مانتا ہی نہیں تھا۔'' وہ آزردہ ہوئی۔

''کیوں؟ کیوں نہیں مانتا تھا؟ وہ تو تمہیں بہت چاہتا تھا نا..؟ پھر شادی سے کیسا گریز؟'' ہتوری نے طنز کیا۔

''ہاں! وہ مجھے بے تحاشا چاہتا تھا۔ دیوانوں کی طرح میرا خیال رکھتا تھا۔ میری ذات کے گرد کسی پروانے کی طرح منڈلاتا تھا۔ مجھے ہر قسم کی آسودگی فراہم کرتا رہا لیکن بس یہی ایک خرابی تھی کہ شادی کا ذکر سن کے بدک جاتا تھا۔'' وہ ہتوری کو کچوکے لگانے میں کوئی کسر روا نہیں رکھ رہی تھی۔

''کیوں؟ کیا رکاوٹ تھی آخر؟'' ہتوری کی انگلیوں میں اینٹھن پیدا ہونے لگی۔

''تم..... تم تھے رکاوٹ۔'' وہ نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ تمہارے سامنے بھی سُرخرو ہی رہنا چاہتا تھا۔''

ہتوری کے ذہن میں انوئے اور یوراشیما کے چہرے گڈمڈ ہونے لگے۔ وہ اپنے مجرم کے کافی قریب پہنچ گیا تھا۔

''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ یقیناً وہ یونہی اپنا مطلب حاصل کرتا رہنا چاہتا تھا۔ شادی کر کے جنجال میں کون پڑتا ہے؟'' وہ اسے سُلگانے کے لیے ہنسا۔

تسوتسومی حسبِ توقع چڑ گئی۔

''وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ اب بھی کرتا ہے۔ میرے بغیر سانس لینا بھی دشوار ہے اس کے لیے۔ لیکن وہ اپنے 'بہترین دوست' کی نظروں میں بھی سرخرو رہنا چاہتا ہے۔''

''کیا؟ کیا کہا تم نے؟'' وہ چونکا۔ مجرم اب بالکل

pklibrary.com

عیاں ہو چکا تھا۔

''بہترین دوست۔'' اس نے ایک بار پھر ہتوری کو نفرت سے دیکھا۔

ہتوری کے ذہن میں ہتھوڑا زنی ہونے لگی۔ وہ لمحات بہت جاں گسل تھے۔ کرب سے بدن کی ہر ایک رگ میں اینٹھن محسوس ہونے لگی۔ اس نے ایک تپائی پر رکھی پھلوں کی ٹوکری سے تیز دھار چھری اٹھائی۔ تسوتسومی کے بال مٹھی میں جکڑ کر گردن بلند کی اور چھری حلق پر پھیر دی۔ لہو کا ایک فوارہ ابلا اور ہتوری کے ہاتھ رنگین ہو گئے۔ اس کا ذہن بالکل ہی الٹ چکا تھا۔ آنکھوں کا کھنچاؤ ناقابلِ برداشت تھا۔ ایک لمحے کے لیے دل چاہا کہ اپنے مجرم کے ساتھ بھی یہی سلوک کرے لیکن دوسرے ہی پل ازلی اور فطری بزدلی غالب آگئی۔ وہ اس شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ تسوتسومی کی خود سے جذباتی وابستگی یا ہتوری کے کسی کمزور پہلو کو ہدف بنا کر ہرزہ سرائی کرنے لگتا تو وہ کیونکر برداشت کر پاتا؟

ہتوری سراسیمہ اور وحشت زدہ نظروں سے خلاؤں میں گھورنے لگا۔ اسے کائنات کی ہر ایک شے اپنا تمسخر اڑاتی محسوس ہو رہی تھی۔

''اوہ..... وہ دیکھو!! وہ ہتوری ہے۔ اپنی بیوی کو جذباتی تسکین فراہم نہ کر سکا۔'' اسے سڑک پر کھڑے کسی بچے کی زبان سے ان فقرات کی ادائیگی کا گمان ہوا۔

''اچھا! تو یہ ہے وہ ہتوری جس کی بیوی اس کے 'بہترین دوست' کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ بے چاری! اور کرتی بھی کیا؟'' سڑک پر چلتی ایک عورت کی سرگوشی سنائی دی۔

''کامیاب افراد اکثر اپنی نجی زندگی میں یونہی ناکام ہوتے ہیں۔'' کسی مرد کی آواز سماعت میں پڑی۔

''عورت تو آکاس بیل ہے۔ اسے اپنے قریب جو بھی سہارا دکھائی دے اس سے لپٹ کر پروان چڑھنے لگتی ہے۔'' ایک اور صدا نے سماعت چھلنی کی۔

ہتوری نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے لیکن سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ رک کے ہی نہ دے رہی تھی۔ ہتوری کی وحشت ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ اس نے تسوتسومی کے پاس پڑا وہ نم کاغذ اٹھایا اور پرزے پرزے کر کے بالکنی سے باہر فضا میں اچھال دیا۔ اس کے بعد وہ دیوانگی کے عالم میں باورچی خانے کی جانب بڑھا اور چولھے کی گیس مکمل طور پر کھول کر اپنا سر اس کے اوپر رکھ دیا۔ اس کے پردۂ تصور پر اپنے مجرم کی خندہ زن شبیہ رقصاں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی روح کا پنچھی بدن کے قفس سے آزاد ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ہتوری کا بہترین دوست اپنے مجلۂ عروسی میں موجود تھا۔ اس خوشی کے موقع پر بھی اس کی طبیعت قدرے پژمردہ تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں میں حیران کن حد تک اضافہ ہو چکا تھا۔ چند روز سے کھانسی نے بھی خاصی بیزاری پیدا کر رکھی تھی۔ مجلۂ عروسی میں اپنی نوبیاہتا کے پاس آمد تک تسوتسومی کا خیال ہی ذہن کے دریچوں پر کئی بار دستک دے چکا تھا۔ تسوتسومی نے اس کے ساتھ بہترین وقت گزارا تھا۔ وہ دونوں باہمی قربت سے بھرپور لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ تسوتسومی کو ایسے ہی توانا اور جذباتی مستحکم شخص کی ضرورت تھی تو اسے بھی ایسی ہی بے باک اور باغی عورت کا ساتھ درکار تھا۔ ان دونوں نے اُن گنت مرتبہ اخلاقی حدود پامال کر کے باہمی مستقل رفاقت کے احکامات پر غور کیا تھا لیکن ہتوری کا خیال آتے ہی اس کی قوتِ ارادی کمزور پڑ جاتی۔

ان خیالات میں غلطاں آگے بڑھتے کھانسی شدید تر ہونے لگی۔ اس نے ایک تپائی پر رکھے جگ سے پانی نکال کر پیا اور اپنا تنفس متوازن کرتے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کی نوبیاہتا گہری نظروں سے ہر ایک جنبش کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے بھی یہ شادی معاشرتی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے کی تھی۔

''کیا بات ہے؟ کس بات کی پریشانی لاحق ہے آپ کو؟'' اس نے ملائمت سے شوہر کو مخاطب کیا تو وہ اپنے خیالات سے چونک گیا اور کھانستے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں! بس دل و دماغ پر ایک بوجھ سا دھرا ہے۔''

''کیسا بوجھ؟ ہم شریکِ حیات ہیں۔ اپنے دکھ درد ایک دوسرے سے بانٹ سکتے ہیں۔'' وہ مزید نرمی سے گویا ہوئی۔

اس کے دل میں تسوتسومی کی یاد نے چٹکی لی اور وہ افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں نے اپنا بہترین دوست کھو دیا ہے..... میرا بیٹا..... میرا ہتوری..... میرا بہترین دوست تھا۔''

یمایا کی آنکھوں سے چند آنسو رخساروں پر لڑھک گئے۔ اس بے رنگ سیال میں ندامت، خلش، احساسِ زیاں اور کرب کا عکس تھا۔ کھانسی شدید سے شدید تر ہونے لگی تھی۔

❖❖❖

pklibrary.com

قسط: 27

شعلہ زن

روبینہ رشید

وہ شعلہ زن تھی یا جوالا مُکھی... اس کے وجود میں ایک آتش فشاں دہک رہا تھا... اپنوں کی خودغرضی، دھوکے اور دل و جاں پر گزر جانے والی ناگہانی اس کے وجود کو تہ و بالا کردینے والے لاوے کے مانند رقصاں تھی... رسوائی کی موت کو اس کا انجام ٹھہرایا گیا مگر مقدر اسے اپنے ساتھ لے اُڑا... اس کے راستے میں رکاوٹوں اور دشواریوں کے ہمالیہ حائل تھے مگر وہ حاتم طائی کی طرح زندگی کی حسن آرا کے مشکل سوالات کے جواب تلاشتی رہی... ہر قیامت نے اس کے حوصلے کو مہمیز کیا... ہر اُفتاد اسے مضبوط بناتی گئی... پناہ اور بقا کی تلاش اسے مسلسل دوڑا رہی تھی... موت روپ بدل بدل کر اس کے تعاقب میں تھی... وہ اپنی طاقت سے خود ناآشنا تھی... راہ میں آنے والے ہر پتھر کو وہ اپنے راستے سے ہٹا رہی تھی... اس کے باوجود اس بار آنے والا طوفان شدید تھا... اس میں ناکامی قیامت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی... ایک ایسی قیامت جو کروڑوں افراد کے قدموں سے زمین کھینچ لیتی ہے...

ایک سادہ و معصوم نازک اندام دوشیزہ کی سنسنی خیز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں سارہ احمد چھوٹے سے گاؤں کی ایک نہایت عام سی لڑکی تھی جسے تین بہنوں میں سب چھوٹی ہونے کی وجہ سے ماں باپ کا لاڈ پیار نہ ہونے کے برابر ہی ملا۔ گھر میں بھائی کی حکومت تھی۔ میرے پیروں سے گھر کی زمین اس وقت سرک گئی جب اسی بھائی نے غصے میں کسی کو قتل کر دیا اور غیرت کے نام پر قتل کا بہانہ بنا کر سزا سے بچنے کے لیے مجھے بدنامی اور الزام کی کالک لگا کر موت کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور میرے ماں باپ نے بیٹے کو بچانے کی خاطر اس فیصلے کو قبول کر لیا۔ اس شام میں نے گھر، گاؤں اور سب کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور ٹرین میں سوار ہو گئی۔ ٹرین میں ایک شیطان ملا۔ میں نے اس کا مقابلہ کیا اور کچھ پیسے لے کر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوئی مگر اس نے میرا پیچھا نہ چھوڑا، جان بچانے کی دوڑ میں، میں ایک کچی بستی میں پہنچی جہاں گندے نالے میں ایک چھوٹی بچی ڈوب رہی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اس بچی کو بچانے کے لیے نالے میں کود گئی۔ اس کی جان بچانے کے انعام کے طور پر مجھے اس کے گھر میں پناہ ملی۔ اس بستی میں منشیات کا دھندا زوروں پر تھا۔ مجھے پناہ تو ملی مگر میری تقدیر کی گردش میرے ساتھ تھی۔ پہلے مجھ پر اس بچی کے باپ کے قتل کا الزام لگا اور پھر وہاں پر خوف و ہراس پھیلانی کالے جادو کی ماہر اماں سے میری جھڑپ ہو گئی۔ وہ اس بچی کے خون سے ایک خاص طاقت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ بچی کو بچانے کی کوشش میں وہ جادو گرنی جل کر مر گئی۔ جس کے بدلے بستی کے بڑے بدمعاش نے مجھے وہیں قتل کرنے کا حکم سنایا۔ علاقے کے دوسرے ڈان نے اچانک کارروائی کر کے مجھے بچا لیا۔ اس نے مجھے اپنے اڈے پر قید کیا جہاں ہر طرف منشیات ہی منشیات تھی۔ میں اسے اس کے تمام تر بُرے ارادوں کے ساتھ ختم کرنے اور اس کے منشیات کے ذخیرے کو آگ لگا کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو ہی رہی تھی کہ ایک افسر کے ہتھے چڑھ گئی۔ جہاں اس کے کرپٹ افسر نے مجھے آپا جی کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ وہ آپا جی مجھے ٹرین میں ملی تھیں اور مجھے بہت اچھی لگی تھیں مگر درحقیقت آپا جی عورتوں کی سوداگر تھیں۔ مجھے ان کے بنگلے پر ہر قسم کی تربیت فراہم کر کے امیروں کا دل خوش کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔ آپا جی نے ایک راستہ مجھے ایک بارسوخ شخص کے محل پہنچا دیا۔ جہاں بڑی مشکلات اور جان لیوا کوشش کے بعد میں اسے چھری مار کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ میں جان بچانے کے لیے اندھا دھند دوڑ رہی تھی کہ بڑی سڑک پر دوڑ لگا دی جہاں سامنے سے آنے والی کار کی ٹکر نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ یہ حادثہ میرے لیے زندگی کی نوید بن گیا۔ وہ گاڑی ڈاکٹر علی چلا رہے تھے۔ جو مجھے پہلے اسپتال اور پھر بابا کے پاس لے گئے۔ بابا کے گھر آ کر میری زندگی بدل گئی۔ ان پر ہونے والے قاتلانہ حملے میں

pklibrary.com

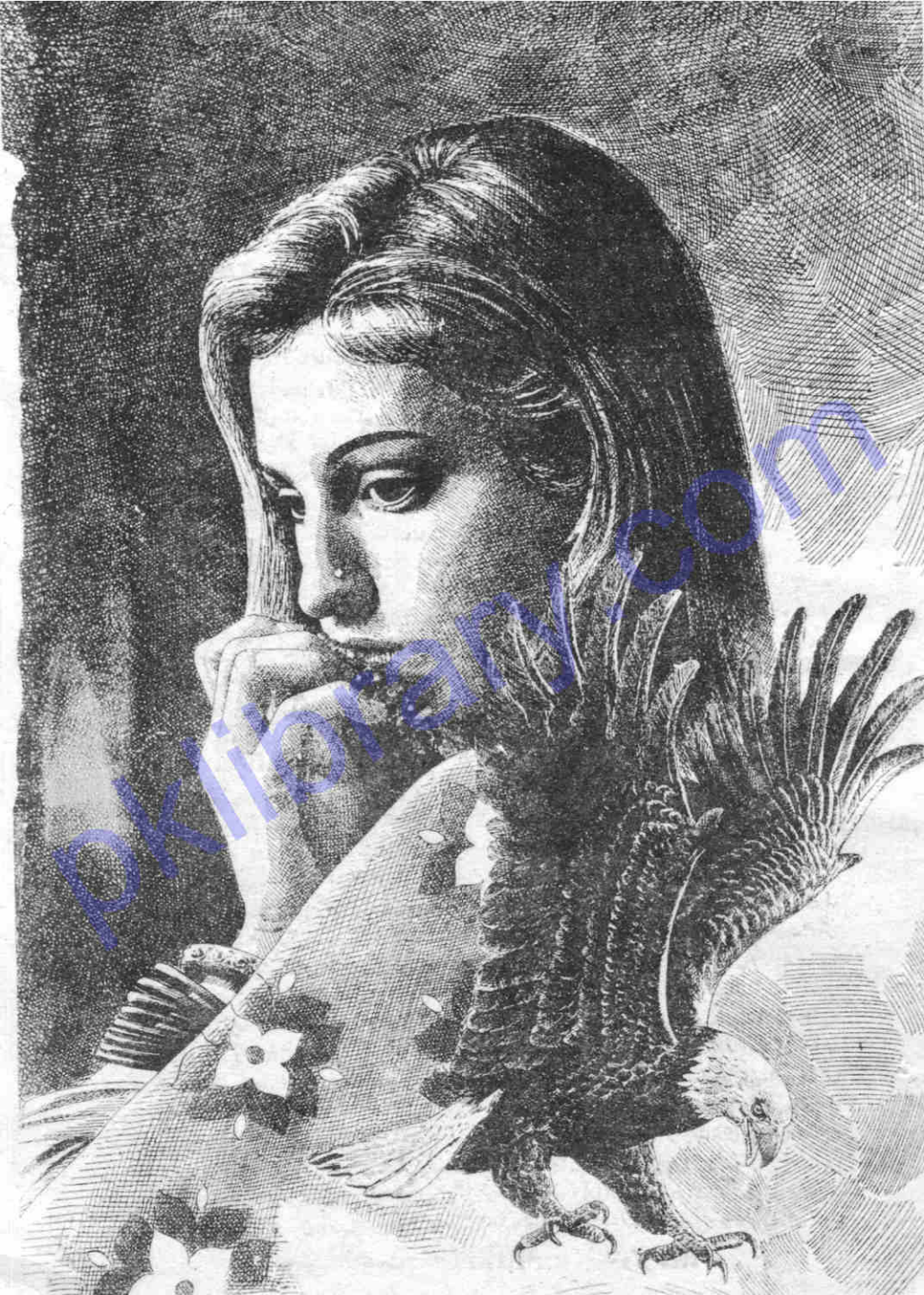

pklibrary.com

میری کوشش اور بہادری نے ان کی جان بچانے میں مدد کی۔ یہی ان سے میرا پہلا تعارف تھا جس کے بعد انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنا لیا، ان کی زندگی کی کہانی مجھ سے کچھ عجیب نہیں تھی۔ لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران انہیں وہاں ایک کروڑ پتی یہودی ابراہام کی بیٹی سے محبت ہوگئی تھی۔ اس محبت نے بالآخر شادی کا روپ دھارا، ابراہام مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس کے نہ ماننے اور مسلسل دھمکیوں کی وجہ سے وہ دونوں پاکستان آگئے۔ یہاں ان کی زندگی بہت شاندار اور خوشیوں سے بھرپور تھی۔ اللہ نے انہیں ایک بیٹی سونیا عطا کی مگر اسی دوران ابراہام کے غنڈے ان کے گھر پہنچ گئے۔ جہاں ان کی جان بچانے کی کوشش میں مریم نے اپنی جان دے دی اور وہ لوگ سونیا کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بابا بمشکل اس غم سے کھڑے ہوئے اور اپنی بیٹی کی تلاش میں لندن پہنچے۔ کسی طرح وہ ابراہام کے محل میں گھسنے اور سونیا تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ اسے لے کر باہر آگئے تھے مگر آخری لمحوں پر ابراہام اور اس کے لوگوں نے انہیں شدید زخمی کر کے سونیا کو ان سے چھین لیا۔ وہ ان کو مار ہی ڈالتے مگر ان کے دوست نے کسی طرح انہیں بچایا اور پاکستان بھیج دیا۔ ابراہام کے محل سے انہیں دو خفیہ فائلیں ملی تھیں جس سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ ابراہام کے پاس موجود تمام دولت مریم کی ماں کی ملکیت تھی اور اس نے اس دولت کو مریم یا اس کی اولاد کے نام کر رکھا تھا۔ سونیا کے 25 سال کی ہونے تک وہ اس کا ولی تھا مگر اسے یہ ثابت کرتے رہنا تھا کہ مریم یا سونیا میں سے کوئی ایک اس کے پاس موجود ہے ابراہام سونیا کو اسرائیل میں کسی نامعلوم مقام پر لے گیا مگر بابا سے اس کا جھگڑا جاری تھا۔ بابا نے مجھے تعلیم و تربیت سے نکھارا، وہاں ان کے علاوہ ڈاکٹر علی اور کریم موجود تھے۔ کریم ایک فلسطینی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے پورے خاندان کو یہودیوں نے مار ڈالا تھا اور بابا اسے کیمپ سے ساتھ لائے تھے۔ وہ فوج میں میجر رہا تھا۔ مارشل آرٹ کا ماہر تھا اور اب فوجی ٹریننگ کی ایجنسی چلا رہا تھا۔ ڈاکٹر علی بابا کے دوست کا بیٹا تھا۔ ماں باپ کے حادثے کے بعد اس کی ذمے داری بابا نے لے لی تھی۔ اب ان دونوں کے ساتھ میں بھی اس گھر کا فرد بن چکی تھی۔ ابراہام کے بابا کو ایک فون نے ہم سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے بابا کو بتایا کہ اب وہ جلد ہی پاکستان کو تباہ و برباد کرنے والا ہے اور یہ سب کرنے کے لیے اس نے ان کی بیٹی سونیا کو (جسے وہ مریم کہہ رہا تھا) تیار کیا ہے یہ سب وہی کرے گی۔ کریم اس معاملے کو فوراً مقتدر حلقوں تک لے گیا تھا انہی دنوں سڑک پر ایک بھکارن کے مشکوک انداز پر میں نے اس کا پیچھا کیا وہاں سے ملنے والا ایک سکہ مجھے فخر الدین کے دفتر لے گیا۔ وہ اور وہ بھکارن تاشی موساد کے لیے کام کر رہے تھے۔ ہم نے ان کے کئی منصوبے ناکام کیے۔ اس دوران تاشی نے زہریلی گیس کے ذریعے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی مگر آخری لمحے پر کریم اور علی نے مجھے بچا لیا۔ پھر کریم کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب ہماری ان سے کھلی جنگ تھی۔ فخر الدین پکڑا گیا مگر غضنفر نے دلاور کے ذریعے اس کو قتل کرا دیا۔ ہم تینوں کو اس معاملے سے ہٹانے کے لیے غضنفر نے بابا کو بیلو استاد کے ذریعے اغوا کروایا مگر ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ اور بابا کو چھڑا لیا گیا۔ اس دوران ہم نے ایک سراغ پر محنت کر کے تاشی کو پکڑ لیا اور اسے خفیہ ایجنسی کے دفتر پہنچا دیا۔ تب ہی مجھے معلوم ہوا کہ کریم بظاہر فوجی ٹریننگ ایجنسی چلا رہا ہے مگر وہ انڈر کور فوجی ہے اور خصوصی خفیہ مشن پر کام کرتا ہے۔ تاشی کے غائب ہونے پر زورین اور غضنفر نے میرے اغوا کا فیصلہ کیا۔ ہمارے گھر کے باہر کیمرا لگایا گیا۔ اغوا کی اس کوشش میں وہ ناکام رہے اور سب کے سب کریم کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ ایک منصوبے کے تحت تاشی کو فرار ہونے میں مدد دی گئی۔ وہ ایک منچلے سے لفٹ لے کر اس کے گھر پہنچی جہاں غضنفر نے اسے ختم کرنے کے لیے دلاور کو بھیجا۔ تاشی وہاں ماری گئی، مقامی ٹیم کی مسلسل ناکامی کی وجہ سے ابراہام نے سونیا کو پاکستان بھیجا۔ شینا ایٹمی ہتھیاروں کی جانکاری کے لیے وہاں کے ایک اعلیٰ ترین افسر سے دوستی کرتی ہے بالآخر پکڑی جاتی ہے۔ تلاشی کے دوران اس کا فون پھٹ جاتا ہے اور وہ ہلاک ہو جاتی ہے۔ ابراہام کی ٹیم بھی جونز کی سرکردگی میں شہر میں موجود ہے وہ اس کی مدد سے پورٹ پر کیمیکل کے ذریعے سیکڑوں لوگوں کی موت کا باعث بنتے ہیں۔ اس پر ابراہام سے جھگڑے کے بعد سونیا گھر سے نکلی اور میری گاڑی سے اس کا حادثہ ہوگیا۔ میں اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے گئی۔ چوٹ لگنے کی وجہ سے وہ وقتی طور پر یادداشت کھو چکی تھی۔ دوسری طرف ابراہام نے خفیہ ایجنسیوں کی وجہ سے اس کی تلاش رکوا دی اور پہلی ٹیم نے تمام کام کرنے والوں کو گراؤنڈ کر دیا۔ دوسری جانب ابراہام کے لیے کام کرنے والا ڈیوڈ بابا جی بن کر ہزاروں افراد کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ انہوں نے 8 دہشت گردوں کی مدد سے بڑے فوجی چھاؤنی میں گھس کر اسلحہ خانہ، ائرٹیس پر قبضہ کر لیا اور اسٹاف کو یرغمال بنا کر ایٹمی ہتھیار حوالے کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ وہاں مجھے دلاور اور غضنفر نے اغوا کر لیا مگر اپنی خاص صلاحیت کی وجہ سے مجھے بہت جلد ہوش آ گیا اور میں غضنفر کو اٹھا لانے میں کامیاب رہی۔ فوجی چھاؤنی کے معاملے میں کریم کو بھی طلب کر لیا گیا تھا۔ کریم اور اس کی ٹیم بالآخر چھاؤنی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اسی اثنا میں ابراہام اپنی کارروائی کو تیز تر کر دیتا ہے۔ شہر میں بم بلاسٹ ہوتے ہیں اور کافی تعداد میں ہلاکتیں ہوتی ہیں۔ میں اسی مقام پر پرویز نامی لڑکے کو گرفتار کروا دیتی ہوں۔ انسپکٹر شمشیر اسے گرفتار کر کے تفتیش کرتا ہے۔ اور اس کی نشاندہی پر سلمان اور جیمز کو گرفت میں لے کر تفتیش کرتا ہے..... ابراہام اپنے تعلق کے زور پر انہیں رہا کروا لیتا ہے..... اب وہ فیروز نامی بزنس مین کو استعمال کر رہا تھا۔ شمشیر چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ وہ فیروز کے فارم ہاؤس میں گھس کر سلمان اور جیمز کو مار ڈالتا ہے۔ فیروز مجھے اغوا کر لیتا ہے جہاں سے شمشیر مجھے نکال لیتا ہے مگر شمشیر زخمی ہو کر بے بس ہو جاتا ہے اور میں دوبارہ اغوا ہو جاتی ہوں۔ کریم اور علی میرا کھوج نکال لیتے ہیں۔ سونیا

پاکستان آچکی تھی۔ ابراہام کی ریشہ دوانیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ وہ بدلے کی آگ میں جُھلس رہا تھا۔ وہ اپنے دو آدمی احمد اور اس کے خاندان کو ختم کرنے کے لیے ہائر کرلیتا ہے۔ وہ ہر صورت نہ صرف سونیا، اس کے والد بلکہ پاکستان کو بھی شدت سے نقصان پہنچانے کے درپے تھا۔ وہ گریٹر اسرائیل کا خواب پورا کرنا چاہتا تھا۔ فیروز ایک بار پھر مجھے اغوا کرلیتا ہے۔ وہ ابراہام کو خوشخبری دیتا ہے کہ سارہ کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ میں فیروز کے ساتھ کہاں تھی، مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ ادھر پاکستان میں ابراہام کے دونوں ایجنٹ عسلی کے اسپتال پہنچ چکے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں سڑک کی جانب مڑنے والے موڑ پر مڑی اور وہیں ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

منظر یکلخت تبدیل ہوگیا تھا۔ چند قدم پیچھے خاموشی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقت تھما ہوا ہو، زندگی ایٹ ایز پر پیر پسارے کھڑی ہو اور تھوڑا آگے بڑھتے ہی سب کچھ گویا ''ہوشیار'' کی صدا کے ساتھ چل پڑا ہو۔ اس طرف زندگی پورے زور وشور سے رواں دواں تھی۔ سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں، عمارتوں پر موجود جگمگاتے سائن بورڈ، دکانوں اور لوگوں کی آمدورفت نے جادوئی انداز میں سب کچھ بدل ڈالا تھا۔

میں نے گہری سانس لی، شال کو اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹا، موسم خاصا سرد تھا۔ اندر کمرے میں اس کا اتنا اندازہ نہیں ہو پایا تھا۔ شکر ہے کہ میں شال ساتھ لے آئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا..... وہاں وہی خاموشی اور نیم اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ کہیں کوئی ہلچل نہیں تھی۔ یقیناً ابھی تک کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو پایا تھا اور اس سے قبل کہ اس مکان میں موجود لوگوں کو حقیقت کا ادراک ہو پاتا، مجھے اس بھیڑ میں گم ہوجانا تھا۔ میں نے تیزی سے قدم بڑھائے اور سڑک عبور کرکے دوسری جانب آگئی۔ یہاں ایک بڑا مال موجود تھا جہاں لوگ آ اور جارہے تھے۔ اس کے اردگرد کھانے پینے کی بہت سی دکانیں اور ریسٹورنٹس تھے۔ گویا یہ ایک پُررونق فوڈ اسٹریٹ تھی۔ چھوٹے ریسٹورنٹ سے لے کر فوڈ کورٹس پر مختلف کھانے فروخت کیے جارہے تھے۔ مختلف اشتہا انگیز خوشبوؤں نے میری بھوک کو جگا دیا مگر میں اس وقت وہاں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ کچھ آگے چل کر مجھے پیلی رنگ کی شاندار کار نظر آئی جس پر ٹیکسی کا ٹیگ موجود تھا، میں اس کی جانب بڑھ گئی۔

''کہاں جائیں گی میڈم.....؟'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ادھیڑ عمر ٹیکسی ڈرائیور نے میرے اندر بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

اس کے سوال نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں کیا بتاتی کہ مجھے کہاں جانا ہے جبکہ مجھے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں؟ اور یہ کون سی جگہ ہے؟ علاقے، عمارات اور لوگوں کو دیکھنے سے یہ اندازہ تو ہو رہا تھا کہ میں اپنے ملک سے بہرحال باہر ہوں مگر کہاں؟ یہ ابھی تک ایک سوال تھا اور ظاہر ہے کہ میں یہ بات کسی سے براہِ راست پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے ٹیکسی کے شیشے سے باہر دیکھا۔ وہاں .... کہیں بھی ایسا کوئی بورڈ نظر نہیں آرہا تھا جس پر علاقے کا نام تحریر ہو۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں اور علی کسی کام سے اندرونِ شہر کے کسی بازار میں گئے تھے وہاں پر دکان پر پورا ایڈریس موجود تھا جسے دیکھ کر ہم ہنسے بھی تھے۔

''بھئی واہ..... یہ درست ہے عین اس جگہ کھڑے ہیں اور مکمل پتا بھی لکھ رکھا ہے۔'' علی نے کہا تھا۔

''تو اس میں کیا غلط ہے، گھروں پر بھی تو ان کا نمبر، پتا سب لکھا ہوتا ہے اکثر جگہ.....'' میں نے اسے ٹوکا۔

''بھئی وہ تو اس کی شناخت کے لیے ہوتا ہے نا یا پر یہاں دکان کا نام موجود ہے اس کام کے لیے.....''

''پھر بھی میں تو سمجھتی ہوں اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

''حرج یہ ہے کہ بورڈ کتاب بن جاتا ہے۔'' وہ ہنسا تھا۔ ''اور اصل نام جو کہ اس کا برانڈ ہے، چھوٹا کرنا پڑتا ہے جگہ تو مختصر ہی ہوتی ہے نا.....''

یہاں اس علاقے میں جہاں میں اس وقت موجود تھی بہت ساری دکانیں موجود تھیں جن پر روشنیوں والے بورڈ یعنی نیون سائنز موجود تھے مگر ان میں سے کسی پر بھی علاقے کا نام تحریر نہیں تھا۔ شاید وہ سب بھی علی کے فلسفے کے قائل تھے۔

''جی میڈم آپ نے بتایا نہیں..... کہاں جانا ہے.....؟'' ڈرائیور کی آواز مجھے یادوں سے حال میں لے آئی۔

''مجھے کسی ہوٹل جانا ہے جہاں میں قیام کرسکوں۔'' بالآخر میں نے کہا۔

''بہتر..... یہاں اچھے ہوٹل بھی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ مہنگے والے اور مناسب کرائے میں... اچھی رہائش گاہ بھی مل سکتی ہے بس شوشا کم ہوگی..... آپ کیا کرنا چاہیں

pklibrary.com

گی؟'' اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''مناسب کرائے والی جگہ.....'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

''ٹھیک ہے پھر دو تین موٹیل قریب ہیں وہاں آپ کو اچھا، صاف ستھرا کمرا اور گرم پانی بھی ملے گا۔'' اس نے کہا۔

''شکریہ.....'' میں مسکرائی۔ ''اگر تھوڑا دور بھی ہوں تو کوئی حرج نہیں بلکہ وہ زیادہ بہتر رہے گا۔'' میرے جواب کے ساتھ ہی اس نے تیزی سے کار کو آگے بڑھایا۔

''میڈم آپ کا سامان وغیرہ.....'' ڈرائیور کو غالباً باتوں کا شوق تھا۔

''اصل میں صرف ایک دن کے لیے آئی تھی تو کچھ خاص ساتھ نہیں ہے۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔

''اوکے..... اوکے.....'' اس نے جواب میں سر ہلایا۔ میرے لہجے سے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ دس منٹ بعد ایک درمیانے سائز کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے، یہ غالباً پارکنگ وغیرہ تھی جہاں اس وقت کئی گاڑیاں موجود تھیں۔ گاڑیوں کے سامنے سے گزر کر اس نے ہوٹل کے دروازے پر ٹیکسی روک دی اور میرے باہر اترتے ہی وہ بھی سیدھا آگے بڑھ گیا تھا۔ میرے سامنے ایک دو منزلہ عمارت تھی جس پر اینی اینڈ تھامسن موٹیل کا بورڈ موجود تھا۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر عمارت میں داخل ہوگئی۔ اندر داخل ہوتے ہی ریسیپشن نظر آگیا تھا جس کے اردگرد کچھ صوفے وغیرہ موجود تھے۔ ریسیپشن پر بھی ایک نوجوان لڑکا موجود تھا۔

''جی میڈم ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟'' مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''مجھے ایک کمرا درکار تھا۔''

''مل جائے گا..... سنگل یا ڈبل؟'' اس نے پوچھا۔

''سنگل.....'' میں نے جواب دیا۔

''جی بالکل مل جائے گا، اس کے پرڈے چارجز 90 ڈالر ہوں گے آپ کتنی راتوں کی بکنگ چاہتی ہیں؟''

''فی الحال دو دن۔'' میں نے جواب دیا اور پھر کندھے پر موجود بیگ میں سے رقم نکال کر اس کی جانب بڑھا دی۔

''بہتر..... میڈم آپ کا سامان؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ایک روز کے لیے آئی تھی کام باقی رہ گیا اس لیے رکنا پڑ رہا ہے۔'' میں مسکرائی۔ ''سامان آجائے گا کل تک.....''

''اوکے..... یہ آپ کے کمرے کی چابی ہے۔'' اس نے ایک کارڈ میری جانب بڑھایا۔ ''آپ کے روم میں بنیادی ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ باتھ روم میں گرم پانی ہے۔ وائی فائی کی سہولت بھی مفت دستیاب ہے جس کا پاس ورڈ بھی کمرے میں موجود میز پر آپ کو مل جائے گا۔ اگر آپ کو کچھ بھی مزید درکار ہو تو مجھے بتائیے گا۔ صبح کا ناشتا کرائے کے ساتھ فری دستیاب ہے البتہ کھانے کے پیسے آپ کو دینا ہوں گے یعنی آپ کے بل میں شامل ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، مجھے کچھ درکار ہوگا تو میں کال کر لوں گی۔'' میں نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

''آپ کا کمرا دوسری منزل پر ہے۔'' اس نے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا، بالآخر میرے پاس سر چھپانے کے لیے جگہ دستیاب ہوگئی تھی۔ کمرے میں پہنچنے کے بعد مجھے شال کی خاص ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے اسے اتار دیا۔ اس کے بعد میں نے سائڈ ٹیبل پر موجود کانٹیکٹ لسٹ کو دیکھا جس میں ریسیپشن، روم سروس وغیرہ کے ایکسٹینشن نمبر موجود تھے اسی پر وائی فائی کا پاس ورڈ بھی تھا۔ میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا۔ وائی فائی کنکٹ ہوتے ہی فون جیسے زندہ ہوگیا تھا۔ وائی فائی نہ ہونے کی وجہ سے میں کئی بار خیال آنے کے باوجود کریم سے رابطہ نہیں کر پائی تھی۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہ جس کا یہ فون تھا یقیناً اسے اب تک اس کی گمشدگی کا علم ہو چکا ہوگا، اس کے بعد فون بند ہو جانا قدرتی بات ہوتی مگر شکر یہ تھا کہ فون اب بھی آن تھا۔ میں نے پہلے کریم کو واٹس ایپ کال کرنے کے بارے میں سوچا پھر اس سے بھی سیل فون میں موجود گوگل میپ کا بٹن دبایا۔ سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر میں تھی کہاں؟ گوگل میپ پر اپنی لوکیشن دیکھ کر اور اس کے بارے میں پڑھ کر میں ایک منٹ کے لیے دم خود بخود رہ گئی تھی۔ یہ تو میں سمجھ گئی تھی کہ میں اپنے ملک یا شہر میں نہیں ہوں مگر اس قدر دور پہنچ جانے کا اندازہ یا خیال بھی میرے ذہن میں نہیں آپایا تھا۔ گوگل میپ کے مطابق میں اس وقت ہیرس برگ امریکی ریاست جو پنسلوانیا کا دارالخلافہ تھا۔ یعنی میں امریکا میں تھی اور نیویارک سے صرف تین گھنٹے کی مسافت پر موجود تھی۔ نہ جانے مجھے کیوں یقین نہیں آرہا تھا کہ فیروز میرے ہوش میں نہ ہونے کے باوجود یہاں تک لے آیا تھا۔

میں نے فون اٹھا کر ریسپشنسٹ کا نمبر ملایا۔

pklibrary.com

''جی سر.....'' دوسری جانب سے مؤدب آواز گونجی۔
''مجھے سٹی میپ اور ٹور کے حوالے سے تفصیلات درکار ہیں کیا آپ مدد کر سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''اوکے میم..... میں ابھی بھجوا رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔
''ہمارا یہ ہوٹل ہیرس برگ میں کہاں واقع ہے؟'' میں نے پوچھ ہی لیا۔
''ہم لوگ کنڈل روڈ پر ہیں میڈم.....'' اس نے فوراً جواب دیا۔
''ٹھیک ہے پلیز آپ مجھے میپ اور ٹور کی تفصیلات بھجوا دیجیے گا۔'' میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔
''یعنی میں واقعی یہاں ہوں۔'' میں نے سوچا۔ میرے پاس کسی قسم کے کوئی کاغذات یا شناختی کارڈ یا پاسپورٹ موجود نہیں تھے۔ میں یہاں تک کیسے پہنچی، یہ ایک سوال تھا مگر اب میں کیا کروں گی، یہ اس سے بڑا اور اہم سوال تھا۔ ایک دو لمحوں تک سوچنے کے بعد میں نے کریم کا نمبر ملایا۔ کال دوسری گھنٹی پر ریسیو ہو گئی تھی۔
''ہیلو سارہ.....'' دوسری جانب سے کریم کی آواز سنائی دی۔ ''یہ تم ہو نا؟ میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔''
''ہاں کریم، میں ہی ہوں۔'' اس کی آواز میں موجود بے تابی مجھے اچھی لگی تھی۔
''کہاں ہو تم؟ کیا کچھ اندازہ ہو پایا؟ کیسی ہو؟ مجھے تھوڑی سی معلومات دو تاکہ میں وہاں پہنچ سکوں اور اس فیروز کو سبق سکھا سکوں۔'' وہ بولا۔
''اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔'' میں نے جواب دیا۔
''کس چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی؟ میرے آنے کی یا فیروز کو سبق سکھانے کی؟'' اس نے پوچھا۔ ''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟''
''کریم یہاں بہت کچھ ہو چکا ہے، فیروز مر چکا ہے اور میں اس کی قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو چکی ہوں۔'' میں نے مختصر الفاظ میں اسے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔
''خس کم جہاں پاک.....'' کریم بولا۔ ''مجھے ساری عمر اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں اس سے دو دو ہاتھ نہیں کر پایا..... تم اس وقت کہاں ہو؟''
''امریکا میں، پنسلوانیا کے شہر ہیرس برگ میں ہوں کریم..... مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھے یہاں کیسے لے آیا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔
''اوہ.....'' کریم ایک لمحے کو خاموش ہو گیا پھر بولا۔ ''چلو اچھا ہے کہ تم وہاں ہو، ہیرس برگ نیویارک سے زیادہ دور نہیں ہے، ہم سب بھی وہیں آ رہے ہیں۔''
''اچھا.....'' میں نے جواب دیا۔ میرے ذہن میں ابراہام اور سارے معاملات گھوم رہے تھے۔
''مجھے بس یہ افسوس ہو رہا ہے کہ میں فوراً بابا سے نہیں مل پاؤں گی..... دوسری بات یہ ہے کہ میرے پاس کسی قسم کے شناختی کاغذات نہیں ہیں، ان کے بغیر یہاں رہنا تھوڑا مشکل ہو گا۔''
''میں سمجھ رہا ہوں تم مجھے پورا پتا بتا دو، میں تمہارے اردگرد اپنے کسی دوست یا ساتھی کو ڈھونڈتا ہوں، وہ وہاں تمام معاملات میں تمہاری مدد کر پائے گا۔ تم زیادہ وقت کمرے میں ہی رہنے کی کوشش کرو، خود کو بالکل لو پروفائل میں رکھو، کسی کی نظر میں آنے سے بچنا ہو گا۔ میں جلد سے جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔''
''میں ایسا ہی کرنے کی کوشش کروں گی یوں بھی فیروز کے مارے جانے سے کیا اثرات سامنے آتے ہیں، یہ ابھی مجھے بھی معلوم نہیں ہے، میں نے یہ فون وہاں چرایا تھا۔ یہ اب تک چل رہا ہے مگر کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ کب بند ہو جائے۔''
''میں ابھی کچھ نہ کچھ سہولیات کا انتظام کرتا ہوں، تم بالکل پریشان نہ ہو سارہ، تم مل گئی ہو تو اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''
''مجھے بابا اور باقی سب سے بھی بات کرنا ہے۔'' میں نے بچوں کی طرح کہا۔
''وہ بھی ہو جائے گا سب سے پہلے میں تمہارے لیے محفوظ رہائش اور مدد کا انتظام کر لوں۔ اب تم وہیں سے ہمارے ساتھ شامل ہو پاؤ گی..... بابا کا نمبر بدل گیا ہے، میں تمہیں وہ نمبر بھیج دوں گا تم ان سے بات کر لینا، انہیں اچھا لگے گا۔''
''ضرور..... اور ہاں ابراہام کے خلاف پہلا سپاہی یہاں پہنچ گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''پریشان مت ہونا سارہ.....'' کریم نے کہا اور اللہ حافظ کے بعد فون بند ہو گیا۔ میں چند لمحے فون کی طرف دیکھتی رہی پھر میں نے اسے بیڈ سائڈ پر رکھ دیا۔

☆☆☆

لاوی کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا، اسے اب تک یقین

pklibrary.com

نہیں آرہا تھا کہ نوم اس طرح مر بھی سکتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ لوگوں میں موت بانٹنے والوں کو اپنی موت دور یا ناممکن سی لگتی ہے اور یوں اس گمان میں وہ ہر حد سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ ان دونوں نے فوج کی ملازمت کے دوران اور اس کے بعد بے شمار ''پروجیکٹ'' ساتھ کیے تھے۔ درجنوں بے گناہ فلسطینیوں کے خون سے ان کے ہاتھ رنگے ہوئے تھے اور اب تو وہ اپنے ''کلائنٹ'' کے لیے یہی کام برسوں سے سرانجام دے رہے تھے۔ لاوی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس قدر خطرناک کاموں سے زندہ سلامت بچ نکلنے والے نوم کو اس طرح اس ترقی پذیر جگہ پر جہاں جدید ہتھیار بھی اس طرح موجود نہیں تھے، ایک عام سے اسپتال کی سیکیورٹی نے انجام تک پہنچا دیا تھا۔ نوم کو مرے ایک دن گزر گیا تھا۔ گزشتہ رات شفیق افتخار کے اسٹاف نے اسے نیند کی گولیاں فراہم کردی تھیں جس کی وجہ سے وہ بمشکل نیند لے پایا تھا۔ اب اس کے سامنے دو راستے تھے۔ وہ یہاں رک کر مشن کو پورا کرنے کی کوشش کرے یا اگلی فلائٹ سے واپس لوٹ جائے۔ وہ جانتا تھا کہ ابراہام اس بات پر بہت مسئلہ کھڑا کرسکتا تھا مگر اس کے پاس بہت پیسا تھا۔ وہ ابراہام کی دی ہوئی رقم بہ آسانی لوٹا سکتا تھا۔ وہ مسلسل سوچوں میں گم تھا اور بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ ہی گیا۔

اسے واپس جانا تھا مگر اس سے قبل اسے نوم کا انتقام ضرور لینا تھا۔ وہ ان سب کو اس طرح آسانی سے معاف نہیں کرسکتا تھا۔ مسئلہ ابراہام یا مشن کا نہیں تھا اب یہ اس کے ذاتی بدلے کی بات تھی۔

وہ اس اسپتال کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر ایسا ہوگیا تو یقیناً لاتعداد افراد بھی جاں بحق ہوں گے اور اس شخص احمد کے بیٹے اور خاندان کا بھاری نقصان ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس دوران وہ سامنے بھی آجائے اگر ایسا ہوا تو پھر اسے ابراہام کی رقم بھی واپس نہیں کرنی پڑے گی۔ اس نے اپنے ہی آئیڈیے پر خود کو شاباش دی اور کمرے میں موجود کالنگ بیل کو دبایا۔ دو لمحوں بعد ہی دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔

''جی سر.....'' وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اگرچہ وہ اچھے لباس میں ملبوس تھا، الفاظ اور باڈی لینگویج کے حوالے سے مؤدب بھی لگ رہا تھا مگر اس کے چہرے پر موجود چاقو کے نشانات اور آنکھیں اس کے اصل رجحان کا پتا دے رہی تھیں۔

''کیا شفیق افتخار یہاں موجود ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں سر، صاحب تھوڑی دیر میں آئیں گے۔''

''ٹھیک ہے، وہ جب بھی آئیں انہیں بتا دیں کہ میں ان سے ملنا چاہ رہا ہوں۔'' لاوی نے کہا۔

''ٹھیک ہے سر..... آپ کو کچھ اور درکار ہے؟''

''نہیں.....'' اس نے خشک لہجے میں کہا۔

''اوکے سر میں باہر ہوں، آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ضرور بتایئے گا۔'' وہ یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

لاوی اس کے جانے کے بعد ایک لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے موبائل ... نکالا اور نمبر ملایا۔

''جی لاوی صاحب.....'' دوسری جانب سے پہلی گھنٹی کے بعد ہی شفیق افتخار کی بھاری آواز سنائی دی۔

''شفیق کیا آپ اس طرف آرہے ہیں؟'' لاوی نے پوچھا۔

''جی ہاں، مجھے ایک گھنٹا لگ سکتا ہے۔''

''اوکے میں آپ کا منتظر ہوں۔'' لاوی نے یہ کہہ کر کال کاٹ دی۔ وہ اس دوران کچھ کام نمٹا لینا چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنے سامان میں سے ڈائری اور پنسل نکالی اور اس پر کچھ تحریر کرنے لگا.....

شفیق پونے گھنٹے میں پہنچ گیا تھا۔ لاوی نے اسے اندر آتا دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''شکر ہے کہ اب آپ ٹھیک ہیں، مجھے نوم صاحب کے حادثے پر نہایت افسوس ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں یہی معلوم کروا رہا تھا کہ ان کی باڈی اس وقت کہاں ہے؟ اگر آپ چاہیں تو میں کسی اور ذریعے سے اس کے لیے کچھ کروں؟''

''نہیں..... مجھے اس کی باڈی کا کیا کرنا ہے، اصل چیز تو روح ہوتی ہے مسٹر شفیق، وہ ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ یہ سارا کھیل دوستی، محبت، نفرت، ساتھ، خیال، دشمنی سب روح کے دم سے ہیں۔ وہ ایک بار نکلی تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ مٹی کا ڈھیر.....'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''ویسے یہ میرے جملے نہیں ہیں، یہ نوم کے الفاظ ہیں، میں اتنی مشکلات اور باریکیوں میں نہیں جاتا۔'' اس نے کندھے اچکا کر کہا۔ ''مجھے نوم کی لاش نہیں چاہیے جو درکار ہے وہ اب مل نہیں سکتا مگر میں ان لوگوں کو بہت بڑا سبق دینا چاہتا ہوں، نوم میرا بڈی (دوست) تھا۔ میں اس کے قاتلوں کو ایسے تو

pklibrary.com

نہیں چھوڑ سکتا۔"

"درست کہہ رہے ہیں مگر اس کے لیے آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"تباہی اور بربادی، ہاں ان دو چیزوں کا تحفہ دینا چاہتا ہوں میں انہیں....." وہ دانت کچکچا کر بولا۔

"یعنی.....؟"

"یعنی اس اسپتال کو اُڑا دینا ہے..... اس سے ایک طرف انہیں نقصان ہوگا اور دوسری جانب ہوسکتا ہے کہ وہ بوڑھا بھی سامنے آجائے۔"

"اور اگر نہ آیا.....؟"

"نہ آیا تو ہمارے پاس اور کئی ذرائع ہیں۔" وہ شفیق کے سامنے یہ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ اب اس کا فوکس ابراہام کا مشن نہیں ہے۔ "یہ مالی و جانی نقصان انہیں بوکھلا دے گا اور یہی موقع ہوتا ہے جب بڑے سے بڑے شخص سے بھی غلطیاں ہوجاتی ہیں۔ ہم ہر ریس اپنی وجہ سے نہیں جیتتے کبھی کبھی کسی دوسرے کی غلطی ہماری فتح کا اعلان بن جاتی ہے۔"

"یہ تو آپ سو فیصد درست کہہ رہے ہیں تو اس کام کو کیسے کیا جائے گا اور اس میں، میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"میں اس اسپتال کو اُڑا دینا چاہتا ہوں، اس کے لیے مجھے بموں، دھماکا دار مواد اور کچھ کام کے لوگوں کی ضرورت پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے میں پرویز کو اس کام پر لگا دیتا ہوں، آپ کو جو سامان درکار ہے، وہی اس کا بندوبست کرے گا اور اس کے پاس چیتے قسم کے افراد کی بڑی تعداد موجود ہے۔"

"گڈ..... میں اُس سے ملنا چاہوں گا۔" وہ بولا۔

"بالکل میں بلا دیتا ہوں، میں نے اس کی ڈیوٹی آپ کے ساتھ ہی لگائی ہوئی ہے۔" وہ مسکرایا اور بیل کا بٹن دبایا، جواب میں وہ ادھیڑ عمر شخص چراغ کے جن کی صورت میں ان کے سامنے آپہنچا۔ "جی صاحب....."

"پرویز، لاوی صاحب ہمارے خاص مہمان ہیں۔ انہیں ایک خاص مشن میں تمہاری خدمت کی ضرورت ہے، اور کچھ لوگ بھی چاہئیں، اس کام کو کامیابی سے سرانجام دینا تمہارا کام ہے۔"

"جیسا آپ کا حکم سر....." وہ مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی تھی۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ سب کچھ کرلے گا؟" لاوی نے پرویز کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سو فیصد..... پرویز چراغ کا جن ہے آپ بتائیے کہ کیا کرنا ہے۔ بندے، ہتھیار سب کا بندوبست کرلیا ہے۔ بم حملوں کا خاص اسپیشلسٹ ہے یہ..... آپ کے کام میں تو یہ بہت کچھ کرسکتا ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" لاوی نے سر ہلایا اور پرویز کی جانب متوجہ ہوگیا۔ "پرویز ہمیں ایک عمارت کو اُڑانا ہے۔" اس نے جان بوجھ کر اسپتال کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

"صاحب آپ لوکیشن بتائیے تاکہ عمارت کی ریکی کرائی جاسکے۔ اس کے سائز کے مطابق کام کریں گے۔"

"بتاتا ہوں، یہ ایک اسپتال ہے شاید دو ہزار گز پر بنا ہوا ہے۔" لاوی نے گوگل پر علی کے اسپتال کا نام ڈال کر اس کی تفصیلات اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"اس میں مکمل تباہی کے لیے کم از کم چار جگہ پر مٹھائی رکھنی ہوگی....." اس نے بغور عمارت کی تصویر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"مٹھائی.....؟" لاوی نے اس کو گھورا۔

"میرا مطلب ہے کہ بم..... مختلف جگہوں پر لگانے سے زیادہ ایریا بھرپور طریقے سے کور کیا جاسکتا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ رسک فیکٹر کم ہوتا ہے۔" وہ بہت آسانی سے یوں گفتگو کررہا تھا جیسے کسی عام بزنس کے متعلق بات کررہا ہو۔ لاوی اب اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"رسک فیکٹر....." اس نے دہرایا۔

"یعنی اگر ایک جگہ بم پکڑا بھی جائے تب بھی باقی جگہ پر کام ہونے کا یقین ہوتا ہے اور پھر ہر بم کو دوسرے سے پانچ منٹ کے بعد پھٹنا چاہیے اس طرح تباہی کا دائرہ خاصا وسیع ہوجاتا ہے یعنی کام کا مزہ آتا ہے....." اس نے سفاکی سے کہا۔

"ہوں، تم کام کے آدمی ہو مگر حلیے سے ایسا نہیں لگتا کہ تم اتنے تجربہ کار ہوسکتے ہو۔"

"صاحب چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر جو نظر آرہا ہو اس پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو....." لاوی مسکرایا۔ "میرا بھی یہی تجربہ تھا۔ ہمیں اس اسپتال میں چار ڈیوٹیز رینٹ لگانے ہیں۔ باقی تفصیلات تم خود طے کرسکتے ہو۔ بس تباہی بھرپور ہونی چاہیے اور اتنے لوگ مرنے چاہئیں کہ ان کی چیخیں نکل جائیں۔"

pklibrary.com

''فکر نہ کریں ایسا ہی ہوگا..... مجھے اس کام کی تیاری کے لیے اڑتالیس گھنٹے درکار ہیں، کام کے بندوں کو میں بلا لوں گا..... آپ کا کام صرف دور سے لطف لینا ہوگا یا پھر ہمیں ہدایات جاری کرنا۔''

''یہ تو بہت مزے کی بات ہے۔ مجھے دوستوں نے بتایا تھا کہ اس طرف ہر طرح کے کاموں کے لیے لوگ مل جاتے ہیں، گھر کے کام ہوں یا باہر کے..... مددگار مل جاتے ہیں کچھ رقم کے عوض..... ہماری طرف تو سب کچھ زیادہ تر خود کرنا پڑتا ہے۔'' لاوی نے کہا۔ ''ہاں بجٹ کی تم فکر مت کرنا جو بھی خرچ ہوگا اس کے لیے رقم بتا دو میں تمہیں ادا کر دوں گا اور کام اچھا ہوا تو انعام بھی.....''

''بہت شکریہ..... پیسا خرچ ہوگا مگر کام آپ کی پسند کا ہوگا۔''

''گڈ، مجھے رقم بتاؤ۔''

''میں تھوڑی دیر میں آپ کو رپورٹ کرتا ہوں۔'' اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا اور پھر اجازت لے کر باہر نکل گیا۔

''امید ہے آپ مطمئن ہوں گے۔'' شفیق نے کہا۔

''یہ بہت تیز ہے، میرے احسانات مانتا ہے اور ہر کام کر سکتا ہے۔ آپ اس پر پورا اعتماد کر سکتے ہیں۔'' شفیق نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں چلتا ہوں، آپ کو کوئی بھی کام ہو تو کال کر دیجیے گا۔''

''شکریہ شفیق.....'' لاوی نے کہا۔ اسے اپنے آئیڈیا پر کام کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اسپتال کی انتظامیہ سے مالک کا فون نمبر حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اسی احمد کا بیٹا تھا۔ وہ اسے تباہ کرنے جا رہا تھا مگر لطف تو اس میں تھا کہ اسے بھی اس بات کا اندازہ ہو اور وہ کچھ بھی نہ کر پائے۔ اس گڑبڑاہٹ میں اس کا اصل مشن بھی پورا ہو سکتا تھا۔''

''نوم انہیں تمہارا خون بہت مہنگا پڑنے والا ہے بہت ہی زیادہ۔'' وہ بڑبڑایا۔

☆☆☆

علی کئی دنوں بعد اسپتال آیا تھا۔ یہاں کافی چیزیں اس کی منتظر تھیں۔ گزشتہ روز پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے اسپتال میں خوف و ہراس کی فضا تھی۔ ڈاکٹرز، اسٹاف اور دیگر عملہ سب ہی ڈرے ہوئے تھے۔ علی کی واپسی ان کے لیے ہمت کی نوید ثابت ہوئی تھی۔ اسے اسپتال میں موجود سیکیورٹی ٹیم سے بھی ملاقات کرنا تھی مگر اس حادثے کے معاملات اور سب سے گفتگو میں اس کے دو گھنٹے صرف ہو گئے تھے۔ اسے سب سے ہی ان دونوں کے بارے میں مختلف باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ اس روز ریسپشن پر موجود سیکیورٹی اسٹاف ممبر واپس جا چکی تھی۔ دیگر میں سے جن کا ان دونوں سے براہِ راست ٹاکرا ہوا تھا، وہ تینوں ہی جان کی بازی ہار چکے تھے۔ کریم کی جانب سے وہاں سیکیورٹی کا مزید سخت انتظام کر دیا گیا تھا۔

''یہ تمام سختی وغیرہ مریضوں کے لیے پریشان کن ثابت تو نہیں ہو رہی؟'' علی نے سیکیورٹی انچارج سے پوچھا۔

''نہیں سر، یوں تو سب کو چند سسٹمز سے گزرنا پڑتا ہی ہے کیونکہ کوئی بھی گھس بیٹھیا مریض کے روپ میں داخل ہونے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس لیے تھوڑی بہت سیکیورٹی کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ فی الحال نفری بڑھا دی گئی ہے اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ ہر وقت مگر بالخصوص او پی ڈی کے اوقات میں ہر طرف نظر رکھی جا سکے۔'' اس نے بتایا۔

''دوسرا جو سب سے اہم کام کیا جا رہا ہے وہ اسپتال میں ہر جگہ کیمروں کا سسٹم ہے جسے کنٹرول روم سے مانیٹر کیا جاتا ہے۔ کیمرے پہلے بھی موجود تھے مگر اب ہر طرف سی سی ٹی وی کیمرا لگا دیے گئے ہیں۔ انہیں خصوصی طور پر لگایا گیا ہے۔ مانیٹرنگ کا نظام بھی ایسا رکھا جا رہا ہے کہ اب اس قسم کے واقعات کا اعادہ نہ ہو سکے۔''

''ٹھیک ہے۔'' علی نے سر ہلایا۔ ''آپ لوگوں کا سارا انتظام نہایت بہترین ہے، مجھے یقین ہے کہ اب ہمیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

''امید تو یہی ہے۔'' وہ بولا۔

علی آج خلافِ معمول کافی سنجیدہ تھا۔ سب سے ملاقاتوں، رپورٹس اور دورے کے بعد وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو قدرے تھکن محسوس کر رہا تھا۔ سب کچھ بہترین نظر آ رہا تھا۔ اسپتال میں تمام کام معمول کے مطابق ہو رہا تھا مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے مگر کیا؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اسے کمرے میں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔

''ہیلو.....'' دوسری جانب اسپتال کا آپریٹر تھا۔ ''سر آپ کے لیے کال ہے۔ آپ کے کوئی پرانے دوست ہیں آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔''

''کیا نام ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''سر وہ انہوں نے نہیں بتایا کہہ رہے ہیں کہ آپ کو

pklibrary.com

سرپرائز دینا ہے..... اگر آپ کہیں تو کال ملادوں؟''

''اوکے ملادیں.....'' علی نے بے دلی سے کہا۔

''ہیلو ڈاکٹر علی احمد خان، کیسے ہیں آپ.....؟'' چند لمحوں بعد ریسیور سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''میں ٹھیک ہوں الحمدللہ آپ کون ہیں؟ میں پہچانا نہیں ہوں آپ کو؟''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ پہچانتے نہیں ہیں ہمیں.....'' دوسری طرف سے ہنستے ہوئے کہا گیا۔ اس آواز میں ایک عجیب سی مشینی کرختگی سی تھی اور لہجہ بھی نامانوس سا تھا۔

''فرمائیے کیا کہنا چاہتے ہیں اگر آپ کوئی پرانے دوست ہیں تب بھی میں آپ کو پہچان نہیں پایا اور یہاں کام کے دوران کسوٹی کھیلنا منع ہے لہٰذا بہتر ہوگا کہ آپ اپنا تعارف خود کرادیں۔'' علی نے کہا۔

''ظاہر ہے کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا ہوگا کیونکہ اس کے لیے جاننا ضروری ہوتا ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''مگر میں نے یہ فون تمہیں دو ضروری باتیں بتانے کے لیے کیا ہے۔ پہلی یہ کہ تم جس اسپتال میں اس وقت بیٹھے ہو وہ جلد ہی ہوا میں اُڑ جانے والا ہے۔''

''یہ کیا بکواس ہے۔'' علی نے بگڑ کر کہا۔

''بکواس نہیں ہے۔'' ڈاکٹر صاحب حقیقت ہے، ایسی حقیقت جو بہت جلد سب کے سامنے آجائے گی۔ میں آپ کو اس لیے آگاہ کررہا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو بچالیں خود کو.....''

''تم جو کوئی بھی ہو میرے پاس اس قسم کی فضولیات کے لیے کوئی وقت نہیں ہے۔'' علی نے سخت لہجے میں کہا۔

''کمال ہے میں تو آپ کو وقت سے پہلے خبردار کررہا ہوں اور آپ کو یہ بات فضول لگ رہی ہے ابھی تو مجھے آپ کو ایک بات اور بتانی ہے.....'' دوسری جانب سے ہنسی کی آواز کے ساتھ کہا گیا۔ ''اسپتال تو ظاہر ہے کہ آپ کے لیے اہم ہے ہی مگر آپ کی زندگی میں ایک اور اہم شخصیت بھی ہے۔''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟ آخر تم ہو کون؟''

''میرا مطلب ہے کہ آپ کے بابا، والد صاحب..... پتاشری..... اور میں کون ہوں، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔''

''آگے بولو۔'' علی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''مجھے اُن کا پتا مل گیا ہے اور میں اُن سے ملنے جارہا ہوں..... بتانا یہ تھا کہ میں اُن کی رہائش گاہ سے بہت قریب ہوں، آپ یہاں سے نکل کر وہاں پہنچنے کی کوشش کرسکتے ہیں مگر یقین کریں کہ میں آپ سے بہت پہلے پہنچ کر اپنا کام کر جاؤں گا۔''

''تم بکواس کررہے ہو، بابا محفوظ ہیں اور تم اُن تک نہیں پہنچ سکتے۔'' علی غرایا۔

''چلو یہ بھی اچھا ہے کہ آپ یہی سمجھیں۔'' وہ دھیرے سے ہنسا۔ ''مگر میں یہ کرنے جارہا ہوں..... اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ تم اسپتال کو بچاؤ گے یا اپنے باپ کو..... ویسے بچا نہیں سکو گے دونوں میں سے کسی کو بھی.....''

''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا.....'' علی نے بپھر کر کہا۔

''مت چھوڑنا، مت چھوڑنا مگر اس کے لیے مجھے پکڑنا ہوگا اور وہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔'' اس نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ ''تم بیٹھ کر سوچو کہ تمہیں کیا کرنا ہے، میں اپنا کام کرنے جارہا ہوں۔'' ان الفاظ کے ساتھ لائن کٹ گئی تھی۔

علی چند لمحے ریسیور کو گھورتا رہا پھر لائن کاٹ کر آپریٹر کا نمبر ملایا۔ ''یہ..... یہ کال کس نمبر سے آئی تھی؟''

''میں دیکھتا ہوں سر.....'' اس نے جواب دیا۔

''فوراً، ایک لمحے میں بتاؤ.....'' علی نے زور سے کہا اور میز پر رکھے موبائل کو اٹھا کر کریم کا نمبر ملایا۔

''سر..... مجھے معلوم نہیں کہ ایسا کیوں ہورہا ہے مگر نمبر ٹریس نہیں ہوسکا ہے سر..... اس کال کا نمبر ہمارے پاس نہیں ہے۔'' آپریٹر نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ علی نے خاموشی سے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ اس کی سمجھ میں لمحہ بھر کے لیے کچھ نہیں آرہا تھا۔ صرف ایک نام اس کے ذہن میں گردش کررہا تھا اور وہ تھا ابراہام، یہ جو کچھ بھی تھا، اس کے پیچھے صرف اور صرف وہی ہوسکتا تھا۔ دو دن پہلے کے وقوعے میں بھی دونوں حملہ آور بابا کا ہی پوچھتے ہوئے آئے تھے اور اب انہیں بابا کے بارے میں معلوم ہوگیا تھا، کیا وہ واقعی بابا تک پہنچ جائیں گے؟ یہ سوال اتنا روح فرسا تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ کریم کا نمبر نہیں لگا تھا ریکارڈنگ ''اس وقت رابطہ ممکن نہیں ہے'' کا اعلان کررہی تھی۔ شاید اس وقت کریم کسی ایسی جگہ پر تھا جہاں موبائل سگنلز نہیں مل رہے تھے۔ اس نے موبائل دوبارہ میز پر رکھا پھر..... اٹھا کر بابا کے پاس موجود موبائل کا نمبر ملایا۔ ان کا اپنا فون تو سارہ کی ویڈیو والے واقعے کے بعد سے کریم

pklibrary.com

کے پاس تھا۔ سیف ہاؤس میں ان کے پاس ایک موبائل موجود تھا جس پر کریم، علی اور سونیا ان سے رابطہ کر سکتے تھے۔ ان کی طبیعت کے پیشِ نظر یہ موبائل وہاں موجود ایک افسر کے پاس ہوتا تھا جو بابا سے ان کا رابطہ کرا سکتا تھا۔ علی نے ایک بار پھر کریم کا نمبر ملایا مگر وہاں ابھی تک رابطہ ممکن نہیں ہے کی ریکارڈنگ نے اس کا استقبال کیا۔ وہ بہت زیادہ اُلجھ رہا تھا۔ اس نے بالآخر بابا والے نمبر پر کال کی۔ وہ فون بند آ رہا تھا۔ علی نے مایوسی کی حالت میں موبائل میز پر پٹخ دیا۔ اسے فون پر ہونے والی گفتگو پر یقین نہیں تھا مگر جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے کسی بھی چیز کی امید کی جا سکتی تھی۔ وہ بابا کے حوالے سے کوئی بھی رسک نہیں لے سکتا تھا اور اسپتال کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا تھا، اس نے بھی علی کا دماغ اُڑا دیا تھا۔

''اسے بابا کے پاس فوری طور پر پہنچنا چاہیے۔'' اس نے سوچا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ وہاں جانا چاہ رہا تھا مگر اسے یہ بھی فکر تھی کہ اس کا کوئی جذباتی قدم بابا کے لیے پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔ یہ کوئی ٹریپ بھی ہو سکتا تھا جس کا مقصد بابا کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بھی ہو سکتا تھا۔ اسی لیے وہ سب سے پہلے کریم سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا۔

اب وہ کیا کرے..... ہاتھ پر ہاتھ دھرے رابطے کا انتظار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کا دماغ اسے سمجھا رہا تھا کہ بابا محفوظ ہاتھوں میں تھے، وہاں پہنچنا اور انہیں نقصان پہنچانا تقریباً ناممکن ہی تھا مگر پھر ذہن کی اسکرین پر کسی خطرے کے سائرن کے مانند گونجتا ابراہام کا نام اس کے دل کو پریشان کر رہا تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا..... کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

''اسے کیا کرنا چاہیے.....؟'' اس کے ذہن میں بس یہی سوال گونج رہا تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی گہری سانسیں لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پینک کی اس حالت میں کچھ بھی مثبت سوچ پانا ممکن نہیں تھا۔ موبائل کی بیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے فون کی جانب دیکھا۔ اسکرین پر کریم مسکرا رہا تھا۔ اس نے لپک کر کال ریسیو کی۔

''علی تمہاری مسڈ کالز دیکھی ابھی۔ اصل میں اندر سگنلز نہیں لگ رہے تھے۔'' کریم نے کہا۔ ''مجھے تمہیں ایک زبردست خبر دینا ہے۔''

''بھائی مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' علی اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''بابا خطرے میں ہیں اور وہاں کا فون ریسیو نہیں ہو رہا۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم علی؟'' کریم کی آواز یکلخت بلند ہو گئی تھی۔ ''وہ سیف ہاؤس میں ہیں، وہاں انہیں کوئی خطرہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم مجھے پوری بات بتاؤ کیا ہوا ہے؟ تم یہ کیوں کہہ رہے ہو؟''

''بھائی مجھے ایک فون آیا تھا جس میں اس نے کہا ہے کہ وہ بابا کے قریب ہے اور خدانخواستہ انہیں نقصان پہنچانے والا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں بابا کو بچانے نکلوں تب بھی وقت پر ان کے پاس نہیں پہنچ پاؤں گا۔'' علی نے کہا۔

''کس نے؟ کس نے کہا ہے یہ سب؟'' کریم نے پوچھا۔

''ایک فون کال آئی تھی اسپتال کے نمبر پر..... اس کا نمبر نہیں مل پایا..... اس کے مطابق وہ ہمارا اسپتال بھی اُڑانے والا ہے اور بابا تک بھی پہنچ گیا ہے۔'' علی نے جواب دیا۔

''ایک بے نامی کال.....؟'' کریم نے کہا۔ ''تم ریلیکس ہو پہلے، بابا کو کچھ نہیں ہو گا۔ میں تمہاری طرف آ رہا ہوں مگر اس سے پہلے بابا کی خیریت معلوم کر رہا ہوں..... تم کہیں نہیں جاؤ گے علی.....'' کریم نے کہا۔

''اوکے، میں انتظار کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں کال کرتا ہوں واپس۔'' کریم نے یہ کہہ کر کال بند کر دی۔

کال بند ہونے کے بعد علی کچھ لمحے سوچتا رہا پھر اس نے ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔

''یس سر.....'' دوسری جانب سے مؤدبانہ مگر الرٹ انداز میں کہا گیا۔

''شوکت صاحب آپ میرے کمرے میں تشریف لائیے۔''

''میں آ رہا ہوں.....'' جواب سن کر علی نے ریسیور رکھ دیا۔ شوکت شمس الدین اسپتال کی سیکیورٹی ٹیم کے نئے سربراہ تھے۔ ان کی تعیناتی بھی کریم ہی نے کی تھی اور وہ اس کی ایجنسی میں کام کر چکے تھے۔

''جی علی صاحب.....'' وہ چند لمحوں میں پہنچ گئے تھے۔ شوکت شمس ایک طویل القامت شخص تھے۔ مناسب جسامت اور ذہین آنکھوں کے ساتھ ایک اچھی شخصیت کے مالک تھے۔

pklibrary.com

''تشریف رکھیے.....'' علی نے کہا۔ ''مجھے آپ سے اسپتال کے حوالے سے بات کرنی ہے۔''

''جی فرمائیے.....''

''مجھے اسپتال کے حوالے سے ایک دھمکی آمیز کال آئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ اسپتال کو اُڑانے والے ہیں۔''

''کال..... آپ اجازت دیں تو میں سسٹم چیک کروں شاید ان کے ویئر اباؤٹ (اردگرد) کے بارے میں کچھ معلومات مل جائیں۔''

''میں معلوم کر چکا ہوں، نمبر نہیں آیا.....'' علی نے بتایا۔

''اسپتال میں سب کچھ کنٹرول میں ہے..... مگر میں سیکیورٹی ٹائٹ کر دیتا ہوں، اندر کسی بھی قسم کا کوئی بارودی مواد لانا ناممکن ہے..... پھر بھی ہم اس بات کو موجودہ حالات کے تناظر میں ہلکا نہیں لے سکتے۔''

''یہی میں سوچ رہا ہوں، یہ بلف بھی ہو سکتا ہے مگر کچھ نہ کچھ تو ہے ہی..... دو دن پہلے ایک بڑا واقعہ ہو چکا ہے جس میں ناقابلِ تلافی جانی نقصان ہوا ہے۔'' علی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار مکمل جائزہ لیں..... اگر ذرا بھی خطرہ محسوس ہو تو اسپتال کو فوری طور پر خالی کروا دیا جائے۔''

''مگر اس سے اسپتال کے نام اور ساکھ پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ دو روز قبل یہاں ایک بڑا واقعہ ہو چکا ہے۔''

''نام اور ساکھ کسی بھی زندگی سے اہم نہیں ہیں شوکت صاحب.....''

''آپ کی بات درست ہے..... میں سب کو الرٹ کرتا ہوں، سیکیورٹی بڑھاتا ہوں اور پورا چیک آؤٹ کر کے آپ کو رپورٹ کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کہیں بھی کچھ مسئلہ ہوا تو ٹریس ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کنٹرول روم کو بھی الرٹ کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے آپ جو مناسب سمجھیں، وہ کریں۔'' علی نے کہا۔

شوکت شمس دروازے کی جانب بڑھا۔ اتنی دیر میں علی کا فون بج اٹھا تھا۔

''جی بھائی.....'' علی نے بے تابی سے فون اٹھایا۔

''علی مطمئن رہو، بابا بالکل خیریت سے ہیں اور بالکل محفوظ ہیں۔'' کریم نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

''شکر الحمدللہ.....'' علی نے گہری سانس لی۔

''بابا سو رہے تھے اور ان کا فون بند تھا۔ میں نے اکبر سے بات کر لی ہے میری اجازت کے بغیر وہ کسی کو بابا سے فون پر بھی بات کرنے نہیں دیں گے۔ یوں بھی کسی کا ان تک پہنچنا ممکن نہیں ہے مگر معاملہ صرف یہ نہیں ہے..... ہمارا یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ تمہیں یہ کال کس نے کی؟ اس کا مقصد آخر کیا تھا؟ اور وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے؟''

''شاید وہ یہ چاہ رہا ہو کہ میں گھبرا کر اسپتال سے باہر نکلوں اور بابا کے پاس پہنچوں۔''

''ہاں یہ ہو سکتا ہے۔'' کریم نے کہا۔ ''بابا کے نام کا مسلسل استعمال یہ بتا رہا ہے کہ یہ سب ابراہام کے اشارے پر ہی ہو رہا ہے۔ چونکہ اسے بابا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو پا رہا اس لیے وہ یہ سارے طریقے آزما رہا ہے۔''

''جی ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔'' علی نے جواب دیا۔ ''اسپتال کے حوالے سے میں نے شوکت شمس کو بریف کر دیا ہے وہ چیزوں کو دیکھ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں۔ تم پریشان مت ہو.....'' کریم نے کہا۔

''نہیں اب میں بہت بہتر ہوں، نہ جانے کیوں میں بابا کے حوالے سے ڈر گیا تھا ورنہ آپ کو پتا ہے کہ میں چھوٹا سا ایک لڑکا ہوں پر کام کرتا ہوں بڑے بڑے۔''

''بالکل معلوم ہے اور تم اپنے انداز میں ہی جچتے ہو، اداسی بالکل اچھی نہیں لگتی تم پر۔'' کریم نے جواب دیا۔ ''ویسے مجھے بھی تمہیں کچھ بتانا تھا مگر اب وہ بات سب کے سامنے کریں گے۔''

''کیا بات؟'' علی نے پوچھا۔

''شام کو گھر پر بات ہو گی۔ میں کچھ دیر میں پہنچتا ہوں پھر دیکھتے ہیں کہ ہمیں مزید کیا اقدامات لینے چاہئیں۔''

''ٹھیک ہے بھائی۔'' علی نے جواب دیا اور فون بند ہو گیا۔ علی نے کرسی کی پشت پر سر رکھ کر ایک لمحے کو آنکھیں بند کر لیں۔ وہ آواز اب تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس میں کچھ نہ کچھ بہت عجیب تھا مگر وہ کیا تھا، یہ وہ اب تک نہیں سمجھ پایا تھا۔

☆☆☆

سونیا صبح دیر سے سو کر اٹھی تھی۔ اس نے معمول کے مطابق ناشتا کرتے ہوئے بابا سے دس پندرہ منٹ بات کی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ گفتگو بابا کو دن پھر مطمئن رکھتی تھی اور اسے خود بھی ان کی جانب سے اطمینان رہتا تھا۔ اس کے بعد کافی

pklibrary.com

لے کر کنٹرول روم میں آ گئی۔ اردگرد کے مکمل جائزے کے بعد اس نے کافی کا سپ لیا۔ گھر میں آج اماں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ کریم کی اجازت ملنے کے بعد شمشیر اپنے کچھ معاملات سلجھانے کے لیے ہیڈ آفس گیا تھا۔ شمع اپنی ڈیوٹی پر تھی۔ علی اسپتال گیا تھا جبکہ کریم معمول کے مطابق دفتر میں تھا۔ گزشتہ چند ماہ میں اس کی زندگی ہی بدل گئی تھی مگر مزے کی بات یہ تھی کہ اسے یہ تبدیلی اچھی لگ رہی تھی۔ کہاں شوٹنگ، مارشل آرٹ اور مختلف پروجیکٹس پر کام کے بغیر اس کے لیے زندگی کا تصور ہی نہیں تھا۔ بابا کے مل جانے اور حقیقت سے آگاہی نے اس کے وجود میں بڑھتی تکلیف دہ آگ کو سرد کر دیا تھا مگر ساتھ ہی ابراہام سے نفرت میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اسے فوراً ختم کر ڈالتی مگر وہ جانتی تھی کہ یہ آسان کام نہیں تھا۔ وہ بہت چالاک تھا، اپنی حفاظت کا پورا خیال رکھتا تھا۔ اتنا سفاک تھا کہ اس کے لیے خود اپنی ذات کے آگے کسی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ بابا کی فون کالز میں اس کے منہ سے اپنی نانی اور ماموں کے قتل کی لرزہ خیز کہانی سن چکی تھی۔ خود اس کی ماں اس کی بربریت کا نشانہ بنی تھی۔ ماں کا خیال آتے ہی اس کا دل غم و غصے سے بھر گیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی ایک بار پھر باہر کا جائزہ لیا اور نیچے کا رخ کیا۔ اسے آج کچھ ضروری کام ختم کرنے تھے جو ان لوگوں اور ابراہام کے خاتمے کے مشن میں ان کی مدد کر سکتے تھے۔ وہ نیچے لاؤنج میں پہنچی تو اس کے کانوں میں عجیب سی گھٹی گھٹی آواز آئی۔ وہ آواز سن کر ٹھٹک کر رک گئی۔

''اوہ..... آہ.....'' آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔

''کون ہے وہاں؟ کیا ہوا ہے؟'' وہ آواز کی سمت آگے بڑھی، کچن کے سامنے پہنچ کر وہ ساکت رہ گئی۔

اماں کچن کے درمیان گری ہوئی تھیں۔ ''ارے..... کیا ہو گیا آپ کو.....؟'' وہ لپک کر ان کی جانب بڑھی۔

''مم..... میری طبیعت خراب ہو گئی ہے.....'' وہ بمشکل بولیں۔

''کیا ہوا ہے؟ کیا آپ کی کوئی دوا ہے؟ کہاں رکھی ہے؟'' وہ انہیں اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''دوا..... دوا ختم ہو گئی ہے..... میں نے سوچا تھا کہ شام کو منگوا لوں گی۔'' وہ مشکل سے بات کر پا رہی تھیں۔ سونیا انہیں سہارا دے کر صوفے تک لے آئی اور انہیں اس پر لٹا دیا۔

''کون سی دوا ہے اماں؟'' اس نے انہیں پانی کا گلاس دیتے ہوئے پوچھا۔

''شوگر کی دوا ہے.....'' انہوں نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں ایک بوتل موجود تھی۔

''اوہ اچھا..... میں لے آتی ہوں آپ کے لیے.....''

''نن، نہیں..... میں ٹھیک ہو جاؤں گی ابھی۔'' وہ غنودہ سے لہجے میں بولیں۔

''آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے، سامنے روڈ پر تو میڈیکل اسٹور ہے وہاں سے لے آتی ہوں۔'' سونیا بوتل اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''بس آپ اپنا خیال رکھیے اور میرے آنے تک یہاں سے اٹھیے گا مت..... سمجھ رہی ہیں نا..... اگر دوبارہ گر پڑیں اور زیادہ چوٹ لگ گئی تو کیا کریں گے۔''

''اچھا.....'' انہوں نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

سونیا نے اوپر جا کر اپنا بیگ اٹھایا۔ بیڈ سائڈ کھول کر پیسے نکالے دراز میں سامنے ہی اس کا گلوک ریوالور موجود تھا۔ اس نے نہ جانے کیا سوچ کر اسے بھی بیگ میں ڈالا اور تیزی سے نیچے اتری۔ اس وقت گھر میں کوئی گاڑی بھی موجود نہیں تھی۔ وہ دروازے کو تھوڑا سا کھلا چھوڑ کر باہر نکلی اور تیزی سے سڑک کی جانب بڑھی۔ میڈیکل اسٹور تھوڑا سا آگے تھا مگر اس کے لیے یہاں سوسائٹی کے اندر سواری ملنا مشکل تھا۔ باہر نکلنے کے بعد تو پھر اسٹور کچھ دور ہی تھا۔ وہ سڑک کے قریب پہنچی تو کئی رکشے اس کے قریب سے گزرے، اس نے پہلے پیدل جانے کا فیصلہ کیا تھا مگر پھر اماں کے خیال سے وہ ایک رکشے میں بیٹھ گئی۔ سڑک کے دوسری جانب جانے کے لیے انہیں آگے چورنگی سے مڑ کر واپس آنا تھا۔ رکشے میں بیٹھنے کے بعد اس نے شمع کو فون کرنے کا ارادہ کیا اور پھر فوراً ہی رد بھی کر دیا۔ اس نے اسے دوا لے کر گھر پہنچنے کے بعد اطلاع دینے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت اسے پریشان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''جلدی چلیے بھائی صاحب! مجھے دوا لے کر فوراً گھر پہنچنا ہے۔'' اس نے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں باجی.....'' رکشے والے نے تابعداری سے کہا اور رکشا آگے بڑھا دیا۔

☆☆☆

لاوی اس وقت بہت خوش تھا۔

پرویز اُس کی سوچ سے زیادہ ہنرمند ثابت ہوا تھا۔ اس نے چوبیس گھنٹوں میں ہی سارا انتظام کر دیا تھا۔ اب

بس اس سب کو اسپتال پہنچانا تھا اور اس کے بعد اس کا کام ہو جاتا، وہ مسکرایا۔ اس سب کے ساتھ ساتھ آج اس کی علی سے فون پر بات بھی ہو گئی تھی اس نے معلومات کے لیے فون کیا تھا مگر علی اسپتال میں موجود تھا اور جس طرح وہ چیخ رہا تھا، اس نے لاوی کا دل خوش کر دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جلد ہی بڈھے کا پتا معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس کے بعد ان کا مشن مکمل کرنا آسان ہو جائے گا۔ اسپتال کی تباہی تو اس کی جانب سے نوم کے لیے تحفہ تھی۔ اس کی نظر میں وہ سب اس سے بھی بڑی سزا کے حق دار تھے۔ وہ اس وقت سڑک پر تھا۔ پرویز کار چلا رہا تھا۔

''تم ان چیزوں کو اسپتال میں کیسے لے کر جاؤ گے؟''

''.... اس نے پوچھا۔ ''کچھ نہ کچھ ہو جائے گا صاحب..... کسی بیمار کے ساتھ مٹھائی اندر جائے گی۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''وہاں سیکیورٹی کا کافی انتظام ہے حالانکہ اسپتالوں میں عموماً ایسا ہوتا نہیں ہے۔'' لاوی نے بتایا۔

''جی صاحب..... کل ایک بیمار عورت کو اسپتال لے کے جائیں گے ریکی کے لیے..... سب اندازہ ہو جائے گا اس کے بعد اصل کام کریں گے۔''

''گڈ..... اور تب تک وہ سب خوف میں لرزتے رہیں گے۔'' لاوی بولا۔

''ایسا ہی ہے صاحب..... آپ کا فون انہیں رات بھر سونے نہیں دے گا۔''

''ایک منٹ.....'' لاوی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اچانک بولا۔

''جی صاحب.....'' پرویز نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

''گاڑی روکو پرویز.....'' لاوی نے غرا کر کہا۔

''جج، جی.....'' پرویز نے گاڑی کو سائڈ پر لے جا کر روک دیا۔

لاوی کی نگاہیں سامنے موجود بڑے سے میڈیکل اسٹور کے سامنے رکے رکشے سے اترتی لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے فوراً اپنے موبائل کو جیب سے نکال کر آن کیا۔ چند لمحوں بعد وہ تصویر اس کے سامنے تھی۔ اس نے تصویر پر نظر جمائی اور پھر اس لڑکی کی جانب دیکھا جو اب میڈیکل اسٹور کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا مگر یہ وہی تھی۔ ابراہام کی نواسی..... ان کا شکار..... کامیابی گویا خود چل کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔

''پرویز ہمیں اس لڑکی کو غائب کرنا ہے۔'' وہ بولا۔

''صاحب.....''

''پرویز یہ ہاتھ سے نہیں نکلنی چاہیے۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ہمارا پہلا مشن ہے اور ہمارے دشمنوں کے لیے اس پورے اسپتال کی تباہی سے زیادہ تکلیف دہ سزا ہو سکتی ہے۔'' وہ بولا۔ ''تم گاڑی اسٹارٹ رکھو، میں ابھی آ رہا ہوں۔'' لاوی نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے صاحب.....'' پرویز نے سر ہلایا۔

''آپ کہیں تو میں.....''

''نو..... تمہیں وہی کرنا ہے جو تمہیں کہا گیا ہے۔'' لاوی نے سرد لہجے میں کہا اور میڈیکل اسٹور کی جانب بڑھ گیا۔

سونیا اتنی دیر میں دوا خرید چکی تھی اور واپسی کے لیے مڑی ہی تھی کہ لاوی اس سے ٹکرا گیا۔ سونیا نے سنبھلنے کی پوری کوشش کی مگر ٹکر اچانک اور زوردار تھی۔ وہ کوشش کے باوجود توازن قائم نہیں رکھ پائی۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پر جا گرتی، لاوی نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر تھا جبکہ دوسرا اس کے بازو کو تھامے ہوئے تھا۔

سونیا نے اس کے ہاتھ کو جھٹکنے کی کوشش کی مگر اسی دوران لاوی کا ہاتھ اس کے کندھے سے پھسل کر گردن تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے گردن کے نیچے موجود مخصوص رگ کو طاقت سے دبایا۔ لمحے بھر میں سونیا کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ اس نے دوسرے ہاتھ کو بلند کر کے لاوی کو دھکا دینے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پائی۔ اس کے ہاتھ میں موجود دوا کی بوتل چھوٹ کر زمین پر جا گری۔ سونیا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اس نے حواس قائم رکھنے کی آخری کوشش کی جس میں ناکامی کے بعد وہ کٹی پتنگ کے مانند زمین کی جانب بڑھی۔ لاوی نے اسے سنبھال لیا تھا۔

''ارے..... ارے کیا ہو گیا؟ طبیعت خراب ہو گئی ہے شاید.....'' وہ زور سے بولا اور اسے سہارا دے کر گاڑی کے قریب لے گیا۔

''سر باجی کو کیا ہوا.....؟'' رکشے والا رکشے سے نیچے اتر آیا تھا۔

''طبیعت خراب ہو گئی ہے گھر لے جا رہے ہیں۔'' پرویز نے جواب دیا۔

''مگر میں باجی کو لایا تھا، مجھے کرایہ نہیں ملا.....'' وہ

pklibrary.com

مشکوک انداز میں انہیں گھورتے ہوئے بولا۔

''کتنا کرایہ ہے تمہارا.....؟'' پرویز نے پوچھا۔

لاوی نے اس دوران سونیا کو پچھلی نشست پر لٹا کر بیلٹ لگا دی تھی۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے دروازہ بند کیا اور رکشے والے کی جانب مڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، پرویز نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر رکشے والے کی جانب بڑھا دیا۔ وہ نوٹ لے کر خوشی سے واپس مڑ گیا تھا۔ اس دوران لاوی اگلی نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ میڈیکل اسٹور والے ان کی جانب ہی دیکھ رہے تھے۔ لاوی کے بیٹھتے ہی پرویز نے چابی گھمائی اور کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

شمع کو آج کچھ ہی دیر کا کام تھا اس لیے وہ لنچ کے بعد گھر پہنچ گئی تھی۔ رات وہ سب کافی دیر سے سوئے تھے اس لیے آج کچھ کسلمندی سی بھی تھی۔ گاڑی پارک کر کے وہ عام استعمال میں رہنے والے چھوٹے دروازے کے قریب آ کر ٹھٹک سی گئی۔ دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا۔ اس نے اسے دھکا دے کر کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔

''اماں! سونیا کہاں ہیں آپ لوگ.....؟'' اس نے اندر آتے ہی آواز دی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔

''اماں.....'' اس نے دوبارہ آواز دی۔

''شمع.....'' کمزور سی آواز سن کر وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اندر لاؤنج کے صوفے پر اماں لیٹی ہوئی تھیں، ان کی طبیعت خراب لگ رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے آپ کو.....؟'' اس نے ان کے قریب پہنچ کر ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''کک، کون.....؟'' انہوں نے پوچھا۔

''شمع.....؟'' وہ نیند سے جاگ گئی تھیں۔

''جی اماں میں ہوں آپ کو کیا ہوا؟'' شمع نے انہیں سہارا دیتے ہوئے پوچھا۔

''شوگر کا مسئلہ ہو گیا تھا..... دوا ختم ہو گئی تھی شمع! چکر آ گیا تو گر پڑی تھی میں.....'' وہ بولیں۔

''اب کیسی طبیعت ہے..... بہتر محسوس کر رہی ہیں نا.....؟'' شمع نے فکرمندی سے پوچھا۔ ''دوا کے بارے میں آپ اتنی بے پروا کیسے ہو سکتی ہیں اماں؟ دوا کھالی ہے نا.....؟''

''نہیں..... مگر اب بہتر محسوس کر رہی ہوں۔'' وہ بولیں۔ ''سونیا نہیں آئیں.....؟''

''سونیا.....'' شمع نے پوچھا۔ ''وہ کہاں گئی ہے؟''

''شمع، سونیا نے ہی تو میری مدد کی، کچن سے سہارا دے کر یہاں تک لائی تھیں..... بہت اچھی بچی ہے، اللہ خوش رکھے۔'' وہ بولیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے اماں مگر وہ اچھی بچی ہے کہاں؟'' شمع نے پوچھا۔

''وہ میری دوا لینے گئی تھی۔'' اماں نے کہا۔

''دوا لینے.....؟ کہاں؟ کب گئی تھی؟ اماں کتنے بجے گئی تھی؟ کچھ یاد ہے آپ کو؟'' شمع نے پریشانی سے پوچھا۔

''شاید آدھا پونا گھنٹا ہوا ہے۔'' اماں نے کہا۔

''آدھا پونا گھنٹا..... آتی ہو گی پھر تو..... میڈیکل اسٹور تو قریب ہی ہے، نہ جانے کس طرح گئی ہو گی گاڑی تو تھی نہیں گھر میں.....'' شمع نے کہا۔ ''شاید اسی لیے باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔''

''میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں بنا کر.....'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''ارے بیٹھی رہیے۔ ابھی تک دوا تو نہیں کھائی ہے آپ نے..... سونیا آ جائے، دوا کھالیں پھر اٹھیے گا۔''

''نہیں اب بہتر محسوس کر رہی ہوں بیٹا.....'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''پھر بھی نہیں اٹھنا ہے اماں..... اور آرڈر از آرڈر..... میں سونیا کو کال کر کے دیکھتی ہوں کہ وہ کہاں ہے اور کتنی دیر میں پہنچ رہی ہے۔'' شمع نے سونیا کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ کال کئی گھنٹیوں کے بعد بھی ریسیو نہیں ہوئی تو اس نے کال کاٹ دی۔ ''نہ جانے کہاں غائب ہے؟ فون نہیں اٹھا رہی۔''

شمع ہر پانچ منٹ بعد سونیا کے نمبر پر کال کر رہی تھی مگر کال ریسیو ہی نہیں ہو رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''اماں میڈیکل اسٹور سے یہاں آنے میں اتنا وقت نہیں لگ سکتا..... مجھے جا کر دیکھنا ہو گا، کال بھی نہیں لگ رہی اور اب تو مجھے ٹینشن سی ہونے لگی ہے۔''

''مجھے خود گھبراہٹ ہو رہی ہے۔'' اماں نے کہا۔

''اسے راستے تو معلوم ہیں اتنی دیر ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، وہ تو مجھے کہہ کر گئی تھی کہ بس فوراً آ رہی ہوں۔''

شمع چابی اور موبائل لے کر باہر کی جانب بڑھی پھر نہ جانے کیا سوچ کر رکی اور شمشیر کا نمبر ملایا۔

''ہیلو شمع..... سب خیر.....'' شمشیر نے کال پک کر لی

pklibrary.com

تھی۔

''تم کہاں ہو شمشیر.....؟'' شمع نے پوچھا۔

''بس واپس آرہا ہوں بلکہ یوں سمجھو کہ آ ہی گیا ہوں۔ سوسائٹی میں داخل ہو گیا ہوں..... کیوں؟''

''ٹھیک ہے تم آجاؤ..... باہر ہی رکنا، میں باہر آرہی ہوں۔'' اس نے اتنا کہہ کر کال کاٹ دی۔ وہ اس وقت کسی سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں اسے اس تاخیر میں کچھ گڑبڑ سی محسوس ہو رہی تھی۔ میڈیکل اسٹور جانے اور واپس آنے میں بمشکل بیس پچیس منٹ لگنے چاہیے تھے جبکہ اسے خود گھر آئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ سونیا کم از کم ایک سے ڈیڑھ گھنٹے پہلے گھر سے نکلی تھی۔ اماں کی حالت کی وجہ سے وہ دوا لینے گئی تھی ایسے میں کسی اور جگہ جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ صرف کوئی حادثہ ہی اس تاخیر کی وجہ ہو سکتا تھا اور وہ جتنا اس بارے میں سوچ رہی تھی، اتنا ہی ٹینشن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''اماں پلیز آپ اپنا خیال رکھیں، آرام سے بیٹھیے گا' میں ابھی سونیا کو دیکھ کر آتی ہوں۔'' وہ باہر نکلتے ہوئے بولی۔

شمشیر کی کار گھر کے بالکل سامنے پہنچ گئی تھی، اسے دیکھ کر شمشیر نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

''سب خیر ہے شمع..... کہاں جانا ہے.....؟'' شمشیر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں.....'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔

''کیا پتا نہیں، خیر یا منزل؟'' اس نے اسے گھورا۔

''دونوں ہی..... خیریت ہے یا نہیں، کچھ نہیں کہہ سکتے فی الحال تو مشکوک ہی لگ رہی ہے.....''

''کیوں اُلجھا رہی ہو مجھے؟ کہاں جانا ہے؟'' شمشیر نے پوچھا۔

''فی الحال تو باہر لے کر قریبی میڈیکل اسٹور تک لے لو۔'' شمع بولی۔

''اوکے..... مگر وہاں کیوں؟'' شمشیر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

''شمشیر، سونیا کو ڈھونڈنے جانا ہے۔'' وہ بالآخر بولی۔

''سونیا کو.....؟'' شمشیر نے اچانک بریک لگا دیا۔ ''سونیا کو کیا ہوا ہے؟ وہ میڈیکل اسٹور کیوں گئی ہے؟ کب سے گئی ہے؟ ہمیں اسے ڈھونڈنے کیوں جانا پڑ رہا ہے؟ کال کیوں نہیں کر رہی ہو اُسے؟'' وہ مسلسل سوال کر رہا تھا۔

''گاڑی تو چلاؤ شمشیر.....'' شمع نے کہا۔ ''سونیا کو کچھ نہیں ہوا، اماں کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ ان کی دوا لینے ایک گھنٹا پہلے گئی تھی۔ میں گھر آئی تو معلوم ہوا، مجھے آئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ہے، وہ اب تک واپس نہیں آئی، نہ ہی کال ریسیو ہو رہی ہے اس لیے پریشانی ہو رہی ہے۔''

''پریشانی کی بات بھی تو ہے..... میڈیکل اسٹور اتنی دور نہیں ہے۔'' شمشیر نے جواب دیا، اس کے ماتھے پر بل سے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایکسلریٹر پر پاؤں رکھا، وہ چند منٹ میں میڈیکل اسٹور پر پہنچ چکے تھے۔

''یہاں پونا گھنٹا پہلے میری بہن دوا لینے آئی تھی۔'' شمع نے دکان پر موجود نوجوان سے پوچھا۔ ''کیا اُس نے دوا لے لی تھی۔''

''باجی یہاں تو لوگ دوا لینے آتے ہی ہیں اب کیسے بتایا جائے کہ کون کب آیا تھا۔'' وہ لڑکا بولا۔

''میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتی ہوں۔'' شمع نے موبائل پر موجود سونیا کی تصویر کھولتے ہوئے پوچھا۔ سونیا کی تصویر دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے چونکا پھر خاموش ہو گیا۔

''یہ آئی تھیں.....؟'' شمع نے پھر پوچھا۔

''نہیں میرے سامنے تو نہیں.....'' اس نے گول مول جواب دیا۔ اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی شمشیر آگے بڑھا اور اس نے کاؤنٹر کی اس جانب سے ہی جھک کر اُس کا گریبان پکڑ لیا۔

''تجھے سب معلوم ہے..... مجھے سچ بتاؤ کہ یہ کب آئی تھیں اور کیسے واپس گئیں؟'' وہ غرایا۔

''آپ..... آپ ایسا نہیں کر سکتے.....'' وہ منمنایا اور شمشیر کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ شمشیر نے اس کے جواب میں اس کا گریبان چھوڑ کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا اور بولا۔ ''شمع تم پولیس کو کال لگاؤ، اسے سب معلوم ہے.....''

''تو بھائی تم ڈی آئی جی ہو، میں بھی پولیس میں ہی ہوں اسے پکڑ کر تھانے لے چلتے ہیں وہاں خود ہی سب بتائے گا۔'' شمع نے جواب دیا۔

پولیس اور پھر ڈی آئی جی کا سن کر لڑکے کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا..... سیٹھ نے بولا تھا کہ اپنے

pklibrary.com

کام سے کام رکھنا ہے۔'' وہ بمشکل بولا۔

''وہ رکھو مگر سچ تو بولو.....'' شمشیر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کہاں ہے تمہارا سیٹھ.....؟ اور تم یہ بتاؤ کہ یہ لڑکی یہاں کب آئی تھی؟ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟''

''مم.....'' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو شمشیر نے اسے گھسیٹ لیا تھا۔ ''دیکھ میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں نہ ایک لفظ کم نہ ایک لفظ زیادہ.....''

''یہ آئی تھی رکشے پر، اس نے شوگر کی دوا لی تھی۔ پھر ایک صاحب سے ٹکرائی اور بے ہوش ہوگئی۔ وہ صاحب اسے گاڑی میں لے کر چلا گیا۔'' وہ فر فر بولتا چلا گیا۔

''اور تم سب دیکھتے رہے.....'' شمع غصے سے بولی۔ ''کم از کم پولیس کو تو فون کر سکتے تھے، کوئی کسی سے ٹکرا کر بے ہوش کیسے ہو سکتا ہے؟ کیسا تھا وہ آدمی؟ کون سی گاڑی تھی.....؟''

''لمبا اونچا صاحب تھا..... بالکل انگریز ہیرو لگ رہا تھا۔'' وہ بولا۔ ''گاڑی بھی لمبی کالی تھی ایک ڈرائیور بھی تھا.....''

''یہ کون ہو سکتا ہے؟'' شمشیر بڑبڑایا۔ ''فیروز تو یہاں ہے نہیں.....'' اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''تمہارا سیٹھ کہاں ہے؟ یہاں اُس وقت کتنے لوگ تھے؟''

''ہم دو ہی تھے..... سیٹھ آ رہا ہے۔''

''اور وہ رکشا جس پر وہ آئی تھی، کیا وہ یہیں کھڑا تھا؟'' شمشیر نے پوچھا۔

''جی ہاں، اس گاڑی والے نے اسے کوئی نوٹ بھی دیا تھا۔''

''کیا تم اس رکشے والے کو پہچان سکو گے؟'' شمشیر نے پوچھا۔

''جی ہاں.....''

''اور اُس انگریز ہیرو کا حلیہ بتا سکتے ہو نا؟''

''جی، جی۔''

''ٹھیک ہے شمع..... فوری طور پر اسکیچ بنوانا ضروری ہے ورنہ یہ کچھ بھول بھی سکتے ہیں۔'' شمشیر نے شمع کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سونیا اغوا ہوگئی تھی۔ کیسے؟ کہاں؟ اور کون اس کے پیچھے تھا۔ وہ اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔

''میں کال کر رہی ہوں۔'' شمع نے کہا۔ اتنی دیر میں ایک ادھیڑ عمر شخص دکان میں داخل ہوا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے شہزاد..... کون لوگ ہیں یہ؟ اندر کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے ڈپٹ کر لڑکے سے پوچھا۔

''سیٹھ جی یہ اُسی لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جو تھوڑی دیر پہلے بے ہوش ہوئی تھی یہاں۔''

''میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ اپنا میٹر نہیں ہے.....'' وہ غرایا پھر شمشیر کی طرف مڑا۔ ''بھائی صاحب معاف کیجیے گا ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ہماری یہ کاروبار کی جگہ ہے۔ یہاں کوئی لفڑا دھندا خراب کرنے والی بات ہے۔''

''اور اگر میں تمہیں شریکِ جرم کے الزام میں حوالات میں ڈال دوں تو کیسی بات ہوگی؟'' شمشیر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم کیسے انسان ہو، تمہاری آنکھوں کے سامنے دن دہاڑے کسی کا اغوا ہوتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں کرتے..... پولیس کو تو فون کر سکتے تھے نا؟''

''پھر خود پھنس جاتا.....؟ نہ بابا ہمیں یہ کام نہیں کرنا۔''

''فی الحال تو تمہارا باپ بھی حلیہ بتائے گا، اسکیچ بھی بنوائے گا اور اگر کچھ اور یاد آیا تو وہ بھی بتائے گا ورنہ تمہارا یہ کاروبار ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔'' شمشیر نے کہا۔

''پولیس آ رہی ہے خضر بھی ساتھ ہے۔ اسکیچ تھانے میں ہی بنتا ہے اس لیے ان دونوں کو جانا پڑے گا۔''

''مم، میں تھانے نہیں جاؤں گا..... میں نے کیا کیا ہے؟'' دکان کا سیٹھ خوف زدہ ہو گیا تھا۔

''کیا تو خیر ہے..... مگر میں سمجھتی ہوں..... اب صرف اتنا کرم کر دیں کہ آپ دونوں اس شخص کا اسکیچ بنوا دیں یہی آپ کی بچت کا راستہ ہو سکتا ہے۔''

شمشیر اس دوران میں کریم کو کال کر رہا تھا۔

''ہاں شمشیر.....'' کریم نے کال ریسیو کر لی تھی، وہ اسی وقت علی کے اسپتال میں داخل ہوا تھا۔

''کریم بھائی بہت بُری خبر ہے.....'' شمشیر نے کہا۔

''کیا ہوا ہے؟ جلدی بولو شمشیر.....''

''سونیا اغوا ہوگئی ہے۔'' شمشیر کے منہ سے بمشکل یہ جملہ نکل پایا۔ ''اس کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔''

''کیا..... کیا کہہ رہے ہو تم یہ.....؟ سونیا گھر سے غائب ہوگئی؟ کیا کوئی گھر میں گھسا تھا؟'' کریم سخت پریشانی کے عالم میں سوال پر سوال کرتا جا رہا تھا۔ ''یہ ہو کیسے سکتا ہے؟''

''یہ ہوا ہے کریم..... میں خود بہت پریشان ہوں، وہ

pklibrary.com

گھر پر نہیں تھیں۔ دوا لینے میڈیکل اسٹور تک گئی تھی۔ وہیں یہ سب ہوا ہے۔'' شمشیر نے کریم کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''سونیا پر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہیں ہے مگر یقینی طور پر اسے بے ہوش کرنے کے لیے کسی قسم کی سوئی یا ایسی کوئی چیز استعمال کی گئی ہوگی جس کی وجہ سے اسے خود کو بچانے کا موقع ہی نہیں مل سکا ہوگا۔''

''اوہ.....'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوگیا۔ ''سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ اچانک ہی گھر سے نکلی تھی پھر کسی کو اس کا علم کیسے ہوا..... یہ بہت بُرا ہوا ہے یقیناً اُس کے پیچھے ابراہام ہے مگر اسے سونیا کے ٹھکانے کا علم ہوتا تو وہ اس کے باہر نکلنے کا انتظار نہ کرتا..... بہر حال میں پہنچ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' شمشیر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

☆☆☆

لاوی راستے میں تھا۔ وہ بے حد خوش تھا، اچانک ہی کامیابی کی ایک بہت بڑی قسط اسے گویا پلیٹ میں سجا کر پیش کردی گئی تھی۔ وہ فوری طور پر ابراہام سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا مگر اس سے بات نہیں ہوسکی، اس کا فون بند آرہا تھا۔

''شاید سو رہا ہو.....'' اس نے سوچا۔ ''وہاں اس وقت رات ہی ہوگی۔ بہر حال اس کو بعد میں اطلاع دی جا سکتی ہے۔'' فی الحال اس کی پوری توجہ پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑی سونیا پر تھی۔ اس نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت تو تھی ہی اس وقت بے ہوشی کی حالت میں وہ اسے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کا بیگ اب بھی اس کے کندھے سے لٹکا ہوا تھا۔ لڑکیاں اور پھر خوب صورت لڑکیاں اس کی ہمیشہ سے کمزوری رہی تھیں۔ نوم اسے ہمیشہ اس بارے میں سمجھاتا رہتا تھا۔ نوم کا خیال اسے اداس کر گیا تھا۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو وہ دونوں اس کامیابی کا جشن مناتے.....

''صاحب اس کو رہائش گاہ پر ہی لے جانا ہے؟'' پرویز کی آواز نے اس کی سوچوں کے سلسلے کو توڑ دیا۔

''ہاں، کوئی اور جگہ ہے تمہاری نظر میں.....'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں صاحب..... وہی ٹھیک ہے۔'' پرویز بولا۔

''بس پھر وہیں چلو مگر جلدی..... میں نہیں چاہتا کہ اسے راستے میں ہوش آجائے۔''

''ٹھیک ہے صاحب۔'' وہ اپنے مشینی انداز میں بولا۔ ''ہم بس پانچ منٹ میں پہنچ جائیں گے۔''

لاوی جواب میں کچھ نہیں بولا تھا۔ اُس کا ذہن تیزی سے چل رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ اُس بڈھے کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرسکتی تھی۔ اگر ایسا ہوجاتا تو وہ تنہا اس مشن کو کامیابی سے مکمل کرسکتا تھا۔ اس کے دھندے میں یہ کامیابی بہت معنی رکھتی تھی۔ ان کی ٹیم میں نوم کو دماغ کی سی حیثیت حاصل تھی۔ اہم فیصلے وہی کرتا تھا اور ملاقاتوں میں بھی لاوی کی موجودگی کے باوجود اس کی حیثیت مرکزی کردار کی ہوتی تھی۔ نوم سے دوستی اور محبت کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اس کی صلاحیتوں کا معترف تھا اور پھر اسے اس سب پر کوئی اعتراض اس لیے بھی نہیں تھا کہ ان دونوں کو برابر کا حصہ ملتا تھا۔ ایسے میں نوم کا زیادہ کام کرنا اس کے لیے تو فائدے کا سودا تھا مگر اب نوم نہیں تھا۔ وہ ہر چیز کا تنہا مالک تھا۔

یہ کامیابی اُسے مستقبل کے کلائنٹس کے سامنے ون مین آرمی ثابت کرنے والی تھی۔

☆☆☆

سونیا کو لے جانے والے شخص کے دو اسکیچز کریم کے سامنے تھے۔

یہ دونوں ہی تقریباً ایک جیسے تھے۔ ان میں سے ایک کو پولیس کے آرٹسٹ نے بنایا تھا جبکہ دوسرا کریم کے دفتر میں بنوایا گیا تھا۔

''یہ ایک ہی شخص کے اسکیچ ہیں یعنی ان دونوں نے ٹھیک بنایا ہے۔'' علی نے کہا۔ وہ کریم کا فون ملتے ہی یہاں پہنچ گیا تھا۔

''ہاں..... مگر اس شخص کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔'' شمع نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ لوگ بھی مزید اتنا ہی بتا پائے ہیں کہ وہ کسی حد تک غیر ملکی لگ رہا تھا۔''

''ان دونوں کا کیا کیا؟..... کہاں ہیں.....؟'' کریم نے ارسلان اور اس کے برابر میں بیٹھے خضر سے پوچھا۔

''انہیں واپس بھیج دیا ہے، ہاں یہ کہہ دیا ہے کہ ضرورت یا شناخت کے وقت دوبارہ بلوایا جاسکتا ہے۔'' خضر نے کہا۔ ''اس سے زیادہ نہ وہ کچھ جانتے ہیں اور نہ ہی بتا سکتے ہیں۔ وہ اس گڑبڑ میں گاڑی کا نمبر بھی نہیں دیکھ پائے البتہ وہ سیاہ رنگ کی قیمتی گاڑی تھی۔ سیٹھ نے تو گاڑی کو دیکھا ہی نہیں مگر اس لڑکے کے مطابق وہ ویگو ٹائپ گاڑی تھی۔

''کاش وہ پولیس کو فون ہی کر دیتے۔'' شمع نے افسوس سے کہا۔ ''بروقت اطلاع کتنی مددگار ہوسکتی ہے اور اس سے مجرموں کو پکڑنا کتنا آسان ہوسکتا ہے، اس بارے

pklibrary.com

میں ہمارے ہاں کوئی تصور نہیں ہے۔''

''سب ہے میڈم لیکن لوگ پولیس کچہری کے چکر سے ڈرتے ہیں اس کے لیے پورے نظام اور خاص طور پر رویّوں کو بدلنا ہوگا..... یہ تو یہ معاملہ ہے مگر لوگ حادثے کے شکار لوگوں کو اسپتال لے جاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ سارا ملبا اُن کے اپنے سر پر ہی نہ گر جائے۔'' خضر نے جواب دیا۔

''سچ کہہ رہے ہو۔'' شمع نے سر ہلایا۔

''میں نے اس پورے علاقے کے سی سی ٹی وی کیمرا فوٹیجز کے لیے کہا تھا۔'' کریم نے ارسلان کی جانب دیکھا۔

''جی، جی..... بس تھوڑی دیر میں وہ مل جائیں گی۔ ہم اس کی مدد سے سیاہ ویگو کو ٹریس کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''افسوس کی بات یہ ہے کہ اس شاپ پر بھی باہر ایک کیمرا موجود ہے مگر وہ کام نہیں کر رہا۔ انہوں نے اسے صرف بھرم بازی کے لیے لگا رکھا تھا ورنہ ہمیں بہت مدد مل سکتی تھی۔

''او کے..... خضر پولیس کو اس پورے کام میں سامنے رہنا ہے، ہماری ٹیم آپ کے ساتھ کام کرے گی..... سونیا کو آج ہی ملنا چاہیے۔'' کریم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی سر..... ہمیں آرڈر بھی وصول ہو گئے ہیں، آپ جیسا حکم کریں۔''

''سڑک پر موجود کیمروں سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ گاڑی وہاں سے نکلی اور کہاں کہاں سے گزری ہے، یہ سارا واقعہ سڑک پر یعنی فٹ پاتھ ایریا میں ہی ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں اس کی کوریج بھی مل جائے۔''

''جی سر وہاں موجود تمام کیمروں کی رپورٹ آ رہی ہے جس کے بعد آگے کی جانب کہاں کہاں کی سی سی ٹی وی کیمرا رپورٹ لینی ہے، یہ طے ہو پائے گا۔'' خضر نے کہا اور ارسلان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

''اس سب کا تعلق اس فون کال والے سے بھی ہو سکتا ہے۔'' علی نے چند لمحوں بعد پوچھا۔ ''یہ سب کچھ ایک ساتھ ہوا ہے۔''

''علی مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس وقت باہر نکلنا سونیا کی روٹین تو ہے نہیں کہ کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہو یا اس کا منتظر ہو..... یہی چیز مجھے پریشان کر رہی ہے کہ آدھے گھنٹے میں اسے نہ صرف ٹریس کر لیا گیا بلکہ یہ سب بھی ہو گیا۔'' کریم نے کہا۔ ''اس کے پیچھے ابراہام کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا اور سونیا کا اس کے ہاتھ میں پڑنا نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے..... ہمیں بہت تیز حرکت کی ضرورت ہے۔''

''اس کے پیچھے فیروز کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے یوں بھی وہ ابراہام کے لیے کام کرتا ہے۔'' شمشیر نے کہا۔

''نہیں وہ اس کا ذمے دار نہیں ہے۔'' کریم بولا۔

''یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ.....؟'' شمع نے پوچھا۔ علی بھی سوالیہ انداز میں کریم کو دیکھ رہا تھا۔

''اس لیے کہ وہ اب زندہ نہیں ہے.....'' کریم نے کہا۔ ''میں یہ بات سب کو ایک ساتھ بتانا چاہ رہا تھا مگر اب اس صورتِ حال میں بتانی پڑ رہی ہے..... سارہ کا فون آیا تھا..... فیروز اس کے ہاتھوں اپنے انجام تک پہنچ چکا ہے اور سارہ اُس کی قید سے آزاد ہو چکی ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔'' علی بے اختیار بولا۔ ''کوئی تو اچھی خبر ملی..... یا اللہ شکر ہے۔''

''یہ تو واقعی بڑی خبر ہے۔'' شمشیر نے کہا۔

''سارہ کہاں ہے؟ کیا اُس نے آپ کو بتایا کہ وہ کہاں ہے؟ کب یہاں پہنچ سکتی ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''سارہ امریکا میں ہے، فیروز اسے ہیرس برگ پنسلوانیا لے گیا تھا اور تب ہی ہم ان کا کوئی سراغ نہیں لگا پا رہے تھے۔ وہ وہیں ہے.....''

''یعنی وہ ابراہام کی لنکا کے بالکل قریب ہے۔'' ڈاکٹر شمع نے کہا۔ ''میں ان سے مل تو نہیں پائی مگر جتنا کچھ ان کے بارے میں سنا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس لنکا کو ڈھا سکتی ہیں۔''

''ہاں بالکل..... سارہ کی آزادی کی خبر بہت بڑی ہے مگر سونیا کی فکر نے اس خوشی کو گہنا دیا ہے۔'' علی بولا۔

''ہاں..... سچ کہہ رہے ہو تم۔'' کریم نے گہری سانس لی۔ ''بات گھوم کر وہیں آ جاتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟''

''ایک منٹ.....'' علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''آج اسپتال میں مجھے کئی لوگوں نے بتایا تھا کہ جو لوگ دو دن قبل اسپتال میں گھسے تھے، وہ گورے چٹے لمبے ہیرو ٹائپ تھے۔ ان میں سے جو ایک شخص مارا گیا وہ بھی غیر ملکی تھا..... کہیں یہ وہی تو نہیں ہیں.....؟''

''ہو سکتا ہے۔'' کریم ایک لمحہ خاموش رہا پھر اُس نے میز پر رکھے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا۔ ''شہزاد اسپتال میں ریسپشن پر مس نوشابہ کی ڈیوٹی لگی تھی نا.....؟''

''گڈ..... تو پھر آپ انہیں فوراً بلا لیں..... ہمیں اُن سے اسکیچ کی شناخت کرانی ہے۔'' وہ دوسری جانب سے ملنے

pklibrary.com

والے جواب کے جواب میں بولا اور ریسیور رکھ دیا۔

''اگر یہ اُن دونوں میں سے ایک ہوا تو ریسیپشن پر تعینات تو شاید اسے پہچان سکتی ہے۔'' کریم ان کی جانب دیکھ کر بولا۔ ''یہ سارے اشارے ابراہام کی جانب ہی جا رہے ہیں..... ہمیں جتنی تیزی سے سونیا کو تلاش کرنا ہے، اسی تیز رفتاری سے ابراہام سے نمٹنا ہے اور اس کے لیے منظر نامہ اس بار اس کی اپنی زمین ہوگی۔ علی، شمع تم دونوں اس سلسلے میں ساری تیاری اور کارروائی مکمل کرو۔'' کریم کی پیشانی پر بل سے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے سیف ہاؤس پر بابا کی حفاظت کے انتظامات کو مزید سخت کروا دیا تھا مگر اس کے باوجود وہ اس سے بھی مطمئن نہیں تھا۔ سونیا کی فکر کے ساتھ ساتھ بابا کی ٹینشن بھی اس کے اعصاب پر سوار تھی۔ وہ روزانہ سونیا سے بات کرتے رہے تھے۔ اب سارہ کے بعد سونیا کی غیر موجودگی کے حوالے سے انہیں مطمئن کرنا بہت مشکل کام تھا۔ ان ساری سوچوں کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن الگ ہی نکتے پر جما ہوا تھا کہ سونیا کے نکلتے ہی اس حملے کا جواز کیا ہو سکتا ہے۔ اب تک وہ اس حوالے سے کوئی جواب تلاش نہیں کر پایا تھا۔

''میں خضر کے ساتھ اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔'' شمشیر نے کہا۔

''ہاں تم اس معاملے کو ہیڈ کرو شمشیر۔'' کریم نے جواب دیا۔

''فکر مت کرو کریم.....'' شمشیر نے کہا۔ ''ہم سونیا کو آج کی رات ہونے سے پہلے ڈھونڈ نکالیں گے اور اس کام میں ملوث کسی بھی شخص کو نہیں چھوڑیں گے۔''

''انشاء اللہ.....'' کریم نے کہا۔

''اور ابراہام کو بھی نہیں.....'' شمشیر نے مزید کہا۔ ''سونیا درست ہی کہتی آئی ہیں کہ جب تک وہ زندہ ہے یہ سب کچھ اسی طرح جاری رہے گا۔''

''ہاں۔'' کریم کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ ''ایسا ہی ہوگا۔'' شمشیر کے جانے کے بعد بھی وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے موبائل کان سے لگا لیا۔ اسے آنے والے مشن اور سونیا کی تلاش کے سلسلے میں کچھ رابطے کرنا تھے۔ اب ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا پھر سارہ کے لیے وہاں ضروری مدد اور رہائش وغیرہ کا انتظام بھی باقی تھا۔

☆☆☆

سونیا اب تک بے ہوش تھی۔

اسے خاص کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ لاوی بھی اس وقت وہیں موجود تھا۔

''جناب کیا اس کے ہاتھ پیر باندھنے ہیں؟'' پرویز نے سونیا کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا جو کہ بستر پر بے سدھ پڑی تھی۔ نس کے دبنے کے علاوہ اس کی بے ہوشی کو طول دینے کی غرض سے اسے ایک انجکشن بھی لگایا گیا تھا۔ ''ایسا نہ ہو کہ یہ ہوش میں آتے ہی فرار کی کوشش کرے؟''

''یہاں کا سیکیورٹی نظام اتنا کمزور ہے کہ ایک نازک سی لڑکی اسے توڑ کر فرار ہو جائے گی؟'' لاوی نے اسے خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر ایسا تھا تو مجھے پہلے بتانا چاہیے تھا تاکہ میں اس کام کے لیے کسی بہتر جگہ کا انتخاب کرتا۔''

''نہیں، نہیں سر..... یہ بات نہیں ہے۔ یہاں کا سیکیورٹی نظام بہت بہترین ہے اور یہ کمرا جہاں ہم ابھی ہیں وہ تو ایسے مہمانوں کے لیے خاص طور پر بنایا گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' لاوی نے پوچھا۔

''یہ کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔ یہاں کوئی چیختا بھی رہے تو باہر آواز نہیں جا سکتی یوں تو اس علاقے میں ویسے بھی کسی کو کسی کی کانوں کان خبر نہیں ہوتی..... ہو بھی کیسے؟ دو دو ہزار گز سے بڑی کوٹھیاں ہیں۔ کسی کے پاس دوسرے کے لیے وقت نہیں ہے۔ ہاں تو میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ کمرے کے باہر ہمارا بہترین شخص نگرانی کا کام کرے گا۔ ہر طرف کیمرے لگے ہوئے ہیں اور گیٹ پر گارڈز موجود ہیں جن کی نگاہوں سے بچ کر نکلنا ناممکن ہے۔''

''تو پھر ہاتھ پیر باندھنے کی کیا ضرورت ہے..... فضول کا وبال..... باتھ روم میں جانا ہے تو کھولو..... کوئی کام ہے تو کھولو.....'' لاوی نے بے پروائی سے کہا۔ ''اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری نظر میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے..... نکل کر تو کہیں جا نہیں سکتی ویسے بھی اسے یہاں کتنی دیر رہنا ہے۔''

''ٹھیک ہے صاحب.....''

''تمہارے انجکشن کے اثرات کب تک رہیں گے؟'' لاوی نے پوچھا۔

''دو سے تین گھنٹے تک رہنا چاہیے۔'' وہ بولا۔

''او کے، مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ اسے کل تک ہوش نہ آئے۔'' وہ بولا۔

''کل تک.....؟ پھر ہمیں ہائی ڈوز انجکشن دینا ہوگا اور غذا وغیرہ نہیں دی جا سکے گی۔'' پرویز نے سرسری انداز میں کہا۔

pklibrary.com

''تو کیا ہوا؟ ایک روز کھانا نہ کھانے سے کوئی مر نہیں جاتا۔'' لاوی نے سٹاکی سے کہا۔ ''ہمیں کل تک اپنا آپریشن اسپتال مکمل کرنا ہے اس دوران میں کسی بھی طرف سے کوئی پریشانی یا مصروفیت نہیں چاہتا، اس سے فارغ ہو کر اسے بھی دیکھیں گے۔''

''ٹھیک ہے سر..... تو میں ابھی یہ کام کر دیتا ہوں۔'' پرویز بولا اور کمرے سے نکل گیا۔ وہ کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی جس میں سنہرا سا سیال موجود تھا۔ اس نے اس کی سوئی کو بے رحمی سے سونیا کے بازو میں اتار دیا۔ وہ کسمسائی اور پھر ساکت ہو گئی۔ لاوی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم تو ملٹی ٹیلنٹڈ آدمی ہو یار.....'' لاوی نے کہا اور دروازے کی جانب بڑھا۔ چند قدم آگے جا کر وہ پھر مڑا اور بیڈ سائڈ پر رکھے سونیا کے بیگ کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے بیگ اٹھا کر کھولا اور اندر جھانکا، اس کے سامنے دونوں کمپارٹمنٹ میں رکھا سامان تھا۔ ایک میں کچھ کاغذات اور ایک کلچ تھا جبکہ دوسری جانب ایک دوسرے آرگنائزر میں میک اَپ اور اسکن کیئر کا سامان تھا۔ اس نے بیگ کے سائڈ میں موجود زپ کھولی، یہ چھوٹی سی درز تھی جس میں سونے کی ایک چین اور کچھ سکے موجود تھے۔ اس نے اسے بند کیا اور بیگ کی زپ لگا کر اسے دوبارہ بیڈ سائڈ پر ڈال دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ذہن میں کچھ خاص چل رہا تھا۔ وہ اس موقع کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہ رہا تھا۔ ابراہام جیسے بارسوخ اور دولت مند ترین شخص کی نواسی اس کے قبضے میں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود اسے مروانا چاہ رہا تھا۔ یقیناً اس کے پیچھے اس سے بہت کچھ زیادہ تھا جو کہ ابراہام نے انہیں بتایا تھا۔ پھر ایک بات تو طے تھی کہ وہ اس کی کمزوری تھی جسے وہ سب کی نگاہوں سے چھپانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے بارے میں اور اس کے مخالفین کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ یہ ایک ڈیل اسے عمر بھر کے لیے مطمئن اور خوش حال کر سکتی تھی۔ یہ وہ جانتا تھا کہ اس کے سامنے ابراہام تھا۔ ذرا سی بھی چوک نظر آنے والے تخت کو اس کے لیے تختۂ دار میں بھی تبدیل کر سکتی تھی مگر وہ لاوی تھا جو ''نو رول لائف'' پر کاربند تھا اور ''نو رسک نو گین'' پر یقین رکھتا تھا۔ سو اس نے یہ گیم کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک لمحے کو میں سمجھ نہیں پائی تھی کہ میں کہاں ہوں پھر دماغ کی اسکرین پر گزرے واقعات کے فلیش بیکس جگمگائے..... میں نے تکیے کے ساتھ رکھے فون کی جانب دیکھا۔ وہ اب بھی بج رہا تھا مگر اسکرین پر کریم کے نمبر کی جگہ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ مجھے یہ کال ریسیو کرنا چاہیے کہ نہیں کیونکہ یہ کال اس موبائل کے مالک سے متعلق بھی ہو سکتی تھی۔ میرے سوچنے کے دوران ہی کال کٹ گئی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد فون پھر بج اٹھا۔ اس بار اسکرین پر چمکنے والا نمبر کریم کا تھا۔ میں نے لپک کر کال ریسیو کی۔

''ہیلو کریم، میں تمہاری کال کا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' میں نے کہا۔

''مجھے اندازہ ہے سارہ، اصل میں یہاں کچھ ایسے معاملات ہو گئے تھے کہ میں فوری رابطہ نہیں کر پایا۔'' کریم بولا۔

''کیا ہو گیا؟ مجھے بتائیں سب خیر ہے نا؟ بابا کیسے ہیں؟ علی ٹھیک ہے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں بابا اور علی تو ٹھیک ہیں مگر.....'' کریم کی آواز گویا ڈوب سی گئی۔

''کیا ہوا ہے کریم پلیز مجھے بتائیں.....'' مجھے شدید بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔

''سونیا غائب ہے وہ دوا لینے میڈیکل اسٹور تک گئی تھی جہاں سے اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔'' آخر کار وہ بولا۔

''اوہ..... یہ تو بہت بُری خبر ہے۔'' میں ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''کریم یہ ابراہام کے آدمیوں کا کام ہے..... سونیا کی جان خطرے میں ہے۔''

''میں جانتا ہوں، ہم اُسے ڈھونڈ نکالیں گے سارہ، میری پوری ٹیم اور ایجنسی اس پر کام کر رہی ہے، پولیس بھی ان کے ہمراہ ہے، اغوا کار ایک غیر ملکی ہے اور اس کا اسکیچ بن چکا ہے۔ انشاء اللہ آج ہی سونیا ہمارے پاس ہو گی۔'' کریم بولا۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو کریم..... ابراہام کا خاتمہ بہت جلد ضروری ہے..... میں یہاں ہوں مگر اس وقت کچھ کر نہیں پا رہی ہوں۔''

''تمہیں اکیلے کچھ کرنا بھی نہیں ہے۔'' کریم نے سختی سے کہا۔ ''کسی بھی آپریشن کے لیے پوری پلاننگ کی ضرورت ہے ورنہ نقصان کا خطرہ زیادہ ہے۔''

''میں جانتی ہوں مگر یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا بھی تو ناممکن ہے۔''

pklibrary.com

''ہاں تمہیں تھوڑی دیر پہلے ایک کال آئی ہوگی، وہاں ہمارے ایک ساتھی ہیں سبحان احمد، یہ اُن کا نمبر ہے۔ میری ان سے بات ہوگئی ہے۔ وہ تمہیں محفوظ رہائش گاہ، ضروری کاغذ اور ضرورت کی اشیا فراہم کردیں گے۔ تھوڑی دیر میں وہ تمہیں کال کریں گے۔''

''ہاں کال آئی تھی پر میں نے پک نہیں کی۔'' میں نے جواب دیا۔

''احتیاط اچھی بات ہے، وہ تمہیں ایک اور فون سیٹ اور نمبر بھی فراہم کردیں گے۔ تم یہ سیٹ انہیں دے دینا۔''

''ٹھیک ہے، بابا کیسے ہیں؟ مجھے اُن کی بہت فکر ہورہی ہے۔ وہ سونیا والی بات برداشت نہیں کرسکیں گے۔''

''انہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔'' کریم نے جواب دیا۔ ''اب میں کال بند کرتا ہوں۔ تم پلیز سبحان سے کوآرڈی نیٹ کرلینا اور فون ملتے ہی مجھے کال کردینا، اوکے۔''

''بالکل اوکے.....'' میں نے جواب دیا اور کال بند ہوگئی۔ سونیا کے اس طرح اغوا ہوجانے کی خبر نے مجھے بے حد پریشان کردیا تھا۔ یہ بجا تھا کہ وہ کوئی چھوئی موئی نہیں تھی مگر میرے سامنے خود میری مثال موجود تھی۔ ''ابراہام یقیناً اسے جان سے مارنا ہی چاہے گا۔'' میں ان سوچوں میں مگن تھی کہ فون پھر بج اٹھا اس بار وہی نمبر تھا جہاں سے پہلے مجھے کال آچکی تھی۔

''جی فرمایئے.....'' میں نے اس بار کریم کی ہدایات کے مطابق کال ریسیو کرلی۔

''میڈم میں سبحان بات کررہا ہوں۔ کرنل کریم احمد کے ریفرنس سے.....'' دوسری جانب سے آواز آئی۔ ''ان کی ہدایات کے مطابق آپ کے لیے تمام چیزوں کا انتظام کردیا گیا ہے۔ میں ہوٹل پر گاڑی بھجوا رہا ہوں۔ وہ آپ کو یہاں لے آئے گی۔''

''اوکے.....'' میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد میں سفید رنگ کی جدید کار میں سوار تھی۔ ڈرائیور اپنے کام میں مشاق تھا۔ گاڑی گویا سڑک پر تیر رہی تھی۔ میرے ذہن میں خیالات اور امکانات کے جھکڑ سے چل رہے تھے جو مجھے کبھی مطمئن، خوش اور کبھی افسردہ اور پریشان کررہے تھے۔ اس کار نے مجھے دس منٹ میں ایک خوب صورت علاقے میں پہنچا دیا تھا جہاں کئی بڑی عمارات تھیں۔ ان میں سے ایک میں سبحان نامی شخص کا فلیٹ تھا۔ دوسری منزل پر موجود یہ فلیٹ بہت اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ عمارت بھی صرف رہائشی تھی جس کی وجہ سے اردگرد خاموشی اور سناٹا تھا۔

''ویلکم..... امید ہے کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہوگی۔'' سبحان مجھے دیکھ کر اپنے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ درمیانے قد اور اچھی شخصیت کا مالک تھا۔

''بالکل نہیں، مگر باقی کی ساری پریشانیاں میرے ساتھ ہیں، کریم نے آپ کو بتایا ہوگا۔'' میں مسکرائی۔

''ہاں مگر اس سلسلے میں آپ کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے، فی الحال آپ اس فلیٹ میں رہیں گی یہاں آپ کی ضروریات کا مکمل سامان موجود ہے، میں نے آپ کے لیے فون سیٹ اور نمبر کا انتظام کرلیا ہے۔'' وہ ایک باکس میری جانب بڑھاتا ہوا بولا۔ ''آپ کے لیے کاغذات تیار ہورہے ہیں۔ کل تک آپ کو مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ آپ کو جو کچھ بھی درکار ہو، آپ بے تکلف کہہ سکتی ہیں کیونکہ یہ میرا کام ہے اور مجھے اس کے لیے ہی ہائر کیا گیا ہے۔''

''سبحان صاحب آپ کا بہت شکریہ، آپ تو حاتم طائی کی طرح میری ہر مشکل کا حل تلاش کرلائے ہیں۔''

''میں نہیں، کرنل کریم، یہ سب انہوں نے ہی کرایا ہے..... مجھے جو حکم ملا، میں نے کردیا۔''

''بالکل اُن کا بھی شکریہ.....'' میں مسکرائی۔ ''مجھے کچھ کپڑوں کی ضرورت ہے۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''اور کچھ دیگر سامان..... مگر میں اس کے لیے خود مارکیٹ نہیں جانا چاہتی۔''

''آپ لسٹ دے دیں، میں یہ کام کروا دیتا ہوں، ٹھیک ہے نا؟'' وہ بولا۔

''ہاں یہ بہتر رہے گا۔ میں آپ کو لسٹ بنا دیتی ہوں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''مجھے اس کے ساتھ ساتھ ایک اچھا ریوالور درکار ہے، اضافی راؤنڈز کے ساتھ۔''

''مل جائے گا میڈم.....'' وہ اسی اطمینان کے ساتھ بولا۔

''بس تو آپ یہ انتظام کرادیں اور یہ بتایئے کہ یہاں سے نیویارک کس طرح جایا جاسکتا ہے؟''

''میڈم آپ کار سے جاسکتی ہیں، ٹرین سے جاسکتی ہیں، جایا تو جہاز سے بھی جاسکتا ہے آپ کس طرح جانا چاہیں گی؟''

''بائی روڈ..... کار میں.....'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''اس کا انتظام بھی ہوجائے گا، کل آپ کے کاغذات

pklibrary.com

مل جائیں گے تو پھر اس کام میں بھی پریشانی نہیں رہے گی، آپ کو نیویارک میں کسی خاص جگہ جانا ہے؟''

''جی ہاں۔'' سارہ نے مختصر جواب دیا۔ ''یہاں سے وہاں پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟''

''تین ساڑھے تین گھنٹے۔'' وہ بولا۔

''زبردست، سبحان بھائی مجھے اس کام میں آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔''

''میں آپ کی مدد کے لیے موجود ہوں، آپ ٹرین کے ذریعے بھی وہاں جاسکتی ہیں۔ اتنا ہی وقت لگتا ہے اگر مجھے آپ کا پلان معلوم ہو تو شاید میں زیادہ مدد کرسکوں۔''

''پلان تو ابھی کچھ کلیئر نہیں ہے مگر یہ طے ہے کہ نیویارک جانا ہے۔ اگر اس کے لیے کار کا انتظام ہوجائے اور جو میں نے آپ سے ریوالور کی درخواست کی ہے، وہ جلد ہوجائے گا اچھا رہے گا۔''

''دونوں کام کل تک ہوجائیں گے مگر میڈم یہاں آپ کار ڈرائیو نہیں کرپائیں گی۔''

''میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے یہاں کا.....'' میں نے بے ساختہ کہا پھر خود ہی رک گئی۔ ''ہاں مگر اس وقت موجود نہیں ہے..... میرا خیال ہے کہ ٹرین کا آپشن بہتر ہے۔''

''اس کے علاوہ آپ کار ہائر بھی کرسکتی ہیں۔ نیویارک میں بھی ٹیکسیز، اوبر بہت سے راستے ہیں۔'' سبحان نے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے بس تو پھر طے یہ ہوتا ہے کہ کل کے بعد میں نیویارک جاسکتی ہوں۔''

''جی بالکل.....'' وہ بولا۔

سبحان کے جانے کے بعد میں اسی حوالے سے سوچتی رہی۔ میرے ذہن میں ابراہام تک پہنچنے کے کئی منصوبے آرہے تھے اور اگلی سوچ کے ساتھ مسترد ہورہے تھے۔ سونیا کے اغوا نے مجھے پریشان اور غصے میں مبتلا کر رکھا تھا۔ کچھ دیر کی اُدھیڑ بُن کے بعد میں نے سب کچھ اس کے سپرد کردیا جو مجھے ہمیشہ راستہ دکھاتا آیا تھا۔ ہر مشکل سے بچاتا آیا تھا۔ میں نے سچے دل سے سونیا کے لیے دعا کی اور بستر پر دراز ہوگئی۔ یہ دو کمروں کا چھوٹا سا مگر جدید اور مرصع فلیٹ تھا۔ کچن میں کھانے پینے کی چیزیں موجود تھیں۔ سبحان مجھے وہاں چھوڑ کر جاچکا تھا۔ میرے پاس اب کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ کریم یقیناً سونیا کے معاملے میں الجھا ہوا ہوگا اس لیے میں نے اسے اپنے فلیٹ پر پہنچ جانے کی خبر وائس میسج کے ذریعے کردی تھی اور اپنا نیا نمبر بھی سینڈ کردیا تھا۔ میرے پاس موجود موبائل سبحان لے گیا تھا۔ لہٰذا اب اس کے ذریعے ٹریس ہونے کا خوف بھی ختم ہوگیا تھا۔ فیروز کی موت کے بعد کیا ہوا؟ کیا وہ لوگ مجھے اب بھی تلاش کررہے ہوں گے؟ میرے پاس ان سوالات کے جواب نہیں تھے لیکن مجھے یقین سا تھا کہ فیروز کی موت نے ابراہام اور ان سب کا رابطہ توڑ دیا تھا یوں بھی ابراہام کی معلومات کے مطابق تو وہ مجھے قتل کرہی چکا تھا۔ اس لیے فی الحال میں خطرے سے قدرے باہر تھی۔ مجھے بھوک بالکل نہیں تھی یوں بھی ہوٹل سے نکلنے سے پہلے میں نے ایک سینڈوچ لیا تھا۔ گزشتہ رات میں ٹھیک طرح سے سو بھی نہیں پائی تھی۔ اس لیے میں نے سونے کا فیصلہ کیا..... صبح تازہ دم جاگ کر میں شاید بہتر پلان بناسکتی تھی، میں نے سوچا اور آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

رات کے پونے بارہ بج رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھانا شروع ہوگئی تھی۔ اسپتال میں بھی اس وقت رش کا وہ عالم نہیں تھا مگر موجود مریضوں، ڈاکٹروں اور اسٹاف کی آمدورفت کی وجہ سے پھر بھی زندگی رواں دواں تھی۔ ایمرجنسی میں آج مریض روز سے کم تھے۔

''آج تو قدرے سکون ہے۔'' رمیش نے اپنے ساتھی گارڈ سے کہا۔ ''گزشتہ کئی دنوں سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی ایکشن فلم میں کام کررہے ہیں۔''

''ہاں یار.....'' اشرف بولا۔ ''یہ جو نیا سیکیورٹی اسٹاف ہے ویسے ہے بہت چیتا..... میں تو روز ان سے کچھ نہ کچھ سیکھ رہا ہوں۔''

''بات تو سچ ہے۔'' رمیش نے جمائی لی۔ الفاظ ابھی اس کے ہونٹوں میں ہی تھے کہ ایمرجنسی کا دروازہ کھلا اور چار پانچ عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ساتھ ایک اسٹریچر تھا جسے اسپتال کا اسٹاف آگے لارہا تھا۔ اس اسٹریچر پر ایک شخص زخمی حالت میں بے ہوش پڑا تھا۔

''ارے کوئی بندہ آئے، ڈاکٹر کو بلاؤ..... ساڈا بندہ بُری حالت میں ہے۔'' ان میں سے سب سے زیادہ عمر رسیدہ عورت نے کرخت آواز میں چیخنا شروع کردیا۔ ''اینوں کچھ نہ ہوجائے..... کتھے ہیں سارے لوگی.....''

''جی..... جی ہم دیکھ رہے ہیں۔'' ایمرجنسی میں موجود دو ڈاکٹرز ان کے قریب آگئے۔

''کہاں دیکھ رہے ہو..... ہائے ہائے شیدے کے ابا.....'' دوسری عورت نے زور سے رونا شروع کردیا۔

pklibrary.com

''آپ لوگ اتنا شور نہ مچائیں یہاں اور مریض بھی ہیں۔'' ایک سینئر ڈاکٹر نے انہیں جھڑکا تو لمحے بھر کے لیے خاموشی ہوئی۔ ''ہوا کیا ہے انہیں..... ایکسیڈنٹ کا کیس ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہ جی..... چھت سے گر گیا ہے.....'' ایک اور عورت بولی۔ ''ساڈا براہ ہے ایکوں ایک بیٹا ہے جی..... اس کو آپ ٹھیک کردو بس۔''

''اس کے لیے دیکھنا پڑے گا۔'' ڈاکٹر نے کہا اور جونیئر ڈاکٹرز اور اسٹاف کو مریض کو اندر کی طرف لانے کا اشارہ کیا۔ وہ سب عورتیں بھی ان کے ساتھ ہی اندر کی طرف بڑھیں۔ ''آپ لوگ یہیں ٹھہریں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''وہ کیسے.....؟ مجھے تو اس کے ساتھ جانے دیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''کیوں تو کیوں جائے گی وڈی زمین دارنی ہے..... میں جاؤں گی۔'' دوسری چمک کر بولی۔

''میرا خاوند ہے..... اور میں پہلی بیوی ہوں۔'' پہلے والی بولی۔

''میرا بھی خاوند ہے اور زنانی، زنانی ہوتی ہے۔'' دوسری زور سے بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب میں ساتھ چلوں گی۔''

''کوئی بھی نہیں جائے گا ورنہ اپنا مریض لے جائیں۔'' ڈاکٹر نے بگڑ کر کہا اور اندر کی جانب چل دیا۔ جونیئر ڈاکٹر اور اسٹاف اسٹریچر کو ساتھ لے گئے تھے۔ وہ ساری عورتیں وہیں کھڑی تھیں۔

''تم لوگوں کے ساتھ کوئی اور مرد ہے؟'' نرس نے ان سے پوچھا۔

''کیوں کوئی اور ہوگا..... یہ ہم دونوں کا مرد ہے، یہ تینوں اس کی بہنیں ہیں اور وہ اس کی ماں ہے..... باقی چاروں بیٹیاں ہیں۔''

''اللہ معاف کرے، تم میں سے ایک ریسپشن پر جاکر پیسے جمع کراؤ..... باقی سب الگ الگ جگہ بیٹھ جاؤ، یہاں رش نہ لگاؤ.....'' نرس نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ انہیں روزانہ ہی الگ الگ طرح کے مریضوں اور ان کے لواحقین سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔

''میں جاتی ہوں بات کرنے۔'' مریض کی ماں نے زور سے تمام عورتوں سے مخاطب ہوکر کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں غالباً رقم تھی۔ ''تم لوگ لڑنا نہ شروع کر دینا ورنہ ہڈیاں توڑ دوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ تو آگے بڑھ گئی، باقی عورتیں وہیں بیچ میں کھڑی رہیں۔

''آپ لوگ بیٹھ جایئے یہاں بیچ میں مت کھڑی ہوں۔'' نرس دوبارہ ان کے قریب آکر بولی۔

''تو کیا تیرے راستے میں کھڑے ہیں، ایک طرف تو کھڑے ہیں۔'' ان میں ایک نوجوان لڑکی اِس پر پل پڑی۔ ''آتے جاتے ڈانٹ رہی ہے، اسپتال ہے یہاں لوگ کھڑے ہی ہوتے ہیں خود بھی تو کھڑی ہے۔''

''تو کیوں لڑ رہی ہے اس سے.....'' ایک عورت اسے گھسیٹتے ہوئے چلّائی۔ ''تو، تو چاہتی ہے کہ یہ لوگ میرے بھائی کا علاج نہ کریں اور مرجائے.....''

''کیسے بولا تو نے یہ میری بیٹی کو..... مرے تو..... تیرے ہوتے سوتے.....'' ایک اور نے بولنے والی کو دھکا دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہنگامہ سا برپا ہوگیا تھا۔ دونوں عورتیں آپس میں لڑ پڑیں۔ ایک نے دوسری کے بال نوچے، دوسری تھپڑوں کی بارش کررہی تھی۔ تمام گارڈز اور عملہ وہاں جمع ہوگیا تھا۔ ان کے ساتھ موجود عورتوں میں سے کچھ گھبرا کر اِدھر اُدھر ہوگئی تھیں جبکہ دو تین اس جنگ میں برابر کی شریک تھیں۔ پانچ منٹ میں پورا اسپتال ان کے شور وغل سے گونج اٹھا تھا۔

''آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟'' سیکیورٹی گارڈز انہیں بمشکل الگ کر پائے تھے۔ ڈاکٹر بھی باہر آگئے تھے۔

''ان کا مریض کہاں ہے انہیں نکالو یہاں سے..... جائیں کسی اور اسپتال میں علاج کرائیں۔'' ڈیوٹی چیف ڈاکٹر بگڑ گیا تھا۔

''اے میرے اللہ..... ان ذلیلوں نے ہنگامہ ڈال ہی دیا۔'' اماں جو کہ ریسپشن پر پیسے وغیرہ کا حساب کررہی تھی، اتنی دیر میں واپس آگئی تھی۔ ''منع کیا تھا، منہ بند رکھنے کو کہا تھا مگر ان کو کیا سمجھ آتی ہے زبان کی بولی..... جوتے کی زبان سمجھتی ہیں کم بخت.....'' اس نے ان دونوں لڑنے والیوں کی پیٹھوں پر دو ہتھڑ برساتے ہوئے کہا۔

''یہ سب یہاں نہیں چل سکے گا اماں.....'' ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہاں سب مریض ہیں، آپ کے مریض کی پٹی ہورہی ہے، ہم اس کے بعد اسے ڈسچارج کردیں گے۔''

''نہیں، نہیں بیٹا..... معاف کردو..... تُسی تو پڑھے لکھے ہو..... یہ تو جاہل ہیں کم بخت..... میں ان سب کو باہر نکالتی ہوں۔'' وہ قدرے منت کے سے انداز میں بولی۔

pklibrary.com

''دیکھیے ماں جی..... آپ کے مریض کی پٹی ہوگئی ہے، وہ گھر پر رہ سکتا ہے، زخم زیادہ گہرا نہیں ہے ٹانکے لگ گئے ہیں۔ ایڈمٹ کی ضرورت ہے ہی نہیں.....'' ڈاکٹر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''مگر ابھی آدھا گھنٹا لگے گا بس آپ کوشش کریں کہ اب کوئی ہنگامہ نہ ہو ورنہ دوسرے مریض متاثر ہوتے ہیں۔''

''نہ جی..... ہنگامہ نہ ہوگا..... میں نے آدمیوں کو تو پہلے ہی اِدھر اُدھر بٹھا دیا ہے ان دونوں کرم جلیوں کا پہرا دیتی ہوں بس آپ میرے بچے کا علاج کر دیں جی.....''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر اندر چلا گیا۔ اگلے دس منٹ میں وہ دوبارہ مزید پیچ چڑھا چکی تھیں۔

''مجھے تو لگ رہا ہے کہ اس آدمی نے خودکشی کی کوشش کی ہوگی۔'' ایک نرس نے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کیا۔

''سچ ہے بھائی..... ان کے ہاں تو ہر وقت ہنگامہ برپا رہتا ہوگا مگر یہ کچھ کم نہیں لگ رہیں..... باقی کہاں ہیں؟''

''وہ کہہ تو رہی ہے کہ اِدھر اُدھر بٹھا دیا ہے۔'' پہلی نرس بولی۔ ''آج کی رات ڈیوٹی سخت رہنے والی ہے سینئر ڈاکٹر وغیرہ سب ایکٹو ہو گئے ہیں، اب تو آنکھ جھپکنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

''بات تو سچ ہے۔'' دوسری بولی۔

اسی دوران عورتوں کے مریض کو چھٹی مل گئی تھی اور جس طرح ہنگامہ آرائی کے ساتھ ان کی انٹری ہوئی تھی، ان کا باہر نکلنا بھی اس سے کم نہیں تھا۔ اب ان سب کی آوازوں میں مریض کی آواز بھی شامل تھی جو ہلکی اور کمزور آواز میں ان سب کو گالیاں دے رہا تھا۔ ان کے اسپتال سے نکل جانے پر سب نے ہی اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ ایمرجنسی وارڈ کا درمیانی حصہ جو اس جنگ وجدل کے نتیجے میں گندہ ہو گیا تھا اس کی فوری صفائی کر دی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اسپتال میں سب کچھ معمول پر آ گیا تھا یا کم از کم دیکھنے والوں کو یہ لگ رہا تھا۔ حقیقت کیا تھی، وہ مقدر کے علم میں تھی جو اس کے آشکار ہونے کے لیے صحیح وقت کا منتظر اور محتاج تھا۔

☆☆☆

وہ ایک چھوٹا ہال نما کمرا تھا جہاں ایک بڑی میز اور کرسیاں موجود تھیں۔ میز کے ایک جانب وہ بیٹھا ہوا تھا جبکہ اس کے سامنے والی کرسیوں پر دو افراد موجود تھے۔

''کام ہو گیا؟'' اس نے اُن کی جانب دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

''جی باس..... جیسا آپ نے بتایا تھا ویسا ہی ہوا ہے۔'' سامنے بیٹھے شخص نے کہا۔

''ٹھیک ہے، چاروں لگا دیے گئے ہیں؟''

''جی باس..... ایک لفٹ میں ایک باتھ روم میں اور دو ایمرجنسی اور او پی ڈی میں..... اسپتال پورا اُڑ جائے گا اس کا یقین ہے۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے، اب تم سب اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔ جن سے کام کرایا ہے وہ تمہارے بھروسے کی ہیں نا.....؟''

''جی بالکل..... بہت بار کام کر چکی ہیں سب میرے ساتھ..... ہنگامہ ڈالنے میں ماہر ہیں..... جہاں یہ موجود ہوں وہاں اتنا شور شرابا ہوتا ہے کہ کسی کا دماغ کام نہ کرے۔'' وہ فخریہ انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے..... ریموٹ مجھے دے دو۔''

''یہ لیں باس..... میں نے وقت آپ کے حکم کے مطابق کل شام پانچ بجے کا لگایا ہے۔''

''ٹھیک ہے..... یہ لو.....'' اس نے میز پر نوٹوں کی چار گڈیاں ڈالیں۔ ''اپنا محنتانہ..... اب تم فی الحال ہمیں بھول جاؤ..... کچھ کام ہوگا تو میں خود رابطہ کروں گا۔''

''جو حکم باس.....'' وہ گڈیاں سمیٹتے ہوئے بولا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اس نے میز پر رکھا ریموٹ اٹھا کر جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اس وقت آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی مگر ان میں سے کسی کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ سونیا کا خیال ایک مسلسل اٹھنے والی ٹیس کے مانند انہیں بے چین کر رہا تھا۔ اس وقت وہ سب کریم کے دفتر میں موجود تھے۔ کچھ دیر قبل خضر اس رکشے والے کو لے کر آیا تھا جو سونیا کو میڈیکل اسٹور تک لے کر گیا تھا۔ وہ اس وقت کریم کے سامنے موجود تھا۔

''صاحب میرا کیا قصور ہے، میں نے تو سواری کو وہاں اتارا تھا، کھڑا ابھی رہا تھا، پھر ان صاحب نے بولا کہ وہ بی بی کے رشتے دار ہیں اور ان کی طبیعت خراب ہوگئی ہے تو میں کیا کرتا؟''

''یعنی تمہیں کچھ غلط نہیں لگا؟'' خضر نے پوچھا۔

''نہیں یہاں ایسا ہوتا رہتا ہے، کتنی بار لڑکیاں جہاں جانے کے لیے نکلتی ہیں وہاں نہیں جاتیں درمیان میں کوئی کزن اُن کو لے جاتا ہے..... ہم تو مزدور لوگ ہیں، ہمارا

pklibrary.com

کام رکشا چلانا ہے غریب کی ویسے بھی کون سنتا ہے۔''

''تم یہ سب چھوڑو یہ بتاؤ کہ جس شخص نے تمہیں پیسا دیا تھا..... پانچ سو کا نوٹ.....'' شمشیر نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''اس کا حلیہ یاد ہے تمہیں.....؟ اس کا اسکیچ بنوا سکتے ہو؟''

''ہاں حلیہ یاد ہے یعنی چہرہ یاد ہے..... کچھ عجیب سا چہرہ تھا..... میں بتا سکتا ہوں آپ اگر بنا ئیں تو.....''

''میں نہیں..... جو یہ کام کرتے ہیں ان کو بتاؤ..... اور کچھ بھولنا مت.....''

''تم نے اس گاڑی کا نمبر دیکھا تھا؟'' کریم نے پوچھا۔

''نن نہیں صاحب..... موقع نہیں ملا میں تو بس حیران ہو گیا تھا۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''کس بات پر حیران؟'' کریم نے کہا۔

''وہ بی بی نے کہا تھا کہ اس کو فوراً گھر جانا ہے اسی لیے مجھے روکا بھی..... اور پھر یکدم اس آدمی سے ٹکرا کر گر پڑیں اور پھر وہ انہیں لے گئے۔''

''تمہیں عجیب لگا مگر پھر بھی تم نے گاڑی کا نمبر... نوٹ نہیں کیا؟''

''میں نے ان سے پوچھا تھا کہ باجی کو کیا ہوا..... مگر اس نے ڈانٹ دیا اور کرایہ کی مد میں پانچ سو روپے دے دیے۔'' وہ شرمندگی سے بولا۔

''ٹھیک ہے تم اسکیچ بنواؤ.....'' کریم نے جواب دیا۔

اس کے جانے کے بعد کریم نے ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔

''نوشابہ سے بات ہوئی..... اسے اسکیچ بھیجا.....؟''

''جی سر بھیج دیا ہے..... اب کال ملاتا ہوں۔'' آپریٹر نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''میری بات کراؤ.....'' کریم نے یہ کہہ کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

شمشیر اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ ہی تناؤ تھا۔ وہ کریم کو دیکھ رہا تھا۔ علی بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

''نوشابہ کی ڈیوٹی پچھلے دنوں اسپتال کے ریسپشن پر تھی اور اس شام اس نے ان دونوں کو اوپر بھیجا تھا۔'' کریم نے ان دونوں کو بتایا۔ ''میں نے میڈیکل اسٹور والے کی یادداشت کے مطابق تیار کردہ اسکیچ اسے بھجوا دیا ہے ہو سکتا ہے کہ یہ ان دونوں میں بچ جانے والا ہو کیونکہ وہ بھی تو غیر ملکی ہی تھے۔''

اناڑی شکاری.....
شکار نہ سہی گولی تو واپس آ ہی گئی!

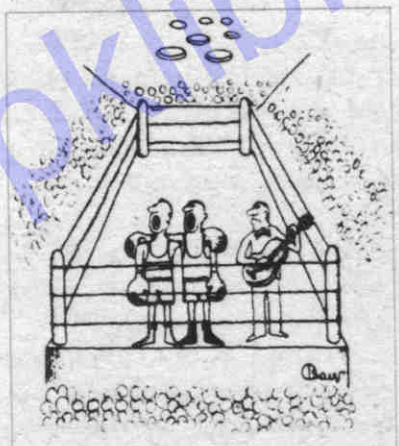

اس گانے کے بعد ہم لڑ مریں گے!

pklibrary.com

''ہاں، یہ عین ممکن ہے۔'' علی نے کہا۔ ''معاملہ اُلجھتا جارہا ہے اور وقت گزرتا جارہا ہے، فکر ہے کہ اژدہے کے مانند ہمیں پورے کا پورا نگل لینے کے چکر میں ہے۔ امید گہرے بادلوں میں چھپی روشنی بنتی جارہی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''علی ہمیں سونیا کو ڈھونڈنا ہے کسی بھی طرح۔'' کریم مضبوط لہجے میں بولا۔ ''پریشانی کو اعصاب پر سوار نہ ہونے دو..... کوئی نہ کوئی راستہ نکلے گا..... انہیں زمین نے نہیں نگلا ہے۔'' اس کا جملہ ختم ہونے سے قبل ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی اس نے ریسیور اٹھایا۔

''سر نوشابہ از آن لائن.....'' آپریٹر کی آواز آئی اور پھر اگلی آواز نوشابہ کی تھی۔ ''سر یہ وہی ہے۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا۔ ''جی، دو افراد سے اس شام میری بات ہوئی تھی، یہ ان میں سے ایک ہے۔''

''تمہیں پورا یقین ہے نوشابہ.....؟'' کریم نے پوچھا۔

''جی بالکل سر..... یہ وہی ہے۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے شکریہ اب تم سوسکتی ہو۔'' کریم نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔

''سونیا کو اغوا کرنے والا تمہارے اسپتال میں گھسنے والے ان دو دہشت گردوں میں سے ایک ہے، ایک تو مارا گیا تھا۔'' کریم نے علی اور شمشیر سے کہا۔ شمع خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

''ایک منٹ بھائی..... آپ کو یاد ہے کہ اُسی روز ہمارے پرانے گھر پر بھی دو آدمی آئے تھے جو بابا کا پتا پوچھ رہے تھے۔ گارڈز کے مطابق وہ بہت ضد کررہے تھے اور خود کو بابا کا دوست بتارہے تھے۔''

''ہاں..... شاید وہ بھی یہ دونوں ہی ہوں۔'' کریم بڑبڑایا۔

''یقیناً وہی ہوں گے۔'' شمشیر بولا۔ ''میں تو یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ اماں کی طبیعت اچانک کیسے خراب ہوگئی۔''

''شمشیر اماں پر شک مت کرنا..... وہ ملازم ضرور ہیں مگر میرا اُن کا میری عمر جتنا ساتھ ہے وہ کسی غلط کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں، میں جانتی ہوں کہ تم پریشان ہو اور وہ تو ہم سب ہیں مگر اس وقت غلط باتیں سوچنا مزید مسائل کھڑے کرسکتا ہے۔'' شمع نے سنجیدگی سے کہا۔

''آئی ایم سوری شمع.....'' شمشیر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''بس یہ سونیا والے معاملے میں شاید میں بہت دباؤ میں آگیا ہوں۔ کاش میں دفتر نہ گیا ہوتا گھر پر ہی رہتا۔''

''یار شمشیر، کاش والے تمام جملے مجھے وقت کا زیاں لگتے ہیں ان سے ہوتا تو کچھ ہے نہیں۔'' شمع بولی۔ ''مجھے سونیا کی فکر ہے مگر میں یہ جانتی ہوں کہ وہ بھی خود کو بچانا جانتی ہے۔ یہ مشکل وقت ہے مگر یہی موقع بھی ہے ہوسکتا ہے کہ یہ ہوا ہی انہیں انجام تک پہنچانے کے لیے ہو۔''

''درست کہہ رہی ہیں شمع.....'' کریم نے کہا اور میز پر رکھے کافی کے مگ کو منہ سے لگالیا۔

''سر میں اندر آسکتا ہوں۔'' رضوان نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوکر پوچھا۔

''ہاں، بالکل آؤ۔'' کریم نے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سی سی ٹی وی کیمروں سے کچھ معلوم ہوا؟''

''جی سر وہی ڈسکس کرنا ہے۔'' وہ بولا۔ وہ بہت زیادہ پُرجوش نظر آرہا تھا۔

''تو آیئے پلیز.....'' شمشیر نے اسے جگہ دی۔ رضوان نے ہاتھ میں پکڑے لیپ ٹاپ کو میز پر رکھا اور اسے آن کیا۔ اسکرین پر ایک بڑا سا نقشہ موجود تھا۔ گوگل میپ کی طرح کے اس نقشے میں کیمرا آگے بڑھتا جارہا تھا اور سی سی ٹی وی کیمرا دکھا رہا تھا۔

''سی سی ٹی وی کیمروں کا ریکارڈ چیک کیا گیا ہے۔ تین چار روٹس کا جائزہ لینے کے دوران ہمیں ایک کیمرے کا رزلٹ ملا ہے۔ یہ روڈ پر موجود سی سی ٹی وی کیمروں سے الگ ہے، اس میڈیکل اسٹور کے برابر میں موجود بیوٹی پارلر کے باہر کیمرا موجود تھا۔ ہم نے وہاں سے بمشکل یہ ریکارڈنگ حاصل کی ہے جو میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔''

''شیور.....'' کریم کے الفاظ پر رضوان نے ایک اور ونڈو کھولی۔ اس میں سڑک اور پارلر کے دونوں اطراف کے مناظر دکھائی دے رہے تھے وہ کیمرا غالباً خودکار انداز میں گھوم رہا تھا کیونکہ منظر آ اور جارہے تھے۔ ایک لمحے کے بعد کیمرے کے عین سامنے ایک رکشا آکر رکا اور اس میں سے سونیا باہر نکل آئی۔ تصویر کافی واضح تھی۔ سونیا کے اترتے ہوئے کیمرا گھوم گیا تھا جب کیمرا اس طرف واپس آیا وہ منظر میں نہیں تھی۔ ایک دو منٹ کے بعد ہی رکشے سے تھوڑے فاصلے پر ایک سیاہ شاندار کار رکی۔ ایک لمحہ وہ رکی رہی پھر اس میں سے ایک شخص باہر نکلا۔

''ایک منٹ..... رضوان کیا تم اس کو یہاں روک کر

اس شخص کو زوم کر سکتے ہو؟'' کریم نے کہا۔

''یس سر.....'' رضوان نے جواب دیا اور فلم کو روک کر اسے تھوڑا ہائی لائٹ کیا۔

''اوہ..... یہ تو وہی ہے جس کا اسکیچ تیار کیا گیا ہے یعنی یہی ہے وہ.....'' شمع بے اختیار بولی۔

''یس یہ ہے وہ..... رضوان اس پک کی کاپی بنالو..... مجھے الگ سے درکار ہوگی۔'' کریم نے کہا۔

''بہتر سر۔'' رضوان نے جواب دیا اور ویڈیو کو پھر چلا دیا۔ اس بار جب کیمرا اس خاص مقام تک آیا سونیا بے ہوشی کی حالت میں تھی اور وہ شخص اسے گاڑی کی طرف لا رہا تھا۔ اسی دوران رکشے والا ان کی جانب آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے اس کی جانب ایک نوٹ بڑھایا۔

''رضوان مجھے اس دوسرے شخص کی تصویر بھی الگ درکار ہے۔'' کریم نے کہا۔

''مل جائے گی سر مگر اس سے زیادہ کارآمد منظر آگے ہے سر۔'' رضوان نے کہا۔

''وہ کیا.....؟'' علی نے پوچھا۔

''یہ دیکھیے.....'' رضوان بولا۔ ''ویڈیو میں اس شخص نے سونیا کو پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ دروازہ بند کیا اور خود آگے پسنجر سیٹ پر براجمان ہو گیا، اس کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی۔ اس ایک لمحے میں کیمرے نے کار کی پشت اور نمبر ریکارڈ کر لیا تھا۔

''زبردست.....'' علی چلایا۔ ''اسے زوم کریں۔''

اب ان سب کے سامنے اس گاڑی کا نمبر تھا۔ یہ سیاہ رنگ کی آٹومیٹک جدید کار تھی جس میں ہر سہولت موجود تھی۔

''یہ بہت اچھا کام ہو گیا ہے۔'' علی بولا۔ ''ہم اس نمبر سے مالک کا پتا لگاتے ہیں اور تفتیش کے لیے بھی گاڑی، اس کا رنگ سب سامنے آ گیا ہے۔''

''تو پھر کام شروع کرتے ہیں۔'' شمشیر بولا۔

''جی سر ہم نے مالک کا نام نکال لیا ہے۔'' رضوان نے کہا۔ ''اور اس گاڑی کو بقیہ کیمروں کی رپورٹس سے جوڑ کر بھی دیکھا ہے جس کے مطابق وہ گاڑی شہر کے سب سے پوش علاقے میں داخل ہو کر گم ہو گئی ہے۔''

''مالک کون ہے گاڑی کا.....؟'' کریم نے پوچھا۔

''سر وہ مشہور بزنس مین ہیں شفیق افتخار..... اب یہ نہیں معلوم کہ اسے اس سب کے بارے میں علم ہے یا نہیں.....''

''یہ تو اب وہ ہی بتائے گا۔'' کریم نے کہا۔ ''اس کے گھر کا ایڈریس اور لوکیشن حاصل کرو، ہم وہاں جا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے سر.....'' رضوان نے سر ہلایا۔

''یہ ویڈیو شیئر کر دو۔'' کریم نے کہا۔

''میں کر رہا ہوں سر۔'' رضوان یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

''ہمیں اس پر دھاوا بولنا چاہیے۔ وہ ہمیں سونیا تک پہنچا سکتا ہے بھائی۔'' علی نے بے تابی سے کہا۔

''ہاں علی، ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو..... ہمیں کچھ دیر رکنا ہوگا، ہر کنفرمیشن کے بغیر نکلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھے بھی یقین ہے کہ یہ شخص ہمیں سونیا تک پہنچا سکتا ہے۔'' کریم بولا۔

رضوان کی واپسی میں تقریباً پونا گھنٹا لگ گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک کاغذ تھا جو اس نے کریم کے سامنے رکھ دیا جس پر شفیق افتخار کا پتا تحریر تھا۔

''ہم اس کی طرف نکلتے ہیں۔'' کریم نے کہا۔

''سر یہاں ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے ہم نے سی سی ٹی وی کیمروں کی کوریج سے یہ دیکھا ہے کہ وہ گاڑی شہر کے پوش علاقے میں داخل ہوئی جبکہ شفیق افتخار کا پتا شہر کے سب سے قیمتی مکانات کے علاقے میں موجود ہے یعنی اگر اس سب میں اس کا ہاتھ ہے تب بھی ہمیں وہاں میڈم کے ملنے کے امکانات پر زیادہ یقین نہیں رکھنا چاہیے۔''

''ہوں.....'' کریم نے علی، شمشیر اور شمع کی جانب دیکھا۔

''ہاں مگر وہ اپنے دیگر ٹھکانوں کے بارے میں بتا سکتا ہے۔'' ڈاکٹر شمع نے کہا ''اس کے لیے ہمارا اُس تک پہنچنا ضروری ہے اور وہ بھی اسے خبردار کیے بغیر..... اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ سونیا کی بازیابی ہے، یہی ہمارا کور مشن ہے باقی ان کٹھ پتلیوں کی سزا اور انہیں پکڑنے کا مسئلہ تو وہ تو ہوتا رہے گا۔''

''بالکل..... سونیا کی بازیابی کے لیے ہی اُن تک پہنچنا اور انہیں پکڑنا ضروری ہے۔'' علی بولا۔ ''اس پر آج ہی ہاتھ ڈال دینا چاہیے تاکہ وہ مزید کچھ اقدامات نہ اٹھا سکے۔''

''ہاں علی مگر اس کے لیے ہمارا جانا اور اس طرح جانا ٹھیک نہیں رہے گا۔ ہمیں پہلے حفاظتی اقدامات کا خیال رکھنا ہوگا۔'' کریم نے کہا۔

''سر اگر آپ حکم دیں تو ہم جا کر یہ کام کر سکتے ہیں۔'' رضوان نے کہا۔

pklibrary.com

کچھ دیر کی گفتگو کے بعد کریم نے یہی طے کیا تھا کہ رضوان وغیرہ یہ کام کریں گے اور وہ سب اس کا یہاں استقبال کریں گے۔

☆☆☆

ابراہام آج بہت خوش تھا۔

آج کا دن اس کے لیے سب سے بڑی فتح ساتھ لایا تھا۔ کونسل کے اجلاس میں آج اسے مزید پانچ سالوں کے لیے سربراہ منتخب کرلیا تھا اور آج ہی اس کا دوسرا کام بھی ہوگیا تھا۔ جس خفیہ ملاقات کے لیے وہ کئی سالوں سے محنت کررہا تھا، آج وہ طے ہوگئی تھی۔ اسے آج شام مخصوص تنظیم کے سرکردہ افراد سے ملنا تھا۔ یہ تنظیم گریٹر اسرائیل کے مشن پر تو کام کر ہی رہی تھی مگر اس کا اندرونی مشن دنیا بھر سے مسلمانوں کو ختم کرنا تھا۔ اس کے لیے ان کے پاس بہت بڑے اور بھاری بھرکم انویسٹرز موجود تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ سرمائے کے حصول کے لیے ہر قسم کے طریقہ کار کا انتخاب کرتے ہوئے نہیں جھجکتے تھے جس میں بلیک میلنگ سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ وہ اس ملاقات سے قبل پوری تیاری کرلینا چاہ رہا تھا۔ اس کے لیے اس نے ایک بھرپور پروگرام بنایا تھا جس کا بلیو پرنٹ اس وقت اس کے سامنے تھا۔ اگر اس کے مطابق تمام کام ہوجاتا تو دو سالوں میں دس اہم مسلمان ملک دنیا کے نقشے سے غائب ہوسکتے تھے اور ان میں سے ایک اس کے دشمن احمد کا ملک بھی تھا جس کی طاقت اس وقت دوسرے اسلامی ممالک کی ڈھارس بنی ہوئی تھی۔ اس طاقت کو جڑ سے ختم کرنا اس کی خواہش بھی تھی اور اس کے بغیر مشن مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔

احمد کا خیال آتے ہی اُسے مریم کا خیال آیا اور پھر نوم اور لاوی کا۔

''یہ احمقوں کی جوڑی آخر کیا کررہی ہے کئی دنوں سے ان کی کوئی رپورٹ موجود نہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔ یہ حقیقت تھی کہ پچھلے ایک ڈیڑھ ہفتے سے موساد کی کونسل کا سربراہ چنا جانا اور پھر مخصوص تنظیم سے ملاقات کی تیاری نے اسے بے حد مصروف رکھا ہوا تھا۔ اس نے نوم کا نمبر ملایا مگر گھنٹیاں جارہی تھیں۔ چند لمحوں بعد اس نے فون بند کردیا پھر اس نے لاوی کا نمبر ملایا۔

''ہیلو.....'' چند گھنٹیوں بعد کال ریسیو ہوگئی تھی۔

''لاوی میں ابراہام بول رہا ہوں، نوم کہاں ہے؟ کام کا کیا بنا؟'' اس نے پوچھا۔

''سر ابراہام ہم یہاں مشکل میں پھنس گئے تھے، وہ صاحب تو اب تک نہیں مل پائے، مجھے جن کی چھٹی کرادینی ہے مگر اس کوشش میں نوم اپنی جان سے گیا۔''

''نوم مارا گیا؟ ہوا کیا تھا؟'' ابراہام نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

''احمد کی تلاش میں ہم اس کے بیٹے کے اسپتال میں گئے تھے وہیں جھڑپ ہوئی جس کے نتیجے میں نوم کو جان لیوا گولی لگی۔ درمیان میں اس نے خود کو ٹھیک رکھنے کی کوشش کرلی تھی مگر وہ سنبھل نہیں پایا۔ ہم دونوں نے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہے سیکنڈ کوشش میں، میں تو نکل گیا مگر وہ نہیں بچ پایا۔''

''اوہ..... یعنی تم لوگ اس کا اب تک کچھ بگاڑ نہیں پائے۔'' ابراہام غرایا۔

''میرا پارٹنر مرچکا ہے مسٹر ابراہام، شاید آپ نے سنا نہیں ہے۔'' لاوی چمک کر بولا۔

''میں نے سنا مگر اس کے ذمے دار تو تم لوگ خود ہو نا، تم نے مجھ سے ایک کام لیا ہے۔ میں نے ایڈوانس پیمنٹ کی اور ساری سہولتیں فراہم کیں مگر اس کے باوجود تم لوگ ناکام رہے ہو... ناکام لوگوں، اداروں یا کمپنیوں سے میں رابطہ نہیں رکھتا۔''

''مگر مشن تو ناکام نہیں ہوا..... آپ کی نواسی ہمارے قبضے میں ہے یعنی ٹیکنیکلی تو وہ ہمارے پاس ہے مگر درحقیقت وہ کسی اور کے قبضے میں ہے اور یہی مسئلہ ہے۔''

''تم نے مریم کو ڈھونڈ نکالا.....؟ یہ کیا نا تم نے زبردست کام.....''

''جی کام تو ہوگیا ہے مگر.....''

''مگر کیا.....؟''

''میں یہاں کچھ مشکلات میں پھنس گیا تھا۔ ایک تو نوم کا اس طرح چلے جانا اور پھر کچھ ادارے پیچھے لگ گئے تھے اس لیے میں نے اس کا بندوبست اس پورے سیٹ اپ سے الگ ہی کیا تھا۔''

''تو.....؟'' اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''اب وہ لوگ مجھ سے ایک موٹی رقم مانگ رہے ہیں۔'' لاوی نے جواب دیا۔

''جو بھی رقم ہے، اس کے منہ پر مارو اور اسے ختم کر ڈالو..... مجھے اس کا ثبوت درکار ہوگا۔''

''مگر یہاں میرے پاس رقم نہیں ہے۔'' لاوی نے گویا بے چارگی سے کہا۔ ''اور انہیں وہ رقم یہاں نہیں امریکا میں درکار ہے ڈالرز میں..... اصل میں انہیں لڑکی کی اہمیت

pklibrary.com

کا اندازہ ہو گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے جو بھی فیگر ہے مجھے بھیج دو رقم ٹرانسفر ہو جائے گی..... بڈھے کا کیا بنا؟''

''یہ لڑکی ہی ہمیں اُس تک پہنچا سکتی ہے اسی لیے میں نے موقع پر اس کا کام تمام نہیں کیا تھا۔ اسے اس کے بارے میں معلوم ہے باس..... ایک بار یہ میرے قبضے میں آجائے تو اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنا مشکل نہیں ہے۔''

''اوکے..... رقم منتقل ہو جائے گی تم تفصیلات بھیجو۔''

ابراہام نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔ ''یہ مجھے احمق سمجھ رہا ہے۔'' وہ بڑبڑایا، اسے یقین تھا کہ لاوی اسے ٹھگ رہا ہے مگر فی الحال اس کے لیے کام رقم سے زیادہ اہم تھا۔ مریم کا خاتمہ اور احمد کی موت اس کے لیے خوش خبری سے کم نہیں تھے مگر اس نے طے کر لیا تھا کہ کام ہو جانے کے بعد وہ لاوی کی تنہائی بھی ختم کر دے گا۔ اسے نوم کے پاس پہنچانے کے بعد ہی اس کا کام ختم ہوگا..... چند لمحوں میں اسے لاوی کا پیغام مل گیا تھا۔ رقم کے ہندسے دیکھ کر ایک لمحے کو اس کا دماغ اڑ گیا تھا مگر پھر اس نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ فی الحال اسے کام سے مطلب رکھنا ہے، لاوی سے نمٹنا بعد کی بات ہے۔ وہ اس بارے میں ہدایات دے کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔ یہ کسی کی کال نہیں تھی فون کا خصوصی الارم تھا جو وہ نہایت اہم کاموں کے لیے لگایا کرتا تھا۔ یوں تو اس کے پاس دو سیکریٹریز تھیں مگر کچھ ٹاپ سیکرٹ کاموں میں وہ کسی کو بھی شامل نہیں کرتا تھا۔ یہ ایک ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ کچھ ہی دیر میں اپنی عالیشان گاڑی میں تھا۔ ڈرائیور اور گارڈ اگلے حصے میں موجود تھے۔ اسے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں ایک گھنٹا لگا تھا۔ یہ ایک عالیشان محل نما عمارت تھی۔ اس کی گاڑی کے وہاں پہنچتے ہی گیٹ کھل گیا تھا۔ اس کی کار اندر داخل ہوئی۔ اندر اصل عمارت تک جانے کے لیے اسے باغ کے درمیان بنی سڑک پر سے گزرنا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اندرونی دروازے کے سامنے تھا۔ ڈرائیور نے کار روک کر لپک کر اس کے لیے دروازہ کھولا، وہ باہر نکلا۔ اس دوران اندرونی دروازہ کھل چکا تھا اور دو ادھیڑ عمر اشخاص مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔

''شالوم (یہودی زبان میں سلام یا ہیلو)۔'' انہوں نے گرم جوشی سے ابراہام کا استقبال کیا۔

''الیکم شالوم.....'' ابراہام نے جواب دیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ میں وقت پر پہنچ گیا ہوں۔''

''وقت سے پہلے پہنچے ہو جوان.....'' ایک سفید داڑھی والے ربی ٹائپ شخص نے باہر آتے ہوئے کہا اور ابراہام کو گلے لگا لیا۔ ''خوشی ہوئی تم سے مل کر..... تم ایک سچے یہودی ہو، خدا ہمیشہ تمہارا مددگار رہے۔''

''شکریہ عظیم الیگزینڈر.....'' وہ قدرے جھک کر بولا۔ ''ہم گریٹر اسرائیل کے سپاہی ہیں۔''

''آؤ اندر آؤ..... ڈیوڈ اور باقی سب تمہاری آمد کے منتظر ہیں۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر کی جانب لے جاتے ہوئے بولا۔ ایک لمبی سی لابی سے گزر کر وہ ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوئے جہاں بیش قیمت فرنیچر موجود تھا۔ دیواروں پر شاہکار تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ اس گھر کا کونا کونا مکینوں کی دولت کا پتا دے رہا تھا۔

''آؤ ابراہام.....'' وہاں موجود چار افراد میں ایک نے اسے خوش آمدید کہا۔ ''وہ اس گھر کا مالک ڈیوڈ تھا۔ دنیا کا سب سے امیر ترین یہودی..... ان کی اس خاص تنظیم کی پہلی خصوصیت یہی تھی کہ اس کے تمام ممبران ارب پتی تھے۔ یہ امیر ترین یہودی گریٹر اسرائیل کے کاز کے لیے پیسا فراہم کرنے کا مرکزی کام سرانجام دیتے تھے۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم یہاں آئے.....''

''یہ میرے لیے فخر و اعزاز ہے۔'' ابراہام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ وہ ابراہام لگ ہی نہیں رہا تھا جو کسی سے سیدھے منہ بات کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔ آج تو اس کے لبوں سے گویا پھول جھڑ رہے تھے۔

''تمہاری خدمات ناقابلِ فراموش ہیں اور اسی طرح تمہارا ویژن بھی..... ڈیوڈ نے ان سب کے بیٹھ جانے اور کافی پینے کے بعد گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ابراہام سے کہا۔ ''تمہارا پلان، عملدرآمد کے لیے بلیو پرنٹ اور کسی مشکل کی صورت میں متبادل پلاننگ پر ہم سب نے بہت غور کیا ہے، اسے مختلف طریقوں سے سمجھا ہے، اس پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے اور یقین کرو کہ ہم سب کو وہ بہت بہترین قابلِ عمل اور مقصد کے قریب پہنچانے والا لگا ہے.....''

''بہت شکریہ.....'' ابراہام مسکرایا۔

''اس وقت اس آخری ضرب کی اشد ضرورت ہے اگر ہم ان تمام ممالک میں گڑبڑ کروانے اور تباہی پھیلانے میں کامیاب ہوتے ہیں تو اس سے ان کی بڑھتی طاقت ختم ہو جائے گی۔ وہ خود کو سنبھالنے اور بچانے کے چکر میں پڑ جائیں گے اور اس دوران ہم ان سے بہت آگے نکل چکے

pklibrary.com

ہوں گے۔"

"جی ہاں سر! اس کے بغیر مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔" ابراہام بولا۔ "میں کئی برسوں سے اس کی تیاری کر رہا ہوں مگر اس کے لیے بہت بڑے وسائل کی ضرورت ہے جو فی الحال میسر نہیں ہے اسی وجہ سے اس پر کام شروع نہیں ہو پایا حالانکہ موساد کی کونسل، حکومت سب اس کی منظوری دے چکے ہیں مگر وہ کھل کر اس پر کام نہیں کر سکتے۔"

"ہاں ان کی مجبوری سمجھ میں آتی ہے مگر تمہارے جیسی ون مین آرمی ہمیں میسر ہے اور تمہیں سب کی آشیرباد اور پوری مدد حاصل رہے گی بس کام تمہیں اپنے لیول پر کرنا ہوگا۔"

"جی بالکل میں یہ بات سمجھتا ہوں، میری خواہش ہے کہ میں اپنی زندگی میں آپ کا گریٹر اسرائیل کا خواب سچ ہوتے دیکھ سکوں۔" وہ تابعداری سے بولا۔

"ہم دیکھیں گے۔" ڈیوڈ نے یقین سے کہا۔ "تم اپنے پروجیکٹ کا آغاز کر سکتے ہو۔ میں اس حوالے سے وزیراعظم سے بات کر چکا ہوں۔ بس دھیان یہ رکھنا ہے کہ تم یہ سب بظاہر اپنے ذاتی حوالے سے کر رہے ہو..... تمہیں پوری سپورٹ ملے گی لیکن اگر کچھ غلط ہوا تو تمہیں خود اسے دیکھنا ہوگا۔ عالمی برادری کی وجہ سے کھل کر تمہاری مدد نہیں کی جا سکے گی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔"

"تمہارا بجٹ تمہیں سونے اور ڈالرز کی شکل میں دے دیا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ عام ملکوں کے سالانہ بجٹ سے زیادہ بڑی اس رقم کو تم تک پہنچایا کیسے جائے، کیا تم یہ 'منی شفٹ' بینک کے ذریعے چاہو گے؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

"ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ تمہیں کیش اور سونے کی شکل میں ادائیگی ہوگی اگر تمہارے پاس مضبوط و محفوظ مقام ہے تو ایک سال کی ادائیگی یکمشت کی جائے گی۔"

"شکریہ..... جی ہاں میرے گھر کے نیچے ایک محفوظ اور بہت بڑا تہ خانہ ہے، اس رقم اور سونے کو وہاں حفاظت سے رکھا جا سکتا ہے۔ یہ یہاں ہوگا اور میرے گھر میں گھسنے کی کسی میں ہمت نہیں ہے..... پھر بھی میں دھمکیوں کے حوالے سے اپنی سیکیورٹی دگنی کرا دوں گا۔"

"گڈ..... تو پھر سونے اور رقم کے دو ٹرک کل رات کسی وقت تمہارے گھر آ سکتے ہیں۔ اس موقع پر اگر وہاں صرف تمہارے نہایت اعتماد کے لوگ ہوں یا کوئی بھی نہ ہو تو ہمارے لوگ وہاں سب انتظام کر دیں گے..... تم ایسا سیٹ اپ بنا لو کہ شک نہ گزرے۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "اگر مشکل لگے تو چھوٹی چھوٹی اقساط بھی مل سکتی ہیں۔"

"نہیں، نہیں..... ایک ہی بار شفٹنگ مناسب رہے گی یہ زیادہ محفوظ ہے۔" ابراہام بولا۔ وہ طاقت ہو یا چیزیں ان کی اپنے پاس اور اپنے ہاتھ میں ہونے کا قائل تھا۔ اس دن اور اس چیز کے لیے اس نے برسوں کام کیا تھا۔

"پھر تم اس کی پلاننگ کر لو۔"

"ٹھیک ہے سر..... میں کل اکثر ملازمین کو چھٹی دے دوں گا اور وجہ گھر میں خصوصی عبادت ہوگی۔ اس دوران ہم یہ شفٹنگ کر لیں گے۔ مشینیں موجود ہوں گی۔ بجٹ تو ظاہر ہے کہ ڈبوں میں بند ہوگا۔ میرے صرف دو وفادار ملازم یہ کام کر لیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو بھی تہ خانے کی بابت زیادہ معلومات ہوں۔"

"ان دونوں پر تمہیں یقین ہے؟" الیگزینڈر نے پوچھا۔

"ان سے زیادہ خود پر یقین ہے۔" ابراہام بولا۔ "اس کام کے بعد میں انہیں بھی انڈر گراؤنڈ کر دوں گا تاکہ وہ اس راز کو اپنے ساتھ ہی لے جائیں۔" اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی تھی۔

"واہ..... ابراہام سب کچھ سوچ کر رکھتا ہے۔" ڈیوڈ کے لہجے میں تعریف تھی۔

"بڑے مشن کے لیے چھوٹی قربانیاں دینی پڑتی ہیں سر....."

"بالکل درست کہا ہے تم نے....." ڈیوڈ بولا۔

"کل یہ کام ہو جائے گا۔ ابراہام! تمہیں خصوصی کلب میں آمد مبارک ہو، اب سے تم ہماری ماہانہ میٹنگ کا حصہ ہو گے، تمہارا پروجیکٹ تنظیم کا سب سے بڑا پروجیکٹ ہے اور سب سے زیادہ اہم بھی....." سیمن نے کہا۔ وہ تنظیم کا سیکریٹری بھی تھا اور ایک نامی گرامی بزنس مین بھی۔

"بہت شکریہ عزت مآب....." ابراہام نے احتراماً گردن جھکائی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ راتوں رات بلینز ڈالرز اور اس سے زیادہ قیمتی سونے کا مالک بننے جا رہا تھا۔ اس کا برسوں کا خواب اب تعبیر بننے والا تھا۔ وہ خوش تھا بہت زیادہ خوش..... خوشی اس کے ہر انداز سے ظاہر تھی۔ وہ اب دنیا بھر کے مسلمانوں پر قہر بن کر گرنے والا تھا..... اس نے سوچا اور مطمئن انداز میں مسکرایا۔ یہ اور بات ہے کہ اس مسکراہٹ میں سفاکی اور بربریت موجود تھی۔

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستانِ حیات کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

دور مشرقی سمت سے سورج کا سرخ گولا بلند ہونا شروع ہوا۔ اُفق سے اس کی نو دمیدہ کرنیں پھوٹنے لگیں۔ کھنڈالا کی سرسبز پہاڑیوں کے وسط میں بل کھاتی ''سنگل بیلٹ'' سڑک بلند ہوتی ''بھور گھات'' تک یوں چلی جا رہی تھی جیسے کوئی لمبا اژدہا بھور گھات کی پہاڑیوں پر رینگتا چلا جا رہا ہو۔

اِن دونوں کے وسط میں ایک نو آبادیاتی چھوٹا پہاڑی شہر تھا۔ نیا اس وجہ سے کہ اس سے پہلے یہ ایک چھوٹا سا گمنام

ذہانت کا کوئی نعم البدل نہیں... بعض ذہین افراد مرتے مرتے اور اپنے جانے کے بعد بھی اپنے علم سے فائدہ اٹھاتے ہیں... اور ثابت کر دیتے ہیں کہ دماغ کے استعمال سے جرم کو بھی نفع بخش بنایا جا سکتا ہے...

دلچسپ پیرائے میں اختتام کی جانب گامزن تفتیش کی انوکھی رُوداد.....

حسابی قتل

عبدالرب بھٹی

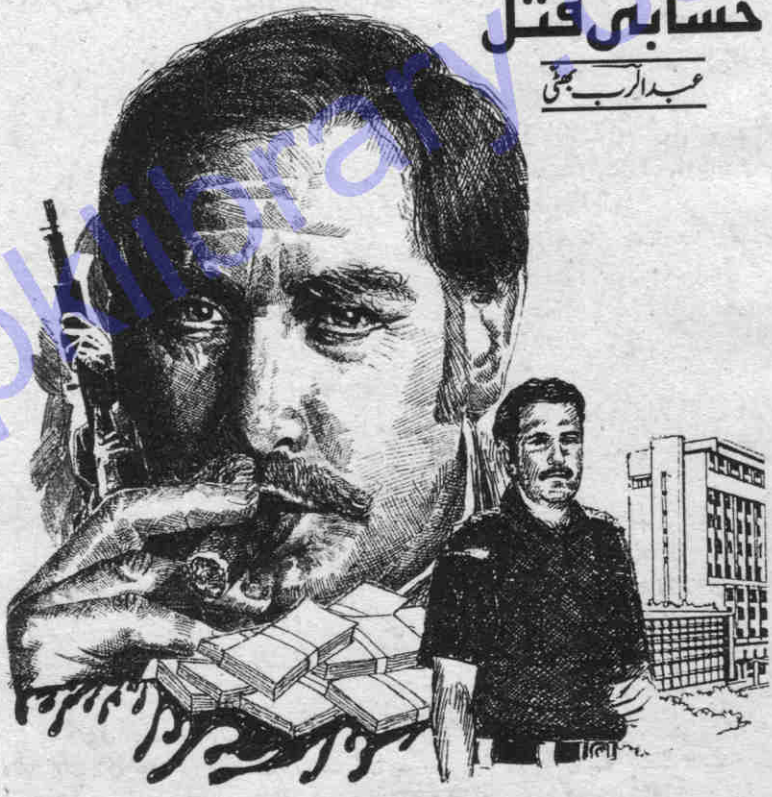

pklibrary.com

گاؤں اور پھر قصبہ تھا لیکن اب یہ باقاعدہ شہر کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ کھنڈالا کا یہ پورا علاقہ صوبہ مہاراشٹر کے اہم شہروں میں شمار ہونے لگا تھا۔ یوں آس پاس کے دیگر گاؤں بھور گھات، کھوپولی اور کرجات بھی اسی طرح ترقی یافتہ شہر بننے لگے تھے۔ لاسلکی ٹیلی کمیونیکیشن، موبائل ٹاورز اور انٹرنیٹ کی سہولیات بھی میسر ہو چکی تھیں۔ ممبئی اور پونا کی قربت اس کی مین وجہ تھی۔

لوناوالا نامی شہر نے بھی یہاں تیزی سے ترقی کی تھی۔ ممبئی لوکل گورنمنٹ، میونسپل اور ٹاؤن کمیٹی کی طرح یہاں بھی یہ سب قائم ہو چکا تھا۔ سیاسی امیدواروں نے یہاں عوام سے محض زبانی کلامی دعویٰ کر کے ووٹ نہیں لیے تھے بلکہ انہوں نے برسرِ اقتدار آ کر یہاں جو کچھ کیا تھا وہ زبان زدِ عام اور نظر بھی آ رہا تھا۔ بلکہ اب ان کی جانب سے ایک اور دعویٰ کیا جا رہا تھا کہ آنے والے دنوں میں یہاں ایک ایسا پاور پلانٹ نصب کریں گے جو پورے کھنڈالا کو مفت بجلی فراہم کرے گا۔ عوام کو اب ان کے دعوے پر پورا یقین تھا۔

یہ پورا علاقہ ''ہل پلیس'' اور پُرفضا ہونے کے سبب یہاں سیاحوں کا بھی ہجوم لگا رہتا تھا۔ آج کل بارشوں کا موسم تھا۔

بہرکیف یہاں بہت امن تھا، قتل یا ڈاکا زنی اور چوری چکاری تو دور کی بات تھی، معمولی سا فساد بھی یہاں کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہاں ''مین پبلک پارک'' میں ایک لاش پائی گئی تو ہر طرف سراسیمگی دوڑ گئی۔ سوئے اتفاق لاش، انسپکٹر رامیش ڈانڈیکر نے ہی سب سے پہلے دیکھی تھی۔ اس کا گھر قریب ہی تھا اور وہ یہاں روز تو نہیں البتہ دوسرے تیسرے روز جوگنگ کے لیے آ جایا کرتا تھا۔

وہ ایک پینتیس چالیس سالہ صحت مند شخص تھا۔ جرائم نہ ہونے کی وجہ سے گویا راوی اس کے لیے چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ اس نے پارک میں ایک شخص کو بینچ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اُونگھتے اُونگھتے سو گیا ہو۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ انسپکٹر رامیش ڈانڈیکر کو جب یقین ہو گیا کہ اب اس شخص کا شمار زندوں میں نہیں کیا جا سکتا تو اس نے فوراً اپنے سیل پر تھانے فون کر کے مختصر سی کمک منگوالی۔

آن کی آن کی میں وہاں لوگوں کا مجمع بھی لگ گیا تھا۔ لوگ بڑی شدومد کے ساتھ اس لاش کے متعلق چہ میگوئیاں کرنے میں مصروف تھے۔ اب ہلکی ہلکی بارش بھی ہونے لگی تھی۔

''اوکے، راہول!'' اس دوران میں انسپکٹر رامیش نے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔ ''اب اس بے چارے کی لاش ڈھانپ دو اور ان لوگوں سے کہو کہ یہاں مجمع نہ لگائیں۔''

ماتحت راہول نے اپنی برساتی لاش پر پھیلا دی تھی اور پولیس کانسٹیبل لوگوں کو پیچھے ہٹانے لگے۔

''یہ کام بہت طاقت ور رائفل کا ہے۔'' انسپکٹر رامیش، راہول سے کہہ رہا تھا۔ ''اور..... نشانہ کافی فاصلے سے لیا گیا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے پارک کے دوسری طرف واقع ہوٹل کی طرف دیکھا۔ ''غالباً اس ہوٹل کی چھٹی یا ساتویں منزل سے یہ کام انجام دیا گیا ہے۔ یاور، ڈاکٹر بھاٹیا کو بلانے گیا ہے۔ اس کے آتے ہی تم لوگ ہوٹل کی ہر منزل کی اچھی طرح تلاشی لینا اور ہوٹل کے عملے کے علاوہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کو بھی ٹٹولنا۔''

اسی وقت پولیس کی ایک اور گشتی گاڑی تیزی سے ان کے قریب آ کر رکی۔ یاور اچھل کر اندر سے برآمد ہوا۔ اس نے دوڑ کر دوسری طرف کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھے ہوئے ایک معمر شخص کی مدد کرنے کی کوشش کی جس نے ہاتھ ہلا کر نوجوان پولیس والے کو ایک طرف ہٹا دیا اور کسی سہارے کے بغیر گاڑی سے باہر نکل آیا۔

وہ بے حد دُبلا پتلا اور بلند قامت شخص تھا۔ کمر بالکل سیدھی تھی۔ چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، لیکن جبڑے کی بناوٹ، مضبوط کردار... آہنی عزم کا پتا دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بے حد چمک دار تھیں اور کشادہ پیشانی ذہانت کی غماز تھی۔

انسپکٹر رامیش ڈانڈیکر نے فوراً آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ ''زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر بھاٹیا!''

''مجھے ڈاکٹر کہہ کر مخاطب نہ کرو۔'' ڈاکٹر بھاٹیا نے سنکی پن سے کہا۔ ''میں دواؤں والا ڈاکٹر نہیں ہوں..... اور میری ڈگری بھی اعزازی ہے جو فاؤنڈیشن کے لیٹر پیڈ پر ہی اچھی لگتی ہے۔ اب بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟''

''یاور نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟''

''نہیں، وہ بہت کم گو نوجوان معلوم ہوتا ہے۔ غالباً پولیس میں نیا بھرتی ہوا ہے۔''

انسپکٹر رامیش نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ ''وہ

صرف احکامات کی تعمیل کر رہا ہے ڈاکٹر صاحب!"

"کیا میں تمہیں پھر یاد دلاؤں کہ مجھے ڈاکٹر کہہ کر مخاطب نہ کرو۔"

"شما کر دیجیے، بھائیا صاحب۔ میرا نام انسپکٹر رامیش ڈانڈیکر ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں نے اپنی عمر کے ستر سالوں میں سے بیس سال اسی شہر میں گزارے ہیں جب یہ ایک چھوٹا سا اور غیر معروف قصبہ کہلاتا تھا۔ جب بھی اخبارات میں موت اور زندگی کے واقعات چھپتے ہیں تو ان کے ساتھ تمہارا نام یا تمہارا چہرہ بھی شائع ہوتا ہے۔ پونا میں تھے نا تم پہلے، خیر، لگتا ہے یہاں بھی وارداتیں تمہارا تعاقب کرتی آ گئی ہیں؟" وہ ہنسا۔ پھر اسی تیکھے پن سے آگے بولا۔

"اب سوال یہ ہے کہ قتل کی اس واردات سے آخر میرا کیا تعلق ہو سکتا ہے کہ اتنی صبح تم نے مجھے یہاں بلایا ہے؟"

"مسٹر بھائیا! آپ کا یہ خیال درست ہے کہ یہاں قتل کی واردات ہوئی ہے۔ قاتل نے ایک طاقتور رائفل کے ذریعے کافی فاصلے سے مقتول کے دل کا نشانہ لے کر گولی چلائی ہے۔ قاتل کا نشانہ بہت عمدہ تھا۔ گولی ٹھیک دل میں لگی اور موت فوری طور پر واقع ہو گئی۔"

مسٹر بھائیا نے چاندی کے سگار کیس سے سگار منتخب کرتے ہوئے اسے جلایا۔ "کیا میں مقتول سے واقف ہوں؟"

"اس کا تو ابھی ہمیں علم نہیں ہے لیکن یہ بات یقینی نظر آتی ہے کہ مقتول آپ سے واقف تھا۔" کہتے ہوئے انسپکٹر رامیش نے بھانپتی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر کو گھورا مگر وہاں اس کی بات پر چونکنے کے آثار نہ پا کر پُرسوچ سے انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"کون ہے یہ؟ کیا نام ہے اس کا؟"

"اس کا ابھی ہمیں علم نہیں ہے۔ اس کی جیبوں سے ہمیں ایک بٹوے کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ اس بٹوے میں صرف ایک کارڈ تھا۔ جس پر لکھا تھا کہ کسی حادثے کی صورت فلاں صاحب کو فلاں جگہ اطلاع دی جائے۔"

ڈاکٹر بھائیا نے سگار کا ایک گہرا کش لیا۔ "اور اس کارڈ پر فلاں صاحب کی جگہ میرا نام اور پتا لکھا ہوا تھا.....؟"

"آپ کا اندازہ درست ہے جناب!" رامیش نے کہا۔ "کیا آپ مقتول کی شناخت میں ہماری مدد فرمانا پسند کریں گے؟"

"ضرور۔"

"اس طرف تشریف لائیں ڈاکٹر! اوہ..... شما کیجیے گا، مسٹر بھائیا۔"

مسٹر بھائیا نے آگے بڑھ کر لاش پر پڑی ہوئی برساتی ایک طرف کھسکائی، مقتول کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بھائیا کے تاثرات بدل گئے۔

"آپ مقتول کو جانتے ہیں مسٹر بھائیا؟"

"جی ہاں، خوب اچھی طرح۔"

"کون ہے یہ؟"

لیکن مسٹر بھائیا نے انسپکٹر رامیش کا جیسے سوال ہی نہیں سنا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ پھر انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے جیسے خود کو مخاطب کیا۔

"بے چارہ ماندیکر۔ طبعی موت سے صرف ایک ڈیڑھ مہینے پہلے ہی اس کا یہ حشر ہونا تھا۔ افسوس!"

انسپکٹر کو اس کی بات سن کر حیرت سی ہوئی تاہم مستفسر ہوا۔ "ماندیکر! مقتول کا نام ماندیکر ہے؟"

جواب میں مسٹر بھائیا نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

"ہاں، یہی نام ہے اس کا، ماندیکر راہوجا..... ممبئی کے بہترین ریاضی دانوں میں سے ایک....." پھر بھائیا نے پلٹ کر سخت نظروں سے انسپکٹر کو گھورا۔ "یاد رکھنا، انسپکٹر! اس کی ڈگری اعزازی نہیں تھی۔ اس نے میتھ میٹکس میں ڈاکٹریٹ کی تھی۔"

"کیا یہ فاؤنڈیشن سے منسلک تھے؟" انسپکٹر نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "آپ نے ابھی طبعی موت اور ڈیڑھ ماہ کے وقفے کا ذکر کیا تھا۔ یہ کیا چکر ہے؟"

ڈاکٹر ماندیکر، اس معاملے میں بڑا بدقسمت تھا۔ اسے کینسر تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ دو ماہ تک زندہ رہتا، لیکن اس سے پہلے ہی کوئی....." مسٹر بھائیا جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئے۔

"آپ کی مقتول سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

"کل سہ پہر کو ہم شام کی چائے ساتھ پی رہے تھے اور حسبِ معمول سنجیدہ موضوعات پر بحث کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ماندیکر راہوجا..... مجھے بتا رہے تھے کہ ریاضی کی مدد سے کس طرح مذہب اور اخلاقی قدروں کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔"

"یہ موضوع میری سمجھ سے بالاتر ہے جناب!" انسپکٹر

pklibrary.com

رامیش نے معذرتی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کل جب آپ کی ان سے ملاقات ہوئی تھی تو کیا انہیں زکام تھا.....؟''

''بڑا عجیب سوال کیا ہے تم نے انسپکٹر! اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے چھ ماہ سے ڈاکٹر ماندیکر ایک ایسی دوا استعمال کر رہے تھے کہ ان پر سردی کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔''

''کوئی نئی دوا تھی جناب؟ ممکن ہے فاؤنڈیشن کی تجربہ گاہ میں تیار ہونے والی کسی نئی دوا کا تجربہ کیا گیا ہو!''

''نہیں انسپکٹر! وہ دنیا کی قدیم ترین مگر عام مستعمل ہونے والی دواؤں میں سے ایک ہے۔ میرا اشارہ مارفین کی طرف ہے..... یہ دوا نہ صرف درد اور تکلیف کو ختم کر دیتی ہے بلکہ بہت سے مریضوں پر اس کا اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ سردی لگنے اور زکام سے بالکل محفوظ ہو جاتے ہیں مگر تم نے یہ سوال کیوں پوچھا تھا؟''

تب ہی انسپکٹر رامیش نے اپنی جیب سے ایک رومال نکالا اور کھول کر اسے مسٹر بھاٹیا کو دکھایا۔ رومال کے بیچ میں ایک گول سوراخ تھا۔ بولا۔ ''یہ رومال ہمیں مقتول کی گود میں پڑا ہوا ملا تھا۔ میرے اسسٹنٹ راہول کا خیال تھا کہ مقتول کو اس وقت گولی ماری گئی ہے، جب وہ ناک صاف کر رہے تھے۔ جبکہ میرا خیال کچھ اور تھا۔ اب چونکہ آپ نے تصدیق کر دی ہے کہ ڈاکٹر ماندیکر کو زکام نہیں تھا اس لیے میرا نظریہ درست ثابت ہوتا ہے۔''

مسٹر بھاٹیا چند لمحے کے لیے انسپکٹر رامیش کو عجیب نظروں سے گھورتے رہے پھر بولے۔

''تم یہ کہنا چاہتے ہو انسپکٹر! کہ ڈاکٹر ماندیکر نے دانستہ یہ رومال اپنے سینے پر اپنے دل کے مقام پر پھیلا دیا تھا تاکہ قاتل کو جو کافی فاصلے پر ہوٹل کی چھٹی یا ساتویں منزل پر موجود تھا، اسے سفید رومال کی وجہ سے دل کا نشانہ لینے میں آسانی رہے؟''

''جی ہاں! میرا یہی خیال ہے، کیونکہ مقتول کے کوٹ کا رنگ گہرا نیلا تھا اور رومال کا رنگ سفید ہے۔ کوئی بھی شخص رائفل کی نال پر لگی ہوئی دوربین کی مدد سے فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود اس رومال کی وجہ سے بالکل ٹھیک نشانہ لگا سکتا ہے۔''

''لیکن انسپکٹر! ڈاکٹر ماندیکر کو اس کی کیا ضرورت تھی؟ اسے تو معلوم تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو ماہ زندہ رہے گا۔ پھر بھلا اسے خود کو ہلاک کروانے کے لیے اس تمام بکھیڑے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر وہ خودکشی ہی کرنا چاہتا تھا تو اس کے دوسرے بہت سے آسان طریقے تھے۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے اسے پہلے تو کرائے کا قاتل تلاش کرنا پڑا ہوگا اور خود کو قتل کروانے کے لیے اسے خاصا معاوضہ بھی دینا پڑا ہوگا۔ نہیں انسپکٹر.....! تمہارا مفروضہ غلط نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے تو میں یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ڈاکٹر ماندیکر خودکشی کرنا چاہتا تھا اور اگر کچھ دیر کے لیے اس مفروضے کو مان بھی لیا جائے تب بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کام کے لیے اس نے اتنا ٹیڑھا اور مہنگا راستہ کیوں اختیار کیا۔''

''جہاں تک خودکشی کا سوال ہے جناب! تو اس کی ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ آپ نے ابھی بتایا ہے کہ وہ کینسر کا مریض تھا اور زیادہ سے زیادہ دو ماہ کا مہمان تھا۔ موت کے انتظار کی دہشت اور ناقابلِ برداشت تکلیف خودکشی کے لیے معقول وجوہات ہیں۔''

''تمہارے دونوں خیال غلط ہیں انسپکٹر!'' بھاٹیا بے تاثر انداز میں مسکرایا۔ ''پولیس والے ہو نا اسی لیے قیاسات اور مفروضے کی لائن پر چلنے کے عادی ہو۔ اب میری ٹھوس حقیقت پر مبنی بات سنو، پہلی بات یہ کہ ڈاکٹر ماندیکر موت سے دہشت زدہ تھا ہی نہیں۔ اس کی گواہی تو فاؤنڈیشن کے وہ تمام افراد بھی دے سکتے ہیں جن سے وہ تقریباً روزانہ ہی ملتا تھا۔ رہا تکلیف کا سوال تو اسے تکلیف نہیں تھی۔ مارفین استعمال کرنے کی یہی وجہ تھی۔ ہاں، یہ ایک علیحدہ چیز ہے کہ وہ بہت کم کھاتا تھا اور بہت جلد تھک جاتا تھا اور پچھلے چند ماہ کے دوران خاصا دُبلا ہو گیا تھا۔''

''تب اس کی دوسری وجہ سوچنا پڑے گی۔ بیمہ پالیسی؟ کیا خیال ہے آپ کا مسٹر بھاٹیا! کیا خودکشی کی وجہ بیمہ پالیسی نہیں ہو سکتی؟ کچھ پالیسیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں طبعی موت پر ورثا کو بیمے کی دُگنی رقم ادا کی جاتی ہے۔''

مسٹر بھاٹیا سگار سلگاتے ہوئے کچھ سوچنے لگے اور پھر انہوں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ''ہاں، ہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ خودکشی کی یہ وجہ ڈاکٹر ماندیکر کی فطرت سے میل کھاتی ہے۔''

''کیا مقتول نے ایسی کوئی بیمہ پالیسی لی ہوئی تھی جناب؟''

''مجھے اس بارے میں تو کوئی علم نہیں انسپکٹر! یہ موضوع کبھی زیرِ بحث نہیں آیا۔''

''کیا مرحوم شادی شدہ تھے؟''

''ہاں، اس کی شادی ابھی چند سال قبل ہوئی تھی۔ یہ اس کی دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی کا انتقال تقریباً ایک سال قبل ہوا تھا۔ میں نہ تو اس کی پہلی بیوی کو جانتا تھا اور نہ موجودہ بیوی سے واقف ہوں۔ اب تو اسے بیوہ کہنا چاہیے لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس کی دوسری شادی کامیاب نہیں تھی۔''

☆☆☆

آدھے گھنٹے بعد مسٹر بھاٹیا اور انسپکٹر رامیش ایک رہائشی عمارت کے صدر دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک دروازے پر ڈاکٹر ماندیکر کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی اور نیچے کال بیل کا بٹن تھا۔

پانچویں بار گھنٹی بجانے کے بعد ایک نیم خوابیدہ عورت نے دروازہ کھولا۔ اس کی عمر تیس سال کے قریب نظر آتی تھی۔ وہ اس طرح بے وقت بیدار کیے جانے پر برہم نظر آئی لیکن جب مسٹر بھاٹیا نے اپنا تعارف کرایا تو اس کی برہمی حیرت و معذرت میں بدل گئی۔

اس نے جلدی جلدی بال اور لباس درست کرتے ہوئے ان سے اندر آنے کی درخواست کی۔ مسٹر بھاٹیا اور انسپکٹر رامیش، ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

''مجھے بے حد افسوس ہے مسز ماندیکر.....'' مسٹر بھاٹیا نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کے پتی کے متعلق ایک بری خبر لایا ہوں۔''

مسز ماندیکر لفظوں کی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہی، بولی۔ ''معاف کیجیے، میرے پتی اس وقت گھر پر موجود نہیں ہیں۔''

''ہمیں معلوم ہے۔'' اس بار انسپکٹر رامیش نے کہا۔ ''وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے، وہ مر چکے ہیں۔''

پہلے تو مسز ماندیکر کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔ پھر اس کے چہرے پر حیرت و استعجاب کے آثار نمودار ہوئے۔ ''مر چکے ہیں۔ کیا ماندیکر کا دیہانت ہو گیا ہے؟'' مسز ماندیکر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر سرخی سی دوڑنے لگی تھی۔ جیسے یہ خبر سن کر اسے کچھ مسرت ہوئی لیکن وہ دوسروں سے اپنی مسرت چھپانا چاہتی ہو۔ ''خیر، یہ خبر میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے۔''

انسپکٹر رامیش، مسز ماندیکر کے چہرے پر بدلتے ہوئے تاثرات بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ ''کیا آپ کو آج اپنے پتی کے مرنے کی توقع تھی؟'' اس کا لہجہ ذرا سخت ہو گیا۔

''نن..... نہیں آج تو نہیں۔'' مسز ماندیکر، انسپکٹر رامیش کی سخت نظروں سے گھبرا سی گئی۔ ''یہ کون صاحب ہیں، ڈاکٹر بھاٹیا؟''

مسٹر بھاٹیا نے انسپکٹر رامیش کا تعارف کرایا اور پھر انسپکٹر سے کہا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں مسز ماندیکر سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور..... ضرور.....''

''میرا خیال ہے مسز ماندیکر! آپ اپنے پتی کی بیماری سے واقف تھیں؟''

''جی ہاں! مجھے معلوم تھا کہ وہ کینسر کے مریض ہیں اور ان کا مرض اب لاعلاج ہے اور ان کی زندگی بہت مختصر رہ گئی ہے۔ پہلے تو مجھے اس اطلاع پر یقین نہیں تھا لیکن ماندیکر نے مجھے ڈاکٹر سے ان باتوں کی تصدیق کے لیے مجبور کیا۔ تب پہلی بار مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔''

''ماندیکر نے آپ کو یہ اطلاع کب دی تھی؟ میرا مطلب ہے اپنی بیماری کے متعلق؟''

''ابھی چند ہفتے پہلے۔''

''اور اس کی زبانی یہ خبر سن کر آخر آپ کو یقین کیوں نہیں آیا؟''

''اس کی وجہ بیمہ پالیسی تھی۔'' مسز ماندیکر نے کہا۔ ''ماندیکر بھیڑ کی طرح بزدل لیکن لومڑی کی طرح چالاک تھے۔''

کچھ کہنے سے پہلے انسپکٹر رامیش نے کھنکھار کر گلا صاف کیا لیکن مسٹر بھاٹیا نے اسے کوئی سوال کرنے کا موقع نہیں دیا۔ انہوں نے جلدی سے مسز ماندیکر سے پوچھا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا، مسز ماندیکر! آخر بیمہ پالیسی کی وجہ سے آپ کو اس بات پر کیوں یقین نہیں آیا کہ آپ کے پتی موت سے بہت نزدیک ہیں؟''

''یہ بات ان کی فطرت کے خلاف تھی یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ عین فطرت کے مطابق۔ دراصل اخلاقی قدروں کے بارے میں ان کے خیالات دوسروں سے ذرا مختلف ہوتے تھے اور ان کی بنیادی وجہ ریاضی تھی۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو ریاضی کے اصولوں پر ناپتے تھے اور اس کے نتائج اخذ کیا کرتے تھے۔ انہوں نے زندگی کا بیمہ بہت پہلے کرایا تھا اور پالیسی میں وراثت کی جگہ اپنی بیٹی کا نام لکھوایا تھا، جو ان کی پہلی بیوی سے ہے۔ پھر اچانک انہوں نے اپنی بیٹی کا نام کٹوا کر وراثت میں میرا نام لکھوا دیا اور اسی لیے جب انہوں نے مجھے یہ اطلاع دی کہ وہ بہت جلد مرنے والے

ہیں تو مجھے ان کی بات پر یقین کرتے ہوئے تذبذب ہوا۔"

"کیا واقعی ماندیکر نے ایسا کیا تھا؟" ڈاکٹر بھاٹیا نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! انہوں نے ایسا ہی کیا تھا، لیکن اس وقت جب انہیں اس بات یقین ہو گیا کہ اب وہ چند ماہ کے مہمان ہیں۔ غالباً ماندیکر کو یہی کرنا چاہیے تھا۔" بتاتے ہوئے مسز ماندیکر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ آگے بولی۔ "اسے معلوم تھا کہ وہ مرنے والا ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کی بیٹی بے سہارا نہیں ہو گی کیونکہ اس کا شوہر زندہ اور تندرست ہے جبکہ اس کی موت کے بعد میں بے سہارا ہو جاؤں گی۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ اگر وہ میرے نام کی بیمہ پالیسی نہ چھوڑتا تو میں اب کیا کرتی۔ چند ہفتوں بعد جب یہ رقم ختم ہو جاتی تو دو وقت کی روٹی کے لیے مجھے ملازمت کرنی پڑتی۔ اسی خیال کے زیرِ اثر اس نے اپنی بیمہ پالیسی میں وہ تبدیلی کرائی تھی لیکن میں اس وقت اسے نہیں سمجھ سکی۔ میرا خیال تھا کہ وہ خود غرض ہے اور مجھ سے زیادہ اپنی بیٹی سے محبت کرتا ہے۔ لیکن اسے کم از کم میرے مستقبل کی بھی چنتا تھی۔ جب میں نے کینسر کے متعلق اس کے ڈاکٹر سے تصدیق کی تب اس کے خلوص پر یقین آیا۔"

"مسز ماندیکر! کیا آپ کو بیمے کی رقم معلوم ہے؟ میرا مطلب ہے کہ ماندیکر نے اپنی زندگی کا بیمہ کتنی رقم کا کرایا تھا؟"

"تقریباً ڈیڑھ کروڑ۔"

"تو اب آپ ڈیڑھ کروڑ کی مالک ہیں۔"

"ہاں، ڈیڑھ کروڑ۔" مسز ماندیکر کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس موقع پر انسپکٹر رامیش نے دخل اندازی کی۔

"ہو سکتا ہے آپ کو دُگنی رقم ملے۔ کیا پالیسی میں حادثاتی موت کی شق موجود تھی؟"

"نہیں، یہ شق ان کی پالیسی میں نہیں تھی کیونکہ بیمہ پالیسی والوں نے یہ شق شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ البتہ یہ شق میری پالیسی میں موجود ہے کیونکہ میں کم عمر ہوں۔" کہتے ہوئے مسز ماندیکر کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔

"آپ کی پالیسی؟" ڈاکٹر بھاٹیا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ "کیا آپ نے بھی زندگی کا بیمہ کرایا ہے مسز ماندیکر؟"

"جی ہاں، وہی ڈیڑھ کروڑ کا۔ اس کے ساتھ غیر طبعی موت کی دفعہ بھی موجود ہے۔ ہمارے درمیان معاہدہ ہوا تھا اور اسی وجہ سے مجھے پہلی بار اس کی نیت پر شک ہوا تھا۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں مسز ماندیکر؟"

"میرے پتی نے جب اپنی پالیسی میں تبدیلی کی تھی اور اپنی بیٹی کی جگہ وراثت میں میرا نام لکھوایا تھا تو انہوں نے یہ تبدیلی اس شرط کے ساتھ کی تھی کہ میں بھی اپنی زندگی کا بیمہ کراؤں۔ اتنی ہی رقم کا اور اپنی پالیسی میں ان کی بیٹی کو اپنا وارث مقرر کروں.. پھر پالیسی لیتے ہوئے انہوں نے بیمہ کمپنی سے غیر طبعی موت والی شق شامل کرنے پر اصرار کیا تھا۔ بیمہ کمپنی نے میری پالیسی میں یہ شق شامل کر دی لیکن ان کی پالیسی میں یہ دفعہ شامل کرنے سے انکار کر دیا مگر اب میں اپنی مرضی کی مختار ہوں۔ میں جب چاہوں اپنی پالیسی میں سے ان کی بیٹی کا نام کٹوا سکتی ہوں اور ڈاکٹر بھاٹیا! میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں جلد از جلد یہ کام کروں گی، مجھے اس کی بیٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر بھاٹیا عجیب انداز میں مسکرائے۔ "سمجھا، آپ نے اپنی زندگی کا بیمہ کراتے ہوئے ماندیکر کی بیٹی کو اس شرط پر اپنا وارث مقرر کیا کہ وہ اپنی پالیسی کا آپ کو وارث بنا دے، ٹھیک ہے نا مسز ماندیکر؟"

"ہاں، لیکن میں بالکل احمق نہیں ہوں، میں اس کے حسابی کتابی اخلاقیات پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ میری بھلائی کے لیے ایک کام کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے بھی اپنی بیٹی کے لیے ایک بھلائی کا کام کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ اس کا باپ ہے۔ نہیں جناب، میں اس قسم کی بکواس پر بھی کان نہیں دھرتی۔ میں نے بیمہ پالیسی پر اس وقت تک دستخط نہیں کیے، جب تک اس کے ڈاکٹر سے اس کے ناقابلِ علاج مرض کی تصدیق نہیں کر لی۔ بے شک وہ کینسر کا مریض تھا اور وہ مرض لاعلاج ہو چکا تھا۔"

ڈاکٹر بھاٹیا چند لمحے سوچتے رہے لیکن انسپکٹر رامیش خاموش نہیں رہا۔ وہ مسز ماندیکر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ کے شوہر کی موت کینسر سے نہیں ہوئی ہے۔"

"کینسر سے نہیں ہوئی؟ تو پھر کیسے ہوئی؟"

"رائفل کی گولی سے۔"

"رائفل! آپ کا مطلب ہے، کسی نے انہیں گولی مار کر ہلاک کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ انہیں قتل کیا گیا ہے۔"

"کس نے؟ انہیں کس نے قتل کیا؟" وہ بے تابانہ بولی۔

"اس کا ابھی پتا نہیں چلا۔ آپ کے خیال میں کون ہو

pklibrary.com

سکتا ہے؟''

''میں..... میں کیا بتا سکتی ہوں، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے۔ بہت ہی عجیب اتفاق۔ ابھی پچھلی رات ہی انہوں نے.....'' مسز ماندیکر بولتے بولتے اچانک اس طرح خاموش ہوگئیں جیسے انہیں غلطی کا احساس ہوگیا ہو۔

''پچھلی رات ماندیکر نے کیا کہا تھا، مسز ماندیکر؟'' ڈاکٹر بھاٹیا نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''انہوں نے..... اُنہوں نے مجھے ایک لفافہ دیا تھا۔ جس کے اُوپر لکھا تھا کہ اسے ان کی موت کے بعد کھولا جائے۔ اس پر میرا نام لکھا ہوا تھا اور لفافے پر مومی مہر لگی ہوئی تھی۔ اندر ایک چابی تھی اور میرے لیے ایک پیغام۔'' مسز ماندیکر رک کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

''کیا وہ پیغام ہم دیکھ سکتے ہیں مسز ماندیکر؟'' انسپکٹر رامیش نے جلدی سے کہا۔

''جی نہیں۔'' مسز ماندیکر نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ ''اس قسم کی چیزیں میاں بیوی کے درمیان راز کی حیثیت رکھتی ہیں، جنہیں کوئی تیسرا فرد نہیں دیکھ سکتا۔''

''بہت خوب! کیا آپ ہمیں اس بیمہ کمپنی کا نام بتائیں گی، جس نے آپ کا اور ماندیکر کا بیمہ کیا تھا؟''

مسز ماندیکر نے اس بیمہ کمپنی کا نام بتا دیا جسے انسپکٹر رامیش نے اپنی یادداشت میں محفوظ کرلیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ کمپنی کے ہیڈ آفس میں موجود تھے۔

استقبالیہ کمرے میں سے ہوتے ہوئے وہ میزوں کے درمیان سے گزر کر ایک کیبن کے پاس رک گئے جس کے دروازے پر کمپنی کے وائس پریزیڈنٹ کا نام اور عہدہ لکھا ہوا تھا۔ انسپکٹر رامش نے وائس پریزیڈنٹ کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا جسے سن کر اس نے انٹرکام پر اپنی سیکریٹری کو دو فائلیں لانے کا حکم دیا۔ چند منٹ بعد کمرے میں ایک نوجوان لڑکی داخل ہوئی اور دونوں فائل میز پر رکھ کر لوٹ گئی۔ بیمہ کمپنی کا وائس پریزیڈنٹ فائلوں کے ورق اُلٹتے ہوئے جلد جلد ان کا مطالعہ کررہا تھا۔

''مسز ماندیکر کی زندگی کا بیمہ ڈیڑھ کروڑ کا ہے۔'' وائس پریزیڈنٹ نے رامیش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اس پالیسی میں غیر طبعی موت کی شق بھی موجود ہے۔ دو ہفتے قبل پورے ایک سال کا پریمیم جمع کرایا گیا ہے۔ مسٹر ماندیکر کی زندگی کا بیمہ بھی ڈیڑھ کروڑ کا تھا لیکن اس میں غیر طبعی موت کی دفعہ موجود نہیں تھی۔ چار روز پہلے مسٹر ماندیکر نے اپنی بیمہ پالیسی منسوخ کرا دی تھی، جس پر کمپنی نے پریمیم اور بونس کی کل رقم بیالیس لاکھ، چھتیس ہزار سات سو پینتالیس روپے ادا کیے۔ یہ ادائیگی چیک کے ذریعے کی گئی تھی۔ یہ چیک مسٹر ماندیکر نے دوسرے روز نیشن بینک ممبئی میں جمع کرا دیا تھا اور ہمارے بینک نے اس چیک کی فوری ادائیگی کردی تھی، کوئی اور سوال محترم؟''

''صرف دو اور..... یہ بتائیے، مسز ماندیکر کی پالیسی کا وارث کون ہے؟''

پریزیڈنٹ وائس نے ایک مرتبہ پھر ایک فائل کھول کر دیکھی۔ ''یہ کوئی خاتون ہیں۔ ان کا نام مسز اوشا پاٹیکر ہے۔''

''یہ کون ہے؟ غالباً ماندیکر کی بیٹی؟'' انسپکٹر رامیش نے ساتھ بیٹھے ڈاکٹر بھاٹیا سے پوچھا۔ انہوں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اس کے شوہر کا نام راج پاٹیکر ہی ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ ایک ہائی اسکول میں لیکچرر ہے۔''

''اور مسٹر ماندیکر کی پالیسی کا وارث کون تھا جناب؟'' رامیش نے بیمہ کمپنی کے وائس پریزیڈنٹ سے سوال کیا۔

جواب میں وہ چند ثانیے دوسری فائل دیکھنے کے بعد بولا۔ ''ان کی بیوی مسز ماندیکر ان کی وارث تھیں، لیکن اس سے پہلے مسز اوشا پاٹیکر ان کی وارث تھیں۔ انہوں نے اپنی بیوی کو اپنا وارث بعد میں مقرر کیا تھا۔''

☆☆☆

بیمہ کمپنی کی عمارت سے نکل کر ڈاکٹر بھاٹیا نے انسپکٹر رامیش سے کہا۔ ''میرا خیال ہے انسپکٹر رامیش! تم ممبئی، نیشن بینک کا رخ کروگے۔''

''آپ ٹھیک سمجھے جناب! اگر آپ بوریت محسوس کر رہے ہوں تو میں پہلے آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں، ہم پولیس والوں کا کام بہت بور ہوتا ہے۔''

''نہیں انسپکٹر! میں اپنا سبق ادھورا چھوڑنے کا قائل نہیں ہوں۔''

''آپ جس تیزی سے پولیس تفتیش کا سبق سیکھ رہے ہیں، اگر اتنی تیزی سے میں ریاضی سیکھنے کا اہل ہوتا تو کبھی کا ڈپٹی کمشنر بن گیا ہوتا۔''

جب وہ نیشن بینک پہنچے تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ چند منٹ بعد وہ بینک کے اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ کے سامنے بیٹھے تھے۔ انسپکٹر رامیش نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ نے اپنے نائب سے ایک لمبا

pklibrary.com

چوڑا رجسٹر (لیجر) منگوایا۔ چند منٹ اس کے اوراق اُلٹتا رہا پھر وہ ایک جگہ رک کر رجسٹر میں تقریباً چڑھتے ہوئے اندراج پڑھنے لگا۔ اگرچہ تمام بینکنگ سسٹم آن لائن تھا مگر کچھ کھاتے لیجرز یا ہارڈ کاپی کے طور پر ریکارڈ میں اب بھی رکھے جاتے تھے۔

''ڈاکٹر ماندیکر نے چار روز قبل یہاں اس رقم کا چیک جمع کرایا تھا۔ جس کا آپ نے ابھی ذکر کیا ہے۔'' اسسٹنٹ نے کہا۔ ''دوسرے روز انہوں نے یہ ساری رقم اور وہ رقم جو ان کے اکاؤنٹ میں جمع تھی ایک چیک کے ذریعے نکلوالی اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا اکاؤنٹ بھی بند کر دیا۔ چیک جمع کروانے سے پہلے ان کے اکاؤنٹ میں چار ہزار تین سو تراسی روپے اور پچیس پیسے تھے۔''

''گویا مسٹر ماندیکر اپنا اکاؤنٹ بند کروا کر اور ساری رقم جیب میں ڈال کر یہاں سے چلے گئے؟''

''ٹھہریے! اب مجھے یاد آیا۔ انہوں نے ڈیڑھ لاکھ کی رقم بڑے نوٹوں میں لی تھی اور اسے ایک بڑے لفافے میں ڈال کر بند کر دیا تھا۔ اور تین لاکھ کا انہوں نے اوپن چیک بنوایا تھا۔ اس قسم کا چیک کوئی بھی کسی شاخ سے جب جی چاہے کیش کروا سکتا ہے۔ یہ بات مجھے اس لیے یاد ہے کہ میں نے اکاؤنٹ بند نہ کرنے کے لیے انہیں بہت قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر یہ معاملہ خود ہی مجھے نمٹانا پڑا تھا۔''

''تین لاکھ کا اوپن چیک؟'' انسپکٹر رامیش نے پُرسوچ انداز میں دہرایا۔ ''لیکن اس چیک پر کسی کا نام تو ضرور لکھا گیا ہوگا؟''

''جی ہاں، وہ چیک ایک صاحب ارجن..... ارجن گوارسی کے نام بنا تھا۔ جی ہاں، یہی نام تھا۔ ارجن گوارسی..... وہ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے ارجن گوارسی سے کسی قسم کا کاروباری معاہدہ کیا ہے، جس کی وہ پیشگی ادائیگی اس چیک کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔''

''پیشگی ادائیگی؟''

''جی ہاں، یہ بات مجھے اس لیے یاد آئی کہ انہوں نے اصرار کر کے چیک پر کئی روز بعد کی تاریخ ڈلوائی تھی جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسٹر ارجن گوارسی وہ چیک اس تاریخ سے پہلے کیش نہیں کروا سکتے۔ ٹھہریے، میں آپ کو وہ تاریخ بھی بتائے دیتا ہوں۔''

کہتے ہوئے اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ نے دوبارہ رجسٹر دیکھا۔ ''اس چیک پر بیس تاریخ ڈالی گئی تھی۔ بیس یعنی آج کی تاریخ، جی ہاں! اس چیک کو آج یا آج کے بعد کسی دن بینک کی کسی بھی شاخ سے کیش کروایا جا سکتا ہے۔''

''کیا آپ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ چیک آج کیش کروایا گیا یا اب تک کسی بھی شاخ میں ادائیگی کے لیے پیش نہیں کیا گیا؟''

''اس قسم کے چیک جب بھی کبھی کسی شاخ میں ادائیگی کے لیے پیش کیے جاتے ہیں تو ہمیں فوراً ہی بذریعہ ٹیلی فون اس کی اطلاع مل جاتی ہے۔ ٹھہریے۔ میں ابھی تصدیق کیے لیتا ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے سامنے رکھے ہوئے فون کا ریسیور اُٹھا کر آپریٹر سے اندرونی رابطے کی لائن مانگی اور چند لمحوں بعد ایک نمبر گھمایا۔ پھر وہ کسی سے چند منٹ گفتگو کرتا رہا۔ جب اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا تو اس کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''مسٹر ارجن گوارسی نے وہ چیک آج صبح ساڑھے نو بجے نیشن سیونگ میں ادائیگی کے لیے پیش کیا تھا جسے انہوں نے ہم سے تصدیق کرنے کے بعد فوراً ادا کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر ماندیکر کا کاروباری معاہدہ بخیر و خوبی انجام پا گیا۔''

''جی ہاں، آپ کا خیال درست ہے جناب! اس معاہدے میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ دونوں فریقوں نے معاہدے کی پوری سچائی سے پابندی کی۔ کسی نے بھی دوسرے کو دھوکا نہیں دیا۔''

''ایسا ہی ہونا چاہیے جناب! اگر ایمان دار لوگ ختم ہو جائیں تو دوسرے ہی روز معاشرے کا شیرازہ بکھر جائے گا۔''

آدھ گھنٹے بعد وہ پولیس اسٹیشن کی عمارت میں موجود تھے۔ انسپکٹر رامیش کی میز پر کئی رپورٹیں موجود تھیں۔ تفتیش کے مطابق مذکورہ پارک کے مقابل واقع ہوٹل کی ساتویں منزل پر، کل شام کے وقت ایک مسافر نے کمرا کرایہ پر لیا تھا اور وہ آج صبح کمرا چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے اپنا نام ڈبلیو شاستری لکھوایا تھا۔ کسی کو بھی اس کا حلیہ یاد نہیں کیونکہ کل شام جب اس نے کمرا حاصل کیا تو آنے والے مسافروں کا خاصا ہجوم تھا اور آج صبح جب اس نے کمرا چھوڑا تو رات کی ڈیوٹی والے کلرک کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں، وہ اسے غور سے نہیں دیکھ سکا۔

''یہ ہمارے مسٹر شاستری کوئی پیشہ ور قاتل نظر آتے ہیں۔'' انسپکٹر رامیش نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا اور پولیس تفتیش کے نتائج سے ڈاکٹر بھاٹیا کو آگاہ کیا۔

''شاستری کا دوسرا نام ارجن گوارسی ہے۔'' ڈاکٹر بھاٹیا نے کہا۔ ''اور ممکن ہے اس کے کئی دوسرے نام بھی ہوں۔''

دونوں کافی پیتے ہوئے اس معاملے کے مختلف زاویوں پر بحث کرنے لگے۔

''میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ڈاکٹر ماندیکر جیسے شریف اور پروفیسر قسم کے آدمی نے اس کام کے لیے کس طرح ایک پیشہ ور آدمی تلاش کیا؟ اور اسے اپنی ہی سپاری بھی دے ڈالی؟'' انسپکٹر رامیش نے کہا۔

''یہ سوال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔'' ڈاکٹر بھاٹیا نے کہا۔ ''اس کا جواب یہ ہے کہ کچھ عرصے سے وہ مختلف کلبوں اور بالخصوص جوا خانوں میں جایا کرتا تھا، اسے جوا کھیلنے کی عادت نہیں تھی، وہ سادہ مزاج آدمی تھا، ہر وقت اپنی ریاضی دانی میں گم رہنے والا، مگر وہ جوا خانوں کی مشینوں میں یہ تلاشتا پھرتا تھا کہ آخر اس میں نمبرز کس ترتیب سے اور کیسے آتے ہیں، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے کسی طوائف پر افسانہ لکھنا تھا تو اس نے کوٹھوں کا رخ کیا اور طوائفوں سے راہ و رسم بڑھائے، محض اس لیے کہ اپنے افسانوں کو حقیقت کا رنگ دے سکے۔ بہرکیف، وہیں کلب یا جوئے خانے میں ماندیکر کی ملاقات کسی ایسے آدمی سے ہوئی ہوگی۔''

''معلوم ہوتا ہے، یہ ڈاکٹر ماندیکر بہت ہی ذہین اور محنتی آدمی تھا۔ میں تو اس چیک پر غور کر رہا ہوں جو ماندیکر نے اپنے قاتل کو دینے کے لیے بنوایا تھا۔'' ڈاکٹر بھاٹیا نے کہا۔

''کوئی خاص بات؟'' رامیش نے مستفسرانہ نظروں سے بھاٹیا کی طرف دیکھا۔

''جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں.....'' بھاٹیا بولا۔ ''کہ اس پورے معاملے کی نجی رقم کی ادائیگی ہے۔ اس میں دو فریق تھے۔ قاتل اور مقتول..... دونوں کو یہ اندیشہ تھا کہ دوسرا اسے دھوکا نہ دے۔ ظاہر ہے، قاتل، ماندیکر کو ہلاک کرنے کا معاوضہ کسی اور سے طلب نہیں کر سکتا تھا۔ اسے مقتول ہی سے اپنا معاوضہ ملتا۔ چونکہ دونوں ایک دوسرے پر اعتبار نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا قاتل کو یہ ڈر تھا کہ اگر اس نے اپنا کام صحیح انجام دیا اور ماندیکر نے معاوضے کی ادائیگی میں گڑبڑ کر دی تو وہ اپنا معاوضہ کسی سے طلب نہیں کر سکے گا، ادھر ماندیکر کو یہ ڈر تھا کہ اگر اس نے اپنے قاتل کو پیشگی معاوضہ ادا کر دیا اور وہ یہ رقم لے کر غائب ہو گیا تو وہ اس کا کیا بگاڑ لے گا۔ عام طور پر پیشہ ور قاتل دھوکے باز ہوتے ہیں۔ اسی لیے ماندیکر نے ایسا طریقہ نکالا کہ اگر قاتل نے اسے دھوکا دیا اور اپنا کام نہیں کیا تو وہ صبح ہی بینک کو فون کر کے چیک کی ادائیگی رکوا دے گا۔ یعنی آج صبح اور اگر اس نے معاہدے کی پابندی کی تو اسے رقم مل جائے گی۔ کیونکہ وہ خود چیک کی ادائیگی رکوانے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔ قاتل نے بھی یہی سوچ کر وہ چیک قبول کر لیا کہ چونکہ وہ ماندیکر کو ہلاک کر ہی دے گا۔ اس لیے ماندیکر چیک کی ادائیگی نہیں رکوا سکے گا اور چیک آسانی سے کیش ہو جائے گا۔ اس لیے ماندیکر نے دھوکا دہی کے الزام کے امکانی طریقوں کو ختم کر دیا اور اپنے قاتل کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ معاہدے کے مطابق اسے ہلاک کر ہی دے۔''

''بالکل ٹھیک..... اور اب جو صورتِ حال سامنے آئی ہے، اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ماندیکر نے اپنی بیوی کو بھی قتل کروانے کا انتظام کیا ہوگا تاکہ اس کی بیوی کی موت پر بیمے کی رقم اس کی بیٹی کو مل جائے اور قتل کی صورت میں دُگنی رقم ملے یعنی تین کروڑ۔ اس طرح اس نے اپنی موت سے پہلے اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ کر دیا۔ کیا خیال ہے آپ کا اس مفروضے کے متعلق.....؟''

''انسپکٹر رامیش تم بہت اچھے شاگرد ثابت ہو رہے ہو۔ میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔ اس نے ضرور یہی انتظام کیا ہوگا اور یہ ایک اچھا جوا ہے۔ ڈیڑھ کروڑ کے بدلے تین کروڑ روپے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے جناب! لیکن یہ سوچیے کہ اس مفروضے کے مطابق ماندیکر کی بیوی کو خود اس کی موت کے بعد ہی مرنا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماندیکر نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کے معاوضے کی ادائیگی کا انتظام کس طرح کیا ہوگا...؟ ظاہر ہے کہ ماندیکر قاتل کو پیشگی معاوضہ ادا نہیں کر سکتا اس لیے ضرور کوئی ایسا انتظام کیا ہوگا کہ قاتل اس کی بیوی کو ہلاک کرنے پر مجبور ہو جائے اور اس کے بعد ہی اپنا معاوضہ وصول کرے، لیکن کس طرح؟ مسٹر بھاٹیا! یہ کام کس طرح ممکن ہے؟''

''تم وہ ڈیڑھ لاکھ روپے بھول رہے ہو جو ماندیکر نے ایک بڑے لفافے میں بند کیے تھے۔''

''ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ماندیکر نے اپنی بیوی کے قتل کا معاوضہ ڈیڑھ لاکھ طے کیا ہوگا اور مسز ماندیکر وہ عورت نہیں ہے جو دھمکی میں آ کر قاتل کو وہ لفافہ دے دے۔ اب قاتل کو لفافہ حاصل کرنے کے لیے مسز ماندیکر کو قتل کرنا ہی پڑے گا۔''

''اور وہ یہی کرے گا، یہی اس کا پیشہ ہے، کیوں انسپکٹر.....؟''

انسپکٹر رامیش کسی خیال سے چونک کر اپنی نشست

pklibrary.com

سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں اب کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ مسٹر بھاٹیا! کہ ماندیکر کس انداز سے سوچتا تھا۔ یاد ہے، مسز ماندیکر نے کیا کیا تھا؟ کل رات ماندیکر نے اسے ایک لفافہ دیا تھا، جس میں ایک چابی اور..... ایک پیغام تھا اور لفافے پر لکھ دیا تھا کہ اسے اس کی موت سے پہلے نہ کھولا جائے۔ وہ اپنی بیوی کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی آج رات ہی یہ لفافہ کھول لے گی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ رات کو جب اس کی بیوی لفافہ کھولے گی تو چابی استعمال نہیں کر سکے گی اور اسے صبح ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا، ممکن ہے مسز ماندیکر اس وقت وہ چابی استعمال کر رہی ہو۔''

''تو آپ کا خیال ہے کہ وہ چابی کسی سیف ڈپازٹ لاکر کی ہے، جس میں اس نے رقم کا لفافہ رکھا تھا؟''

''نہیں، میرا خیال ہے کہ میں ڈاکٹر ماندیکر کی سوچ کے انداز سے کافی واقف ہوں اور میرا خیال صحیح ہے تو ماندیکر نے وہ لفافہ کسی لاکر یا سیف ڈپازٹ میں نہیں بلکہ کسی سنسان علاقے میں واقع بس اسٹاپ کے لاکر میں رکھا ہوگا۔ کوئی ایسی جگہ جہاں صبح کے وقت مسافروں کی بھیڑ نہ ہوتی ہو، تاکہ قاتل وہاں اطمینان سے اپنا کام کر لے۔''

انسپکٹر رامیش نے اسی وقت اپنے سیل پر مسز ماندیکر کا نمبر ملایا۔ ڈاکٹر بھاٹیا بھویں سکیڑے اسے دیکھتا رہا۔

''شٹ۔''

''کیا ہوا؟''

''کال ریسیو نہیں ہو رہی۔''

''اوہ.....''

''لو اب، وہ بھی بند ہو گئی، بیل جانا بند ہو گئی۔''

''تو تم کچھ کرنا پڑے گا انسپکٹر!''

رامیش نے ہونٹ بھینچ لیے۔ پھر جلدی سے اس نے ایک اور نمبر ملایا، اس پر بات کی، پھر دوسرا ملا کر اپنے اس دوسرے مخبر سے بات کرنے کے دوران ہی اس کے منہ سے متاسفانہ انداز میں ''ہے بھگوان'' نکل گیا اور مایوسی کے عالم میں اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''کیا ہوا؟''

''افسوس بھاٹیا! قاتل نے اپنا کام کر ہی ڈالا۔ اس بار اس نے دور مار رائفل کی جگہ چاقو کا استعمال کیا ہے، ابھی ابھی مجھے اس واردات کے متعلق مطلع کیا گیا ہے۔'' کہتے ہوئے رامیش نے آگے تفصیل بتائی۔

''مسز ماندیکر کی لاش ابھی ابھی دریافت ہوئی ہے۔ اس کی لاش ایک پٹرول مین نے شہر کے نواحی علاقے کے بس اسٹاپ کے پیچھے ایک سنسان گلی میں پڑی دیکھی تو فوراً ریڈیو پر ہیڈ آفس کو اطلاع دی۔ یہ اطلاع ابھی ابھی آئی ہے۔''

مسٹر بھاٹیا خاموشی سے کچھ سوچتے رہے پھر انہوں نے سگار کیس میں سے ایک سگار نکال کر دانتوں میں دبا لیا۔

''بس! اب میں آخری سوال پوچھنا چاہتا ہوں انسپکٹر! اس کے ساتھ ہی میرا سبق بھی مکمل ہو جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا جرم نفع بخش ہوتا ہے؟''

''ہاں، کبھی کبھی'' انسپکٹر رامیش نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''کیوں؟'' اس نے بہ غور ڈاکٹر بھاٹیا کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر اسرار بھرے تاثرات نمایاں تھے۔

''میں اس وقت خود کو ماندیکر کی جگہ رکھ کر اس معاملے پر غور کر رہا ہوں۔ اس نے بھی اس پر ضرور غور کیا ہوگا کہ بیمہ کمپنی تین کروڑ روپے ادا کرنے میں ضرور گڑبڑ کرے گی اور قانونی بنیادوں پر اس پالیسی کو منسوخ کرنے کی کوشش کرے گی۔ ظاہر ہے ماندیکر نے اس کا بھی کوئی بندوبست کیا ہوگا۔''

''یہ تو صاف ظاہر ہے۔ موجودہ حالات میں مسز ماندیکر کی پالیسی خود بخود منسوخ ہو جائے گی۔'' انسپکٹر رامیش نے کہا۔ ''لیکن بیمہ کمپنی کو عدالت میں یہ سب کچھ ثابت کرنا پڑے گا۔''

''اور یہ سب کچھ ثابت کرنے کے لیے قاتل کا پکڑا جانا اور اس کا اعتراف جرم ضروری ہے۔''

''ظاہر ہے۔ قاتل کو پکڑے بغیر بیمہ کمپنی یہ سب کچھ ثابت نہیں کر سکتی۔''

''انسپکٹر! تمہارے خیال میں قاتل کے پکڑے جانے کے امکانات کیا ہیں؟''

''سرکاری طور پر صد فیصد، غیر سرکاری طور پر میرا خیال ہے کہ قاتل کا پکڑا جانا ایک معجزہ ہی ہوگا۔''

ڈاکٹر بھاٹیا نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور اپنا سگار جلا کر ایک گہرا کش لیا۔ بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے انسپکٹر.....! اس وقت میں بڑی سنجیدگی سے یہ سوچ رہا ہوں کہ اب میں ریاضی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دوں۔ بہت کارآمد اور مفید مضمون ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا.....''

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں جناب! میں خود بھی سنجیدگی سے اس پر غور کروں گا۔'' انسپکٹر رامیش نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

❖❖❖

pklibrary.com

دو ہفتے کی اَن تھک محنت کے بعد مجھے ایک صاف ستھرے علاقے میں دو کمروں پر مشتمل گھر کرائے پر مل ہی گیا۔ گو کہ صرف بالائی منزل ہی میری دسترس میں تھی مگر میں اسی پر خوش تھا کیونکہ مجھ اکیلے بندے کے لیے دو کمرے بہت تھے۔ خیر میں اپنا تعارف کرواتا چلوں۔ میرا نام ایڈورڈ ہے۔ میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔ میری حال ہی میں مشی گن سے یہاں پوسٹنگ ہوئی ہے چونکہ میری ابھی شادی نہیں ہوئی گویا میں تو بیوی کی روز روز کی چک چک اور بچوں کی کِل کِل سے بچا پُرسکون زندگی بسر کر رہا ہوں، ہاں بس یہاں گرمی کچھ زیادہ ہے جو میرے سکون میں خلل ڈالتی ہے۔ نچلے حصے میں ایک درمیانی عمر کی عورت رہتی ہے جو عورت کم لڑکی زیادہ لگتی ہے، اس کا نام الزبتھ ہے۔ وہی لینڈ لیڈی ہے۔ اس نے تقریباً سو شرطیں رکھنے کے بعد مجھے کرائے پر رہنے کی اجازت دی ہے۔ ہماری زیادہ بات نہیں ہوتی، کبھی دکھائی دے جائیں تو ہائے ہیلو ہو جاتی ہے بس اس سے زیادہ وہ بات بھی نہیں کرتی مگر الزبتھ میں نہ جانے کیوں مجھے کوئی بات بہت پُراسرار سی لگتی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی ذات اپنے اندر کوئی گہرے راز دفن کیے ہوئے ہے۔ ویسے بھی وہ اتنی مضبوط اور بارعب شخصیت کی مالک تھی کہ میں نے ان پورے گیارہ دنوں میں ایک بار بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بات نہیں کی۔ پہلی دفعہ جب ملاقات ہوئی تو یہ کوشش کی تھی مگر اس کی آنکھیں جیسے دہکتے انگاروں کے مانند محسوس ہوئیں اور جسم میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی تھی اس کے بعد یہ غلطی دوبارہ نہ کی۔

اس گھر کے پچھلے حصے میں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا۔ جسے جالیوں کی مدد سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔

باغیچے میں لگے پھول بے انتہا خوب صورت تھے خاص کر وہ ہارن کی شکل کے جامنی پھول۔ انہیں جب بھی میں دیکھتا دل چاہتا توڑ لوں اور جی بھر کے ان کی خوشبو کو اپنی سانسوں

عورت کو سراپا محبت کہا جاتا ہے... وہ بھی ایک عورت تھی... عورت جو سراپا ممتا کا مرقع ہوتی ہے لیکن اس کے خمیر میں تو کچھ اور بھی تھا... وہ لوگوں کی زندگی میں زہر تقسیم کر رہی تھی...

مغربی معاشرے میں پھیلے جرائم میں سے ایک جرم کا انکشاف.....

زہریلا پھول

ایشا گل

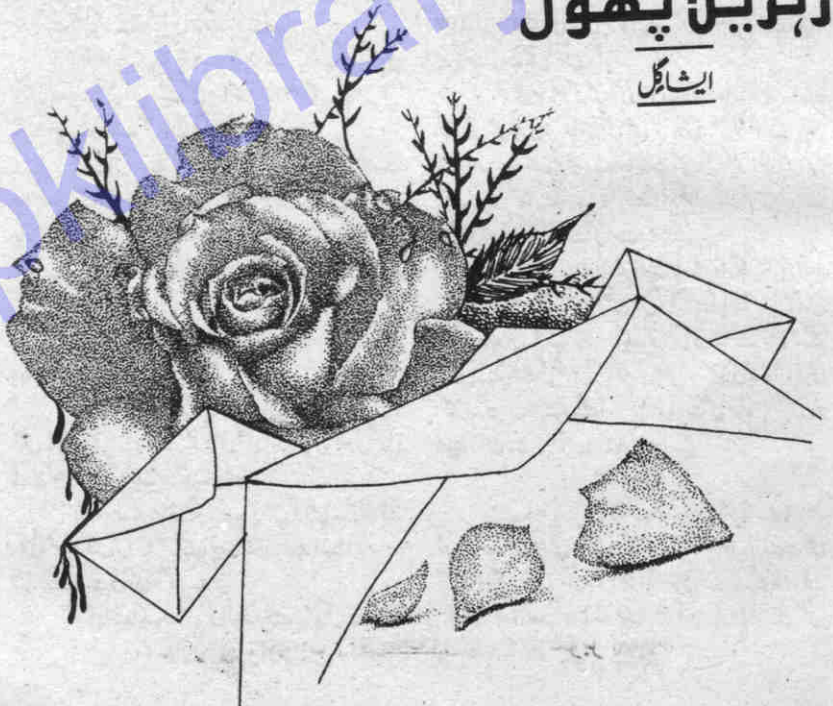

pklibrary.com

میں اتاروں مگر توڑنا تو دور کی بات اک روز میں ان کے قریب کیا چلا گیا الزبتھ میڈم نے تو اپنا جارحانہ روپ دکھا ڈالا۔ کوئی عورت صرف ایک پھول کے پیچھے اتنی طیش زدہ بھی ہو سکتی ہے مجھے پہلی بار پتا چلا تھا۔

بہر حال میں بھول گیا تھا کہ ان شرطوں میں سے ایک اہم ترین شرط ان کے باغیچے سے سوفٹ دور رہنا ہے۔ اس کے بعد سے میں نے ان کے قریب پھٹکنے سے بھی توبہ کر لی۔

☆☆☆

معمول کے مطابق میں اپنی بائیک پر کام سے واپس آ رہا تھا تو اپنے دروازے کے سامنے لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر ٹھٹکا۔ بائیک ایک سائڈ پر کھڑی کی اور ان کے بیچ جا شامل ہوا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں، اتنی بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے۔'' میں نے استفسار کیا۔

''تم کون ہو.....؟'' ایک ادھیڑ عمر آدمی نے اچھنبے سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں ان کا کرائے دار ہوں مگر آپ لوگوں نے یہاں مجمع کیوں لگا رکھا ہے۔'' میں نے الزبتھ کی جانب اشارہ کیا۔

''دیکھو ینگ مین ہمارا تمہارا کوئی معاملہ نہیں ہے ہم تو یہاں اکٹھے ہوئے ہیں اس عورت کو یہ کہنے کہ جلد از جلد اس محلے کو چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جائے۔ ہم ایک قاتلہ کو یہاں برداشت نہیں کر سکتے۔'' وہی بزرگ بولے۔

''قاتلہ۔'' میں ناسمجھی سے بڑبڑایا۔ ''یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں آپ کیسے کسی پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہیں؟'' میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی ناگواری چھپا نہ سکا۔

''تم یہاں نئے ہو لڑکے، تم نہیں جانتے یہ عورت جادوگرنی ہے کالا جادو کرتی ہے۔ اپنے شوہر کو بھی اس نے اسی جادو سے قبر میں پہنچا دیا۔ ناگن ہے یہ ناگن۔ بہت بری طرح ڈستی ہے۔ زہر بھرا ہے اس کے اندر، جس کو بھی چھوتی ہے نیلگوں کر دیتی ہے۔''

میں نے استعجاب سے ان بزرگ کو اور پھر اس عورت کو دیکھا جسے ناگن قرار دیا جا رہا تھا۔

''اگر ایسا ہے تو پھر یہ اب تک یہاں کیوں ہیں، انہیں تو جیل میں ہونا چاہیے تھا۔'' میں کسی بھی طور ان کی فضول گوئی ماننے کو تیار نہیں تھا ایک عورت میں زہر.....

''یہ عورت بہت شاطر ہے۔ پولیس کو اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکا مگر ہمیں پورا یقین ہے کہ اپنے شوہر اور اس کے دوست کی یہی قاتل ہے۔''

''لو جی اب ایک اور قتل نکل آیا۔ دیکھیے یہ یہاں سے کہیں نہیں جائیں گی۔ آپ کسی کے ساتھ زور زبردستی کرنے کا حق بالکل نہیں رکھتے اس لیے بہتر ہے کہ چپ چاپ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں خود بھی جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔''

میں نے انہیں بمشکل ان کے گھروں کی جانب روانہ کیا اور خود بھی اندر چلا آیا مگر ایک بات میں نے نوٹ کی تھی کہ اس پورے تماشے کے دوران الزبتھ صرف خاموش سامع بنی رہی بلکہ وہ تو یوں کھڑی تھی کہ گویا وہاں موجود ہی نہ ہو۔ اسے لوگوں کی باتوں اور دھمکیوں سے رتی بھر فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ ایک بار بھی اپنی صفائی میں کچھ نہ بولی جبکہ میں اس کا چند دن کا کرایہ دار ہونے کے باوجود بھی اس کا یوں حمایتی بنا رہا جیسے آدھا بچپن میرا اسی کے ساتھ گزرا ہو۔

''آپ نے ایک بار بھی ان لوگوں کا منہ بند کروانے کی کوشش نہیں کی آخر کیوں..... جبکہ آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں کہ آپ کسی کی ذرہ بھر بات بھی برداشت کرتی ہوں۔'' وہ اپنے کمرے کی سمت بڑھ رہی تھی جب دل میں مچلتے سوال کو میں نے زبان دے ڈالی۔

وہ پلٹی اور پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ اس مسکراہٹ میں کیا تھا کہ میں گھبرا سا گیا اور نظریں چرا لیں۔

''ہاں میں واقعی اپنی طرف اٹھی انگلی ہرگز برداشت نہیں کرتی مگر کیا تم نے کبھی Rappaccini's daughter والی کہانی پڑھی ہے۔'' اس سوال پر بے اختیار میرا سر اثبات میں جنبش کر گیا۔

''تو پھر تم سمجھو کہ میں اسی کہانی کے دو کردار ہوں..... ریپا چینی بھی میں ہوں اور بیٹرس بھی میں ہی ہوں۔ سن لیا تم نے، ایک بات اور..... آئندہ تم میرے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرو گے۔ یہاں رہنا ہے تو اپنے کام سے کام رکھو اور ہاں آئندہ میرے باغیچے کی طرف نظر اٹھا کے بھی مت دیکھنا۔''

وہ روکھے سے انداز میں ایک بار پھر وارننگ دیتی اندر چلی گئی جبکہ میں عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا کہ یہ خاتون کچھ زیادہ ہی عجیب نہیں۔ ایک تو اس کی حمایت میں اتنے لوگوں سے بحث کی مگر صلہ کیا ملا..... صفر..... بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں۔ خیر اس وقت تو مجھے آرام کی ضرورت تھی سو تمام سوچوں کو اپنے ذہن سے جھٹکتا زینہ چڑھ گیا۔

☆☆☆

رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ نیند نہ آنے کے باعث میں برآمدے میں لگی ریلنگ کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ ہوا بہت بھلی چل رہی تھی۔ جس سمت میں کھڑا تھا وہاں سے باغیچے کا صرف کچھ ہی حصہ دکھائی دیتا تھا جبکہ باقی گھر کے پچھلے حصے میں

چھپ جاتا تھا۔ وہ باغیچہ جس میں شاید الزبتھ کی جان تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے وہ جامنی پھول دکھائی دیتے تھے مگر اندھیرے کے باعث وہ جامنی سے سیاہ بن گئے تھے۔ میں خاموشی سے اس رات کی سیاہی میں اپنے رنگ چھپائے پھولوں کو دیکھنے لگا مگر تب ہی مجھے وہاں کوئی انسانی ہیولا دکھائی دیا۔ میں فوراً جھکنا ہوا اور ریلنگ سے ذرا پیچھے کھسکا۔ وہ جو کوئی بھی تھا وہاں سے ایک پھول توڑ کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گیا مگر جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا مجھے سمجھنے میں وقت نہ لگا کہ یہ الزبتھ ہے مگر رات کے اس پہر وہ آخر کہاں جا رہی تھی۔ یہ سوال میرے ذہن میں بری طرح کھٹکنے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں سونے کے لیے واپس نہ جا سکا بلکہ تجسس کے مارے وہیں کھڑا رہا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ واپس آئی اور اندر چلی گئی۔ میں اس سے زیادہ دیکھ نہ پایا کہ وہ گلی میں دائیں سمت گئی تھی۔

یہی سوچتے رات گزر گئی۔ صبح ہوئی تو معمول کے مطابق کام کے لیے تیار ہو کر اپنی بائیک نکالنے لگا مگر تب ہی کھٹ کھٹ کی آواز نے میری توجہ بائیک سے اپنی جانب مبذول کروائی۔ میں نے بائیک وہیں چھوڑی اور آواز کی سمت میں قدم بڑھا دیے۔ میرے قدم الزبتھ کے کمرے کے پاس جا کر رکے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا سو میں جان نہ پایا کہ یہ آواز کس چیز کی ہے۔ میں واپس پلٹا مگر ابھی دو چار قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ میری نظر ایک روشن دان پر پڑی مگر یہ قدرے اوپر تھا۔ گو کہ کسی کے کمرے میں جھانکنا غیر اخلاقی حرکات میں شمار ہوتا ہے مگر الزبتھ کی ذات میں چھپے راز مجھے اندر جھانکنے پر اکسا رہے تھے۔ میری تجسس والی رگ پھڑکنے لگی۔ میں نے قریب ہی پڑی ایک کرسی روشن دان کے نیچے رکھی اور خاموشی سے اس پر چڑھ گیا اور تانک جھانک کرنے لگا۔ کمرے کے وسط میں بیٹھیں الزبتھ چٹو بٹا لیے کچھ کوٹ رہی تھیں میں نے ان کے آس پاس نظر دوڑانا چاہی تو شدید الجھن میں گھر گیا۔ وہ ڈھیروں جامنی پھول لیے بیٹھی تھی اور ایک ایک کر کے ان کا رس نکالتی جا رہی تھی۔ جب سارا رس نکل گیا تو اسے ایک شیشے کی بوتل میں ڈالنے کے بعد دو قطرے اپنے حلق میں انڈیل لیے۔ ان پھولوں میں آخر ایسا کیا تھا جو وہ ان کا رس پی رہی تھی۔ یہی سوچ لیے میں وہاں سے چلا آیا۔ یہ عورت تو پہلے سے بھی زیادہ میرے لیے پُراسرار بنتی جا رہی تھی۔

کام سے جب میں واپس لوٹا تو کل کی طرح آج بھی گلی میں بھیڑ تھی مگر کسی اور کے دروازے پر۔

''یہاں اتنی بھیڑ کیوں ہے۔'' میں نے ایک آدمی سے استفسار کیا۔

''اسمتھ کا انتقال ہو گیا ہے، کسی نے انہیں زہر دیا تھا۔''

اسمتھ وہی بزرگ تھے جو کل پرزور انداز میں الزبتھ کو اس محلے سے نکالنے کی بات کر رہے تھے۔ آخر کس نے مارا ہوگا، انہیں وہ بھی زہر دے کر۔ ساری رات میں سوچتا رہا۔ دھیان اسمتھ کی موت سے ہٹ کے پھر سے الزبتھ کی طرف چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک خیال برق کی تیزی سے میرے ذہن میں کودا۔

''اوہ خدایا جو میں سوچ رہا ہوں کیا الزبتھ ویسی ہی ہے۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ وہ خیال جو جھماکے کی صورت میں ذہن میں آیا وہ تھا ریپا چینی کی کہانی جس میں ڈاکٹر ریپا چینی ایک سائنس داں تھا، اس نے اپنی تحقیق کو لوگوں کے لیے موثر بنانے کے بجائے ان کے لیے خطرے کا باعث بنایا۔ اس نے اپنے گھر کا ایک حصہ باغیچے کے لیے مختص کر ڈالا اور وہاں بہت سارے مصنوعی پھول پودے لگائے۔ جن کے اثرات زہریلے تھے۔ ان سے ہٹ کر ایک چشمے کے قریب ایک پودا ایسا بھی تھا جس پر جامنی پھول اُگتے تھے جن کی خوشبو اور رس دونوں ہی بہت زہریلے تھے۔ ڈاکٹر ریپا چینی نے اس پھول کا تجربہ اپنی بیٹی بیٹرس پر کیا اور اسے اس پھول کو روز سونگھنے اور اس کی دیکھ بھال پر مامور کر دیا۔ یوں وہ روز بروز زہریلی بنتی گئی، وہ جس چیز کو بھی چھوتی وہ مرجھا جاتی۔ وہ کھلے ہاتھ پھولوں کو چھو لیا کرتی جبکہ اس کا باپ ہمیشہ ماسک اور دستانے پہن کر پھولوں کو ہاتھ لگاتا تھا۔ یہ تمام کہانی جب میرے ذہن میں آئی تو میں حق دق ہی رہ گیا۔

''ڈاکٹر ریپا چینی بھی میں ہوں اور بیٹرس بھی میں ہی ہوں۔'' الزبتھ کی یہ بات بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی بلکہ کوڑوں کے مانند برس رہی تھی۔ اب مجھے کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی مگر پھر بھی میں کسی ٹھوس ثبوت کے بنا کسی پر الزام نہیں لگا سکتا تھا تب ہی میں نے سوچا کیوں نا اس جامنی پھول کو توڑ کر اس پر ریسرچ کروائی جائے۔ یہی سوچتے ہوئے میں نیچے چلا آیا۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ الزبتھ سوئی ہی ہوگی اس لیے اس وقت پھول کو حاصل کرنا آسان تھا۔ ہاتھوں میں دستانے اور چہرے پر ماسک پہن لیا اور ساتھ ایک رومال بھی لے لیا کہ اگر یہ پھول واقعی زہریلا ہوا تو کہیں میں اپنی ہی جان کو خطرے میں نہ ڈال بیٹھوں۔ میں دبے پاؤں چلتا بنا آہٹ کے دروازہ کھولے باغیچے میں چلا آیا اور بنا وقت ضائع کیے اسے توڑ کر رومال میں لیا اور ویسے ہی بلی کی سی چال چلتا اوپر چلا آیا۔ اب بس مجھے صبح کا انتظار تھا تاکہ اسے اپنے دوست کی لیب میں ریسرچ کے لیے لے جاؤں۔ اتفاق سے میرا دوست

یہیں رہائش پذیر تھا۔

قطرہ قطرہ کر کے رات کی تاریکی سنہری روشنی میں تبدیل ہوئی۔ میں نے ناشتا تیار کیا اور دفتر جانے سے پہلے اپنے دوست کی لیب چلا آیا اور اسے پھول دے کر اس کے پیچھے کی تمام کتھا اس کے گوش گزار دی۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے مجھے اپنی لیب میں بلایا۔

میں کرسی پر اس کے روبرو جا بیٹھا۔ ہمارے درمیان ایک میز حائل تھی اور میز پر پیکٹ میں بند وہی جامنی پھول پڑا تھا۔

''اب ذرا میری بات غور سے سنو۔'' میرے دوست نے گلا کھنکارتے ہوئے تمہید باندھی۔ ''یہ پھول بہت زہریلا ہے۔''

وہ مزید بولنے والا تھا کہ میں بول پڑا۔ ''یعنی میرا شک درست تھا۔ یہ واقعی زہریلا ہے اب سمجھ آئی الزبتھ بار بار مجھے باغیچے سے دور رہنے کے لیے وارن کیوں کرتی تھی اور اس روز یہی پھول لیے گھر سے باہر کیوں گئی..... اوہ میرے خدایا۔'' میں نے اپنا سر پکڑ لیا جبکہ دوست نے اپنی بات وہیں سے شروع کر دی۔

''اسے چھونا اتنا خطرناک نہیں ہے بلکہ سونگھنا بہت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے حتیٰ کہ جان بھی جاسکتی ہے کیونکہ اس کی خوشبو میں ایسا زہر ہوتا ہے جو دماغ کو مفلوج کر دیتا ہے..... دماغی نسیں پھٹ سکتی ہیں۔ بلڈ پریشر بھی ہائی ہوسکتا ہے اور ان تمام صورتوں میں جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ یہ دس سے بارہ گھنٹے تک پوری باڈی میں اثر انداز ہوتا ہے جس وقت اس کو سونگھا جائے اس وقت کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا سوائے شدید خوشبو کے مگر دس سے بارہ گھنٹے کے دوران دماغ پر اثر ہونا شروع ہوجاتا ہے۔'' وہ زہریلے پھول سے آگاہی فراہم کر کے خاموش ہوگیا۔

''یعنی یہ سیدھا دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن جو انسان اس کا رس نکال کر پیتا رہے، اس کے بارے میں تم کیا کہنا چاہو گے؟'' میرے ذہن میں اس کے وہ دو قطرے اٹکے ہوئے تھے جو الزبتھ نے اپنے حلق میں انڈیلے تھے۔

میرا دوست اس بات پر مسکرایا اور بولا۔ ''جو انسان اس خطرناک زہریلے پھول کا رس پیے جیسا کہ تم نے بتایا دو قطرے، تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خود کو زہریلا بنانے کی کوشش میں ہے۔ دو قطرے اگر وہ روز پیے تو اس کی باڈی بیلنس کر جاتی ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ ایک ہی بار میں سارا رس پی ڈالے۔ یہ خطرناک ہے۔ اس کو سونگھنا زیادہ خطرناک ہے کیونکہ ایسے یہ سیدھا دماغ پر اثر کرتا ہے۔ کبھی تم بھی تجربہ کرنا کہ کوئی ایسی خوشبو جو بہت تیز ہو یا تمہیں ناپسند ہو تو اسے سونگھنے سے تمہارا دماغ گھوم جائے گا۔ سر چکرائے گا کیونکہ خوشبو سیدھا دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے جبکہ کسی چیز کا کھانا پینا سب سے پہلے معدے پر اثر انداز ہوتا ہے پھر مکمل باڈی پر اور اب تمہیں ایک اور راز کی بات بتاؤں۔'' دوست نے رازدارانہ انداز میں کہا تو میں نے متجسس نظروں سے اسے دیکھ کر ہامی بھری۔ دوست کی مسکراہٹ پہلے سے بھی زیادہ گہری ہوگئی۔

''اس پھول کے رس میں ایسی خاصیت ہے جس سے انسان اپنی بڑھتی عمر پر بھی قابو پا سکتا ہے، ہے نا عجیب اور ناقابلِ یقین بات۔''

''ہاں واقعی ایسا کیسے ممکن ہے؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''ممکن ہے خاص کر آج کے سائنس دانوں کے لیے تو سب ممکن ہے۔ دنیا میں کئی لوگ ہیں جو اپنی عمر کو کنٹرول کرنے کی خاطر اس پھول کو استعمال کر رہے ہیں جن میں سے ایک الزبتھ بھی ہے مگر اس کے استعمال سے وہ دوسروں کے لیے خطرناک بنتی جارہی ہے۔ تم نے کبھی ریپا چینی ڈاٹر کی کہانی سنی ہے۔'' دوست کی بات کاٹ کر میں بولا۔

''تو بس پھر جان لو کہ ریپا چینی نے تو اپنی بیٹی پر تجربہ کیا مگر اس عورت نے خود پر ہی۔ جس طرح بیٹرس جس چیز کو بھی چھوتی تو وہ مرجھا جاتی اور اس کا وجود اور سانسیں انسانوں اور کیڑے مکوڑوں کے لیے بھی خطرناک ثابت ہوتیں اسی طرح الزبتھ بھی دوسروں کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ بہتر ہے کہ تم اپنا بوریا بستر اسمیٹو اور کوئی اور گھر تلاش کرو ورنہ تم بھی اس خطرے کی لپیٹ میں آسکتے ہو۔''

دوست کی بات تو ٹھیک تھی مگر میں ایسے نہیں جاسکتا تھا مجھے یقین تھا کہ اسمتھ کی موت کے پیچھے الزبتھ ہی ہے اور اب تو مجھے لوگوں کی باتوں پر بھی یقین آگیا تھا یعنی الزبتھ ایک نہیں دو نہیں بلکہ تین لوگوں کی قاتلہ ہے۔ ''مجھے اس شاطر اور خطرناک عورت سے سب کو محفوظ کرنا ہوگا ورنہ یہ ہر انگلی اٹھانے والے کو اپنے زہریلے پھولوں سے موت کے گھاٹ اتارتی جائے گی۔'' میں دوست سے کہتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔ مجھے جلد از جلد شیرف کو انفارم کرنا تھا اور اس پھول کی باقاعدہ ریسرچنگ رپورٹ انہیں دینی تھی اور الزبتھ کے گھر چھاپا پڑوانا تھا تاکہ وہ الزبتھ کا تمام سامان دیکھ سکیں جس سے وہ زہریلی دوائیں بناتی رہتی ہے۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ میں کام سے واپس آتے ہی سیدھا شیرف کے دفتر گیا اور رپورٹ سمیت تمام کتھا ان کے گوش گزاری۔ پندرہ منٹ بعد ہی ہم الزبتھ کے گھر موجود تھے۔

☆☆☆

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	سیالکوٹ	0524568440
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	میرپورAK	03460397119
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	اٹک سٹی	057210003
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	دیپالپور	03004854922
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	لیہ	03002373988
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	قصبہ ڈنگہ	03083360600
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	عارف والا	03008758799
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	لورالائی	03023844266
راولپنڈی	03005583938	بورےوالہ	03347193958	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	جلالپور پیروالا	03338303131
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	ہری پور	03321905703
رحیم یارخان	03055872626	ڈیرہ غازی خان	03336481953	چکوال	03348761952
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	وہوا	03346383400
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	حافظ آباد	0307-6479946
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	واہ کینٹ	0301-5497007
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	ایبٹ آباد	0992335847
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	چوکی	03454678832
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	مانسہرہ	0333-5021421

منڈی بہاؤالدین 0331-7619788 میچن آباد 0301-7681279 کوٹ رادھا کشن 03004992290

ڈسکہ 0300-9463975 سمبڑیال 0333-8604306 قصور 0300-6575020

حجرہ شاہ مقیم 03006969881 ٹوبہ ٹیک سنگھ 0315-6565459

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

pklibrary.com

"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ، دیکھو میرے قریب مت آنا۔"

الزبتھ اب بُری طرح پھنس چکی تھی۔ اپنے سامان کو اتھل پتھل ہوتا دیکھ کر چلّا اٹھی۔

"تم نے بلایا ہے نا ان کو، بولو..... تم دھوکے باز مکار کہیں کے، تمہیں تو میں چھوڑوں گی نہیں۔ تمہیں شرم نہیں آئی مجھ پر جھوٹا الزام لگاتے ہوئے، اکیلی عورت ہوں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی بھی مجھے کمزور سمجھ سکتا ہے۔"

وہ جان گئی کہ شیرف کو لے کر میں آیا ہوں تب ہی آپے سے باہر ہونے لگی اور لال بھبھوکا چہرہ لیے مجھے آتش فشاں سی نگاہوں سے گھورنے لگی۔

"پہلے میں بھی یہی سمجھتا رہا مس الزبتھ کہ آپ بے قصور ہیں لوگ آپ پر بلاوجہ ہی الزامات لگاتے ہیں مگر آپ سے ایک غلطی ہوگئی اور وہ یہ کہ آپ نے اپنے منہ سے اپنا راز اگل دیا۔"

میں نے اسے اس کی غلطی یاد کروانا چاہی تو اس نے الجھن بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ کون سی غلطی۔

"کیوں مس الزبتھ کیا آپ نے ہی نہیں کہا تھا مجھ سے کہ ریپا چینی بھی آپ ہیں اور بیٹرس بھی آپ ہی ہیں۔"

میں نے معنی خیز انداز میں ایک ابرو اچکا کر یاد کروایا تو اس کے سر پر جیسے کوئی بم پھٹا۔ یقیناً اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کی اس بات سے میں کس کھوج کی تہ تک پہنچ جاؤں گا۔ اس ایک جملے نے اس کی ذات میں چھپے رازوں سے پردہ ہٹا ڈالا۔ وہ غیر محسوس طریقے سے دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی گئی کیونکہ پولیس کی عورتیں اپنے چہرے پر ماسک لگائے اور ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"صحیح کہہ رہے تھے سب لوگ میری ہی وجہ سے مرا میرا شوہر مگر میں نے اسے نہیں مارا، میرے اندر پلتے زہر کے باعث وہ بھی زہریلا بنتا گیا مگر اس کا جسم اس زہر کے ساتھ سروائیو نہ کر سکا اور بے جان ہوگیا۔"

الزبتھ کو اعتراف جرم کرتا دیکھ کر دو نوں عورتیں وہیں کھڑی ہوگئیں مگر حیرت تھی کہ وہ اتنی جلدی کیسے بول پڑی۔

"مائیکل کو اپنے دوست کی موت کی اصل وجہ معلوم ہوگئی تھی تب ہی میں نے اس کو یہ کہہ کر کہ میں مشکل میں ہوں میری مدد کروا اپنے گھر بلایا۔ وہ فطرتاً رحم دل آدمی تھا، فوراً چلا آیا مگر میں نے زہریلے پھول کا رس اسے جوس میں ڈال کر پلا دیا۔ رس کی مقدار زیادہ تھی، وہ چوبیس گھنٹوں کے اندر ہی مر گیا۔ اس کی موت چونکہ سفر کے دوران ہوئی تو کسی کو مجھ پر شک نہ گزرا، نہ کوئی جان سکا کہ اس روز وہ میرے گھر آیا تھا اور رہی بات اس بوڑھے اسمتھ کی تو اس کے گھر کی دیوار پھلانگنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا، میں نے صحن میں سوئے اسمتھ کے نتھنوں کے آگے چند منٹ اس پھول کو رکھا اور پھر لوٹ آئی۔ ہاں میں نے ہی مارا اسے بھی کیونکہ مجھ سے یہ ہرگز برداشت نہیں کہ کوئی راہ میں رکاوٹ بنے۔"

"جہاں تمہیں ان پھولوں کو پیس کے رس نکالنے کی عادت ہے وہیں تم اب جیل میں بیٹھ کے چکی پیسنے کی عادت ڈالنا۔" شیرف نے یہ کہتے ہوئے اشارہ کیا اور یہ اشارہ پاتے ہی دونوں لیڈی کانسٹیبل اسے ہتھکڑیاں لگانے کو آگے بڑھیں مگر اس سے پہلے کہ وہ ان کے ہاتھوں کو ہتھکڑیوں میں مقید کرتیں۔ الزبتھ نے کمر میں چھپائی ہوئی شیشی نکالی اور کھول کر پوری کی پوری حلق میں انڈیل لی۔ یہ سب اتنا آناً فاناً ہوا کہ کوئی یہ نہ جان پایا اس شیشی میں کیا تھا، نہ ہی روک پایا۔

"تمہیں میرا خود کو بیٹرس کہنا تو یاد رہا مگر کیا تم یہ بھول گئے کہ بیٹرس کا انجام کیا ہوا تھا۔" میں یہ سن کر ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

"کیا تم بھول گئے کہ بیٹرس کو کسی پولیس نے گرفتار نہیں کیا تھا بیٹرس کی موت ہوئی تھی اور وہ بھی ایک تریاق کی زیادتی سے۔"

اوہ میرے خدایا یعنی الزبتھ نے ایک تریاق اس صورت حال کے لیے پہلے سے ہی تیار کر رکھا تھا مگر یہ تریاق اس کی جان بچانے کے لیے نہیں بلکہ جان لینے کے لیے تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیچے گر پڑی اور دھیرے دھیرے اس کا جسم نیلا پڑنے لگا ایسا نیلا کہ شاید ہی کسی زہریلے انسان کا بھی ہوا ہو۔

"کوئی اس کے پاس نہ جائے اس حالت میں اسے چھونا زندہ حالت سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔" شیرف نے سب کو وارن کیا جبکہ میں گم صم سا کھڑا رہا۔ میں نے یہ تو نہیں چاہا تھا کہ ایک عورت میرے سامنے اپنی جان لے ڈالے۔ میں اسے موت کی سزا تو نہیں دینا چاہتا تھا مگر شاید اس کے نزدیک اس کے لیے موت جیل سے بہتر تھی مگر کیا ہی یہ اچھا تھا کہ الزبتھ ریپا چینی کی طرح پھولوں پر کی گئی اپنی تحقیق کو لوگوں کے لیے فائدہ مند بناتی نہ کہ خود کے اور دوسروں کے لیے نقصان اور خطرے کا باعث بنی۔ اگر وہ ان کا درست یعنی فائدہ مند استعمال کرتی تو آج اس کا انجام اس قدر بُرا نہ ہوتا آج اسے خود کو اپنے ہی ہاتھوں حرام موت کے سپرد نہ کرنا پڑتا۔

پولیس اپنا کام کرتی رہی جبکہ میں اوپر آ کر اپنا سامان سمیٹنے لگا اب مجھے نئے سرے سے کرائے کے لیے کوئی بہتر گھر تلاش کرنا تھا مگر یہ تو طے تھا کہ جو گھر مجھے ڈھونڈنا تھا اسے زہریلے پھولوں سے پاک ہونا تھا۔

❖❖❖

pklibrary.com

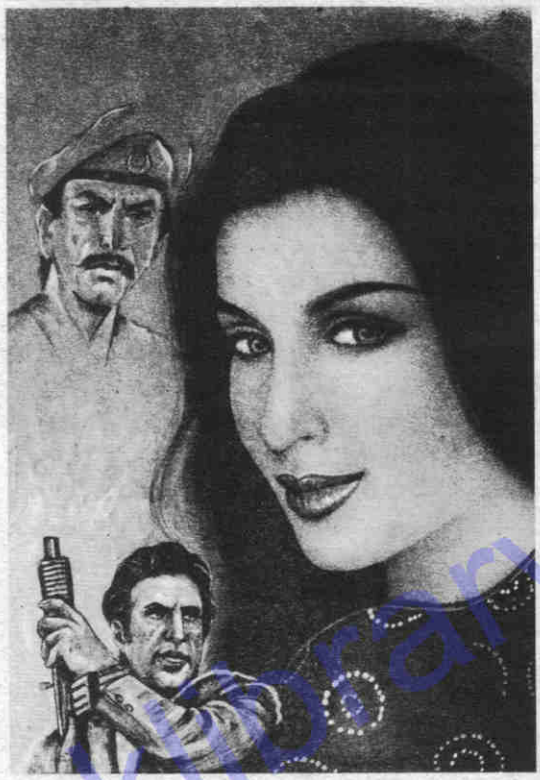

دھندلی تصویر

یعقوب بھٹی

لوگ رفتہ رفتہ حالات کے عادی ہو جاتے ہیں... چاہے وہ کتنے ہی تباہ کن حالات ہی کیوں نہ ہوں... زندگی کا دھارا بہہ نکلتا ہے... مگر بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ ماضی کے ایک واقعے سے خود کو جوڑ کر رکھتے ہیں۔ خوش فہمی یا غلط فہمی جو بھی ہو اسے اپنی زندگی کے لیے لازمی قرار دیتے ہوئے آکاس بیل کے مانند لپٹے رہتے ہیں... دل و دماغ کو جکڑ لینے والی ایک ایسی ہی دھندلی تصویر کی اسیری میں زندگی گزارنے والے محبت گزیدہ کا دل خراش ماجرا...

وصل و انتظار کے لمحوں میں قید ایک سیاہ بخت کی چاہتیں.....

پورٹ الزبتھ کی وہ ایک قدرے خنک رات تھی۔ ہفتے کی رات کی ساری سرمستی دم توڑ چکی تھی۔ اپنی ڈیوٹی آف کر کے میں نے اپنی راہ لی تھی۔ میں ایک بار روم میں کام کرتا تھا جو ایک سردار جی کی ملکیت تھا۔ سردار جی اپنی نوجوان بیٹی کے ساتھ مل کر بار روم چلاتے تھے۔ بار کے دیگر کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے ساتھ ساتھ بدمست شرابیوں سے نمٹنا بھی میری ذمے داری تھی۔

میری رہائش گاہ اور بار روم کے درمیان چند بلاک

pklibrary.com

ہی حائل تھے۔ میں آمدورفت کے لیے سائیکل کا استعمال کرتا تھا۔ میں ابھی جھلملاتی سڑک پر تھا۔ اس سڑک کو یہ نام میں نے دیا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس کے چند بلب کئی ماہ سے جل بجھ رہے تھے۔ انہیں تبدیل کرنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ جنوبی افریقہ کے بیشتر شہروں کا حال بھی وطنِ عزیز کے عام شہروں سے مختلف نہیں تھا اور جرائم کی شرح کے مقابلے میں تو ہمارا..... جنوبی افریقہ سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ اس معاملے میں یہ ہم سے بہت بلند مقام پر کھڑا ہے۔

تیزی سے پاؤں چلاتے ہوئے اس پل پر میرے ذہن میں اپنے آرام دہ بستر کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اچانک جھلملاتی روشنی میں میری نظر تین سیاہ فاموں پر پڑی جو ایک لڑکی کو کھینچتے ہوئے سڑک کے درمیان کھڑی ایک گاڑی کی طرف لے جا رہے تھے۔ لڑکی کی اسکوٹر بھی سڑک پر الٹی پڑی تھی اور اس کا عقبی پہیا گھومے جا رہا تھا۔

میرے لیے یہ ایک بے حد عام سا منظر تھا۔ رات کے اس پہر ایک تنہا لڑکی اس ویران سڑک پر اکیلی اسکوٹر پر گھوم رہی تھی تو یہ بھیڑیوں سے بھرے جنگل میں ہرنی کی چہل قدمی جیسا تھا۔

میں نے اس منظر سے نگاہیں چُرائیں اور پہلو سے نکلتا چلا گیا۔ اسی وقت میری سماعت سے چند الفاظ ٹکرائے۔ ''پلیز! میری مدد کرو! خدا کے لیے میری مدد کرو۔''

بے اختیار میں نے پوری قوت سے بریک دبائے۔ سائیکل ڈگمگا کر رک گئی۔ میرے دماغ میں جیسے زور کی اندھیری چل پڑی تھی۔ آہ..... آواز میں اگر کوئی جادو ہو سکتا ہے تو پل بھر میں، میں اس جادو کے اثر میں آ گیا تھا۔ یہ آواز تو میری جانی پہچانی تھی بلکہ میری سماعتوں کو نچوڑا جائے تو اس آواز کے سوا شاید ہی کوئی اور آواز نکلے۔ اس سے پہلے کہ میں اس آواز کو واہمہ جانتا، وہی آواز دوبارہ میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس آواز کو تو میں لاکھوں آوازوں میں جدا پہچان سکتا تھا۔ یہ آواز تہذیب کی تھی۔ جو دردناک انداز میں مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ میں سائیکل پھینک کر بے اختیار مڑا۔ ایک سیاہ فام ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا جبکہ دو لڑکی کو عقبی نشست میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میری تمام تر حسیات اس پل آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ میرے لیے اس لڑکی کے علاوہ جیسے ہر منظر دھندلا گیا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں، میں نے واضح طور پر دیکھا..... اسکن ٹائٹ جینز اور پوری آستینوں والی شرٹ میں ملبوس بے حد گھنے بالوں والی وہ ایک سانولی، سلونی سی لڑکی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

میرے سینے میں جیسے دھواں سا بھر گیا..... وہ لڑکی تہذیب نہیں تھی۔ میری سماعت نے مجھے ناقابلِ یقین دھوکا دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں پلٹ جاتا، لڑکی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ دو ہٹے کٹے سیاہ فاموں کی گرفت میں وہ پوری قوت سے مچلی اور سینے کی پوری قوت سے مدد کے لیے چلّائی اور بازو گاڑی کی چھت پر ٹکا دیے۔ اگلے پل ایک سیاہ فام نے وحشیانہ قوت سے اس کے بازو کھینچے اور سر پر ہاتھ کے دباؤ سے اسے نیچے جھکا دیا۔

میں نے حیرت سے آنکھیں جھپکیں۔ یا خدا یہ کیا ماجرا تھا۔ وہ لڑکی ہرگز تہذیب نہیں تھی مگر وہی آواز..... وہی لہجہ۔ میں دوبارہ سے اس آواز کے سحر میں ڈوب ہو گیا۔

درمیانی فاصلہ میں نے جیسے پلک جھپکتے میں طے کر لیا تھا۔ سرخ ٹی شرٹ والے کے شہتیر جیسے بازو کو میں نے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ پشت کے بل پیچھے جا گرا۔ دوسرے نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا تو لمحے بھر کو ششدر رہ گیا۔ اگلے پل اس نے لڑکی کو چھوڑ کر میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہ حرکت اسے بھاری پڑی۔ میں نے اس کی کہنی کے جوڑ کے اوپری حصے پر ضرب لگائی۔ بازو کے ساتھ ساتھ وہ بھی خم ہو گیا۔ میرے سر کی زوردار ٹکر نے یقیناً اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ ایک چیخ کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔

ڈرائیونگ سیٹ والا گالیاں بکتا ہوا نیچے اترا۔ اس کے استقبال سے پہلے میں نے ٹکر کھانے والے کو کندھے پر لاد کر پشت کے بل گرنے والے پر اچھال دیا جو اب کھڑا ہو گیا تھا۔ اس دفعہ دونوں زمین بوس ہو گئے۔

ڈرائیونگ سیٹ والا جیسے ہی نیچے اترا، میں نے پاؤں کی جچی تلی ہوئی ضرب اس کی ٹانگوں کے درمیان لگائی۔ اس دفعہ اس کے منہ سے باقاعدہ گٹر اُبل پڑا اور وہ ٹانگوں کے درمیان دونوں ہاتھ دبائے ناچنے لگا۔ سینے پر پاؤں کی زوردار ضرب وصول کرتے ہی اس نے ناچنا چھوڑا اور ہوا میں اُڑتا ہوا اسٹریٹ لائٹ کے پول سے جا ٹکرایا۔ جارح، مغلوب ہو چکے تھے۔ یہ سب محض چند سیکنڈ میں وقوع پذیر ہوا تھا۔

ایک، دوسرے کے اوپر لدے سیاہ فاموں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں حیران تھا کہ انہوں نے ابھی تک ہتھیار کیوں نہیں نکالے تھے۔ میں اس کے لیے تیار

pklibrary.com

تھا۔

چہرے پر ٹکر کھانے والے کے منہ اور ناک سے خون بہہ نکلا تھا اور چہرے پر سوجن آنا شروع ہو چکی تھی۔ وہ ایک خون آشام درندے کے مانند نظر آ رہا تھا۔ دوسرے کا چہرہ طیش کے سبب بگڑ سا گیا تھا۔ دونوں گھیرنے کے سے انداز میں درمیانی فاصلہ رکھ کر میری طرف بڑھے۔ میں نے کھلنڈرے انداز میں انہیں ایک فحش اشارہ کر کے حملے کے لیے اکسایا۔ اس سے پہلے کہ دونوں جذبات سے مغلوب ہو جاتے، خاموش فضا میں یکے بعد دیگرے گولیاں چلنے کی آواز گونجی۔

حملے کی غرض سے آگے بڑھنے والے دونوں سیاہ فام اپنے قدموں پر اُچھلے اور پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پول سے ٹکرانے والا بھی اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

میں بے اختیار گھوما۔ چند لمحوں کے لیے میں جس لڑکی کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا، وہ گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر نیچے اتر رہی تھی۔ اس کے نازک ہاتھ میں بڑا سا پسٹل کسی توپ کے مانند لگ رہا تھا (بعد ازاں معلوم ہوا کہ اس نے ڈیش بورڈ میں رکھے حملہ آوروں کے ہتھیاروں میں سے ایک نکال کر بڑی مہارت سے استعمال کیا تھا) وہ تیزی سے لپک کر میری طرف آئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تشکر نمایاں تھا۔ وہ ہیجانی انداز میں بولی۔ ''تم انڈین ہو؟''

میں کیا جواب دیتا۔ آنکھیں بند ہوتیں تو جیسے تہذیب..... میرے مقابل تھی۔

میری خاموشی کو اس نے کچھ اور سمجھا اور انگریزی میں اپنا سوال دہرایا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور بمشکل زبان کو جنبش دی۔

''نہیں..... میں پاکستان سے ہوں۔''

اس نے اردو سن کر اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ غالباً سوچ رہی تھی کہ عجیب بندہ ہے..... اردو میں کیے سوال کا جواب نہیں دیا اور انگریزی میں دہرائے اسی سوال کا جواب اردو میں آیا تھا۔

اُلجھن کو جھٹک کر وہ بولی۔ ''یہاں سے نکلنا ہوگا۔ گولیوں کی آواز پٹرولنگ پولیس کو کھینچ کر اس طرف لا رہی ہوگی۔'' پسٹل بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے اسکوٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔

''پلیز! اسے سیدھا کرنے میں میری مدد کرو۔''

میں کوشش کے باوجود اس آواز کے سحر سے نکل نہیں پا رہا تھا۔ ایک معمول کے مانند میں نے اسکوٹر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہیں رک کر پٹرولنگ پولیس کی مدد لینی چاہیے۔''

اس نے اُلجھے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ ''نہیں، میں ایک گمبھیر مسئلے کا شکار ہوں۔ پولیس کی مدد نہیں لے پاؤں گی۔'' اسکوٹر سیدھا ہوا تو اس کی حالت دیکھ کر وہ جھنجلا گئی۔ عقبی مڈگارڈ ٹیڑھا ہو کر پہیے کے ساتھ لگ گیا تھا۔ غالباً اسے عقب سے ٹکر مار کر روکا گیا تھا۔

لمحے بھر کے لیے وہ بے چین روح کے مانند نظر آئی۔ پھر اس کی آنکھیں مجھ پر آ ٹکیں۔ ''کیا باقی ماندہ رات کے لیے تم..... مجھے پناہ دے سکتے ہو..... پلیز..... انکار نہیں کرنا۔ پہلے بھی تم ناقابلِ یقین انداز میں میری مدد کر چکے ہو۔''

میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔ یا خدا یہ کیسے ممکن تھا۔ وہی آواز..... وہی لہجہ..... وہی بات کرنے کا انداز..... چہروں کی مشابہت تو اکثر دیکھی تھی مگر ایک جیسی آواز اور لہجہ پہلی دفعہ میرے علم میں آیا تھا۔

میری خاموشی کو اس نے تذبذب جانا۔ پسٹل پھینک کر اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔''

وہ، میرے اتنے قریب تھی کہ اس کے بالوں سے اُمڈتی خوشبو اور وجود کی تمازت میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس تہذیب سے جدا تھا مگر ہتھیلیوں کی نم سی گرمی یکساں تھی۔ اس نے مزید کہا۔

''یہ بھیڑیے اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ یقیناً یہاں سے مار کھانے کے بعد یہ لوگ میرے فلیٹ کے پاس گھات لگائیں گے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں..... خدا کے لیے آج کی باقی رات کے لیے مجھے پناہ دے دو۔ میں صبح ہوتے ہی نکل جاؤں گی۔'' میرے ہاتھ چھوڑ کر اس نے باقاعدہ میرے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔ اس پل وہ بے چارگی کی تصویر نظر آنے لگی۔

''ان کالوں کے ساتھ تمہارا کیا معاملہ ہے؟''

''یہ لمبی کہانی ہے۔ آرام سے بیٹھ کر سناؤں گی۔''

میں نے طویل سانس لیا۔ خود کو چند گھنٹے مزید دھوکا دینے کو جی مچل اٹھا تھا۔ ''ٹھیک ہے آ جاؤ..... میرے ساتھ۔''

وہ بچوں کے مانند خوش ہو گئی۔ اسکوٹر کے پاس ہی گرا ہوا اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر وہ جانے کے لیے تیار تھی۔

عام لوگوں کی طرح میں نے بھی اپنی سائیکل کی سیٹ

کے عقب میں بڑا سا کیریئر نصب کروایا تھا۔ ہفتے بھر کا راشن میں اسی کیریئر پر باندھ کر لے آتا تھا۔ اس پر ایک درمیانے سائز کا بیگ آسانی کے ساتھ بار کیا جا سکتا تھا۔ میں نے سائیکل سیدھی کی تو وہ 'پلک کر اسی کیریئر پر بیٹھ گئی۔ توازن کے لیے اس نے میری کمر تھام لی۔

میں نے سائیکل آگے بڑھائی۔ عقب سے اس کی آواز اُبھری۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

وجود میں میٹھی سی کسک نے سر اٹھایا۔ لگا تہذیب سے دوبارہ سے تعارف ہونے جا رہا ہے۔ ویران اور جھلملاتی سڑک پر دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔

بے اختیار زبان پھسل گئی۔ ''بندے کو وقاص شاہ کہتے ہیں۔''

وہ ہنسی۔ ''واہ..... شاعرانہ انداز۔''

شرمندگی کے احساس کے ساتھ میں خاموش رہا۔ میں یونیورسٹی میں زرغون کے تخلص کے ساتھ معروف تھا۔ سر پر شاعری کا بھوت سوار تھا اور یونیورسٹی کی حد تک معروف بھی تھا۔ میرے لفظوں سے متاثر ہو کر جب تہذیب میرے قریب آئی تھی تو میں نے اسی انداز میں اپنا تعارف کروایا تھا۔ جواب میں وہ بھی ہنسی تھی اور کہا تھا۔

''زرغون..... آپ پر بالکل بھی سوٹ نہیں کرتا..... آپ نا..... شاہ کو بطور تخلص آزمائیں۔''

میں نے اس کی چمکیلی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں مجھے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ اس کے دو دن بعد میرا نیا قطعہ زبان زد عام تھا۔

اس سے پہلے میری آنکھیں، خواب سب بے رنگ تھے
پھر مجھ میں سما گئے اس کے آنچل میں جتنے رنگ تھے
سمجھا تھا کہ تیرے شہر کے لوگ پذیرائی کو آئے ہیں شاہ
دور سے نظر آتے تھے جو پھول، وہ خوشنما سنگ تھے

اس کے بعد چند دن پہلے یوحنا آباد سے آنے والی وہ لڑکی جھینپی جھینپی سی نظر آنے لگی تھی۔ ہماری نگاہیں ملتی تھیں اور اس کے چہرے پر رنگ بکھر جاتے تھے۔ یہ منظر میں اتنی محویت سے دیکھتا تھا کہ دیکھنے والے جو قیامت کی نظر نہیں بھی رکھتے تھے، واقف حال ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد یہ بات راز نہیں رہی تھی کہ میں نے تخلص کیوں تبدیل کیا ہے۔ میں لحظہ بھر کو جیسے پورٹ الزبتھ کے بے مہر شہر سے غائب ہو کر ماضی میں اپنی یونیورسٹی کے ماحول میں پہنچ گیا تھا مگر میری ہم سفر کی جادوئی آواز مجھے واپس کھینچ لائی۔

''کیا تم پروفیشنل فائٹر ہو؟''

میں نے پلکیں جھپکیں اور آخری لمحے پر سڑک کے کنارے کھڑی گاڑی سے ہینڈل موڑ کر سائیکل کو ٹکرانے سے بچایا تھا۔ اس بات کو اس نے بھی محسوس کر لیا۔

''شاید تم..... میری وجہ سے ذہنی دباؤ کا شکار ہو رہے ہو۔ ایسا ہے تو میں یہیں سے اپنی راہ لیتی ہوں۔ میرے ساتھ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ کچھ اور سوچتے ہوئے میں غائب دماغ ہو گیا تھا۔ اسی سبب گاڑی نظر نہیں آئی۔''

وہ ایک دفعہ پھر ہنسی۔ ''خوب..... مزاج شاعرانہ اور انداز جارحانہ۔''

اپنی خفت مٹانے کے لیے میں بھی دھیرے سے اُس کی ہنسی میں شریک ہوا۔ بلاشبہ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ اس نے محض ایک جملے میں، میری ساری زندگی کا خلاصہ بیان کر دیا تھا۔

اس نے دوبارہ پوچھا۔ ''کیا تم پروفیشنل فائٹر ہو؟''

''ایک طرح سے کہہ بھی سکتی ہو..... ایک بار میں جز وقتی ''باکسر'' کے بھی فرائض انجام دیتا ہوں۔ ویسے نوجوانی کا بیشتر حصہ مارکٹائی میں گزرا ہے۔ اسی سبب تھوڑے بہت ہاتھ چلا لیتا ہوں۔ پھر افریقہ میں بہت سا مشکل وقت گزارا ہے۔ سچ پوچھو تو صحیح معنوں میں لڑنا اس مشکل وقت میں اپنے ایک تھائی روم میٹ سے سیکھا ہے۔''

''تم یقیناً انکساری سے کام لے رہے ہو ورنہ جن مسٹنڈوں کی تم نے اکیلے ٹھکائی کی ہے..... ان میں سے ایک بھی کئی پر بھاری ہے۔''

اس دوران میں ہم..... میرے ڈربا سائز کے اپارٹمنٹ والی بلڈنگ کے مرکزی دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ سلاخ دار فولادی گیٹ کے دوسری طرف نائٹ واچ مین جوزف موجود تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی مگر خوب مستعد تھا۔ گیٹ کھولتے ہوئے اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میرے ساتھ آنے والی لڑکی کو دیکھا اور پھر بولا۔

''مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔''

میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ وہ کس لیے ایسا کہہ رہا ہے۔

pklibrary.com

میں نے کہا۔ ''تمہاری آنکھوں کو اب علاج کی ضرورت ہے۔''

جوزف نے اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک سال میں پہلی دفعہ تمہارے ساتھ کوئی لڑکی دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ تم نارمل زندگی کی طرف آ رہے ہو۔ میری نیک خواہشات تمہارے لیے۔''

میں نے کہا۔ ''تم جو سمجھ رہے ہو، ویسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ صرف مہمان ہے۔''

جوزف معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''اس میں شرمانے والی کوئی بات نہیں۔ زندگی اور جوانی سے لطف اندوز نہ ہونا بے وقوفی ہے۔''

میرا اپنا سر پیٹنے کو دل چاہا۔ مزید صفائی دینا فضول تھا۔ لڑکی کو میں نے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لڑکی بولی۔ ''واچ مین کی گفتگو سے میں نے جو اندازہ لگایا ہے، وہ ناقابلِ یقین ہے۔ کیا واقعی تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں ہے؟''

اس کی آواز میرے جذبات کو اتھل پتھل کر رہی تھی۔ میں، اسے کیا بتاتا کہ اس کی آواز اور لہجہ جس لڑکی سے صرف مماثلت ہی نہیں رکھتا بلکہ ہو بہو اسی جیسا ہے..... وہ لڑکی میری زندگی میں آئی تھی..... اس کے بعد جو آیا اسے ہر دروازہ بند ملا تھا۔

سینے کی گہرائیوں سے ایک دلدوز آہ بلند ہوئی اور اس نے وہیں کہیں دم بھی توڑ دیا۔ میں نے لہجے کو عام سا رکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ ایسا ہی ہے..... ویسے تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔''

وہ تیزی سے ایک سیڑھی چڑھ کر میرے سامنے آ گئی۔ مجھے اپنے قدم روکنے پڑے۔ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ بے باکی سے بولی۔ ''جنذر کور کو اب لوگ جیسی کے نام سے جانتے ہیں۔''

میں نے اس کی آنکھوں سے عیاں دعوت سے نگاہ چُرائی۔ ''جیسی زبان پر چڑھتا ہے۔'' ساتھ ہی میں پہلو کاٹ کر آگے بڑھا۔

''اس عمارت کی دیواریں بہت پتلی ہیں۔ میں کسی بدمست شرابی کی گالیاں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں..... آ جاؤ۔'' میں نے اس کا ٹھنڈا سانس لینے کی آواز سنی تو دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

میں نے اپارٹمنٹ کی لائٹ روشن کی تو وہ تنقیدی نظروں سے اپارٹمنٹ کا جائزہ لینے لگی۔ فرشی بستر، صوفہ کم بیڈ، چھوٹا سا فریج، اوون اور برقی چولھا..... یہی میرا کُل اثاثہ تھا۔ چند برتن بھی تھے۔ بے ترتیبی نمایاں تھی البتہ گندگی نہیں تھی۔ مجھے صفائی کا جنون سا تھا۔

وہ ہر طرف نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''تھوڑی سی ترتیب بہتر کر لو تو رہنے کی بہترین جگہ ہے۔'' ساتھ ہی اس کی نظر مجھ پر آ رکی۔ ''تمہاری شرٹ پھٹ گئی ہے۔''

میں نے سر جھکایا۔ گریبان سے کچھ نیچے تک شرٹ پھٹی ہوئی تھی۔ ''کوئی بات نہیں، ویسے بھی مجھے غسل کرنا ہے۔ تبدیل کر لوں گا۔ اس دوران جو کھانا پینا چاہو حاضر ہے۔''

نیم گرم پانی کے غسل نے تھکاوٹ اور کسلمندی جیسے دھو ڈالی تھی۔ کپڑے تبدیل کر کے میں مختصر سے باتھ روم سے نکلا تو وہ پلاؤ کی پلیٹ اوون سے نکال رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ''سوری! پلاؤ دیکھ کر رہا نہیں گیا۔ حالانکہ کھانا میں کھا چکی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔ تمہارے نصیب کا رکھا ہوا تھا۔''

وہ بستر پر پھیل کر بیٹھ گئی۔ اسکن ٹائٹ جینز کے سبب اسے قدرے مشکل ہوئی۔ وہ ایسی پوزیشن میں تھی کہ میں نظریں چُرانے پر مجبور ہو گیا۔

پہلا چمچ منہ میں ڈالتے ہی اس نے اچنبھے سے میری طرف دیکھا۔ ''یہ تم نے بنائے ہیں؟''

میں نے اقرارِ جرم کے انداز میں اثبات میں سر ہلایا تو بولی۔ ''تمہارے تو ہاتھ چومنے کو دل چاہ رہا ہے۔ میں ترس گئی تھی اس طرح کے دیسی پلاؤ کو۔''

''کیوں؟ تم کوکنگ نہیں جانتیں؟''

منہ میں چمچ ڈالتے ہوئے وہ لطف بھر کو کھوسی گئی پھر فوراً ہی سنبھالا لے کر بولی۔ ''ٹائم بھی نہیں ملتا اور میری دلچسپی بھی نہیں ہے۔'' ساتھ ہی اس نے معنی خیز انداز میں آنکھیں گھمائیں۔ ''شاید مجھے کوئی ایسا مل جائے جو کچن کی ذمے داری سنبھال لے۔''

ایک دفعہ تو دل چاہا کہ اس آواز کے ساتھ بہہ جاؤں مگر اگلے پل خود کو سنبھالتے ہوئے میں نے موضوع بدلا۔ ''ان کالوں کے ساتھ تمہارا کیا معاملہ ہے؟ میرا اندازہ ہے..... تمہاری، ان لوگوں کے ساتھ واقفیت ہے۔''

اس نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''اس بات کو تھوڑی دیر رہنے دو! مجھے ذرا پلاؤ سے لطف اندوز ہونے دو۔''

مجھے بھی خیال آیا کہ کھانا کھائے کافی وقت ہو گیا ہے۔ مجھے بھی کچھ کھا لینا چاہیے۔ میں نے مکس فروٹ کا ایک

pklibrary.com

ٹن کھول کر باؤل میں ڈال لیا اور کانٹے کی مدد سے کھانے لگا۔

جیسی، میرے سامنے بیٹھی خوب رغبت سے پلاؤ کھا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پلیٹ صاف کر دی اور بڑی بے تکلفی سے میرے ہاتھ سے کانٹا لیتے ہوئے بولی۔

''بڑے کھٹور ہو، رسماً بھی کھانے کو نہیں پوچھ رہے۔''

میں نے باؤل اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''تم نے بھی تو پلاؤ کا نہیں پوچھا۔''

''تم بھول رہے ہو کہ میں مہمان ہوں۔''

''شاید بھول گیا تھا۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ کانٹا درمیان میں ہی رک گیا تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''ہوں۔''

وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''تم..... میری طرف دیکھنے سے کتراتے کیوں ہو؟''

''مجھے دیکھنے سے زیادہ سننا پسند ہے۔''

اس نے ایک دفعہ پھر ٹھنڈا سانس لیا۔ ''تم عجیب سے ہو مگر نجانے کیا کیمسٹری ہے..... دل تمہاری طرف کھنچتا ہے..... ہمیں ملے ہوئے شاید پورے دو گھنٹے بھی نہیں ہوئے مگر برسوں کا تعلق محسوس ہوتا ہے۔ مجھے صبح چلے جانا ہے مگر میں ساری زندگی تمہیں یاد رکھوں گی۔''

اس کے لہجے میں سچائی کا گداز تھا۔ میرا دل پگھلنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ضروری تو نہیں کہ ہماری دوبارہ ملاقات نہ ہو۔ ہم دوستوں کی طرح مل سکتے ہیں اور ممکن ہے تمہیں مزید میری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔''

وہ اداس ہو گئی اور آزردہ سے انداز میں بولی۔ ''کاش تم پہلے مل گئے ہوتے تو ہم یادگار وقت گزارتے۔ میں..... ایک، دو دن میں انڈیا واپس جا رہی ہوں۔ اس دوران بہت سے کام نمٹانے ہیں مگر ہم رابطے میں رہیں گے۔ کسی اچھے وقت میں ہم دوبارہ سے مل سکتے ہیں..... ایک ''نیوٹرل'' مقام دبئی بھی ہے۔'' اس بات پر مسکراتے ہوئے وہ اچھی لگی۔

میرے اندر بھی کچھ ٹوٹتے ٹوٹتے دوبارہ جُڑ گیا۔ تہذیب کی آواز سے میں جُڑا رہوں گا۔ اس کے وائس نوٹ سننے کا نشہ ابھی سے میرے حواسوں پر چھانے لگا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔''

اس نے ایک توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''کوئی آرام دہ لباس مل سکتا ہے۔ میں چینج کر لوں..... پھر اس رات کو یادگار بناتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں خمار ہی خمار تھا۔

''میرے ٹراؤزر اور ٹی شرٹس میں سے کچھ دیکھ لو۔ مگر میں اس رات کو ''یادگار'' بنانے کا ہرگز خواہش مند نہیں ہوں۔'' میرے قطعی انداز کو محسوس کر کے وہ بجھ سی گئی پھر سنبھالا لے کر بولی۔

''تمہاری پارسائی پر میں قطعی حملہ آور نہیں ہوں گی۔ چند گھنٹوں کی باقی ماندہ اس رفاقت کو ہم باتیں کر کے بھی تو یادگار بنا سکتے ہیں۔''

''یہ ضرور ممکن ہے۔''

میرے کپڑے چھانٹتے ہوئے وہ شرارت سے بولی۔ ''تمہاری پارسائی کی وجہ تو میں ضرور جان لوں گی۔ میرے خیال میں تو خواہ ذہنی کا فلسفہ پرانی انڈین فلموں نے تمہارے دماغ میں ٹھونسا ہے۔ محبوبہ کی بے وفائی کے بعد ہر خوشی سے منہ موڑ لینا..... خاص طور پر لڑکیوں کی طرف تو دیکھنا تک نہیں..... وغیرہ وغیرہ۔'' وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہالی ووڈ کی فلموں کے سوا میں نے کسی اور فلم میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔''

اس دوران وہ ایک سیاہ ٹراؤزر اور پیلی ٹی شرٹ منتخب کر چکی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ سیٹ تہذیب کا دیا ہوا تحفہ تھا۔ اس ٹراؤزر اور شرٹ میں ملبوس دیکھ کر وہ، مجھے تکے جاتی تھی۔ اس کے بعد میں نے یہ بھی زیب تن نہیں کیے تھے۔

میری حالت سے بے خبر وہ کہہ رہی تھی۔ ''چلو! جو بھی وجہ ہے ابھی جان لیتے ہیں۔'' بڑے یقین سے یہ کہتے ہوئے وہ باتھ روم میں گھس گئی۔

چینج کر کے وہ واپس آئی تو اس نے شاور بھی لے لیا تھا۔ ٹراؤزر کو اس نے پائنچوں سے اُڑس لیا تھا۔ شرٹ بھی ڈھیلی ڈھالی سی تھی مگر مضحکہ خیز نظر آنے کے بجائے وہ اور بھی دلکش نظر آنے لگی تھی۔

تولیے سے بال رگڑتے ہوئے اُس نے میری نگاہوں کی تپش محسوس کی۔ اس کے سلونے چہرے پر سرخی لہرائی بظاہر اس نے بے نیازی سے پوچھا۔ ''تمہارے پاس ڈرائر ہوگا؟''

''نہیں..... کبھی کسی کو بال خشک کرنے کی ضرورت

pklibrary.com

ہی نہیں پڑی۔"

"لے کر رکھ لو، ہو سکتا ہے کبھی ضرورت پڑ ہی جائے۔"

"مشکل ہے۔" یہ کہہ کر میں نے صوفہ کم بیڈ کو بیڈ میں تبدیل کر لیا اور دو تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔ وہ فریج کھول کر اندر جھانکتے ہوئے بولی۔ "لگتا ہے لڑکیوں کے ساتھ ساتھ تم بیئر وغیرہ کو بھی منہ نہیں لگاتے۔"

میں بے اختیار ہنس دیا۔ "ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔"

وہ سوفٹ ڈرنک کا ایک ٹن نکالتے ہوئے بولی۔ "تم بھی لو گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ ٹن کھولتے ہوئے قریب ہی آ گئی اور صوفہ کم بیڈ کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھ گئی۔ ایک پہلو سے کسی تصویر کے مانند وہ، میرے سامنے نمایاں تھی۔ اس کے ہوشربا نشیب و فراز سے نگاہیں چراتے ہوئے میں نے کہا۔ "اب بتاؤ..... ان کالوں کے ساتھ تمہارا کیا معاملہ تھا؟"

اُس نے سر میری طرف گھمایا اور ٹھوڑی صوفے پر ٹکا دی۔ "میں "ریڈ مون" نائٹ کلب میں ڈانسر کے طور پر کام کرتی ہوں۔ مالکن آج مجھے بے لباس نچوانا چاہتی تھی۔ میرے انکار پر وہ زبردستی پر اتر آئی تو میں بھاگ کھڑی ہوئی۔ مالکن نے اپنے پالتو کتے میرے پیچھے بھگائے..... آگے کی کہانی تم جانتے ہو۔" اس نے نہایت اختصار کے ساتھ تلخ لہجے میں اپنی داستان سنا دی۔

میں نے کہا۔ "میری معلومات کے مطابق تو ایسے "مخصوص شو" غیر قانونی ہیں۔ قانون اتنا بھی یہاں کمزور نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے قانون کی مدد لے لو۔"

اس کا لہجہ مزید تلخ ہوا۔ "طاقتور کے آگے یہاں بھی قانون کی وہی حیثیت ہے جو ہمارے خطے میں ہے۔ کچھ قصور میرا بھی ہے۔ تحریری معاہدے میں جکڑی ہوں اور ماں کی بیماری کے لیے اچھی خاصی رقم ایڈوانس لیتے ہوئے میں نے اس مخصوص شو کے لیے ہامی بھر لی تھی۔ بعد میں یہ سب مجھ سے نہیں ہو سکا۔" آخر میں وہ روہانسی ہو گئی۔

میں نے تسلی دینے کے انداز میں اس کا بازو تھپکا۔ "رقم کا معاملہ ہے تو دو سالوں میں پس انداز کی ہوئی میرے پاس کچھ رقم ہے۔ تمہیں دے سکتا ہوں۔ اس معاملے سے جان چھڑوا لو۔"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا۔ "سچ کہہ رہے ہو؟"

اسیرِ جنوں

ایک شعلہ جوالہ نوجوان کی جنوں خیزی

دو بہنوں کی آپسی رسہ کشی جس کا

سیدھا اثر کئی خاندانوں پر پڑا

بھیڑ کی کھال میں چھپے بھیڑیوں کی داستان

ایک ایسی طویل سرگزشت جو عرصہ دراز تک ذہنوں پر چھائی رہے گی

بہت جلد سرگزشت کے صفحات پر ملاحظہ کریں

میں نے کہا۔ ''آزمالو۔''

اچانک ہی اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمکے اور پھر اس کے شفاف رخساروں پر گرنے لگے۔

میں بوکھلا گیا۔ ''کیا ہوا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور خاموش آنسو بہانے لگی۔

میں خود ٹوٹا ہوا شخص تھا۔ اُس کے آنسو میرے دل پر گرنے لگے۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ میں پھسل کر اس کے لیول پر آگیا۔ اس کا سر میں نے سینے سے لگایا تو وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ نہ جانے کتنے درد و کرب وہ وجود میں مقید رکھے بظاہر ہنستی، کھیلتی نظر آتی تھی۔ معمولی سی ہمدردی پاتے ہی خشک سوتے بہہ نکلے تھے۔ میں نے اسے رونے دیا۔ وہ مزید کھسک کر میرے ساتھ لگ گئی تھی۔ اس کا تلاطم میں محسوس کرتا رہا اور میرا گریبان اس کے آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔ میں نے اسے رونے دیا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ پھر اس نے خود ہی سر اٹھایا۔ آنسوؤں سے بھیگ کر وہ کتنی معصوم لگ رہی تھی۔ یہ اُس لڑکی سے قطعی مختلف تھی جو چند گھنٹے پہلے طوفان کے مانند میری منجمد زندگی میں آئی تھی۔

آنسوؤں کے درمیان وہ مسکرائی اور بولی۔ ''گزشتہ تین سال سے زائد عرصے میں سبھی نے میرا استحصال کیا ہے۔ انڈیا میں گھر والوں کو بھی ہمیشہ پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں بھی بے غرض کوئی نہیں ملا۔ تمہاری آفر نے سارے ضبط کے بندھن توڑ ڈالے..... آئی ایم سوری..... شاید میں نے تمہیں جذباتی طور پر تکلیف دی۔''

میں نے اس کے قدرے گیلے بال انگلیوں سے سنوارے اور ایک طرف پڑا سوفٹ ڈرنک کا ٹن اٹھا کر اس کے گداز ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''میری آفر ابھی برقرار ہے۔''

اس نے ایک طویل گھونٹ لیا۔ ''دوبارہ سے رُلانا چاہتے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے ٹن اسے تھما دیا۔

اُس نے ہاتھ سے آنسو صاف کیے اور ایک مزید گھونٹ لیا۔

میں نے کہا۔ ''تم، میری آفر قبول کرو یا نہ کرو، میں نے ابھی ابھی ایک فیصلہ کیا ہے۔''

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''میں اس لمحے سے لے کر اپنے ملک روانگی تک تمہارے ساتھ رہوں گا۔''

اُس کا چہرہ چمک اٹھا۔ ٹن رکھ کر اس نے دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ لے لیا۔ ''میں اسے خوش قسمتی جانتی مگر تمہیں یہاں رہنا ہے۔ وہ لوگ خطرناک اور زہریلے سانپ کے مانند ہیں۔ تمہیں ضرور ڈس لیں گے۔ تم جو کر چکے ہو، اس کے لیے بھی مجھے تفکرات نے گھیرا ہوا ہے۔ وہ ضرور تمہارے تعاقب میں آئیں گے۔''

میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''دیکھا جائے گا..... اکیلی جان ہے اور اس کی زیادہ پروا بھی نہیں..... میں، تمہیں بس خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔''

میرا ہاتھ تھامے وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''تو پھر میرے ساتھ چلو! دنیا کے کسی اور پُرسکون اور گمنام خطے کی طرف نکل جاتے ہیں۔ تمہارے سنگ میں خوش رہوں گی۔''

میں نے طویل سانس لے کر اُس کے ہاتھوں میں سے ہاتھ نکالا۔ ''ایسا ممکن نہیں ہے۔'' میں نے حتی الامکان لہجہ نرم رکھا تھا۔ اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔

میں نے دھیرے سے اس کا گال تھپکا۔ ''اپنی فیملی کے ساتھ خوش رہو اور صبح ایک مصروف دن ہے۔ تھوڑا سا آرام بھی کرلو۔'' میں نے اٹھا کر اسے بستر پر لٹایا۔ وہ زیادہ معترض نہیں ہوئی۔ اسے لٹا کر میں نے چادر اوڑھائی اور روشنی کو بالکل مدھم کر کے اپنے بستر پر آگیا۔ مصروف دن کی تھکاوٹ نے فوراً ہی مجھے آدبوچا۔ کوشش کے باوجود میں نیند کی یلغار کو نہیں روک پایا۔ تھوڑی ہی دیر میں، میں گہری نیند میں تھا۔

نہ جانے میں کتنی دیر تک سویا تھا۔ سینے پر بوجھ کے سے احساس کے ساتھ میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی اور ریشم کا ایک ڈھیر سا میرے سینے پر دھرا تھا۔ یہ جیسی تھی جس کی گرم اور مرطوب سانسیں میری گردن سے ٹکرا رہی تھیں۔

میں نے قدرے سختی سے اس کی گردن پر انگلیاں جما کر اسے دور ہٹانا چاہا۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے سختی سے کہا۔

اس نے مضبوطی سے میرے گریبان سے شرٹ تھام لی۔ ''خدا کے لیے نہیں..... میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتی۔'' اس کی التجا سے زیادہ آواز نے اثر دکھایا۔ میری گرفت کمزور پڑ گئی۔

''یہ مناسب نہیں ہے۔'' مجھے اپنی آواز خود کمزور محسوس ہوئی۔

pklibrary.com

اس نے سر مزید میری ٹھوڑی کے نیچے گھسایا۔
''کہانا..... اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' تہذیب کی آواز میں وہ منمنائی تو مجھے ہار ماننا پڑی۔
ریشمی اندھیرے میں خود سے لڑتے ہوئے کئی پل بیت گئے۔ اس کا تلاطم میرے تلاطم سے ہم آہنگ ہوگیا تھا۔ شکر کا مقام تھا اس نے مزید پیش قدمی نہیں کی ورنہ میں بھی اس کے ساتھ بہہ جاتا۔ اس کے بالوں سے اُمڈتی خوشبو میرے حواس مختل کیے جارہی تھی۔ میں مسلسل خود کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا۔ چند لمحے بعد اس کی خواب ناک آواز اُبھری۔
''سینے میں جو درد چھپائے ہو نکال دو! ورنہ یہ درد تمہیں مار ڈالے گا۔''
اس آواز اور گداز نے مل کر وقاص علی شاہ کو شکست دے دی۔ اپنے درد کے گرد کھڑی دیواریں مجھے دھڑام سے گرتی محسوس ہوئیں۔ بے اختیار میری انگلیاں اس کے گھنے بالوں میں سرسرانے لگیں اور میں نے خود کو کہتے سنا۔
''وہ ایک لڑکی تھی۔''
جیسی جذبات انگیز انداز میں دھیرے سے ہنسی۔ ''ہر کہانی کی ابتدا میں ایک ہی لڑکی ہوتی ہے۔ باقی بعد میں آتی ہیں۔''
''مگر میری کہانی میں دوسری لڑکی نہیں آئی۔''
وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ غالباً مجھے سننا چاہتی تھی۔
جس بے ربط انداز میں، میں نے اپنی کہانی شروع کی تھی۔ اسی بے ربط انداز میں آگے بڑھائی۔
''یونیورسٹی لیول تک میری زندگی کا صنفِ نازک والا خانہ خالی تھا۔''
اس نے دھیرے سے مداخلت کی۔ ''گبرو جوان ہو..... سوہنے بھی ہو یہ کیسے ممکن ہوا؟''
''بس، شروع سے ہی دنگے فساد اور پھر کالج لائف سے اسٹوڈنٹ سیاست میں رہا۔ کئی لڑکیوں سے بات چیت ہوئی مگر جو خاص دروازہ تھا..... وہ یونیورسٹی میں کھلا تھا۔''
''یقیناً وہ بہت خاص لڑکی ہوگی؟''
''ہاں، شاید۔''
''پھر کیا ہوا؟'' گہری دلچسپی سے اس نے مجھے اصل ٹریک کی طرف دھکیلا۔
''ہونا کیا تھا..... وہی ہوا جو میرے اور تمہارے ملک کی تقریباً 80 فیصد فلموں میں ہوتا ہے۔''
اس نے فوراً نقطۂ اعتراض اٹھایا۔ ''تم نے تو کہا تھا تم ہالی ووڈ کے علاوہ اور فلمیں نہیں دیکھتے۔''
''اسی لیے تو نہیں دیکھتا۔'' میرے حواس قدرے لوٹے تھے۔ میں نے اس کے بالوں سے انگلیاں نکال لیں۔
وہ ٹھٹکی۔ ''پلیز! ہاتھ نہیں روکو! ماں کے بعد کسی نے پہلی دفعہ تو مجھے اتنی اپنائیت سے چھوا ہے۔''
''ٹھیک ہے مگر اس شرط پر کہ اب تم درمیان میں نہیں بولو گی۔''
''اوکے!'' اِک ادا سے کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے بالوں پر رکھ دیا۔
میری انگلیاں دوبارہ سے متحرک ہوگئیں۔ دماغ کی اسکرین پر ماضی کی فلم سی چلنے لگی تھی۔
ایک دن تہذیب یونیورسٹی آئی تو اس کی شفاف آنکھوں میں اندیشوں کے گہرے سائے اترے ہوئے تھے۔ بہار کی ایک بے حد چمکیلی دوپہر میں پھولوں اور پودوں سے گھرے ''گوشۂ محبت'' کے نام سے منسوب وسیع لان کے ایک حصے میں تنہا بیٹھے تھے۔ اس جگہ کو یہ نام یار لوگوں نے دیا تھا۔
چھوٹتے ہی وہ بولی۔ ''میرا رشتہ آیا ہے..... شاہ!''
میں بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ اسی کے زیرِ اثر بولا۔ ''یہ شاید پہلی دفعہ نہیں ہوا۔''
''ہاں مگر اس دفعہ حالات مختلف ہیں۔'' اندیشے آنکھوں سے اتر کر اس کے ملیح چہرے پر اتر آئے۔ ''اس دفعہ جو رشتہ آیا ہے وہ ہماری کمیونٹی کے چند گنے چنے خاندانوں میں سے ایک خاندان سے آیا ہے۔ لڑکا..... یو کے کی کسی آئل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر ہے۔ میں نے اپنی فیملی کو اس رشتے کو بے کر بے حد خوش اور مطمئن دیکھا ہے..... مجھے ڈر لگ رہا ہے شاہ.....!'' میرا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے وہ روہانسی سی ہوگئی۔
میں نے دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ ''پریشان کیوں ہوتی ہو جانِ من! ایک پڑھی لکھی لڑکی کا سادہ سا انکار ساری پریشانی پل بھر میں اڑا دے گا۔'' اسے حوصلہ دینے کی خاطر میں نے مصنوعی بشاشت سے کام لیا۔
''میں اتنے افراد کی ناراضگی کا بوجھ نہیں اٹھا پاؤں گی۔'' وہ جیسے کراہی۔
میرے سینے میں جیسے کڑوا سا دھواں بھر گیا۔ ''میری ناراضگی کا بوجھ اٹھا لوگی؟''

اُس کا سر جھک گیا۔ میرے لیے جیسے کائنات ساکت ہوگئی تھی پھر اس کا سر نفی میں ہلا تو گردش کے ساتھ ساتھ میری رکی ہوئی سانسیں بھی بحال ہوگئیں۔

چند ہفتوں بعد مجھے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ تہذیب نے گھر سے واپسی سے ہوسٹل میں ہی مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ نہیں تو اس سے پہلے وہ ہر ہفتے گھر جاتی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے پہلے تو بڑے آرام سے کہہ دیا۔

''ڈیڈی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔'' اگلے ہی پل اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کے مانند میرے سینے سے آلگی۔ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے متاعِ جان کے طور پر اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔

مزید کچھ دن گزرے تو تہذیب نے اپنے گلے کی طلائی چین اور اس کے ساتھ جھولتی سی صلیب کا لاکٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی... یہ تو بیچ آؤ۔''

میں نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ''اسے بیچنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں کس مرض کی دوا ہوں۔''

اس کے اصرار کے باوجود میں چین بیچنے پر کسی صورت رضامند نہیں ہوا اور چین زبردستی دوبارہ اس کے گلے میں ڈال دی۔ ان دنوں ذرا ذرا سی بات پر اس کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔

میرے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ تینوں شادی شدہ تھے۔ ہم تینوں بھائی آبائی مکان میں ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ والد صاحب وفات پا گئے تھے۔ دونوں بھائی ملازمت کرتے تھے۔ والد صاحب کی پنشن میرے اور ماں کے تصرف میں آتی تھی۔ اس میں سے ہم صرف بجلی اور گیس کے بل وغیرہ ادا کرتے تھے۔

ماں کا اے ٹی ایم کارڈ میرے استعمال میں ہوتا تھا۔ اکاؤنٹ میں جو کچھ تھا، میں نے لاکر تہذیب کے ہاتھ پر لاکر رکھا۔ بہرحال یہ کوئی خاص رقم نہیں تھی۔

تیسرے دن مجھ سے اس رقم کے بارے میں استفسار ہو رہا تھا۔ بجلی کے بل کی آخری تاریخ آگئی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ وہ رقم مجھ سے استعمال ہوگئی ہے۔

بھائی خاموش تو رہے مگر کئی دن وہ ناراض ناراض سے رہے۔ ظاہر ہے ان کے اپنے اخراجات تھے۔ دونوں کے بچے اسکولوں میں پڑھتے تھے اور دونوں کی تنخواہیں بھی ہزاروں میں ہی تھیں۔

میں خواب پرست نوجوان تھا۔ جلد ہی مجھ پر زندگی کے تلخ حقائق عیاں ہونے لگے۔ دوستوں سے ادھار کے بعد بائیک کا نمبر آگیا۔ میں بڑی کامیابی سے سارے معاملات تہذیب سے چھپائے تھا مگر بائیک کا بیچنا چھپ نہیں سکا تھا۔

ہم ایک، دوسرے کا ہاتھ تھامے گم صم سے بیٹھے تھے۔ عملی زندگی اپنے تلخ حقائق کے ساتھ منہ کھولے سامنے کھڑی تھی۔ تعلیم ابھی آخری مراحل میں تھی۔ نوکری کا مسئلہ اس کے بعد آنا تھا۔ اس موقع پر تہذیب نے مجھے بھی حوصلہ دیا۔ ہوم ٹیوشن اور شام میں اکیڈمی میں پڑھانے کے کچھ آپشنز دستیاب تھے۔ جن پر تہذیب نے ورک کیا تھا۔ مجھے بھی کچھ ڈھارس ہوئی اور ہم دونوں نے مل کر حالات سے لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

ہماری محبت جذباتی دھارے سے نکل کر میچور ہو رہی تھی۔ شادی کا فیصلہ ہم نے تعلیم مکمل ہونے کے بعد کیا تھا۔ درمیان میں مذہب بھی تھا..... اس پر بھی ہم نے بعد میں بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تہذیب میرے ساتھ ساتھ میرے مذہب کو بھی قبول کرلے گی۔

اس دوران میں..... تہذیب کے خاندان اور کمیونٹی کی خاموشی کو ہمیشہ کی خاموشی سمجھ بیٹھا تھا۔ البتہ تہذیب اس حوالے سے کبھی کبھار اپنے خدشات کا اظہار کرتی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کے خدشات درست تھے۔ ہمارے گرد بڑی خاموشی اور عیاری کے ساتھ جال بُنا جا رہا تھا۔

یونیورسٹی میں تہذیب کی کمیونٹی کے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں۔ عموماً یہ لوگ آپس میں بھی گیدرنگ کرتے تھے مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ یہ باقی لوگوں سے کٹے ہوئے تھے۔ لڑکے البتہ مجھ سے کچھ کھچے کھچے سے رہتے تھے۔ میں بھی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے میں ان کی کمیونٹی کی سب سے خوب صورت لڑکی لے اُڑا تھا۔

بظاہر ایک عام سے دن تہذیب کی کمیونٹی کے دو لڑکوں نے میرے ساتھ خواہ مخواہ اُلجھنے کی کوشش کی..... میں، ان کے منصوبے سے بے خبر تھا۔ اُن سے الجھ بیٹھا۔ معاملہ بڑھ گیا۔ میں نے دونوں لڑکوں کے حلیے بگاڑ دیے۔ اتفاق کی بات اس دن فلو کے سبب تہذیب کیمپس نہیں آئی تھی ورنہ وہ..... میرے ساتھ معاملے کو بھی سنبھال لیتی۔ اس کی سمجھ، بوجھ مجھ سے بہت بہتر تھی۔

پھر تہذیب کی کمیونٹی کے کچھ اور لڑکے مجھ پر ٹوٹ

pklibrary.com

پڑے۔ بے شک ابتدائی ہلّے میں ان لوگوں نے مجھے بہت مارا مگر میرے ہاتھ بھی جو آیا سلامت نہیں رہا۔

پھر میرے کچھ دوست بھی اس لڑائی میں کود پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی پھیل گئی اور اسے مذہبی رنگ دے دیا گیا۔ کچھ دیر بعد پولیس کے دستے یونیورسٹی میں داخل ہورہے تھے اور اس کے ٹھیک چند گھنٹوں بعد میں زخموں سے چُور چُور حوالات میں تھا۔ میرے ساتھ درجن بھر سے زائد دوسرے لڑکے بھی تھے جن میں سے چند میرے قریبی دوست تھے۔ اس کے چند دن بعد میں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا۔ میرے ساتھ میرے قریبی دوست بھی تھے مگر دوستوں کی فوراً ہی ضمانت ہوگئی۔ ان پر صرف دنگا فساد کی دفعات تھیں۔ مجھ پر دنگے، فساد کے علاوہ مذہبی منافرت پھیلانے کی بھی ناقابلِ ضمانت دفعہ لگائی گئی تھی۔

میں عدالت میں چیختا رہ گیا کہ یہ ہرگز مذہبی معاملہ نہیں تھا۔ اصل کہانی کچھ اور ہے مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔

اس کے بعد کی کہانی مزید تکلیف دہ تھی۔ میری ماں یہ صدمہ برداشت نہیں کرسکی تھی۔ جیل کی ڈیوڑھی میں ایمبولینس کے اندر پڑی ماں کا چہرہ دیکھتے ہوئے میں پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ ماں کے ساتھ ہی باپ کی پنشن بھی بند ہوگئی۔ چند مہینے تو بھائی آتے رہے..... میرے لیے انہوں نے وکیل کا بھی بندوبست کیا تھا مگر درخواستِ ضمانت رد ہوتے ہی وکیل اور بھائی دونوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔

شروع میں دوست بھی جیل میں ملنے کے لیے آجاتے تھے۔ انہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ میری گرفتاری کی پہلی رات کو ہی تہذیب کے خاندان والے اسے زبردستی ہاسٹل سے لے گئے تھے۔ ان کے ساتھ پولیس کی گاڑیاں بھی دیکھی گئی تھیں۔

اس کے بعد میرے دل و دماغ میں طوفان برپا تھے مگر زندگی جمود کا شکار تھی۔ مجھے باہر کی دنیا کی کچھ خبر نہیں تھی کہ وہاں کیا ہورہا ہے اور کون کس حال میں ہے۔ تہذیب کا خیال آتا تو وحشت کے عالم میں، میں اپنی کوٹھری کی دیواروں سے سر ٹکرانے پر مجبور ہوجاتا۔ نہ جانے وہ کس حال میں تھی۔

مذہبی منافرت پھیلانے کے حساس ترین معاملے کی وجہ سے مجھے عام قیدیوں کے ساتھ بیرک میں رکھنے کے بجائے تنہا ایک کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔

ایک رات جب میں وحشت کے عالم میں دیواروں سے سر ٹکرا کر اور شدید بے بسی کے عالم میں اونچی آواز میں رو رہا تھا تو میں نے اپنی کوٹھری کے سلاخ دار گیٹ پر کسی کی موجودگی محسوس کی..... سر اٹھایا تو سامنے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل عاصم رانا کھڑا تھا جو یقیناً رات کے راؤنڈ پر نکلا تھا۔ وہ نوجوان آفیسر تھا اور ابھی اپنی پہلی تعیناتی پر تھا۔ اس نوجوان آفیسر کی آنکھوں میں اپنے لیے ترحم کی جھلکیاں نظر آئیں۔

عاصم رانا کرسی منگوا کر میرے سامنے بیٹھا تو پھر کئی گھنٹے اٹھ نہیں سکا۔ مہینوں بعد کوئی ہمدرد ملا تھا۔ میں نے بھی دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ آخر میں آنکھوں میں آنسو لیے وہ اٹھ گیا۔

پھر دیکھنے والوں نے ایک حوالاتی اور جونیئر آفیسر کا یارانہ دیکھا۔ عاصم، میرے لیے فرشتہ ثابت ہوا۔ اس کی وجہ سے مجھے ڈھنگ کا کھانا ملنے لگا۔ کچھ اور سہولیات بھی مل گئیں جن میں کاغذ، قلم بھی شامل تھے۔ میں اپنا درد کاغذ پر اتارنے لگا۔

پھر میں نے اسی فرشتے کے منہ سے وہ خبر سنی..... جس کو سننے کی مجھ میں طاقت نہیں تھی۔ میری ٹانگوں نے میرا وزن اٹھانے سے انکار کردیا تھا۔ میں کئی دن تک ہوش و حواس سے بیگانہ رہا تھا۔ اس دوران عاصم نے بہت ساوقت میرے ساتھ گزارا تھا۔ وہ خاموشی سے میرا ہاتھ تھامے گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میری تکلیف لفظوں سے کم ہونے کے بجائے بڑھ جائے گی..... اسی سبب اس نے کبھی مجھے حوصلہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

تہذیب کی چند ہفتے پہلے شادی ہوگئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے سنگ یو، کے چلی گئی تھی۔

میں سوچتا تھا اور حیران ہوتا تھا کہ یہ خبر سننے کے بعد میں زندہ کیسے ہوں..... میرا دل پھٹ کیوں نہیں گیا۔

میرے دل کا درد عاصم اکٹھا کرتا رہا اور پھر ایک دن میری شاعری کا پہلا اور آخری مجموعہ میرے ہاتھ میں تھا ''جون کا صحرا'' جو لاہور کے ایک بڑے پبلشر ادارے نے شائع کیا تھا۔

انتساب کے طور پر شائع ہونے والا شعر میں نے شاید خونِ جگر میں انگلیاں ڈبو کر لکھا تھا۔

تو ستاروں، جگنوؤں کے استعاروں میں ڈھونڈتی رہی پگلی!
تیرا نام تو میری کتاب کے انتساب میں تھا

عاصم کے بچپن کے ایک دوست کا باپ نہ صرف

نامور وکیل تھا بلکہ کچھ مخصوص حلقوں میں خاصا اثر ورسوخ بھی رکھتا تھا۔ عاصم کی کوششوں سے اس نے میرا کیس ہاتھ میں لیا اور ہائی کورٹ سے میری ضمانت کروانے میں کامیاب ہوگیا۔

میں آزاد فضاؤں میں تھا اور تہذیب تک پہنچنے کا جنون مجھے پل بھر کو چین لینے نہیں دے رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تہذیب کو جس جبری رشتے میں باندھا گیا ہے..... وہ اسے توڑ کر پل بھر میں میرے ساتھ ہوگی۔ میں، اسے ''دیو کی قید'' سے آزاد کروانے کے لیے بے چین تھا۔

عاصم نے میری وحشتوں کو لگام دینے کی کوشش کی۔ اس کا ماننا تھا کہ ممکن ہے تہذیب اپنی نئی زندگی کے ساتھ کمپرومائز کر چکی ہو..... میری مداخلت اس کی زندگی میں زہر گھول سکتی تھی مگر میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری راہ تکتی ہوگی۔

بھائیوں کے سفید خون کا مجھے اندازہ ہو چکا تھا۔ میں نے آبائی مکان میں اپنے حصے کا جھگڑا ڈال دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بھائی مجھ سے کچھ ڈرے ڈرے سے تھے۔ ظاہر ہے جیل یاترا سے واپسی پر مجھے ایک سکہ بند مجرم سمجھا جا رہا تھا۔

بھائیوں نے لون لے کر..... بیویوں کے زیور بیچ کر نہ صرف مجھے حصہ دیا بلکہ میں نے اکلوتی بہن کو بھی اس کا حصہ دلوا دیا۔

اس کے بعد میں نے اپنے طور پر کھوج لگانا شروع کیا کہ تہذیب یوکے، میں کہاں تھی۔ اس دوران یوکے ویزے کے لیے بھی میں نے تگ ودو شروع کر دی تو معلوم ہوا کہ ایک عام پاکستانی کے لیے یوکے کا ویزا لینا آسان نہیں ہے۔ میرے لیے یوکے جانا سات سمندر پار جانے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ میرے پاس جتنی رقم تھی اس کے ساتھ یوکے جانا دیوانے کے خواب جیسا تھا۔

تہذیب کا کھوج لگانے کے چکر میں..... میرا اس کے بھائیوں کے ساتھ بھی جھگڑا ہو گیا۔ ان دنوں میں ہر وقت ایک خنجر اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس جھگڑے کے دوران میں نے خنجر استعمال کیا اور تہذیب کے دونوں بھائیوں کو گھائل کر دیا۔

اس کے بعد ظاہر ہے پولیس میرے تعاقب میں تھی مگر اس دفعہ میں، ان کے ہاتھ کہاں آنے والا تھا۔ عاصم کے علاوہ میری اور کوئی پناہ گاہ تھی نہیں۔ میں چند ہفتے اس کے ایک دوست کے ڈیرے پر رہا۔ اس دوران میری عاصم سے چند ملاقاتیں ہوئیں اور وہ..... مجھے بیرونِ ملک جانے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

افریقہ کے چند ملکوں سے ہوتا ہوا میں ایک ایجنٹ کی معرفت غیر قانونی طور پر جنوبی افریقہ میں داخل ہوگیا۔ دھکے کھاتے کھاتے آخرکار ضروری کاغذات بنوا کر میں لیگل ہو ہی گیا تھا۔

تہذیب تک پہنچنے کا جنون تو رفتہ رفتہ دم توڑ گیا تھا مگر اس کا ''درد'' میں نے خوب سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور اسے ابھی تک سینے سے لگائے تھا۔

میری داستان ختم ہو چکی تھی۔ جیسی، میرے سینے پر سر دھرے خاموش تھی۔ اس کی سانس کا زیر و بم میں محسوس کر رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ سو گئی ہے۔ اس کے بالوں میں سرسراتی میری انگلیاں تھمیں تو وہ خوابیدہ انداز میں بولی۔

''بہت تکلیفیں اور اذیت برداشت کی ہے تم نے مگر اس میں تہذیب کہاں پر کھڑی ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب ساری اذیت اور پریشانی تم نے برداشت کی..... سب سے بڑھ کر اپنی مری ماں کا منہ جیل میں دیکھا اور وہ خاموشی سے شادی کر کے پیا دیس سدھار گئی۔ تم، اس کا غم سینے سے لگائے ہو..... میں تو کہوں گی اس نے سیدھی سیدھی بے وفائی کی ہے۔''

میں نے ایک جھٹکے سے اسے دور اچھالا۔ وہ، میرے قریب سے کہیں منمنائی۔

''کیوں سچ برداشت نہیں ہوا؟'' اس کا انداز نشتر زنی کا تھا۔

میں نے دماغ میں اچانک سلگ اٹھنے والے انگاروں پر پانی ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مشرقی لڑکی ہوتے ہوئے بھی تم شاید ایک مشرقی لڑکی کی مجبوریوں کو نہیں سمجھ پا رہیں۔ وہ بے چاری..... باپ اور بھائیوں کے نرغے میں پھنس کر کیا کرتی۔ اس کا واحد سہارا تو میں تھا اور اس وقت مجھے خود سہارے کی ضرورت تھی۔''

''وہ پڑھی لکھی تھی، بغاوت کر سکتی تھی۔''

''کس کے سہارے کرتی؟''

''محبت سہارے نہیں دیکھتی..... کچے گھڑے پر بھی نکل پڑتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کچے گھڑے والے ڈوب جاتے ہیں۔''

''ڈوبنے والے ہی تو امر ہوتے ہیں۔''

pklibrary.com

مجھے لگا کہ میں لاجواب ہو رہا ہوں۔ میری خاموشی کو بھانپ کر وہ مزید بولی۔ ''میں زیادہ تو نہیں صرف اتنا اور کہوں گی کہ تہذیب کی محبت تمہارے مقابلے میں اتنی شدت نہیں رکھتی تھی کہ کچے گھڑے پر تیر جاتی۔'' پھر اس کے لہجے میں حسرت در آئی۔ ''کاش تہذیب کی جگہ میں ہوتی تو تمہارے لیے زمانے سے لڑ کر دکھاتی۔'' پھر اس نے ٹشو لے کر میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اگلے ہی پل میں نے اس کے نیم گرم اور مرطوب ہونٹ اپنی پیشانی پر محسوس کیے پھر اس کی سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔

''میں زیادہ مذہبی تو نہیں ہوں مگر تمہارے دل کے سکون کے لیے دعا کروں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے بچوں کے مانند میرے گال تھپتھپائے۔ ''ایک سوال اچانک ہی دماغ میں چبھنے لگا۔''

''کچھ رہ گیا ہے تو پوچھ لو۔''

وہ لمحے بھر کی خاموشی کے بعد پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''تم نے دیکھ لیا تھا کہ مجھے زبردستی لے جایا جا رہا ہے۔ پہلے تو تم کنی کترا کر نکل رہے تھے..... پھر اچانک کیا ہوا؟''

میں لمحے بھر کو سناٹے میں رہ گیا۔ کم بخت بڑی دور کی کوڑی لائی تھی۔ میں نے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

''بس، اچانک ہی تمہاری مدد کرنے کو دل چاہا اور میں پلٹ پڑا۔''

وہ لمحہ بھر میری آواز میں کچھ ڈھونڈتی رہی پھر بڑے یقین سے بولی۔ ''جھوٹ بول رہے ہو مگر مان لیتی ہوں..... اب سو جاؤ۔''

میں نے محسوس کیا کہ وہ، میرے پہلو سے اٹھ گئی ہے مگر جاتے جاتے مجھے ایک نئے بھنور میں پھنسا گئی تھی۔

تہذیب کیا اس مشکل ترین وقت میں کسی سہارے کے بنا کچھ کر سکتی تھی؟ دل فوراً ہی اس کی وکالت کو آ گیا تھا۔ میں نے سر کو جھٹک کر سونے کی کوشش شروع کر دی اور تھوڑی دیر میں کامیاب بھی ہو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو برائے نام سی بالکونی کے آگے تنے پردے کے عقب سے روشنی کا انعکاس اتنا واضح تھا کہ کمرا نیم روشن ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سورج ڈھلنا شروع ہو چکا ہے۔ اسی وقت ہی وہ بالکونی کے عین سامنے ہوتا تھا۔

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ جیسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ باتھ روم میں تھی مگر اگلے چند لمحوں میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ جا چکی تھی۔ گزری رات جیسے خواب کے مانند نگاہوں کے سامنے گزر گئی۔ اس کے گھنے بالوں کی خوشبو، اس کے آنسو اور نشتر زنی۔ مجھے لگا کہ اس کے ہونٹوں کا لمس ابھی تک میری پیشانی پر ہے۔ بے اختیار میں نے پیشانی چھوئی اور پھر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ محض ایک رات کے چند گھنٹوں میں ایک عام سی لڑکی نے میرے دل کے گرد کھڑی مضبوط دیواریں ہلا دی تھیں۔ یہ ناقابلِ یقین تھا مگر ہوا تھا۔

خود کو سرزنش کرتے ہوئے اچانک میری نظر فریج پر پڑی۔ مقناطیس سے چپکا ہوا ایک بڑا سا کاغذ وہاں موجود تھا۔ لپ اسٹک سے لکھا ہوا تھا۔

''تمہیں مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی۔ اسی لیے جا رہی ہوں۔ میں، تہذیب نہیں جو زمانے سے لڑ نہ سکوں۔ اپنے معاملات سے اچھے طریقے سے نمٹ کر تم سے رابطہ کروں گی۔ تمہارے موبائل فون سے تمہارا نمبر اور ایک تصویر بلوٹوتھ کے ذریعے چرائی ہے۔ اس کے لیے معذرت نہیں کروں گی اور پلیز..... میری خاطر چند دن اپنا راستہ بدل لینا۔ تمہارے ہاتھوں پٹنے والے ضرور دو، تین دن وہاں گھات لگائیں گے۔''

میں نے گہرا سانس لے کر وہ کاغذ سنبھال لیا۔ خواہش کے باوجود اسے ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کر سکا۔

تھوڑی دیر مجھے کمرے کی حالت بہتر کرنے میں لگی۔ صفائی ستھرائی اور فریش ہونے کے بعد ناشتا تیار کر کے میں نے اپنے موبائل فون پر نظر ڈالی۔ سردار جی کی تین کالز وقفے وقفے سے آ چکی تھیں۔ بے اختیار میں نے وقت دیکھا۔ میں دو گھنٹے سے زیادہ لیٹ ہو چکا تھا۔ بار کی صفائی کی ذمے داری آج سردار جی اور ان کی بیٹی نیرو نے اٹھائی ہوگی..... اسی سبب ان دونوں کا پارا ہائی ہونا یقینی تھا۔

ناشتے کے ساتھ میں نے بیک ٹو کال کی۔ میری آواز سنتے ہی سردار جی دہاڑے۔ ''اوئے سیالکوٹیے! کتھے مر گیا ایں..... صفائی تیرے پیو نے کرنی سی۔''

میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہ تو کچھ نہیں تھا..... وہ تو مجھے اکثر بے ضرر قسم کی گالیوں سے بھی نوازتے رہتے تھے مگر دل کے بہت اچھے تھے۔ مشکل ترین وقت میں جب میری جیب خالی تھی اور دو دن سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ انہوں نے مجھے سہارا دیا تھا۔ دوسری بات وہ، مجھے سیالکوٹیا کہتے تھے حالانکہ میرا تعلق سیالکوٹ سے نہیں تھا۔ کبھی موڈ میں ہوتے تو میرے بالائی ہونٹ کے اوپر والے حصے پر موجود تل کی طرف دیکھتے ہوئے گنگناتے تھے۔ ''تیرے مکھڑے دا کالا کالا تل وے..... کڈ کے لے

گیا میرا دل وے..... منڈے آسیا لکوٹیا..... وے منڈے آسیا لکوٹیا۔''

یہ سب لمحے سے بھی کم وقت میں دماغ کی اسکرین پر نمودار ہو کر غائب ہو گیا تھا۔ میں نے بڑے آرام سے کہا۔

''سردار جی! آج آنکھ نہیں کھلی۔''

''اوئے گھوڑے! دارو تو نہیں پیندا..... کڑیاں تو وی جالندھر ایکسپریس وانگو جانا اے..... فیر تیری اکھ کیوں نہیں کھلی؟'' ساتھ ہی ان کا انداز معنی خیز ہوا۔ ''کتھے اکھ..... شکھ تے نہیں لائی؟''

میں دھیرے سے ہنسا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔''

''چل فیر جلدی نال پہنچ..... اس تو پہلے کہ نیرو غصے نالوں پاٹ جائے۔ اونج وی او پاٹرنوں پھیر دی اے۔''

میں نے بمشکل ہنسی روکی۔ نیرو تیزی سے اوور ویٹ ہو رہی تھی۔ میں اور سردار جی اکثر اس حوالے سے اسے مل کر چھیڑتے رہتے تھے۔ میں تھوڑی دیر میں بار روم پہنچ گیا۔ میں کسی پھڈے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا اسی لیے راستہ بدلنے کے ساتھ ساتھ میں نے سر پر پی کیپ اور آنکھوں پر چشمہ لگا لیا تھا۔ سائیلنٹ پر رہنے والا موبائل فون اب جنرل موڈ پر تھا۔ ہر نوٹیفکیشن پر لگتا تھا وہی ہوگی۔ دو دن خیریت سے گزرے تو مجھے بے فکری ہوگئی۔ پی کیپ اور چشمہ میں نے اتار پھینکا مگر نئے راستے کا معمول جاری رکھا۔ تیسرے دن میں ہفتہ وار راشن وغیرہ کی خریداری کے لیے شہر کے کاروباری مرکز کے ایک گروسری اسٹور پر چلا گیا۔ یہاں کام کرنے والا ایک لڑکا میرے شہر کا تھا۔ اس سے مل کر اپنایت کا سا احساس ہوتا تھا۔ حفیظ گل نامی وہ لڑکا بڑا خوش خوراک تھا۔ اپنے شہر کے کھانوں کا ذکر ایسے کرتا تھا کہ سماں باندھ دیتا تھا۔

حفیظ گل سے گپ شپ کر کے اور سامان کے تھیلے لے کر میں ابھی گروسری اسٹور کے اندر ہی تھا کہ میری نگاہ شیشے کی دیوار کے پار وسیع پارکنگ میں ایک شخص پر پڑی۔ دن کے اس وقت رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس شخص کے ساتھ ایک سفید فام شخص بھی تھا۔ دونوں ایک گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔

میری نگاہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ سفید فام کے ساتھ بے شک پرویز البرٹ ہی تھا۔ تہذیب کا بڑا بھائی۔ وہ پہلے سے زیادہ موٹا ہو گیا تھا۔ پیشانی کے بال اُڑ گئے تھے مگر میرے خنجر کے دیے ہوئے بوسے کا نشان آج بھی اس کے گال پر تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ شاندار سیاہ گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ سیاہ گاڑی پر کسی کمپنی کا مونوگرام نظر آ رہا تھا مگر اتنے فاصلے سے میں اس سنہرے مونوگرام کو واضح نہیں دیکھ سکا تھا۔

پرویز تو منظر سے غائب ہو چکا تھا مگر میرے دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟ یہ بات دل کو نہیں چھوڑ رہی تھی کہ کہنہ رنجش اسے، میرے تعاقب میں لے آئی تھی۔ یقیناً کوئی اور سلسلہ تھا۔ جن دنوں ہمارے درمیان جھگڑا ہوا تھا، پرویز باقاعدہ کوئی کام دھندا نہیں کرتا تھا۔ عین ممکن تھا روزگار کے سلسلے میں وہ یہاں موجود ہو۔

بہرحال شکر کا مقام تھا کہ ہمارا سامنا نہیں ہوا تھا۔ میری خواہش تھی کہ ایک ہی شہر میں ہونے کے باوجود ہمارا سامنا نہ ہونا ہی بہتر تھا۔ یہ اسی شام کا واقعہ ہے۔ میں بار روم میں کاؤنٹر کے عقب میں موجود تھا۔ میرے ساتھ بھاری بھرکم نیرو تھی۔ سردار جی ایک مقامی مگر ہردلعزیز شراب کے چکر میں کہیں گئے ہوئے تھے۔ بار روم میں چند ہی گاہک موجود تھے جو پنجابی بھنگڑے کی دُھن پر مستی کے عالم میں سر اور پاؤں کی مدد سے تال سے تال ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا تھا کہ پنجابی بھنگڑا جنوبی افریقہ میں بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ اسی وقت بار کے داخلی دروازے پر ایک عورت نمودار ہوئی۔ آسان سے لفظوں میں اسے ایک غیر معمولی عورت کہا جا سکتا تھا۔ وہ سیاہ فام تھی، عمر کا اندازہ چالیس سے اوپر کا تھا۔ غیر معمولی طور پر اس کا قد چھ فٹ کے قریب تھا۔ بنتے معمول سے زیادہ چوڑے، دونوں کانوں میں سرخ رنگ کے بالے اور ہتھنی سی جسامت۔ وہ دروازے پر لحظہ بھر رکی اور پھر اس کی نظریں مجھ پر آ جمیں۔ وہ تیر کے مانند میری طرف لپکی۔ اس کے عقب میں دو شناسا سی صورتیں بھی تھیں۔ جن کے چہروں پر کینہ واضح نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی سیاہ فام تھے جن کے چنگل سے میں نے جیسی کو نکالا تھا۔

میرے قریب موجود نیرو منمنائی۔ ''ان لوگوں کے ارادے اچھے نہیں لگ رہے۔''

میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''شاٹ گن تیار رکھو!''

نیرو نے تھوک نگلتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ کٹی ہوئی نال والی شاٹ گن کیش والی دراز کے پاس رکھی تھی اور وہی اس دراز کے قریب تر تھی۔

وہ عورت میرے سامنے آ رکی۔ ''جیسی کہاں ہے؟''

اس کی پُرسکون آواز کے پیچھے طیش کا طوفان صاف محسوس ہو رہا تھا۔

کچھ چھپانے یا مکرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، میں نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا، صبح وہ چلی گئی تھی۔''

عقب میں موجود سیاہ فاموں کے چہروں پر طیش چمکا مگر وہ جیسے دانت پیس کر رہ گئے تھے۔ یقیناً اس کا سبب میرے سامنے کھڑی ان کی باس تھی جس کا ذکر جیسی نے کیا تھا۔

''کہاں چلی گئی؟'' عورت کے جبڑے بھنچ گئے تھے۔ وہ جیسے ضبط کی انتہا پر تھی۔

نیرو حیرت سے یہ مکالمہ سنتے ہوئے کبھی میری طرف اور کبھی اس عورت کی طرف دیکھتی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم۔''

میرے الفاظ کی بازگشت ابھی باقی تھی کہ عورت کا ہاتھ برق کے مانند میرے گریبان کی طرف آیا۔ غالباً وہ، مجھے کاؤنٹر کے عقب سے کھینچ لینا چاہتی تھی مگر میں ایسے ہی کسی ردِعمل کے لیے تیار تھا۔ میں نے ہوا میں ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لگا ہی نہیں کہ یہ ہاتھ کسی عورت کا ہے مگر میں نے اس کے عورت ہونے کا احترام کیا ورنہ محض ایک جھٹکا اسے، میری خوفناک ٹکر کی رینج میں لے آتا جو سیاہ فام میری ٹکر سے ''آشنا'' ہو چکا تھا..... وہ آج ساتھ نہیں تھا۔

اس کا ہاتھ جکڑتے ہوئے میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم حد سے بڑھ رہی ہو، جو حقیقت تھی، میں نے بتا دی ہے۔''

وہ دماغ سے زیادہ اپنے ہتھنی جیسے وجود کی طاقت پر یقین رکھتی تھی۔ ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ غرائی۔ ''غلط جگہ سینگ لڑا بیٹھے ہو لڑکے! تمہاری تو نسلیں بھی جیسی کا ٹھکانا بتائیں گی۔''

اس دوران پہلے سے تیار اس کے ماتحت فوراً اپنی مالکن کی مدد کو آئے تھے۔ اگلے ہی پل وہاں ایک ہنگامے کا آغاز ہو گیا۔

کاؤنٹر کے عقب میں موجود شراب کی انواع و اقسام کی بوتلوں سے سجے ریک اور کاؤنٹر پر موجود قیمتی کراکری کو بچانے کی غرض سے میں نے ہتھنی کا ہاتھ چھوڑ کر جست بھری تھی اور دونوں سیاہ فاموں کو لے کر ہال کی ایک میز پر گرا تھا۔

ہم تینوں کے ساتھ ہی کئی کرسیاں اور میزیں الٹی تھیں۔ زوردار تڑاکے سے ایک میز توٹ بھی گئی تھی۔ ہال میں موجود مرد و زن چیختے ہوئے باہر نکلنے والے راستے کی طرف دوڑے تھے۔

پنجابی بھنگڑے کی دُھن پر میں نے اپنی زد میں آئے ایک سیاہ فام کے سینے پر ٹانگ جماتے ہوئے دیکھا کہ نیرو نے شاٹ گن نکالی تھی مگر اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ ہتھنی نے اس کے ہاتھ سے شاٹ گن چھینتے ہوئے ایک زوردار تھپڑ اُس کے گال پر رسید کر دیا۔ میوزک کے شور کے باوجود مجھے تھپڑ کی گونج سنائی دی تو جیسے میرے سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو گئی۔

نیرو چیختی ہوئی کاؤنٹر کے عقب میں گری تھی۔

سینے پر لات کھانے والا چکنے فرش پر پھسلتے ہوئے دور کی کرسیوں سے جا ٹکرایا تھا۔ اس دوران ہال خالی ہو چکا تھا۔ دوسرے نے میری ٹانگ جھپٹ لی مگر مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ میری توجہ ہتھنی پر تھی جو خون آشام درندے کے مانند میری طرف جھپٹ رہی تھی۔

لیٹے لیٹے میں نے ایک کرسی کی ٹانگ پر ہاتھ جما لیا۔ جیسے ہی اس نے مجھے مارنے کے لیے ٹانگ اٹھائی۔ ''دھائیں'' کی آواز سے کرسی اس کی ٹانگ سے ٹکرائی۔ دوسری ٹانگ اس کی ہوا میں تھی۔

بھینس کے ڈکرانے جیسی آواز اس کے حلق سے بلند ہوئی اور وہ دھڑام سے میرے قریب گری۔ اس دوران ٹانگ جکڑنے والا آکٹوپس کے مانند میرے نچلے دھڑ سے لپٹ گیا تھا۔ اس موقع سے سینے پر ٹانگ کھانے والے نے فائدہ اٹھایا۔ ٹوٹی ہوئی میز کی ایک ٹانگ جو اسٹیل کے پائپ کی تھی۔ وہ تھام کر میری طرف جھپٹا۔ میں نے نچلا دھڑ جکڑنے والے کے سر پر کہنی کی زوردار ضرب لگائی۔ وہ قدرے ڈھیلا پڑا مگر اس دوران اسٹیل کا پائپ میرے سر سے ٹکرا چکا تھا۔ پے در پے لگنے والی ضربوں نے میری آنکھوں کے آگے تاریک سی چادر پھیلا دی۔ میں نے نیم گرم سیال اپنی پیشانی اور چہرے پر بہتا محسوس کیا جو یقیناً میرا خون تھا۔ یہ خون آنکھوں میں بھی جا رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس ہتھنی کی بھیانک چنگھاڑیں سنیں اور اپنی پسلیوں پر اس کی قیامت خیز ضربیں برداشت کیں۔ تاریکی میں ڈوبنے والے دماغ کے ساتھ میں نے پولیس پٹرولنگ گاڑیوں کے سائرن سنے اس کے بعد میرا دماغ مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں اسپتال کے سفید براق بستر پر

تھا۔ مریضوں کے لیے مخصوص سبز گاؤن نما لبادہ میرے جسم پر تھا اور سر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ نیرو، میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس کے گال پر ابھی بھی سوجن باقی تھی۔ وہ موبائل فون پر مدھم آواز میں کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ میری کھلی آنکھیں دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان چمکا۔ اس نے جلدی سے بات ختم کر کے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

''شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔''

''کیوں؟ میرے ہوش میں آنے کے امکانات نہیں تھے؟''

''سو فیصد تھے۔'' وہی چہکی۔ ''سی ٹی اسکین وغیرہ سب نارمل تھے۔ بس، تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ایک پولیس آفیسر کب سے تمہارے ہوش میں آنے کا منتظر ہے۔ ڈیڈی بھی اس کے ساتھ ہیں۔ ہم نے اس بھینس کے خلاف رپورٹ رجسٹرڈ کروا دی ہے۔ اپنے مشٹنڈوں سمیت جلد ہی سلاخوں کے پیچھے ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

''میری وجہ سے تمہیں تکلیف اٹھانا پڑی..... وہ تھپڑ میرے دل پر چھپا ہے۔ میں، تم سے معافی مانگتا ہوں۔ موقع ملا تو اس تھپڑ کا بدلہ ضرور لوں گا۔''

''میرے خیال میں اُس بھینس کو لنگڑا کر کے تم بدلا لے چکے ہو۔ پولیس گاڑیوں کے سائرن سن کر جس طرح وہ ایک ٹانگ پر پھدکتی ہوئی بھاگی تھی، وہ بڑا یادگار منظر تھا۔'' پھر اس نے میرا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔

''مجھے اور ڈیڈی کو ساری بات معلوم ہوگئی ہے۔ اُس لڑکی کی تمہارے نمبر پر کال آئی تھی..... تم نے جو کیا بہت اچھا کیا۔''

میرے لیے یہ چونکا دینے والی خبر تھی۔ ''کیا کہتی تھی وہ؟''

نیرو نے شریر انداز میں جھک کر میرے گال پر دھیرے سے چٹکی کاٹی۔ ''رو رہی تھی اور تم سے بات کرنا چاہتی تھی مگر تم بے ہوش تھے۔''

''کہاں ہے میرا فون؟''

''ہائے، ہمارے راجھے کو آخر ہیر مل ہی گئی۔ ابھی تھوڑا صبر کرو، ڈاکٹر کی اجازت کے بعد ہی تمہیں فون مل سکے گا۔''

نیرو غلط فہمی کا شکار ہو رہی تھی۔ فی الحال غلط فہمی دور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ کمرے سے نکلتے نکلتے رکی۔ ''ہاں یاد آیا..... جیسی نے کہا تھا کہ پولیس والوں کو اس کے فون کا نہ بتایا جائے۔''

میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

تھوڑی دیر بعد ایک سیاہ فام مگر نفیس سی ڈاکٹر نے آ کر میرا معائنہ کیا اور میری حالت کو تسلی بخش قرار دیا۔ اس کے بعد ایک بلڈاگ کی سی شکل کا سفید فام پولیس آفیسر آدھمکا۔ میں نے اسے ساری تفصیل بتائی۔ وہ خاموشی سے نوٹ لیتا رہا پھر کُرید کُرید کر سوال کرنے لگا۔ مجھے شک سا ہوا کہ اس کی تمام تر دلچسپی جیسی کی ذات سے تھی۔ میں محتاط ہوگیا۔ جنوبی افریقن پولیس کی شہرت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ کرپشن کے معاملے میں یہ لوگ بھی ہم سے زیادہ پیچھے نہیں تھے۔

خدا خدا کر کے پولیس آفیسر رخصت ہوا تو نیرو اور سردار جی اندر داخل ہوئے۔ سردار جی خوب اونچے، لمبے تھے۔ پگڑی کے ساتھ سفید داڑھی اور مونچھیں انہوں نے رنگ لی تھیں۔ یہ کمبی نیشن ان پر جچتا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے ہانک لگائی۔ ''منڈے آ..... تُو تے چھپا رستم نکلیا اے۔ کڑی وی سیٹ کر لئی تے سانوں خبر ای نہیں ہون دیتی۔'' انہوں نے دھیرے سے میرے بازو پر چپت لگائی۔

''نہیں سردار جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''اوئے رہیر دے! اے اسی دھپ وچ چٹے کیتے نے۔'' انہوں نے مونچھ کا کونا پکڑا۔

نیرو نے شرارت سے کہا۔ ''ڈیڈی جی! اے تے کالے نے۔''

انہوں نے نیرو کو گھورا تو اس نے سنجیدہ سا منہ بنانے کی کوشش کی۔ اس کی یہ ناکام کوشش دیکھ کر میں ہنسی روک نہیں پایا تھا۔ ہمارے درمیان بار روم میں بھی اکثر یہی کچھ چلتا رہتا تھا۔

سردار جی اپنے نقصان پر ذرا بھی خائف نہیں تھے بلکہ وہ خوش تھے کہ میں نے نہ صرف ایک پنجابی لڑکی کو سیاہ فاموں سے بچایا تھا بلکہ اسے پناہ دینے کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ چکر بھی چلا لیا تھا۔ وہ یہ بات سننے کو ذرا بھی تیار نہیں تھے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بے حد خوش تھے کہ میری زندگی میں ایک ''پنجابی کڑی'' آ گئی ہے۔ انہیں خوش دیکھ کر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

pklibrary.com

''ریڈ مون'' کی مالکن کا نام جوزی معلوم ہوا تھا۔ وہ کئی غیر اخلاقی دھندے چلاتی تھی اور اس کے اثر و رسوخ سے بھی انکار ممکن نہیں تھا۔ فی الوقت وہ منظرِ عام سے غائب تھی۔ پولیس اس کی رہائش گاہ اور نائٹ کلب کا ایک دفعہ چکر لگا چکی تھی۔ یہ سب مجھے سردار جی کی زبانی معلوم ہوا تھا۔

سردار جی نے ڈٹ کر جوزی کا سامنا کرنے کا اعلان کیا تو میرا حوصلہ بھی بڑھ گیا۔ ڈاکٹروں نے چوبیس گھنٹے بعد آخری معائنہ کرنا تھا۔ اس کے بعد ہی مجھے گھر جانے کی اجازت ملنے والی تھی۔

جاتے ہوئے نیرو نے چپکے سے میرا موبائل فون تکیے کے نیچے سرکا دیا تھا۔

تنہائی میسر آتے ہی میں نے موبائل فون چیک کیا۔ میری فون بک میں صرف چند ہی نام تھے۔ اب وہاں ایک اور نیا نام محفوظ ہو چکا تھا۔ پنجابی کُڑی۔ یہی نام ریسیو کال میں بھی تھا۔ جیسی کا نمبر یقیناً نیرو نے اس نام سے محفوظ کر دیا تھا۔

دل کے کسی جذبے سے زیادہ مجھے..... اس کی خیریت کی فکر تھی۔ میں نے فوراً کال کر دی۔ نمبر پاور آف جا رہا تھا۔ میں نے دوبارہ کوشش کی مگر اسٹیٹس وہی رہا۔ میں نے چیک کیا وہ واٹس ایپ پر بھی تھی۔ ڈی، پی، اس نے ایک کیوٹ سی بلی کی لگا رہی تھی۔ میں نے فوراً اسے واٹس نوٹ کر دیا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ میرے لیے کھانا آ گیا۔ بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے کھانا کھا لیا۔ کھانے کے کچھ ہی دیر بعد پسلیوں میں درد کی اسٹیٹس اٹھنے لگیں اور رفتہ رفتہ درد بڑھنے لگا۔ اب تک میں شاید پین کلر کے زیرِ اثر تھا جس کے سبب یہ درد دبا ہوا تھا۔ جوزی نے بڑی بیدردی سے میری پسلیوں میں ٹھوکریں ماری تھیں۔

شکر تھا کہ جلد ہی ایک فربہ اندام سفید فام نرس میرے کمرے میں آ گئی۔ میں نے درد کی شکایت کی تو ایک مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''اسی لیے تو آئی ہوں۔ انجکشن کا وقت ہو گیا تھا۔''

اس نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ ایک انجکشن میری نس میں اتار دیا اور تسلی دیتے ہوئے واپس چلی گئی۔

رفتہ رفتہ درد دم توڑ گیا۔ اچانک میرا موبائل فون گنگنایا تو دل کی دھڑکن خواہ مخواہ ہی بڑھ گئی۔ میں نے تیزی سے موبائل اٹھایا تو اسکرین پر نیرو کا نام جگمگا رہا تھا۔ میں گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

نیرو نے میری خیر و عافیت جاننے کے فوراً بعد پوچھا۔

''اس سے بات ہوئی؟'' انداز میں بے پناہ اشتیاق تھا۔

میں نے جب بتایا کہ اُس کا نمبر بند جا رہا ہے تو وہ قدرے مایوس ہوئی مگر فوراً ہی سنبھل کر مجھے آس دلائی کہ کوئی نہیں، دیکھ لینا وہ جلد ہی فون کرے گی۔

اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد اس نے کال کاٹ دی۔

موبائل پر گیم کھیلتے ہوئے غیر ارادی طور پر مجھے اس کی کال کا انتظار تھا۔ پھر میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ شاید یہ اس انجکشن کا کام تھا جو تھوڑی دیر پہلے نرس نے مجھے لگایا تھا۔

نہ جانے میں کتنی دیر سویا رہا۔ نیند کے عالم میں مجھے احساس ہوا کہ میرا موبائل مسلسل گنگنا رہا ہے۔ نیند کا غلبہ بے انتہا تھا۔ میں نے اس گنگناہٹ کو نظر انداز کر دیا۔ آخر کار موبائل خاموش ہو گیا۔

دوبارہ سے نیند کی گہری وادی میں اترتے ہوئے دماغ میں جگنو سا چمکا۔ اگلے پل میرا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ مجھے تو کسی کی کال کا شدت سے انتظار تھا۔

ایک جھٹکے سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ پنجابی کُڑی کی چار کالز آ چکی تھیں۔ میں نے فوراً بیک ٹو کال کی۔ دل کی دھڑکن زیر و زبر ہونے لگی۔ بیل جا رہی تھی۔ تیسری بیل پر کال ریسیو ہو گئی۔

وہ تہذیب کی آواز میں بولی۔ ''لگتا ہے سو رہے تھے جھوٹے!''

''ہاں مگر تم نے مجھے جھوٹا کیوں کہا؟''

وہ دھیرے سے ہنسی۔ اس ہنسی میں جیسے کوئی راز چھپا تھا۔ ''بتاؤں گی مگر اپنے بارے میں بتاؤ! کیسے ہو اب؟''

''بالکل ٹھیک ہوں اور تمہارے لیے فکر مند ہو رہا ہوں، کہاں ہو؟''

''ہائے.....'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''اس فکر مندی پر تو جان قربان کر دینے کو جی چاہ رہا ہے۔''

میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''جو پوچھا ہے، وہ بتاؤ۔''

''میں بھی بالکل ٹھیک اور محفوظ ہوں۔'' اس کے لہجے میں چھپی خوشی مجھ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ ''کہاں ہوں اور میرے بہت قریب کون ہے تو شاید یہ جان کر تمہاری دھڑکن رک جائے۔ اس لیے یہ نہ جاننا تمہارے لیے بہتر ہے۔''

pklibrary.com

اس کا لہجہ دوبارہ سے اسرار کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔
''پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟ صاف بات کرو۔''
''کرتی ہوں مگر پہلے ایک اور اہم بات جان لو۔''
میں خاموشی سے اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ لمحے بھر کے وقفے کے بعد وہ بولی۔
''جوزی بے حد خطرناک اور کینہ پرور عورت ہے۔''
''یہ بات تو میں جان گیا ہوں۔''
وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''تم نے صرف آئس برگ کا اوپری حصہ دیکھا ہے۔ اس کی طاقت و اثر رسوخ کا صرف اس بات سے اندازہ لگا لو کہ دنگا و فساد، املاک کو نقصان پہنچانے اور تشدد کے سنگین ترین چارج لگنے کے بعد بھی وہ پولیس کی پہنچ سے دور ہے۔''
میں نے کہا۔ ''وہ کہیں روپوش ہے؟''
وہ ہنسی۔ ''میرے بھولے شہزادے! ایسا بالکل نہیں ہے۔ اس کی صرف آمد و رفت محدود ہوئی ہے۔ ریڈ مون کے لگژری سوٹ میں اس وقت بھی وہ بڑے ٹھمطراق کے ساتھ موجود ہے۔''
میں قدرے حیران ہوا۔ ''مگر وہاں تو پولیس نے چھاپا مارا تھا۔''
''چھاپا مارنے والوں کے منہ نوٹوں سے بھر دیے گئے ہوں گے..... بہرحال یہ سب کہنے اور تمہیں بتانے کا مقصد ہے..... تم محتاط رہو۔ اُسے یقین ہے کہ مجھے..... تم نے ہی کہیں چھپا رکھا ہے اور میں، اس کی ضد بن چکی ہوں۔ کلب میں..... میری ایک ہمدرد ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ مجھے کلب میں بے لباس نچوانے کی اس نے قسم کھائی ہے۔''
میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ ''ایسا ہوا تو وہ عورت میرے ہاتھوں ماری جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے مجھے اپنا لہجہ اجنبی سا محسوس ہوا۔ فولادی عزم نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا۔
اگلے پل وہ بے تحاشا فون کو چومے جا رہی تھی۔
''پاگل ہو گئی ہو؟''
''ہاں.....'' وہ مخمور انداز میں بولی۔ ''کاش اس وقت تم، میرے سامنے ہوتے۔''
میں بڑی مشکل سے اسے واپس ٹریک پر لایا۔ وہ سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔
''بس، میں نہیں جا رہی واپس انڈیا! جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔''
''یہ بیوقوفی نہیں کرنی۔ ایسا سوچ رہی ہو تو میں ابھی فون بند کرنے لگا ہوں۔''
اس دھمکی سے وہ ڈر گئی۔ اس کے دو پُراسرار جملے میرے دماغ میں کھلبلی سی مچا گئے۔ میں دوبارہ اسے اس طرف لایا تو وہ گہرا سانس لے کر سنجیدہ ہوئی۔
''زندگی بھی کبھی کبھار اتفاقات کا ایسا کھیل کھیلتی ہے کہ بندہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔''
اس کی تمہید مجھے بے چین کر رہی تھی۔ میں نے بمشکل خود کو بولنے سے روکا تھا۔
وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ ''مجھے اس سوال کا جواب مل گیا ہے کہ اُس رات تم، میری مدد کو کیوں لوٹے تھے۔ اسی سبب میں نے تمہیں جھوٹا کہا تھا۔''
میں اپنی جگہ الجھ ہی رہا تھا کہ وہ سرسراتے لہجے میں بولی۔
''تم اُس رات میری ''آواز'' سن کر پلٹے تھے۔ حیرت انگیز طور پر میری اور تہذیب کی آواز میں ناقابلِ یقین حد تک مشابہت ہے۔ یہ مشابہت اتنی زیادہ ہے کہ قریبی لوگ بھی بڑی آسانی کے ساتھ دھوکا کھا جاتے ہیں۔''
دماغ کے ساتھ ساتھ میرا پورا وجود ہی سنسنا اٹھا تھا۔ وہ یہ بات کیسے جان گئی تھی۔ لگتا تھا کوئی انہونی ہو گئی تھی۔ میں جیسے پتھر کے بت میں تبدیل ہو کر اسے سن رہا تھا۔
''تمہارے اس جملے کا مفہوم مجھ پر اب جا کر آشکار ہوا ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ تم، میری طرف دیکھنے سے کترا کیوں رہے ہو۔ تم نے بڑے آرام سے کہہ دیا تھا۔ ''مجھے دیکھنے سے زیادہ سننے میں دلچسپی ہے'' ایسا ہی کہا تھا نا تم نے گھنے!'' وہ ہنسی۔
میں نے بمشکل زبان کو حرکت دی۔ ''تم یہ سب کیسے جان گئی ہو؟''
وہ سنجیدہ ہوئی۔ ''سنا تھا کہ زندگی حیرت انگیز اتفاقات کا مجموعہ ہے مگر اس حقیقت کو دیکھ بھی لیا ہے۔ تہذیب، میرے بہت قریب موجود ہے۔ درمیان میں صرف دو کمرے ہیں..... وہ یہیں پورٹ الزبتھ میں ہی ہے۔''
حیرت کے شدید ترین جھٹکے کے ساتھ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''
وہ بولی۔ ''موصوفہ کے شوہر نامدار یہیں ایک ''رِگ'' پر تعینات تھے۔ مقامی باغیوں نے اس پوری کمپنی کو یرغمال بنا لیا تھا۔ پھر باغیوں نے ان بائیس یرغمالیوں کو ایک جرائم پیشہ گروہ کے ہاتھ بیچ دیا۔ جرائم پیشہ گروہ انہیں جنوبی افریقہ

لے آیا تھا۔ خیر..... جس کمپنی کے وہ ملازم تھے اس نے بھاگ دوڑ کی اور بھاری تاوان ادا کر دیا ہے۔ موصوفہ کے شوہر دیگر یرغمالیوں کے ساتھ کسی بھی وقت رہا ہونے والے ہیں۔ ان کے ''استقبال'' کے لیے پورا خاندان یہاں موجود ہے۔''

میرے سنسناتے دماغ میں وہ منظر دوبارہ ابھر آیا جب پرویز ایک گورے کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔

''تم یہ سب کیسے جان گئی ہو؟''

''تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ پانچ منٹ انتظار کرو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کال کاٹ دی۔

میں جھنجلا کر رہ گیا تھا۔ ماضی کی آندھیاں گزرے وقت کو اُڑا کر دوبارہ میرے سامنے لے آئی تھیں۔ سات سمندر پار جانے والی میرے قریب تھی۔ بہت قریب مگر شاید لامتناہی فاصلے پر بھی تھی۔

میرے اندر کچھ ٹوٹ کر دور تک بکھر گیا۔ وہ، میرے لیے نہیں اپنے شوہر کے لیے آئی تھی۔ تلخ سا دھواں تھا جو تیزی سے سینے سے اٹھ کر دماغ پر چھانے لگا تھا۔ وقت گزارنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر بے چینی سے مختصر سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ انتظار طویل ہونے لگا تو میں نے خود ہی کال کی مگر نمبر دوبارہ سے پاور آف جا رہا تھا۔ جھنجلاہٹ کے عالم میں بڑی مشکل سے میں نے موبائل فون کو دیوار پر کھینچ مارنے سے روکا تھا البتہ اسے بستر پر ضرور پھینک دیا۔

کچھ دیر بعد اس کی دوبارہ کال آئی تو میں نے بمشکل اپنے لہجے کی تلخی پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ''اتنی دیر کیوں کر دی؟''

وہ قدرے آواز دبا کر بولی۔ ''میں ایک بیمار اور معذور خاتون کے ساتھ بطور اٹینڈنٹ کام کر رہی ہوں۔ اسے دوائی دینے کا وقت ہو رہا تھا اور اس کے کمرے میں موبائل لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ وہ لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''میں، تمہارے اپارٹمنٹ سے نکلی تو بڑی اُلجھی ہوئی تھی۔ ضروری کاغذات اور نئے پاسپورٹ کے لیے میں اپنے سفارت خانے سے رابطہ کر سکتی تھی مگر اصل پریشانی یہ تھی کہ میں نے بلیک مارکیٹ سے سستے داموں گینڈے کے چند سینگ خریدے تھے۔ وہ ایک جگہ محفوظ ہیں۔ ان سے مجھے خاصی رقم ملنے کی امید ہے۔ میں نہ انہیں چھوڑ کر جا سکتی تھی اور نہ ہی ساتھ۔ لے کر جا سکتی تھی۔ اسی سبب میں نے چند دن خاموشی سے روپوش رہنے کا فیصلہ کیا۔''

سانس لینے کے لمحاتی وقفے کے بعد وہ دوبارہ بولی۔

''تم سے تیسرے بلاک میں، میری ایک انڈین دوست رہتی ہے۔ فیملی والی عورت ہے۔ پرانا تعلق ہے اور جوزی وغیرہ اس کے بارے میں نہیں جانتے۔ میں، اس کے پاس جا دھمکی۔ میری پریشانی..... اس کے ایک بڑے مسئلے کا حل بن گئی۔ وہ، یوکے کی ایک تیل کمپنی کے مقامی آفیسر کے ہاں کام کر رہی تھی۔ وہ، اس آفیسر کی معذور اور بیمار ماں کے ساتھ ہوتی تھی اور بمشکل پندرہ دن بعد چند گھنٹوں کے لیے گھر آتی تھی۔ پُرکشش معاوضہ خواہش کے باوجود اسے یہ نوکری چھوڑنے نہیں دیتا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اچانک سے اس نے پوچھا۔

''سن رہے ہو؟''

میں نے مختصر کہا۔ ''ہاں۔'' یوکے کی تیل کمپنی کا سنتے ہی میرے دماغ میں کہانی کا خاکہ واضح ہونے لگا تھا۔

وہ مزید آگے بڑھی۔ ''میری وہ دوست یکسانیت سے بُری طرح اکتا چکی تھی اور اپنی فیملی کے ساتھ کسی تفریحی مقام پر چند چھٹیاں گزارنے کی شدید خواہش مند تھی اور مجھے ایک محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی..... سو ہم دونوں کا مسئلہ حل ہو گیا۔ چند دنوں کے لیے اس کی جگہ میں نے سنبھال لی۔

تیل کمپنی کے آفیسر کے شاندار ولا میں پاکستان کے درجن بھر سے زائد مہمان بھی موجود تھے۔ انہیں مہمانوں میں سے ایک لڑکی کو جب میں نے بولتے سنا تو حیران رہ گئی۔ وہ، میری آواز میں بول رہی تھی۔''

مجھے اپنے دل میں ٹیسیں سی محسوس ہوئیں۔ بے اختیار میں سینہ مسلنے لگا۔

اپنی دُھن میں وہ کہہ رہی تھی۔ ''جب میں نے اُس کا نام جانا تو مزید کُرید لگ گئی۔ جلد ہی مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ میری ''ہم آواز'' تہذیب ہی بھی تمہاری تہذیب رہی تھی اور ساتھ ہی یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ تم نے میری مدد کیوں کی اور میں، تمہارے اتنے قریب کیسے آ گئی۔ ہم آواز ہونے کے سبب تم مجھ میں اپنی گم گشتہ محبوبہ کو دیکھ بلکہ سن رہے تھے۔''

مجھ سے اور برداشت نہیں ہوا تو میں چیخ پڑا۔ ''ہاں، یہی سچ ہے۔ مجھ پر اب اور نشتر مت چلاؤ۔'' ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ بے آواز آنسو میرے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

وہ خاموش ہوگئی۔ اس کی خاموشی طویل ہونے لگی تو میں نے آنسوؤں کا گھونٹ بھرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ’ایک اور وجہ بھی تھی۔‘‘

’’کیا.....؟‘‘ اس نے گلوگیر انداز میں پوچھا۔

’’تم..... مجھے اپنوں اور غیروں کی ستائی ہوئی..... اندر سے ٹوٹی ہوئی اپنے جیسی ہی محسوس ہوئی تھیں۔ ہمارے درمیان بے شک مختلف رنگ میں مگر ’’درد کا رشتہ‘‘ تھا۔ اس سبب بھی میں نے تمہیں اپنا گریبان بھگونے دیا تھا۔‘‘

میرے ساتھ وہ بھی رونے لگی۔ آواز دبانے کے لیے اس نے غالباً منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا پھر اُسے، میرے آنسو بھی محسوس ہو گئے۔ روتے روتے وہ..... مجھے چپ کروانے لگی اور میں اُسے..... تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ہنس رہے تھے۔

اس پل تہذیب مجھے دور اور وہ پنجابی کُڑی اپنے بے حد قریب محسوس ہوئی۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک اور انکشاف کیا کہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں اس کے اور تہذیب کے درمیان بہت سی باتیں ہوئی تھیں اور تہذیب یہ جان کر حیران ہوئی تھی کہ میں..... پورٹ الزبتھ میں ہوں مگر وہ..... مجھ سے ملنے کی ہرگز خواہش مند نہیں تھی۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے خوش اور مطمئن تھی اور سب سے بڑھ کر ایک بچی کی ماں تھی۔

جیسی کے پاس میرے لیے تہذیب کا ایک وائس میسج بھی تھا۔ وائس میسج سے پہلے اس نے مجھے کچھ تصویریں واٹس ایپ پر بھیج دیں۔ یہ تصویروں کا پورا البم تھا۔

میں نے ان تصویروں میں تہذیب کے کئی روپ دیکھے۔ زیادہ تر تصویریں، یوکے، کے تفریحی مقامات کی تھیں۔ وہ کہیں ماڈرن لباس میں تھی تو کہیں مشرقی لباس میں۔ اس کے ساتھ ایک خوب رُو نوجوان بھی تھا۔ یہ ہنی مون پیریڈ کی تصویریں تھیں۔ اس کے بعد کی تصویروں میں تہذیب بے حد نکھری نکھری سی نظر آئی۔ اس کے گالوں پر گلاب سے کھل اٹھے تھے اور وزن قدرے بڑھ گیا تھا۔ پھر اس کی پریگنینسی کے دنوں کی تصویریں تھیں..... پھر ننھی سی پری اس کی گود میں نظر آئی۔ بعد کی تصویروں میں وہ پری خاصی بڑی ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ اس کا خوبرو شوہر بھی موجود تھا۔ گھر..... گاڑیاں..... جو کچھ بھی نظر آیا تھا وہ ایک خوش حال اور خوش و خرم زندگی گزارنے والے خاندان کی زندگی کی جھلکیاں تھیں۔

میری آنکھوں میں جیسے مرچیں سی بھر گئی تھیں۔ میں نے تصویروں کو زوم کر کے بغور دیکھا۔ تہذیب کے چہرے اور آنکھوں میں کہیں مجھے ملال، افسردگی کی جھلک تک محسوس نہیں ہوئی بلکہ وہ بے حد خوش اور مطمئن نظر آتی تھی۔

میں نے تصور میں ہمیشہ اُسے بھی اپنی طرح تباہ حال ہی دیکھا تھا۔ شوہر کے ساتھ باامر مجبوری نباہ..... افسردہ اور خود سے بے پروا مگر حقیقت تو اس سے قطعی مختلف تھی۔ مجھے لگا کہ محبت کا سارا خسارہ میں نے ہی اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ وہ اس بوجھ کو بہت پہلے اپنے کندھوں سے جھٹک چکی تھی۔

پھر میں نے اس کا آڈیو میسج سنا۔ اُس کی آواز سنتے ہوئے دھڑکنوں نے ذرا بھی شور نہیں مچایا..... شاید دل پتھر کا ہو گیا تھا اُس نے کہا تھا۔

’’شاہ..... ہمارے درمیان جو کچھ تھا۔ میرے شادی کی ہامی بھرتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ میں سمجھتی ہوں اسٹوڈنٹ لائف کا وہ ایک وقتی ابال تھا جو وقت کے ساتھ ہی بیٹھ گیا مگر جیسی کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ تم ابھی تک اسی اُبال کے زیرِ اثر ہو..... سچ پوچھو تو ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔

ہاسٹل کے آخری دنوں نے زندگی کی معاشی سختیوں سے مجھے آشنا کیا تھا۔ سچ پوچھو تو ان دنوں کو یاد کر کے مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوئی تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ ہم ایک نہ ہو سکے۔ ہماری تو جیسے، تیسے گزر جاتی مگر شاید ہم اپنے بچوں کو وہ شاندار مستقبل نہ دے پاتے جو اَب کم از کم میں دے پاؤں گی۔

اچھے دوست کے طور پر میرا مشورہ ہے کہ زندگی بہت خوب صورت اور انمول ہے۔ اسے یوں ضائع نہ کرو۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا..... میری طرح خوابوں کی دنیا سے نکلو اور حقیقت کی دنیا میں آجاؤ۔ کچھ کرنے اور خود کو سنوارنے کے لیے تمہارے پاس ابھی وقت ہے۔ نیک خواہشات کے ساتھ تمہیں ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہتے ہوئے میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔‘‘

میں موبائل ہاتھ میں لیے گم صم بیٹھا تھا اور باہر پورٹ الزبتھ کی ایک اور رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ آہ..... جس کے لیے زندگی تیاگ دی تھی اسے بعد میں پتا چلا تھا کہ ہماری محبت محض ایک ’’وقتی اُبال‘‘ تھا۔ دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ جس کے درد نے میرے لفظوں کو پتھروں کو پگھلانے کی تاثیر دی تھی جس کے درد میں ڈوب کر درجنوں دل کو چھو لینے والی غزلیں اور نظمیں لکھی تھیں..... اس کے نزدیک محض ایک وقتی اُبال

تھا۔

میری شدتوں سے عاصم واقف ہوا تھا یا پھر جیسی! اتفاق سے دوسری طرف کی ''شدت'' سے جیسی واقف ہوگئی تھی۔ میں، جیسی کا سامنا کیسے کروں گا؟ میری داستان سنتے ہوئے اس نے کتنا درست اندازہ لگایا تھا کہ دوسری طرف اتنی شدت نہیں پائی جاتی۔ یہاں۔۔۔ سرے سے دوسری طرف نام کی بھی شدت نہیں تھی۔

شرمندگی اور زیاں کے احساس نے میرا سر جھکا دیا اور یہ سر گھٹنوں تک جھکا رہا۔ گزشتہ زندگی ایک فلم کے مانند نگاہوں کے سامنے تھی۔ جیسی نے شاید درست ہی تجزیہ کیا تھا کہ میں خود اذیتی کا شکار تھا۔

صبح ہونے تک میں خود کو خوب ملامت کرنے کے بعد کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔ سورج طلوع ہوا تو مجھے بھی یہ خوش کن احساس ہوا کہ میری زندگی کا بھی ایک نیا سورج طلوع ہو چکا ہے۔

تہذیب کے الفاظ میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ ''زندگی بہت خوب صورت ہے۔''

☆☆☆

اگلے دن میرا سر خوب زور سے چکرایا اور قے ہو گئی۔ معائنہ کرنے والے ڈاکٹر نے مجھے ڈسچارج کرنے کا فیصلہ موخر کر دیا۔

سردار جی اور نیرو..... جو مجھے ساتھ لے جانے کی خواہش کے ساتھ آئے تھے متفکر ہو کر لابی میں ہی بیٹھے رہ گئے۔

میرے دوبارہ سے کئی ٹیسٹ ہوئے۔ سر پر لگنے والی چوٹیں زیادہ خطرناک نہیں تھیں۔ کھوکھلے پائپ کے سبب سر زخمی ضرور ہوا تھا۔ ٹانکے بھی آئے تھے مگر کھوپڑی کی ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

میرا ذاتی خیال تھا کہ خواب آور دوائی کی مزاحمت کرتے ہوئے میں نے رات جاگ کر گزاری تھی اسی سبب میری یہ حالت ہوئی تھی۔

ٹیسٹ دوبارہ سے ٹھیک آئے تھے۔ اس کے باوجود مجھے مزید چوبیس گھنٹے اسپتال میں رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ ٹیسٹوں کی رپورٹس جان کر سردار جی اور نیرو مطمئن ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھے رہے اور پھر واپس چلے گئے۔

رات کے بعد سے جیسی کی طرف سے خاموشی تھی۔ میری جذباتی کیفیت سے وہ بخوبی اندازہ لگا چکی تھی۔ غالباً اسی سبب مجھے سنبھلنے کے لیے وقت دے رہی تھی۔

میں نہ صرف سنبھل گیا تھا بلکہ جیسے ہوش میں بھی آ گیا تھا۔ ہر چیز بدلی بدلی سی اور اچھی لگ رہی تھی۔ میں نے کال کی تو حسب توقع جیسی کا نمبر بند ملا۔ میں نے واٹس ایپ پر مختصر سا واٹس نوٹ چھوڑ دیا۔ سارا دن ایسے ہی گزر گیا۔ میں اس مختصر سے کمرے سے بری طرح اکتا گیا۔ میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے بات کی تو اس نے بڑی آسانی کے ساتھ میری صوابدید پر مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے خوشگوار حیرت کے ساتھ سردار جی کو فون کر دیا۔ وہ فوراً آدھمکے اور ضد کر کے مجھے اپنے گھر لے گئے حالانکہ میں اپنے اپارٹمنٹ جانے کا خواہش مند تھا۔

دورانِ سفر پورٹ الزبتھ کو میں آج ایک نئی نظر سے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 2400 روپے

بیرون ممالک کے لیے زرِ سالانہ 25,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0334-5498977
0301-2454188

سرکولیشن مینیجر محمد شہزاد خان: 0333-2256789

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ۔ کراچی

دیکھ رہا تھا۔ رواں دواں گاڑیاں، بلند عمارتیں اور جگمگاتے سائن بورڈ سب کچھ مجھے بے حد خوب صورت اور اچھا لگ رہا تھا۔

پہلے میں نے ایک جگہ رک کر آئسکریم کھائی تو سردار جی قدرے حیران ہوئے پھر گاڑی میں میری محویت کو محسوس کر کے ان سے رہا نہیں گیا، بولے۔ ''پہلی واری دیکھ رہیا اے شہر؟''

''ہاں..... سردار جی!''

سردار جی کا رنگ اُڑ گیا۔ ''بابا! خیر کریں۔ اوئے..... تیرا کوئی فیوز تے نہیں اُڑ گیا؟''

میں بے تحاشا ہنسا تو سردار جی کو یقین ہو گیا کہ سر کی چوٹ سے زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ میرا دماغ ضرور الٹ گیا ہے۔ انہوں نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی۔

''گدا اے..... واپس اسپتال جارا پاؤ!''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ گھر چلیں۔''

منہ میں کچھ بدبداتے ہوئے سردار جی نے دوبارہ سے رفتار بڑھا دی۔

ہم، سردار جی کے چھوٹے مگر خوب صورت سے گھر جانے کے لیے ذیلی سڑک پر مڑے تو ایک سیاہ سیڈان بھی ہمارے ساتھ مڑی تھی۔ عقبی آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے میں چونکا۔ ایکسپریس وے پر میں نے پہلے بھی اس گاڑی کو دیکھا تھا مگر اپنی ترنگ میں دھیان نہیں دیا تھا۔ ذیلی سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیڈان نے رفتار پکڑی اور ہمارے برابر آ گئی۔ سیڈان میں سفید دانت چمکاتی تین منحوس صورتوں کو دیکھتے ہی دماغ میں خطرے کا سائرن زور سے بجا اور نگاہوں کے سامنے ہتھنی نما جوزی آ گئی۔

سردار جی نے بھی کسی گڑبڑ کو محسوس کر لیا۔ انہوں نے رفتار بڑھائی۔ سیڈان نے بھی رفتار بڑھالی مگر جب سیڈان کی اگلی نشست پر بیٹھے سیاہ فام نے پسٹل کا رخ ہماری طرف کیا تو سردار جی نے گھبرا کر بریک لگا دی۔

مجھے بڑے زور کا جھٹکا محسوس ہوا۔ سیٹ بیلٹ کے سبب میں ڈیش بورڈ سے ٹکرانے سے تو محفوظ رہا تھا مگر سر میں جیسے بھونچال سا آ گیا تھا۔ سامنے کا منظر نگاہوں کے سامنے گڈمڈ سا ہو گیا۔

منظر واضح ہوا تو سیڈان نے ترچھا ہو کر ہمارا راستہ بالکل مسدود کر دیا تھا۔ ایک موٹر سائیکل سوار دور سے یہ منظر دیکھ کر وہیں رک گیا تھا اور تین اسلحہ بردار سیاہ فام ہماری طرف لپک رہے تھے۔ سابقہ تجربے کی بنیاد پر اس دفعہ ہتھیار انہوں نے پہلے ہی نکال لیے تھے۔ انہوں نے دیکھ رکھا تھا کہ یہاں پٹھوں کی طاقت سے کام چلنے والا نہیں ہے۔

میں نے بمشکل سیٹ بیلٹ کھولی ہی تھی کہ دروازہ کھول کر مجھے باہر گھسیٹ لیا گیا۔ مجھے گھسیٹنے والا وہی تھا۔ جیسی کو بچاتے ہوئے جس کے چہرے پر میں نے ٹکر ماری تھی۔ اس ٹکر کی معمولی سی نشانیاں ابھی باقی تھیں۔ دوسری طرف سے سردار جی کو نکال لیا گیا۔ بے ربط سے انداز میں سردار جی نہ جانے کیا کہہ رہے تھے۔ مجھے کھینچنے والے نے بے دریغ میرے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ تکلیف کی شدت سے دہرا ہونے کے باوجود میں نے اس کے پاؤں پر زور سے ٹھوکر ماری۔ بلبلاتے ہوئے اس نے پسٹل کا دستہ میری گدی پر مارا تو میں نیچے گر پڑا۔ اگلے ہی پل تینوں گالیاں دیتے ہوئے مجھ پر پل پڑے تھے۔ میرے لیے ان کا غیظ وغضب سمجھ میں آنے والا تھا۔ اس موقع سے سردار جی نے فائدہ اٹھایا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھاری بھرکم سردار جی کو اتنی رفتار سے بھاگتے دیکھ کر اس حالت میں بھی میں خاصا محظوظ ہوا۔

اگلے چند منٹوں میں، میں دو سیاہ فاموں کے درمیان سیڈان کی عقبی نشست پر سینڈوچ بنا ہوا تھا۔ دو فولادی ٹانگیں میری پسلیوں کو چھو رہی تھیں اور سر میں جیسے درد کا طوفان سا برپا تھا۔

یہ لوگ یا تو سردار جی کے ساتھ لگے ہوئے تھے یا پھر میرے لیے انہوں نے اسپتال کے باہر ہی ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

☆☆☆

ساحل کے قریب ہی ایک ویئر ہاؤس میں لا کر مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ ویئر ہاؤس میں بلاشبہ ہزاروں گتے کے کارٹن ترتیب سے پڑے ہوئے تھے اور اُس بُو بھی جو دوائیوں کے گودام سے آتی ہے۔

مکمل تلاشی کے بعد میرا موبائل اور جیبوں میں جو کچھ تھا نکال لیا گیا تھا۔ مجھے کمرے میں بند کر کے اور لائٹس وغیرہ آف کر کے تینوں سیاہ فام افراتفری کے عالم میں وہاں سے نکل گئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وسیع وعریض ویئر ہاؤس میں، میں تنہا ہوں۔ اگر کوئی واچ مین تھا تو ویئر ہاؤس کے باہر ہی تھا۔

pklibrary.com

اپنے قید خانے کا جائزہ لیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ آخر کار میں جوزی کے ہتھے چڑھ ہی گیا تھا۔ پسلیوں اور سر میں شدت کا درد جاگ اٹھا تھا۔ چہرے پر نئی چوٹوں کے نشان تھے اور سر کی پٹی بھی ایک طرف سے کھل گئی تھی۔ کسی نہ کسی طرح میں نے پٹی دوبارہ سے لپیٹ لی۔

مختصر سا کمرا کسی بھی قسم کے فرنیچر سے عاری تھا۔ فرش پر گرد کی دبیز تہ تھی اور کئی اقسام کے حشرات الارض نظر آئے تھے جو روشنی کے سبب کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے۔ فولادی دروازے کے ساتھ کھڑکی تھی جس کے باہر کی جانب گرل لگی ہوئی تھی۔ میں نے فولادی گرل کے ساتھ زور آزمائی کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تھک ہار کر میں گرد آلود فرش پر بیٹھ گیا اور دیوار کے ساتھ کمر لگالی۔ ان حالات میں خدا کے بعد واحد امید سردار جی تھے۔ ساتھ ہی یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ میرے موبائل میں جو ڈیٹا تھا اس کے سبب میرے اور جیسی کے باہم رابطے سے یہ لوگ آگاہ ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی کال بھی آسکتی تھی۔

لوکیشن کا تو نہیں لیکن مجھے کم از کم یہ ضرور معلوم تھا کہ جیسی کس کے گھر پر تھی مگر یہ لوگ میری کھال ادھیڑ کر بھی میری زبان نہیں کھلوا سکتے تھے۔ یہ میرے اندر سے اُبھرنے والی آواز تھی اور مجھے مضبوطی عطا کر رہی تھی۔

سوچتے سوچتے اچانک خیال آیا کہ ہم جس دریا میں رہتے تھے، اس میں جوزی کی حیثیت ایک مگر مچھ کی سی تھی۔ اس کے ساتھ بیر رکھ کر یہاں رہنا مشکل تھا۔ اس مگر مچھ کے ساتھ مفاہمت کا خیال آیا تو ایک امید نے سر اٹھایا۔ رفتہ رفتہ امید بڑھنے لگی اور ایک خیال مضبوط ہونے لگا۔ جلد یا بدیر جوزی سے میرا سامنا تو ہونا تھا۔

کئی گھنٹوں بعد کھٹ پٹ کی آوازیں اُبھریں اور لائٹس آن ہوگئیں۔ میں جلدی سے اٹھ کر کھڑکی میں آیا۔ یہ مجھے زبردستی لانے والے تین افراد میں سے دو تھے۔ انہوں نے آتے ہی میری کئی تصویریں بنائیں۔ میں نے غور کیا تو اس مقصد کے لیے میرا ہی موبائل فون استعمال ہو رہا تھا۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔

''مجھے مادام جوزی سے بات کرنی ہے۔''

اُن میں سے ایک گرل کے قریب آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ ان نگاہوں کو میں کوئی مفہوم نہیں پہنا سکا پھر وہ بولا۔

''صرف بات نہیں..... بہت جلدی ملاقات بھی ہونے والی ہے۔'' اس کے انداز میں دھمکی صاف محسوس ہوتی تھی۔ ''مادام خود بھی تم سے ملاقات کے لیے بے چین ہیں۔''

اس بات پر دوسرے نے دانت نکال دیے تھے۔

مجھ سے بات کرنے والا قدرے اور قریب ہوا اور بغور مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم میں کچھ تو خاص ہے کہ ایک لڑکی جس کی خودغرضی کی مثال دی جاتی ہے..... تمہارے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔''

خدشات نے میرا دل لرزا دیا۔ ''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جانتے تو ہو تمہاری نئی نویلی محبوبہ کا ذکر ہو رہا ہے۔''

بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی۔ یقیناً میری تازہ ترین تصویریں جیسی کو ہی بھیجی جا رہی تھیں۔ دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''مادام سے بات کرنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے، اس کی ذمے داری صرف اور صرف تم پر عائد ہوگی۔ فوراً میری بات کراؤ ورنہ بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

میرے انداز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ایک طرف ہو کر اپنے موبائل فون کے ذریعے کسی سے بات کی اور پھر میری طرف آیا تو اُس کے چہرے پر بڑی کمینی سی مسکراہٹ تھی۔ ''جو کہنا ہے کہہ دو! مادام تک تمہارا پیغام پہنچ جائے گا۔ مادام ایک خاص الخاص شو کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ امید ہے یہ شو کل رات ہوگا اور اس میں تمہاری محبوبہ ناچے گی۔''

مجھے لگا جیسے ہوش کا دامن مجھ سے چھوٹ گیا ہے۔ میں نے اتنی شدت سے گرل کو ٹکر ماری کہ وہ تھرتھرا گئی۔ ''کہہ دینا اُس کمینی عورت سے..... تم سب میرے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔ میں اس ہتھنی کو پورٹ الزبتھ کی سڑکوں پر ننگا نچواؤں گا۔''

پیچھے ہٹ کر اس نے مجھے خونی نظروں سے گھورا۔ دوسرے کا حال بھی زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اپنی مادام کے بارے میں میرے خیالات جان کر دونوں کے چہروں پر زلزلے کی سی کیفیت نظر آئی۔ میرے منہ میں جو آیا میں نے کہہ دیا۔ پھر میری طرح شاید وہ دونوں بھی ہوش کا دامن چھوڑ بیٹھے اور دروازہ کھول کر کمرے میں گھس آئے۔

وہ مجھے پہلے ہی زخمی جان کر مزید دلیر ہو گئے تھے مگر نہیں جانتے تھے کہ میرے وجود میں آتش فشاں سے پھٹ پڑے ہیں اور اُبلنے والا لاوا اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے

گیا ہے۔ مجھے بھی خاصی چوٹیں آئی تھیں مگر اُن کا سامنا تو ایک طوفان سے تھا۔ آخر میں ایک نے پستول نکالنے کی کوشش کی تو وہ میں نے چھین لیا اور پھر وزنی فولاد کی ضربوں نے انہیں میرے قدموں میں لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

انہیں کمرے میں بند کر کے میں باہر نکل آیا۔ ان کے ہتھیار اور موبائل فون اب میرے پاس تھے۔ میں نے ان سے حاصل کردہ اپنے موبائل فون کے ذریعے فوراً جیسی کو کال کی۔ شکر تھا کہ اس کا نمبر آن تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ ششدر رہ گئی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''میں، جوزی کی گرفت سے نکل چکا ہوں۔ اب پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اوہ..... تھینکس گاڈ! اس کی آواز میں جیسے جان پڑ گئی۔ ''اس کتیا نے تمہارے موبائل سے ہی مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ میں چند گھنٹوں میں تمہارے پاس آنے والی تھی۔''

''بے وقوف ہو تم۔ یہ کیا کرنے جا رہی تھیں..... وہ زیادہ سے زیادہ مجھے مار ہی دیتے نا۔''

وہ رونے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اپنی لوکیشن کے بارے میں تو اسے نہیں بتایا؟''

آنسوؤں کے درمیان اس نے انکار میں جواب دیا۔ میں نے مزید کہا۔ ''رونا چھوڑو اور چند گھنٹوں کے لیے نمبر بند کر دو۔ میں بعد میں رابطہ کرتا ہوں۔''

وہ بھیگی آواز میں بولی۔ ''سب چھوڑ دو..... ہم خاموشی سے کہیں نکل جاتے ہیں۔''

میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تین گھنٹے بعد رابطہ کرتا ہوں۔'' ساتھ ہی میں نے کال کاٹ دی۔ فوراً ہی اس کی کال آ گئی۔ میں نے اپنا موبائل ہی آف کر دیا۔

اب میرے ہاتھ میں وہ موبائل تھا جس سے میرے قیدیوں میں سے ایک نے تھوڑی دیر پہلے کال کی تھی۔ میں نے کال لسٹ دیکھی تو سب سے اوپر جوزی کا نام جگمگا رہا تھا۔ میں نے کال کر دی۔ کئی گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو ہو گئی اور اس کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اب کیا تمہاری ماں بھاگ گئی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جس کی ماں کے بھاگنے کا تمہیں اندیشہ ہے وہ..... میرے قدموں میں پڑا ہوا ہے۔''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ جوزی کو یقیناً سانپ سونگھ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''جیسی کے حوالے سے جس خاص شو کا تم اہتمام کر رہی ہو اگر تم خدانخواستہ کامیاب ہو بھی گئیں تو اس کے بعد یا تو میں زندہ رہوں گا یا پھر تم زندہ رہو گی۔ ہم میں سے ایک کا مرنا یقینی ہے۔''

مجھے اس دن اندازہ ہوا کہ ارادے کی طاقت جب لہجے کو ملتی ہے تو مقابل پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ زندگی جوزی کو بہت پیاری تھی اور وہ، میری دیوانگی کی چند جھلکیاں دیکھ چکی تھی۔ تازہ مثال ابھی اُس کے سامنے تھی۔ وہ بولی۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

مجھے توانائی کا احساس ہوا، میں نے کہا۔ ''تم سے مل کر مفاہمت کی بات کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے نصف گھنٹے بعد میں اور جوزی ایک بڑی سی گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے دو افراد باہر کھڑے تھے۔

جوزی کی ایک ٹانگ پر پلستر چڑھا ہوا تھا اور ایک ٹن سے وہ بیئر کی چسکیاں لے رہی تھی۔ ایک چسکی لے کر وہ بولی۔ ''تم دلیر ہو اور ایسے لوگوں کی میں قدر کرتی ہوں ورنہ تمہاری دھمکی میں نے.....'' اس نے بڑے مردانہ انداز میں ایک ناقابلِ بیان جملہ کہا۔

''یہ تمہارا بڑا پن ہے۔ میں اس کے لیے تمہارا مشکور ہوں۔ اپنی اور جیسی کی تمام کوتاہیوں کی تم سے معافی مانگتا ہوں۔''

اس کے کرخت چہرے پر نرم سی پھوار برسنے لگی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے وہ بولی۔ ''ویسے تمہاری ''پریم کہانی'' نے بھی مجھے متاثر کیا ہے۔ اس سبب بھی میں تمہارے بارے میں نرمی سے سوچنے لگی ہوں۔''

میں نے ایک دفعہ پھر اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولی۔ ''اب کام کی بات کرو۔''

میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔ ''ہمارے درمیان جو کچھ ہوا..... اس کا میں جرمانہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔ تم، جیسی کو تمام معاہدوں سے آزاد کر دو اور ہمیں..... ہمارے حال پر چھوڑ دو! میں، تمہارے خلاف پولیس کیس واپس لے لیتا ہوں۔''

اس نے پولیس کیس کو ایک شاندار گالی سے نوازتے ہوئے کہا۔ ''اس کی مجھے پروا نہیں اور کسی جرمانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے میرے بندوں کو مارا..... میری ٹانگ بھی توڑی..... بدلے میں تمہارا حلیہ بھی بگڑا ہوا ہے۔ یہ حساب تو برابر اور ختم سمجھو۔'' پھر اس کا لہجہ رمزیہ ہوا۔ ''جیسی کو تحریری معاہدوں سے بھی تمہاری خاطر آزاد کر سکتی

pklibrary.com

مگر ایک معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے، سو خاموش رہا۔ وہ، میرے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے بولی۔

"میں نے جیسی کو اپنے کلب میں ننگا نچوانے کی درجنوں لوگوں کی موجودگی میں قسم کھائی ہے۔ میں اس قسم کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ البتہ میری بدلی رنگت اس جہاندیدہ عورت سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ جان گئی تھی کہ یہ ذکر میرے لیے کتنا تکلیف دہ ہے۔

میں نے کہا۔ "ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو آخر ہوتا ہی ہے نا۔"

اُس نے آنکھیں گھمائیں اور بظاہر عام سے انداز میں بولی۔ "کیوں نہیں..... میں اندر سے قدیم قبائلی عورت ہی ہوں۔ ایک بھینٹ دے کر اس قسم سے آزاد ہو سکتی ہوں۔"

"کیسی بھینٹ؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

اُس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک نمودار ہوئی۔ "کہیں سے سیاہ گینڈے کے دو، تین سینگوں کا انتظام ہو جائے تو ان کی بھینٹ سے کام چل جائے گا مگر میں اتنی مہنگی بھینٹ کا انتظام نہیں کر سکتی۔"

میں نے طویل سانس لیا۔ اس چالاک عورت کو یقیناً کہیں سے جیسی کی تحویل میں موجود ان سینگوں کی بھنک پڑ گئی تھی اور انہی کے لیے اس نے بھینٹ والا ڈراما کیا تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہارے لیے "بھینٹ" کا انتظام ہو جائے گا۔"

بے اختیار اُس کے دانت نکل آئے اور نتھنے ضرورت سے زیادہ پھیل گئے۔ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "پھر آج سے ہم دوست ہوئے۔"

میں نے اس کا کھردرا ہاتھ تھام لیا۔

☆☆☆

وقت تیزی سے بیت گیا ہے۔ میری شادی کی آج دوسری سالگرہ ہے۔ میری شادی میں پاکستان سے عاصم اور اس کے چند دوستوں نے بھرپور شرکت کی تھی اور سردار جی کے ساتھ مل کر خوب بھنگڑے ڈالے تھے۔ نیرو بھی پیچھے نہیں رہی تھی۔ میری بہن اپنے شوہر اور بچوں سمیت آئی تھی۔ بھائیوں کو میں نے محض دعوت نامے بھیجے تھے اور ظاہر ہے وہ نہیں آئے تھے۔ بہن کو میں نے نہ صرف اصرار کر کے بلایا تھا بلکہ تمام اخراجات بھی اٹھائے تھے۔

نیرو کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ کبھی کبھار آ جاتی ہے۔ سردار جی اکیلے ہو جاتے اسی لیے وہ زبردستی ہمیں گھر لے آئے ہیں اور ان کا اب سارا وقت میرے ننھے بیٹے تیمور کے ساتھ کھیلتے ہوئے گزرتا ہے۔ ان کی مرضی سے ہم بار روم کو ریستوران میں تبدیل کر لیا ہے۔

سردار جی آج بھی مجھے گالیوں سے نوازتے ہیں مگر میری بیوی تہذیب فاطمہ کو بڑے پیار سے "فاطمہ پُت" کہہ کر بلاتے ہیں تو وہ نہال سی ہو جاتی ہے۔

آج خاص دن تھا۔ فاطمہ تو ریستوران آج آئی ہی نہیں تھی جب شام ڈھلنے لگی تو سردار جی نے مجھے گھورا۔ "اوئے کھوتے دیا کھرا تو گھر نہیں جارا؟"

"بس، سردار جی نکلنے لگا ہوں۔"

سردار جی نے تیوریاں چڑھائیں۔ "نکلے گا یا دولتی کھا کے جارا ائی۔"

دولتی سے پہلے میں ریستوران سے باہر نکل آیا۔

گھر پہنچا تو فاطمہ تیمور سمیت میری منتظر تھی۔ شادی کی سالگرہ کا کیک ہم نے گھر کاٹا اور پھر باہر نکل کھڑے ہوئے۔ گھومتے، پھرتے رات کا کھانا ہم نے باہر کھایا اور پھر واپس آ گئے۔ ہم سے پہلے سردار جی نہ صرف واپس آ گئے تھے بلکہ اوپر منزل پر اپنے کمرے میں سو بھی چکے تھے۔

تیمور کو سُلا کر وہ، میرے پاس آ دھمکی۔ ریشمی تاریکی میں ریشم کا ڈھیر سا میرے سینے پر دھرا تھا اور اس سے اٹھتی خوشبو مجھے مدہوش کر رہی تھی۔

میرا ہاتھ کھینچ کر اپنے بالوں پر رکھتے ہوئے وہ مخمور انداز میں بولی۔ "شروع ہو جاؤ۔"

میری انگلیاں اس کے بالوں میں سرسرانے لگیں۔ گزشتہ دو سال سے یہ بھی میری "ڈیوٹی" تھی۔ اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ زندگی کتنی خوب صورت ہے۔ اسے گھڑے کو بجا کر پرکھنے والوں کے لیے کبھی بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

آخر میں ایک چھوٹی سی بات بتا دوں کہ تہذیب فاطمہ کو میں فاطمہ کہہ کر بلاتا ہوں..... وہ جھگڑتی ہے..... اسے تہذیب نام اچھا لگتا ہے..... چاہتی ہے اُسے تہذیب کہہ کر بلاؤں مگر یہ نام میرے حافظے سے مٹ چکا ہے اور یہ نام مٹانے والی بھی وہی پگلی ہے۔

❖❖❖

pklibrary.com

سودائے زر

ایچ اقبال

جس طرح تیز روشنی میں آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں... بالکل اسی طرح زر... زن اور زمین کی کشش آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے... راتوں رات تمام خواہشات پایۂ تکمیل تک پہنچ جائیں... انسان انسانیت صداقت کو خیرباد کہہ کے خواہش کے بے لگام گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے... جس کا کام صرف دوڑنا ... ہوتا ہے... زر کی سنہری زنجیر سے بندھے ایسے ہی چند کرداروں کی وحشت انگیزی... نیند میں ڈوبے امانت میں خیانت کے مرتکب قیامت خیزی کو دعوت دینے والے ہوس پرستوں کا ماجرائے ستم... وہ بنا سوچے فیصلے اور عمل میں انتہائی تیزی سے قدم بڑھا رہے تھے...

آنکھ میں بکھرے خوابوں کا سودا کرنے والے زر گزیدوں کا جنون.....

ماسٹر ہمدانی نے اپنے موجود ساتھیوں کو یکے بعد دیگرے دیکھا، پھر اُس کی نظر وجاہت پر رکی۔

''یہ اہم کام میں تم سے کروانا چاہتا ہوں۔''

''جی ماسٹر!'' وجاہت نے ادب سے کہا۔

''اس بیگ میں دو کروڑ ڈالرز ہیں۔'' ہمدانی ماسٹر نے کہا۔ ''یہ تمہیں شرجیل تک پہنچانے ہیں۔ شرجیل یہ کسی اور کو پہنچائے گا جو اس شہر میں نہیں رہتا۔''

''ٹھیک ہے ماسٹر۔''

''ابھی دو بجے ہیں، رات کو پولیس موبائلز کا گشت بڑھ جاتا ہے۔ تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ راستہ طویل ہے تم پانچ بجے تک وہاں پہنچ سکو گے۔''

''میں ایسے راستے اختیار کروں گا جہاں پولیس موبائل کم ہی نظر آتی ہے۔ ویسے میری کار میں ایک ایسا خفیہ خانہ ہے کہ پولیس کے فرشتے بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔''

''میں نے اسی خفیہ خانے کی وجہ سے تمہارا انتخاب کیا ہے۔''

''میں روانہ ہوتا ہوں ماسٹر!'' وجاہت نے کہا۔

''راستے میں چند منٹ کے لیے اپنے گھر پر رکوں گا۔ ویسے بھی مجھے گھر پہنچنے میں دیر ہو چکی ہے۔ رات بھر غائب رہوں گا تو شبنم بہت پریشان ہو جائے گی۔''

''بہت چوکس رہنا۔''

''آپ اطمینان رکھیں ماسٹر!''

وجاہت بیگ اٹھا کر ماسٹر ہمدانی کے گھر سے نکل آیا۔

اپنے گھر وہ اس لیے جانا چاہتا تھا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔

اس نے اپنے گھر کی کال بیل بجائی ہی تھی کہ شبنم نے دروازہ کھول دیا۔

''کیا دروازے پر ہی کھڑی ہوئی تھیں؟'' اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''جلدی سے ایک کپ کافی پلا دو۔ مجھے پھر جانا

pklibrary.com

ہے۔"

"اتنی دیر سے تو آئے ہو، اور اب پھر جانا ہے۔"

"تم کافی بنالاؤ۔ بتادوں گا کہ مجھے کیوں اور کہاں جانا ہے، دیر نہ کرو، مجھے بہت جلدی ہے۔"

"میں لاتی ہوں۔" شبنم تیزی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

وجاہت ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھ کر شہر کی سڑکوں کا وہ نقشہ دیکھنے لگا جو وہ اپنی کار سے نکال لایا تھا۔ اتنی دیر میں شبنم کافی بنالائی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے نقشہ دیکھ کر کہا۔

"راستوں کا انتخاب کر رہا تھا بلکہ کر چکا ہوں۔"

وجاہت نے نقشہ تہ کر کے اپنی جیب میں رکھا۔ اس نے شبنم کے ہاتھ سے کافی کی پیالی لے لی تھی۔

"جہاں جانا ہے، اس کے لیے اتنی احتیاط؟"

"رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے اور معاملہ دو کروڑ ڈالرز کا ہے۔"

"دو کروڑ ڈالرز؟" شبنم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"میرے نہیں ہیں۔" وجاہت نے کہا۔ "ماسٹر نے یہ میرے ذریعے شرجیل کے گھر پہنچانے کی ذمے داری سونپی ہے۔"

"اوہ..... اور وہ بھی اتنی رات کو؟"

"ایمرجنسی ہوگی۔ شرجیل کو یہ ڈالرز شاید کل صبح کسی اور کو پہنچانے ہیں۔"

"تو اسے یہ کام دن میں کرنا ہوگا جبکہ تم اس وقت جا رہے ہو۔ شرجیل کا فارم ہاؤس بھی ایسی سڑک پر ہے جو عموماً ویران رہتی ہے۔"

"سبھی کے بارے میں سب کچھ جانتی ہو تم۔"

"جب وہ تمہیں دو تین دن کے لیے کہیں بھیجتے ہیں تو پھر میں انہی کے گھر پر ہوتی ہوں۔ وہ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں، جیسے میں ان کی بیٹی ہوں جب وہ اپنے آدمیوں سے باتیں کرتے ہیں، وہ میں نے بھی کبھی سن لی ہیں، پھر تم سے بھی تصدیق ہوگئی کہ وہ کس قسم کے کام کرتے ہیں۔"

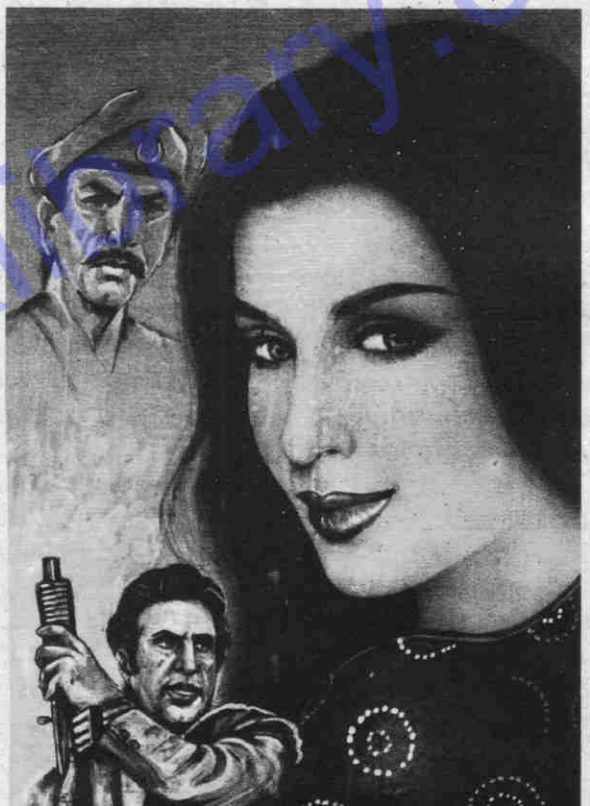

pklibrary.com

''میں ان کے لیے اُس وقت سے کام کر رہا ہوں جب ہم دونوں کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، بس محبت کی کشتی چل رہی تھی۔''

''زیادہ خطرناک کام وہ تم ہی سے کرواتے ہیں۔''

''مجھ پر سب سے زیادہ اعتماد ہے انہیں۔''

''واپسی کب تک ہوگی؟''

''اتنی ڈرائیونگ تھکا دے گی۔ مجھے وہاں ایک دو گھنٹے تو آرام کرنا ہوگا۔ کل دوپہر کو ہی آسکوں گا۔'' وجاہت نے جواب دیتے ہوئے شبنم کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

شبنم ہنسی۔ ''اب چلتے چلتے بھی۔''

''جانے کیوں..... اس وقت مجھے تم پر بہت پیار آرہا ہے۔''

''وہ تو تمہیں کافی دن سے آرہا ہے۔ جب سے میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں ماں بننے والی ہوں۔''

''لیکن آج کچھ زیادہ ہی پیار آرہا ہے تم پر۔''

وجاہت تھوڑی دیر بعد اپنے گھر سے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

ویران راستوں پر فیصل بڑی تیز رفتاری سے کار چلا رہا تھا کہ اس کے موبائل پر زرینہ کی کال آئی۔

''بہت بے چین ہو۔'' فیصل نے ہنس کر کہا۔

''بے چینی تو ہوگی ہی۔''

''پریشان نہ ہو۔ میں چار لاکھ روپے لے کر آرہا ہوں۔ تمہیں اپنا خوب صورت لاکٹ بیچنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''تم نے ہی زور دیا تھا کہ میں ایسا نہ کروں ورنہ میں آج ہی لاکٹ بیچ دیتی۔''

''مجھے تمہارے گلے میں وہ لاکٹ اتنا ہی اچھا لگتا ہے کہ اس کا تمہارے گلے میں نہ ہونا مجھے صدمہ پہنچائے گا۔''

''تم کب تک پہنچو گے؟'' زرینہ نے پوچھا۔

''میں راستے ہی میں ہوں جانِ من..... میں صبح سات بجے تک تمہارے پاس ہوں گا۔''

''اچھا۔'' زرینہ نے طویل سانس لی۔ ''مجھے اتنی بے چینی ہے کہ ساری رات جاگتی رہی ہوں۔''

''میں پہنچوں گا تو ساری بے چینی ختم ہو جائے گی۔ اب میں فون بند کر رہا ہوں۔''

ان باتوں کے بعد فیصل نے موبائل بند کر کے کار کی رفتار بڑھا دی۔

☆☆☆

شرجیل بہت اُلجھا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی محبوبہ شاردا نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اتنے اُپ سیٹ کیوں ہو ڈارلنگ؟''

''دو کروڑ ڈالرز آنے والے ہیں۔''

''وہ تو تم مجھے پہلے ہی بتا چکے ہو۔ بس یہ نہیں بتایا کہ وہ تمہیں کہاں پہنچانے ہیں۔''

''یہی تو پریشانی ہے کہ وہ مجھے کہیں نہیں پہنچانے۔''

''کیا مطلب؟''

''دو کروڑ ڈالرز!'' شرجیل نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''ایسا تو ہے کہ ماسٹر ہمدانی سے ہمیں لاکھوں روپے ملتے ہیں لیکن دو کروڑ ڈالرز تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے۔''

''تو کیا ارادہ ہے؟''

''میں نے سنگاپور کے دو ٹکٹ منگوائے ہیں۔ وہ لے کر ہم دونوں یہاں سے پُھر سے اُڑ جائیں گے۔ ہمیں سات بجے یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ چھ بجے تک وجاہت کو یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ اگر اسے دیر ہوگئی تو میرا پروگرام چوپٹ ہو جائے گا۔''

''وہ بہت تھکا ہوا آئے گا۔ یہاں کچھ دیر آرام تو کرے گا۔''

''وہ جتنی دیر یہاں آرام کرے گا، میں اتنی دیر میں اسے ختم کر دوں گا۔''

''ماسٹر ہمدانی کو چونا لگانا بہت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اس بارے میں بھی سوچا ہے تم نے؟''

''سنگاپور سے ہم کہیں اور چلے جائیں گے۔ سب کچھ سوچ لیا ہے میں نے۔ ماسٹر کے فرشتے بھی ہمارا کھوج نہیں لگا سکیں گے۔''

''قتل..... بہت سنگین جرم کرو گے تم؟''

''دو کروڑ ڈالرز کے لیے سب کچھ کیا جاسکتا ہے۔''

''دیر ہو جانے کی صورت میں وہ ضرور یہاں آئے گا اور وجاہت کی لاش دیکھ کر سمجھ جائے گا کہ تم نے اسے قتل کیا ہے۔''

''اس کی لاش کسی کو یہاں نہیں ملے گی۔''

''کیسے؟''

''بس دیکھتی رہو۔ ایک پہلو پر میں نے اور بھی غور کیا ہے۔ شاید وہ یہاں رکنا نہ چاہے۔ ایسی صورت میں تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ اسے کافی یا چائے پلانے کے بہانے کچھ دیر روکو۔ بس اسی وقت میں اپنا کام کر جاؤں گا۔''

pklibrary.com

''یہ تو ہے کہ دو کروڑ ڈالرز میں ہماری زندگی بہت خوب صورت ہوجائے گی۔''

''اس کے لیے تمہیں اتنا کرنا ہے کہ اسے ذرا دیر کے لیے روکو۔''

''میں اسے روک تو لوں گی۔'' شاردا بہت تیز وطرار تھی اور دولت کی بھوکی بھی۔ شرجیل اسے کچھ زیادہ پسند نہیں تھا لیکن اس کے لکھ پتی ہونے کے باعث ہی وہ اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔ اب دو کروڑ ڈالرز کے لیے وہ شرجیل کے ساتھ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' شاردا کچھ سوچ کر بولی۔

''کیا بات؟''

''وجاہت کا قتل کیا ضروری ہے؟''

''اس طرح ماسٹر کے ذہن میں یہ خیال ڈالنا ہے کہ وجاہت ہی دو کروڑ ڈالرز لے کر فرار ہوا ہے۔ وجاہت کی لاش اسے یہاں نہیں ملے گی۔ اگر اسے ہمارے سنگاپور جانے کی بات معلوم بھی ہوگئی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا یہ پروگرام پہلے سے تھا۔ ہم سنگاپور میں ہی شادی کریں گے اور وہیں ہنی مون منائیں گے۔''

''اسے تم پر کوئی شک نہیں ہوگا؟''

''اس کا امکان اس لیے نہیں ہے کہ اسے وجاہت کی لاش نہیں ملے گی۔ وہ اسی کے بارے میں سوچے گا۔ اگر کسی وجہ سے اس کا دھیان ہماری طرف گیا بھی تو کچھ دیر لگے گی۔ اتنی دیر میں ہم سنگاپور سے کہیں اور جا چکے ہوں گے جس کا اسے سراغ نہیں ملے گا..... میں نے بہت سوچ سمجھ کر پروگرام بنایا ہے۔''

وہ دونوں ایک گمبھیر معاملے پر باتیں کرنے میں اتنے محو تھے کہ کال بیل کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

''اوہ!'' شرجیل کے منہ سے نکلا۔ ''وجاہت کے آنے میں تو ابھی پندرہ منٹ باقی ہیں۔ شاید وہ ٹریولنگ ایجنٹ ہوگا جسے سنگاپور کے ٹکٹ لانے ہیں۔''

''تو دیکھو جا کر۔'' شاردا نے کہا۔

شرجیل سر ہلاتا ہوا اٹھا، بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں پہنچا اور دروازہ کھولا۔

''ارے وجاہت..... تم کچھ جلدی آگئے۔'' شرجیل نے کہا۔

''اندازہ تو تھا کہ چھ بج جائیں گے لیکن کار کی رفتار شاید زیادہ تھی۔''

''خیر، اندر تو آؤ۔'' شرجیل ایک طرف ہٹا۔

وجاہت بیگ سنبھالے ہوئے اندر آیا۔ شرجیل نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

''ڈرائیونگ نے بُری طرح تھکا دیا ہے۔ کافی پلواؤ۔ ذرا دیر آرام بھی کروں گا۔'' وجاہت نے بیگ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

شرجیل کے دل کی مراد بر آئی۔ وہ تو وجاہت کو روکنا ہی چاہتا تھا۔

''ابھی پلواتا ہوں، شاردا کریم کافی بہت اچھی بناتی ہے۔'' شرجیل نے کہا، پھر بلند آواز میں شاردا کو پکارا۔

''یہاں تو آؤ، وجاہت آگیا ہے۔''

شاردا مسکراتے ہوئے آئی۔ وہ اور وجاہت ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ان میں ''ہیلو ہائے'' کا تبادلہ ہوا۔

''کافی پلواؤ وجاہت کو۔'' شرجیل نے کہا۔

''ابھی لاتی ہوں۔'' شاردا جاتے جاتے رکی اور بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''ڈالرز ہوں گے اس میں!''

''ظاہر ہے، شرجیل نے بتا دیا ہوگا تمہیں۔''

''ہوں۔'' شاردا مسکراتے ہوئے ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔

''واقعی بہت تھک گئے ہوگے۔'' شرجیل نے کہا۔

''حکم تھا ماسٹر کا کہ جلدی پہنچنا اس لیے کار زیادہ رفتار سے دوڑائی۔''

''ارے!'' شرجیل یکا یک کھڑا ہوا۔

''کیا ہوا؟'' وجاہت نے پوچھا۔

''تم کچھ بھوکے بھی ہوگے۔ میں شاردا سے کہنا بھول گیا کہ کچھ سینڈوچ وغیرہ بھی لائے کافی کے ساتھ۔''

''مجھے زیادہ بھوک نہیں ہے۔''

''کم بھوک سہی..... کچھ تو کھا لینا۔'' شرجیل کہتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکلا اور تیزی سے کچن میں پہنچا۔

''کوئی خاص بات؟'' شاردا نے پوچھا۔

''سینڈوچ تو رکھے ہوں گے نا..... وہ بھی گرم کر لینا۔ اس میں کچھ وقت لگے گا۔ میں اتنی دیر میں اپنے کام کی تیاری کرلوں۔''

''میرے تو ابھی سے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔''

شرجیل نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اور کچن سے نکل کر اس کمرے میں پہنچا جو اسٹور کے کام آتا تھا۔ وہاں سے اس نے بیٹ نکالا۔ کسی زمانے میں اسے کرکٹ کا

pklibrary.com

بہت شوق تھا۔ بیٹ کو ایک کپڑے سے جھاڑ پونچھ کر وہ وہاں سے نکلا۔

جب وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچا تو اس نے جھانک کر دیکھا۔ اسی وقت شاردا، وجاہت کے لیے ایک ٹرے لے کر آئی اور کارنر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

''اِدھر اس صوفے پر آجاؤ۔''

شرجیل نے دل ہی دل میں شاردا کی ذہانت کو سراہا۔ اس نے وجاہت کو ایسی جگہ بٹھایا کہ اس کی پشت اس دروازے کی طرف تھی جہاں سے شرجیل کو داخل ہونا تھا۔

''سینڈوچ ابھی گرم کیے ہوں گے۔ تیار کرنے میں تو زیادہ وقت لگتا۔'' شرجیل نے ایک سینڈوچ اٹھا کر اس میں سے کچھ حصہ کاٹا۔

''ہاں۔'' شاردا نے کہا۔ ''شرجیل کو بہت شوق ہے اسی کے لیے بنا کر رکھتی ہوں۔''

''اچھے بناتی ہو۔''

اسی وقت شرجیل دبے قدموں ڈرائنگ روم میں داخل ہو چکا تھا۔ شاردا نے اسے دیکھ لیا لیکن اس کی طرف سے انجان بنی رہی۔

''یہ شرجیل کہاں رہ گیا؟'' وجاہت نے پوچھا۔

''بیڈ روم سے کچھ لینے چلا گیا ہوگا۔'' شاردا نے دھڑکتے دل کے ساتھ جواب دیا کیونکہ شرجیل، وجاہت کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

وجاہت سینڈوچ چبا رہا تھا۔

''مزے لے لے کر کھا رہے ہو۔'' شاردا زبردستی مسکرائی۔ اس کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

شرجیل نے بیٹ کا ہینڈل دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سر سے اوپر اٹھایا، پھر پوری طاقت سے وجاہت کے سر پر مارا۔

وجاہت کراہ کے ساتھ آگے جھکا۔ شاردا نے خود کو بچایا ورنہ وجاہت اسی پر گرتا۔ سینڈوچ اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

''تم ذرا دور رہو۔'' شرجیل نے شاردا سے کہا۔

شاردا جلدی سے چند قدم ایک طرف ہٹ گئی۔

شرجیل نے بیٹ دوسری بار وجاہت کے سر پر مارا۔ وجاہت کے سر سے بہنے والے خون نے فرش کو رنگین کر دیا۔ شرجیل نے تیسری بار بھی مارا۔ پھر بیٹ ایک طرف ڈال کر وجاہت پر جھکا۔

شاردا کھڑی کانپ رہی تھی۔ شرجیل نے اسے چیک کر لیا تھا۔ وجاہت مر چکا تھا۔

''لاش کہاں ٹھکانے لگاؤ گے؟'' شاردا نے پوچھا۔

''تم یہیں رکو۔ فرش پر اس کا خون پھیلنے سے روکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

شاردا نے ایک صوفے سے شرجیل کی شرٹ اٹھائی جو شرجیل نے کسی وقت اتار کر وہیں ڈال دی تھی۔ شاردا نے وہ اٹھا کر فرش پر بہتے خون پر ڈال دی۔

شرجیل جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کمبل تھا جو اس نے فرش پر بچھا دیا۔

''اب یہ لاش اٹھا کر کمبل پر لانا ہے۔ اس میں تم میری کچھ مدد کرو۔ اگر لاش کو گھسیٹ کر کمبل پر لایا گیا تو خون کے اور دھبے لگ جائیں گے فرش پر۔''

''میں اس کا وزن نہیں اٹھا سکوں گی۔''

''میں کوشش کروں گا کہ زیادہ وزن میں سہار لوں، تم کسی حد تک سہارا تو دے سکتی ہو، کوشش کرو۔''

شاردا نے کوشش کی اور وہ دونوں کسی طرح لاش کو کمبل پر ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ شرجیل نے لاش کمبل میں لپیٹ دی۔

''اب اسے اٹھا کر گھر کے پچھواڑے لے جانا ہے۔''

''وہاں لے جا کر کیا کرو گے؟''

''جب تم سو رہی تھیں تو میں نے وہاں ایک گڑھا کھود دیا تھا۔ لاش اسی میں دفن کرنا ہے۔''

دونوں کسی نہ کسی طرح لاش کو گڑھے تک لے گئے۔

''اب میں یہ گڑھا پاٹتا ہوں۔'' شرجیل نے کہا۔ ''تم جا کر کسی بھی طرح فرش سے خون صاف کر دو۔ معمولی سا دھبا بھی نہ رہنے پائے۔''

''یہ تو میں کر دوں گی۔'' شاردا نے کہا اور تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ خون اچھی طرح صاف کرنے کے لیے اس نے پرانے کپڑے بھی گیلے کر کے استعمال کیے۔

جب شرجیل واپس لوٹا تو اس کے کپڑے خاصے گرد آلود ہو چکے تھے۔

''بالکل ٹھیک۔'' شرجیل نے فرش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اب میں جا کر کپڑے تبدیل کر لوں۔ یہ بہت خراب ہو گئے ہیں۔''

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' شاردا نے ایک چھوٹی سی گٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں وہ خون آلود کپڑے ہیں جن سے میں نے فرش صاف کیا ہے۔''

''یہ میں باتھ روم میں لے جاتا ہوں۔'' شرجیل نے

pklibrary.com

گٹھڑی اٹھا کر کہا۔ ''جلا کر راکھ فلیش میں بہا دوں گا۔''

شرجیل گٹھڑی اٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

فیصل اس وقت جھنجلا گیا جب ایک جگہ اس کی کار خراب ہو کر رک گئی۔ اس کی خرابی سمجھنا فیصل کے لیے ممکن نہیں تھا پھر بھی اس نے بونٹ اٹھا کر جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے بونٹ بند کر دیا۔ اس وقت اس کی نظر ایک گھر پر پڑی۔ اس کی دو ایک کھڑکیاں روشن تھیں۔ نہ ہوتیں تو اس اندھیرے میں وہ گھر دکھائی نہیں دیتا۔

مدد ملنے کے خیال سے فیصل نے اس گھر کا رخ کیا۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ وہاں بالکل سناٹا تھا۔

سو رہے ہوں گے، فیصل کو خیال آیا۔ اس وقت کسی کو سوتے میں ڈسٹرب کرنا کیا مناسب ہوتا؟

مناسب تو نہیں تھا لیکن فیصل کی مجبوری تھی کہ وہ کسی کی مدد حاصل کرے۔ اس نے دو مرتبہ کال بیل کا بٹن دبایا اور انتظار کرنے لگا۔

ایک منٹ تک کوئی نہیں آیا تو اس نے دوبارہ بٹن دبایا۔ اس مرتبہ اندر کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی جوان العمر تھی۔ ایک پل کو ایسا لگا جیسے فیصل اس سے کہیں مل چکا ہے لیکن اس نے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ کہیں کسی خوب صورت لڑکی کا چہرہ دکھائی دے جائے تو دماغ سے چپک کر رہ جاتا ہے۔

''آئی ایم ویری سوری محترمہ!'' فیصل نے کہا۔ ''اس وقت آپ لوگوں کو ڈسٹرب کیا۔ ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ یقین کیجیے کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔''

''یقین تو میں نے کر لیا ہے فیصل!'' وہ مسکرائی۔

اس کے منہ سے اپنا نام سن کر فیصل چونک گیا۔

''آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''تم بھول گئے مجھے۔'' وہ مسکرائی۔ ''ہم نے ایک ہی کالج میں پڑھا ہے۔ سارا کالج ہی میرا شیدائی تھا۔ ان میں ایک تم بھی تھے۔''

''اوہ!'' فیصل کے منہ سے نکلا۔ ''تم شاردا ہو؟''

''اب یاد آیا۔'' شاردا ہنسی۔

''تم بہت بدل گئی ہو۔'' فیصل نے کہا۔ ''پہلے تمہارے بال بہت بڑے بڑے اور سیاہ سے تھے۔ وہ اب تم نے ترشوا دیے ہیں۔ بال بھی اخروٹی رنگت کے ہیں لیکن یہ طے ہے کہ تم پہلے سے زیادہ اچھی لگ رہی ہو۔ آج تمہیں اچانک دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ کیا تم مجھے اندر نہیں بلاؤ گی؟''

''آؤ، آؤ۔'' شاردا نے بے تکلفی سے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے گئی۔ دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔

شاردا اسے ایک صوفے پر بٹھا کر خود بھی اس کے برابر میں بیٹھ گئی اور بولی۔ ''میں بھی تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہوں۔ کالج کے سبھی لڑکے مجھے لائن مارتے تھے اور میں انہیں بے وقوف بناتی رہتی تھی۔''

''مجھے تم نے کبھی بے وقوف نہیں بنایا۔''

''آج میں تمہیں بتا دوں کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی تھی لیکن تم اچانک کالج چھوڑ گئے۔''

''مجبوری تھی۔'' فیصل نے جواب دیا۔ ''والد صاحب کا ایک اور شہر میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ مجھے بھی ان کے ساتھ جانا پڑا۔''

''اگر تم نہ جاتے تو میں کسی وقت بھی تم سے اظہارِ محبت کر سکتی تھی۔''

''واقعی؟'' فیصل ہنسا۔

''تم آج بھی پہلے کی طرح ہینڈسم ہو۔ شادی کر لی ہو گی تم نے؟''

''نہیں۔'' فیصل نے جواب دیا۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ میں تو اپنے شوہر سے عاجز ہوں۔''

''اوہ!'' فیصل کو کچھ مایوسی ہوئی۔ ''یہاں تم اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہو؟''

''ہاں مجبوراً رہتی ہوں۔ شادی جو کر لی ہے۔ وہ ذرا بھی رومینٹک نہیں ہے اور میں رومان پسند ہوں۔''

''وہ ہے کہاں؟''

''کپڑے بدل رہا ہو گا۔ گھریلو کام کاج میں بھی پڑا رہتا ہے۔ اسی میں کپڑے خراب ہو جاتے ہیں۔ ابھی وہ آئے گا تو تمہیں ملاؤں گی اُس سے۔''

''مجھے دیکھ کر کیا سوچے گا؟''

''کچھ بھی سوچے، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ تم اگر مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔''

فیصل کا دل بڑی زور سے دھڑک اٹھا۔ اگرچہ ان دنوں اس کا جھکاؤ زرینہ کی طرف تھا لیکن شاردا کے مقابلے پر وہ کچھ بھی نہیں تھی۔

''تم اُس سے کس طرح پیچھا چھڑاؤ گی؟'' فیصل نے

pklibrary.com

پوچھا۔

شاردا نے جواب نہیں دیا تھا کہ ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔

''آؤ شرجیل!'' شاردا نے جلدی سے کہا۔ ''آؤ! تمہیں اپنے بہت پیارے دوست فیصل سے ملاؤں۔ ہم ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔''

فیصل نے اٹھ کر شرجیل سے مصافحہ کیا۔ اسے محسوس ہوا کہ شرجیل اس سے مل کر ذرا بھی خوش نہیں ہوا تھا۔

''دراصل.....'' فیصل نے اس سے کہا۔ ''یہاں قریب میں میری کار خراب ہوگئی ہے۔ میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ یہاں... شاید کوئی میری کچھ مدد کر سکے۔ اتفاق سے دروازہ ہی شاردا نے کھولا اور مجھے اندر لے آئی۔''

''لیکن یہاں کوئی آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ میں کار کی مشینری سے قطعی ناواقف ہوں۔'' شرجیل کا لہجہ خشک تھا۔

''ایسی صورت میں تو مجھے فون کر کے کسی مکینک کو بلوانا پڑے گا۔''

''جو دل چاہے، کریں آپ!'' شرجیل نے کہا۔ پھر شاردا سے بولا۔ ''میں کپڑے تبدیل کر کے خود کو فریش محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ شاور لینا پڑے گا۔''

''تو چلے جاؤ باتھ روم۔'' شاردا نے کہا۔

''ہاں۔'' شرجیل نے کہا۔ ''تم اپنے دوست کو انٹرٹین کرو۔ میں شاور لے کر آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''

شرجیل نے فیصل سے ''ایکسکیوز'' کرنا ضروری نہیں سمجھا اور چلا گیا۔

''دیکھا تم نے!'' شاردا نے فیصل سے کہا۔ ''بد دماغ بھی ہے، تم سے مصافحہ کرتے ہوئے بھی اس کا منہ ٹیڑھا تھا۔''

''وہ میں محسوس کر چکا ہوں۔''

اسی وقت اندر سے شرجیل نے شاردا کو پکارا۔

''میں ابھی آئی۔'' شاردا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''تم کسی رسالے کی ورق گردانی کرو۔''

سینٹر ٹیبل پر کئی رسالے اور اخبار پڑے ہوئے تھے لیکن فیصل کو ان سے کوئی دلچسپی کم از کم اس وقت نہیں رہی تھی۔ وہ صرف شاردا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے پا کر وہ زرینہ کو بھول سکتا تھا جو اس کے خیال میں کسی قدر لالچی بھی تھی۔ اس نے فیصل سے چار لاکھ روپے مانگے تھے لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے اتنے پیسوں کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔

سوچتے ہوئے فیصل نے اپنا موبائل فون بند کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زرینہ اسے فون کرے۔

☆☆☆

شاردا جیسے ہی شرجیل کے پاس پہنچی، شرجیل نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' شاردا غصے سے بولی۔

''بے وقوف عورت!'' شرجیل نے دانت پیس کر کہا۔ ''تمہیں احساس نہیں کہ ہم کن حالات میں ہیں؟ تم نے اسے گھر کے اندر بلا لیا۔''

''وہ میرا پرانا دوست ہے۔'' شاردا نے کہا۔ ''اور آج تم نے مجھے پہلی مرتبہ تھپڑ مارا ہے۔ اب ہاتھ کھل گیا ہے تمہارا۔ آئندہ بھی مجھے مارتے رہو گے۔''

''پاگل مت بنو۔'' شرجیل نے غصے سے کہا۔ ''میں ویسے ہی پریشان ہوں کہ ٹکٹ لانے والا ٹریول ایجنٹ ابھی تک نہیں آیا۔ اس پریشانی میں مجھے یہ بہت بُرا لگا ہے کہ تم نے کسی کو گھر میں بلا لیا ہے۔ اب اسے جلدی سے کسی طرح ٹالو۔ میں باتھ لے کر آتا ہوں۔''

وہ چلا گیا اور شاردا نے اپنا گال سہلاتے ہوئے سوچا، اس شخص سے جان چھڑانے کے لیے میں نے پہلے ہی سوچا تھا اور اب اسے فوری طور پر فیصل کا سہارا بھی مل سکتا ہے۔

ڈرائنگ روم میں جانے سے پہلے اس نے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا اور اس سے پوچھا۔ ''ابھی تم کتنی دور ہو.....؟'' پھر جواب سن کر بولی۔ ''اپنی کار یہاں سے دس فٹ کے فاصلے پر روکنا۔ اندرونی لائٹس بھی بجھا دینا۔ کسی کی نظر نہ پڑے تمہاری کار پر! میرے دوسرے فون کا انتظار کرنا۔''

''کیا کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''جتنا میں نے کہا ہے، اس کے بعد کوئی سوال نہیں۔'' شاردا نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

پھر وہ ڈرائنگ روم ہی کا رخ کرتی لیکن شرجیل نے بیڈ روم سے اس کو آواز دی۔ شاردا وہاں پہنچی۔

شرجیل اپنی جیبوں کا سامان نکال کر تپائی پر رکھنے کے بعد قمیص اتار رہا تھا۔ ''وارڈ روب سے میرا سوٹ وغیرہ نکال دو۔''

شاردا خاموشی سے الماری کی طرف بڑھی۔

اسی وقت شرجیل کے موبائل کی گھنٹی بجی جو اس نے

pklibrary.com

تپائی پر رکھ دیا تھا۔ وہ قمیص اتار چکا تھا لیکن باتھ روم میں داخل ہونے سے پہلے موبائل کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر موبائل کی اسکرین پر نظر پڑتے ہی وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔

''کیا ہوا؟'' شاردا نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

شرجیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ متفکر نظر آنے لگا تھا۔

شاردا نے خود قریب جا کر موبائل اٹھایا۔

''ریسیو مت کرنا۔'' شرجیل بولا۔

شاردا نے اسکرین پر کال کرنے والے کا نام دیکھ لیا۔

''ماسٹر کی کال۔'' اس کے منہ سے نکلا۔

''ہوں۔''

''تو بات کیوں نہیں کر رہے؟''

''سوچ رہا ہوں کہ اس کی باتوں کا کیا جواب دوں۔ وہ ضرور وجاہت اور دو کروڑ کے بارے میں پوچھے گا۔''

''کال ریسیو کرنا بہتر ہوگا۔'' شاردا نے کہا۔

شرجیل نے شاردا کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔ ''یس ماسٹر!''

''کئی گھنٹیوں کے بعد فون اٹھایا تم نے؟'' ماسٹر ہمدانی کی آواز آئی۔

''میں باتھ روم میں تھا ماسٹر..... باہر آ کے فون اٹھایا ہے۔''

''خیر..... وجاہت تو پہنچ گیا ہوگا۔ دو کروڑ ڈالرز مل گئے؟''

''نہیں ماسٹر!'' شرجیل نے کہا۔ ''وجاہت ابھی آیا ہی نہیں۔''

''کیا؟'' ماسٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں ماسٹر! میں خود بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ چھ بجے تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

''حیرت ہے کہ..... خیر..... وہ جیسے ہی آئے مجھے اطلاع دو۔''

''آپ اس کو فون کر لیتے۔'' شرجیل نے کہا۔

اسے اپنی بات کا جواب نہیں ملا۔

شرجیل نے فون بند کر کے شاردا کو بتایا کہ ماسٹر سے کیا بات ہوئی تھی۔

شاردا بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم سے پہلے اس نے وجاہت ہی کو فون کیا ہوگا اور اسے جواب نہیں ملا ہوگا۔''

''ہاں۔'' شرجیل نے کہا۔ ''میں نے اس کا موبائل بند کر کے اس کی لاش کے ساتھ ہی دفن کر دیا تھا۔''

''میں دیکھ چکی ہوں۔'' شاردا نے کہا۔

شرجیل مزید کچھ کہے بغیر باتھ روم میں چلا گیا۔ شاردا نے وارڈ روب سے شرجیل کا ایک سوٹ نکالتے ہوئے فون پر کسی سے رابطہ کیا۔ کچھ کہنے کے بعد کچھ سنا، پھر ایک اور جملہ کہہ کر موبائل بند کر دیا۔

☆☆☆

شرجیل سے بات کرنے کے بعد ماسٹر ہمدانی کی فکرمندی بڑھ گئی۔ اس سے پہلے وہ وجاہت سے رابطہ کرنے کی کئی کوششیں کر چکا تھا لیکن اسے وجاہت کا فون بند ملتا رہا تھا۔

''کیا وجاہت وہاں ابھی تک نہیں پہنچا؟'' اس کے قریب موجود اس کے ایک آدمی نے پوچھا۔ ''آپ کی بات سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے، وجاہت کے دیر ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ راستے میں اس کی کار کچھ خراب ہو گئی ہو۔''

''اسے چاہیے تھا کہ مجھے اس کی اطلاع دیتا۔'' ماسٹر نے کہا۔

''وہ خود ہی کار ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔''

''لیکن اس نے اپنا فون کیوں بند کر رکھا ہے؟''

''اس کی بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔''

''کیا.....؟ کیا وجہ؟''

''جب ہم لوگوں کی میٹنگ ہوتی ہے تو آپ کی ہدایت پر ہم بھی فون بند کر دیتے ہیں۔ وجاہت نے بھی بند کیا ہوگا۔ پھر جب یہاں سے گیا تو وہ فون کھولنا بھول گیا ہوگا۔ ذہنی دباؤ میں تو وہ ہوگا۔ آپ نے اسے بڑی اہم ذمے داری سونپی تھی۔''

''میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ تم ذرا اس پولیس اسٹیشن کا فون نمبر معلوم کرو جس کے دائرہ اختیار میں شرجیل کا فارم ہاؤس بھی آتا ہو اور ہاں تھانے کے انچارج کا نام بھی معلوم کرو۔''

ماسٹر ہمدانی کے آدمی نے موبائل پر دو مختلف آدمیوں سے بات کی، پھر ماسٹر ہمدانی کو پولیس اسٹیشن کا فون نمبر بتانے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ انچارج کا نام انسپکٹر ایوب ہے۔

☆☆☆

شرجیل کے بیڈ روم سے شاردا ڈرائنگ روم میں پہنچی۔

''کہاں رہ گئی تھیں؟'' فیصل نے پوچھا۔ ''کچھ غصے میں

pklibrary.com

نظر آرہی ہو۔"

"اس سے نفرت ہوگئی ہے مجھے..... زندگی میں پہلی بار کسی کا تھپڑ کھایا ہے میں نے۔"

"ارے..... کیوں؟"

"وہ اس پر ناراض ہے کہ میں نے غیر معمولی حالات میں تم کو گھر میں بلالیا۔"

"غیر معمولی حالات؟..... کیا مطلب؟"

"میں اس کے آنے سے پہلے تم کو جلد از جلد وہ سب کچھ بتادیتی ہوں لیکن پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔"

"پوچھو۔"

"کیا تم مجھے اپنا ناپسند کرو گے؟"

فیصل چونک گیا۔ پھر بولا۔ "یہ تو میرے لیے بہت خوشی کی بات ہوگی۔"

"اگر تمہیں دو کروڑ ڈالرز بھی مل جائیں تو کیسا محسوس کرو گے؟"

"بہت بڑی بات کہی ہے تم نے۔" فیصل بولا۔ "میں مالی طور پر خوش حال ہوں لیکن دو کروڑ ڈالرز تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے۔ یہ تم نے کیا کہا کہ مجھے دو کروڑ مل جائیں تو میں کیسا محسوس کروں گا۔"

"اب میں تمہیں ایک ایسی بات بتاؤں گی کہ شاید تم پریشان ہوجاؤ۔"

"یہ بعد کی بات ہے کہ میں پریشان ہوں گا یا نہیں۔"

"تو سنو..... شرجیل ایک ایسے شخص کے لیے کام کررہا ہے جو سوسائٹی میں بہت عزت دار سمجھا جاتا ہے لیکن وہ اور اس کے کچھ آدمی جرائم پیشہ ہیں۔"

"کیا؟" فیصل کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"میں نے کہا تھا کہ حیران رہ جاؤ گے۔ اب تم جلدی سے ایک اہم بات بھی سن لو۔ شرجیل جس شخص کے لیے کام کررہا ہے، اسے ماسٹر ہمدانی کہا جاتا ہے۔ اس نے ایک شخص..... یعنی اپنے ہی ایک آدمی کے ذریعے شرجیل کو دو کروڑ ڈالرز بھجوائے تھے۔ اتنی بڑی رقم کی وجہ سے شرجیل کی نیت بھی ڈانوں ڈول ہوگئی۔ اس نے وجاہت کو قتل کردیا ہے۔"

"کیا؟" فیصل اچھل پڑا۔

"ہاں۔" شارداؔ نے کہا۔ "یہاں پیچھے کی زمین نرم ہے۔ شرجیل نے وہاں گڑھا کھود کر وجاہت کی لاش دفنا دی ہے۔ یہ ہے وہ بات جس کی وجہ سے شرجیل نے مجھ سے غیر معمولی حالات کی بات کی اور مجھے تھپڑ بھی مارا۔ میں اپنی یہ توہین برداشت نہیں کرسکتی۔"

"تمہاری یہ بات سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے ہیں۔" فیصل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس نے فرار ہونے کے لیے ایک ٹریول ایجنٹ سے سنگاپور کے لیے دو ٹکٹ بھی منگوائے ہیں۔"

"یعنی تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے؟"

"ہاں۔"

اسی وقت شرجیل ڈرائنگ روم میں آتا نظر آیا۔

"اتنی جلدی آگیا یہ کم بخت۔" شارداؔ زیرِ لب بڑبڑائی۔

جب وہ قریب آگیا تو شارداؔ نے اس سے بھی یہ بات شائستہ انداز میں پوچھی۔

"ہاں۔" شرجیل نے کہا۔ "بس زیادہ دیر نہا نہیں سکا۔"

شارداؔ اس کے جلدی آنے کا سبب سمجھ گئی۔ وہ جلد از جلد جاننا چاہتا ہوگا کہ فیصل کو ٹال دیا گیا یا نہیں۔

اس سلسلے میں وہ کنایتاً شارداؔ سے کچھ کہتا کہ کال بیل بج اٹھی۔

"شاید ٹریول ایجنٹ آگیا۔" شرجیل کہتا ہوا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

"وہی ہوگا۔" شارداؔ بولی۔ "اس وقت اب اور کون آسکتا ہے۔"

شرجیل نے دروازہ کھولا تو چونک گیا۔ اس کے سامنے کھڑے ہوئے تین افراد معمول کے لباس پہنے ہوئے تھے۔

"فرمایئے!" شرجیل بولا۔

"میں نیا نیا آیا ہوں اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کا انچارج بن کر۔" جیکٹ میں ملبوس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایوب نام ہے میرا..... انسپکٹر ایوب..... اوہ آپ تو پولیس کا نام سن کر کچھ پریشان ہوگئے۔ نہ نہ..... پریشان نہ ہوں۔ میں بس اپنے علاقے کے لوگوں سے شناسائی پیدا کرتا پھر رہا ہوں۔" اسے دروازے ہی سے فیصل اور شارداؔ نظر آگئے۔ "صبح قریب ہے۔ آپ لوگ شاید ناشتا کرنے کے لیے جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ کیا میں ان لوگوں سے مل سکتا ہوں؟"

"آیئے۔" شرجیل نے سنجیدگی سے کہا۔

شارداؔ اور فیصل بھی ان کی مدھم آوازیں سن چکے تھے۔

شرجیل کے ساتھ تینوں اندر آگئے۔ جیکٹ والے کے ساتھی کچھ مؤدب تھے اس لیے سوچا جاسکتا تھا کہ وہ انسپکٹر ایوب کے ماتحت ہوں گے۔

pklibrary.com

''یہ میری بیوی ہیں، شاردا۔'' شرجیل نے تعارف کرایا۔
''میں شاردا کے کالج کے زمانے کا دوست ہوں۔''
فیصل نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔
انسپکٹر ایوب ہنس کر بولا۔ ''آپ تینوں ہی کچھ پریشان ہو گئے ہیں کہ پولیس یہاں اس وقت کیوں ٹپک پڑی۔''
''نہیں۔'' شاردا بولی۔ ''کچھ ایسے زیادہ پریشان اس لیے نہیں ہوئے کہ آپ نے میرے شوہر کو بتا دیا ہے کہ آپ علاقے کے لوگوں سے ملاقاتوں کی غرض سے نکلے ہیں پولیس اسٹیشن سے۔''
''بالکل..... بالکل.....'' ایوب مسکراتا ہوا شرجیل کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''آپ تو اتنے زیادہ پریشان ہو گئے تھے جیسے کسی کو قتل کر بیٹھے ہوں۔''
''جی؟'' شرجیل کے منہ سے نکلا۔
''ارے کچھ نہیں۔'' ایوب نے پھر اس کا شانہ تھپکا۔ ''مذاق کیا ہے میں نے۔ عادت ہے میری۔ نئے لوگوں سے ملتا ہوں تو مذاق کر بیٹھتا ہوں۔ اس طرح لوگوں سے بے تکلفی بھی ہو جاتی ہے۔''
''آپ کافی پسند کریں گے یا چائے؟'' شاردا نے پوچھا۔
''کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ بس اب میں چلوں گا..... اور آپ.....'' اس نے فیصل کی طرف دیکھا۔
''میں نے بتایا تو تھا۔'' فیصل مسکرایا۔ ''میں شاردا کا.....''
''دوست ہیں آپ ان کے۔'' ایوب نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں نے کچھ فاصلے پر ایک کار کھڑی دیکھی ہے۔ وہ آپ ہی کی ہوگی؟''
''جی ہاں۔''
''بہت بے تکلف دوست ہیں آپ مسز شرجیل کے..... اتنی صبح ان سے ملنے چلے آئے.....؟''
''دراصل یہ اتفاقی ملاقات ہے۔'' فیصل نے کہا۔ ''میرے علم میں نہیں تھا کہ یہ شاردا کی قیام گاہ ہے۔ ہوا یہ کہ میری کار اچانک کچھ خراب ہو گئی، رک گئی۔ میں نے بونٹ کھول کر دیکھا بھی لیکن کچھ خاص سمجھ میں نہیں آیا۔ میں یہ فارم ہاؤس دیکھ کر اس خیال سے اِدھر نکل آیا کہ شاید یہاں سے کسی کی مدد مل جائے۔''
''میں معائنہ کر لیتا ہوں ابھی۔'' ایوب نے کہا۔ ''مجھے اس معاملے میں خاصی معلومات ہیں۔ کوئی معمولی خرابی ہوئی تو ابھی ٹھیک کر دوں گا۔''

''شکر گزار ہوں گا آپ کا۔'' فیصل نے کہا۔
''آیئے۔'' ایوب نے کہا۔ پھر شرجیل اور شاردا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ لوگوں کو ڈسٹرب کیا۔''
''کوئی بات نہیں آفیسر۔'' شاردا بولی۔ ''بڑی خوشی ہوتی اگر آپ کافی، چائے یا.....''
''میں نے کہا نا کہ تکلف کی ضرورت نہیں۔ ابھی مجھے کچھ اور لوگوں سے بھی ملنا ہے۔ اب آپ لوگوں سے اتنی باتیں ہو گئی ہیں کہ بے تکلفی کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ میں گشت پر تو رہتا ہی ہوں۔ کسی دن کھانے ہی کے وقت پر ٹپک پڑوں گا۔''
''ضرور۔'' شاردا نے کہا۔ ''ہمیں خوشی ہوگی۔''
ایوب نے دونوں میاں بیوی سے اجازت لی اور فیصل سے پھر بولا۔ ''آیئے، میں آپ کی کار کا معائنہ کر لوں۔''
''جی۔'' فیصل کھڑا ہو گیا۔ ''میں ابھی آتا ہوں شاردا۔''
''دیکھ لو!'' شاردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہوگا اگر تمہاری کار اسی وقت ٹھیک ہو جائے۔''
فیصل ان تینوں کے ساتھ باہر نکلا۔
''آپ کرتے کیا ہیں؟'' ایوب نے کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''ہمدانی انٹر پرائز میں انجینئر ہوں۔''
''اوہ..... بڑی دور سے آ رہے تھے آپ۔''
''یہاں سے قریب جو شہر ہے، وہاں جا رہا تھا۔ کسی سے ملنا ہے۔''
ان باتوں کے دوران میں وہ کار کے قریب پہنچ گئے۔ فیصل نے بونٹ کھولا۔
''آپ ڈرائیونگ سیٹ پر ہی رہیے۔'' ایوب نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں، کیا ہوا ہے۔'' وہ جھک کر مشینی آلات کا جائزہ لینے لگا۔
سیٹ پر بیٹھا فیصل، شرجیل اور شاردا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ شرجیل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے۔ غالباً اتفاق ہی تھا کہ پولیس آفیسر نے اس سے مذاق میں اس کے قاتل ہونے کی بات کی تھی۔
''اسٹارٹ کریں فیصل صاحب!'' ایوب بونٹ سے ہٹ کر بولا۔
فیصل کی پہلی ہی کوشش میں کار اسٹارٹ ہو گئی۔
''واہ!'' فیصل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''بہت معمولی خرابی تھی۔ ٹھیک کر دی میں نے۔'' ایوب نے کہا۔

pklibrary.com

فیصل نے بونٹ بند کر کے انجن بھی بند کیا اور کار سے اتر آیا۔

واپس لوٹتے ہوئے ایوب نے کہا۔ ''میری کار وہیں کھڑی ہے۔''

''وہ تو نظر پڑی تھی میری!'' فیصل نے کہا۔

☆☆☆

شرجیل کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور شاردا اپنی جگہ بیٹھی اپنے دماغ میں ایک منصوبہ ''پکا'' رہی تھی۔

''وہ واپس آرہا ہے۔'' شرجیل نے کھڑکی سے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے جلد از جلد ٹالو۔''

''وہ میرا بہت پرانا اور اچھا دوست ہے شرجیل!'' شاردا نے کہا۔ ''ایک دم تو اس سے نہیں کہہ سکتی کہ میاں چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

''بہرحال کوشش کرو۔ میں بیڈ روم میں جا رہا ہوں۔ اس طرح ٹھیک سے نہا کر سوٹ پہن لوں گا۔ ٹریول ایجنٹ کو دیر تو ہو گئی ہے لیکن اب وہ آتا ہی ہوگا۔ اتنی دیر میں تو تم اسے ٹال ہی دو گی۔''

''بس کافی پلا کر کسی بہانے ٹال دوں گی۔''

''جب میں تیار ہو کر آؤں تو اُسے نہ دیکھوں۔'' شرجیل نے خشک لہجے میں کہا۔ اور ڈرائنگ روم سے جاتے ہوئے بولا۔ ''اجنبیوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنا مجھے پسند نہیں ہے۔''

شاردا کچھ نہیں بولی اور شرجیل چلا گیا۔

ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ فیصل آ گیا۔

''شرجیل پھر کہیں چلا گیا؟'' فیصل نے کہا۔

''کہہ رہا تھا کہ مجھے اجنبیوں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ غیر مہذب بھی ہے۔''

''اچھا ہوا چلا گیا۔'' شاردا نے کہا۔ ''میں نے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ اس پر بات کرنا ہے تم سے۔''

''تم اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہو نا؟''

''ہاں۔'' شاردا نے سنجیدگی سے کہا اور بے تکلفی سے فیصل کے قریب آ گئی۔ ''تم مجھے کالج کے زمانے ہی سے پسند ہو۔ تم سے شادی میرے لیے بہت خوشی کی بات ہوگی۔ اس کے علاوہ دو کروڑ ڈالرز بھی ہوں گے ہمارے پاس۔''

''وہ تو شرجیل کے قبضے میں ہیں۔''

''وہ دو کروڑ حاصل کرنے کے لیے اسے قتل کرنا ضروری ہے۔''

''کیوں میرے رونگٹے کھڑے کر رہی ہو۔''

''اور یہ کام تم کرو گے۔'' شاردا نے زور دے کر کہا۔ ''اس کا سر بھی اسی کرکٹ بیٹ سے پھاڑا جا سکتا ہے جس سے اس نے وجاہت کو ختم کیا تھا۔''

''لیکن شاردا.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' شاردا اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اس کا سینہ سہلانے لگی۔

فیصل کے جسم میں کرنٹ سا دوڑنے لگا۔ یہ اُس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ ایک خوب صورت لڑکی اس کے جذبات برانگیختہ کر رہی تھی۔ ویسے وہ خود بھی ہمیشہ سے دولت مند بننے اور کسی خوب صورت لڑکی سے شادی کر کے ایک پُرتعیش زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن کیا اس کے لیے وہ قتل جیسا بھیانک قدم اٹھا سکے گا؟

''وقت کم ہے فیصل..... تم اسے سوچنے میں ضائع کر رہے ہو؟ اتنی بہت سی دولت اور مجھ جیسی خوب صورت لڑکی تمہاری زندگی میں آنے کی خواہش مند ہے اور تم سوچ میں پڑے ہوئے ہو۔''

''قتل بہت سنگین جرم ہے۔'' فیصل کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔

''جو کچھ حاصل ہو سکتا ہے، اس کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانے سے نہیں چوکنا چاہیے۔''

''قتل کر کے ہم قانون سے کیسے بچیں گے؟''

''سنگاپور جانے کے لیے شرجیل نے دو ٹکٹ منگوائے ہیں۔ وہ ٹکٹ آنے میں دیر تو لگی ہے لیکن وہ آئیں گے ضرور..... وہی ٹکٹ ہمارے کام آئیں گے۔ تم شرجیل کے نام سے سفر کر سکو گے۔''

''سنگاپور جا کر بھی ہم بچ نہیں سکیں گے۔ پولیس وہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔''

''لیکن ہم سنگاپور میں صرف ایک دن رہیں گے۔ اس کے بعد ایک ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں کا خیال بھی پولیس کو نہیں آئے گا۔ شرجیل نے مجھے اس کے بارے میں کچھ بتایا تو نہیں لیکن میں نے اس کی ڈائری چپکے سے پڑھ لی ہے۔ اس نے جو پروگرام بنایا ہے، ہم اسی پر عمل کریں گے۔''

فیصل اب بھی تذبذب کا شکار رہا۔ بچاؤ کی تدبیر بھی شاردا نے بتا دی تھی جو اسے اطمینان بخش نظر آ رہی تھی لیکن قتل؟ اس خیال سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

pklibrary.com

شاردا جھنجلائے ہوئے انداز میں کھڑی ہوگئی۔ ''اگر تم یہ نہیں کرنا چاہتے تو جہنم میں جاؤ۔ میں کچھ اور سوچوں گی۔ دو کروڑ ڈالرز تو مجھے حاصل کرنے ہی ہیں۔ تمہاری کار ٹھیک بھی ہوچکی ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔''

''ناراض نہ ہو ڈیئر!'' فیصل نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''میں تمہارے کہنے کے مطابق عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

بگڑی ہوئی شاردا یک لخت خوش ہوگئی۔ اس نے جھک کر فیصل کے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں دبالیے، پھر بولی۔ ''بس تو اب اور وقت ضائع نہ کرو۔ شرجیل اس وقت باتھ لے رہا ہوگا۔ جیسے ہی وہ باہر آئے گا میں اسے خود سے اُلجھا لوں گی..... سمجھے..... تمہیں بیٹ سے کام لینا ہوگا۔ میرے پاس ریوالور بھی ہے۔ شرجیل کے پاس بھی ہے لیکن وجاہت کو قتل کرنے کے لیے اس نے ریوالور استعمال نہیں کیا تھا۔ گولی چلنے کی آواز یہاں کے سناٹے میں دور تک جاتی۔ اسی لیے میں بھی شرجیل کو ختم کرنے کے لیے ریوالور استعمال نہیں کروں گی۔''

فیصل نے کسی قدر پریشانی کے باوجود شاردا کی بات مان لی۔

''تم ذرا سا رک کر خواب گاہ میں آنا۔ میں دروازہ اندر سے بند نہیں کروں گی۔ وہ عموماً بند نہیں کیا جاتا کیونکہ یہاں میرے اور شرجیل کے سوا اور کوئی نہیں رہتا۔ دروازہ بند کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔''

''تم چلو، میں آتا ہوں۔''

شاردا بہت خوش تھی کہ اس نے فیصل کو شیشے میں اتار لیا تھا۔

☆☆☆

شرجیل باتھ روم سے نکلا تو اس کے جسم کا صرف زیریں حصہ بڑے تولیے میں چھپا ہوا تھا۔ وہ اسی حالت میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جاکر کھڑا ہوا۔ اسی وقت شاردا کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ فوراً ہی شرجیل کے قریب جاکر اس سے لپٹ گئی۔

''کتنا خوب صورت جسم ہے تمہارا۔''

شرجیل ہنس دیا۔

''ہنس لو۔'' شاردا نے دل ہی دل میں کہا۔ ''زندگی میں آخری بار ہنس لو...'' وہ اس کے سینے پر ہاتھ اس طرح پھیرنے لگی کہ اس کے جذبات بھڑکا سکے۔

''کیا کر رہی ہو؟'' شرجیل بولا۔

''فیصل کو رخصت کر دیا ہے میں نے۔ یہاں اب کوئی نہیں ہے جو ہمیں اس حالت میں دیکھے۔''

''اچھا مجھے کپڑے تو پہن لینے دو۔''

''وہ بعد میں پہن لینا۔''

''مجھے اچھا نہیں لگتا اس طرح برہنہ رہنا۔'' شرجیل نے خود کو شاردا سے چھڑایا اور سوٹ پہننے کے بجائے معمولی کپڑے پہننے لگا۔

شرجیل جیسے ہی کپڑے پہن کر کھڑا ہوا، شاردا نے اسے دھکا دے کر بستر پر لٹا دیا۔

''اس وقت بہت پیار آرہا ہے تم پر۔'' شاردا نے کہتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیے۔

''تمہیں اس وقت اتنا پاگل نہیں ہونا چاہیے۔'' شرجیل نے کہا۔ ''نکٹ ابھی تک نہیں آئے، میں ذہنی دباؤ کا شکار ہوں۔''

''ابھی تمہارا سب دباؤ ختم ہوجائے گا۔'' شاردا نے کہا اور اس سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

فیصل نے بہت احتیاط اور آہستگی سے شرجیل کی خواب گاہ کا دروازہ کھول کر جھری سے اندر جھانکا۔ اس نے دیکھا کہ شاردا، شرجیل کے جذبات بھڑکانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

فیصل کو فوراً خیال آیا کہ آنے والے وقت میں شرجیل کی جگہ وہ ہوگا اور شاردا کے خوب صورت جسم کو پیار کر رہا ہوگا۔

فوری طور پر ایسا موقع نہیں تھا کہ فیصل اندر داخل ہو سکتا۔ قوی امکان تھا کہ شرجیل اسے دیکھ لیتا۔ ایسی صورت میں اس کا سر پھاڑنا فیصل کے لیے مشکل ہوجاتا۔

پھر ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ شاردا بستر پر اس طرح پلٹی کہ شرجیل اس کے اوپر ہوگیا، لیکن شاردا ابھی تک اس کے جذبات بھڑکانے میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی جس کا سبب یہی ہوسکتا تھا کہ وجاہت کو قتل کرنے کے باعث شرجیل کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔

لیکن اس طرح فیصل کو اندر داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ اب شرجیل کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ غالباً شاردا نے دروازے کی جھری دیکھ کر سمجھ لیا ہوگا کہ وہ وہاں آچکا تھا۔ اسے اندر آنے کا موقع دینے کے لیے اس نے بستر پر پوزیشن بدلی تھی۔

بیٹ فیصل کو دروازے پر ہی مل گیا تھا۔ وہ اس کا

pklibrary.com

ہینڈل مضبوطی سے پکڑ کر بہت احتیاط سے دروازہ کھولنے کے بعد دبے قدموں بستر کی طرف بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاردا نے اسے دیکھ لیا تھا۔ سچویشن ایسی ہوگئی تھی کہ فیصل کا اس کی نظر میں آجانا عین ممکن تھا۔

''تم بالکل پاگل ہوئی جارہی ہو اس وقت۔'' شرجیل کہہ رہا تھا۔ ''ماسٹر مجھے دو مرتبہ اور فون کر چکا ہے۔ وجاہت کے بارے میں پوچھ چکا ہے۔ ٹکٹ ابھی تک نہیں آئے ہیں کہ ہم فوری طور پر یہاں سے نکل سکیں۔ اگر ماسٹر کو کچھ شبہ ہو گیا تو وہ کسی وقت بھی یہاں پہنچ جائے گا۔ میں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔''

''ماسٹر یہاں نہیں آسکتا۔'' شاردا نے کہا۔ ''اسے اور اس کے دیگر ساتھیوں کو بھی نہیں معلوم کہ تم نے یہ فارم ہاؤس کہاں بنوایا ہے۔ صرف وجاہت کو معلوم تھا۔ اسی لیے اس نے ڈالرز لے کر وجاہت کو ہی بھیجا تھا۔''

''ارے اب ختم بھی کرو کھیل!'' شاردا نے پل بھر کے لیے رک کر کہا۔

''میں کھیل تماشے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' شرجیل کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔

لیکن فیصل نے سمجھ لیا کہ شاردا نے آخری جملہ دراصل اس سے کہا تھا، شرجیل سے نہیں کہا تھا۔

فیصل نے بیٹ اپنے سر پر بلند کیا۔ اس کے دماغ میں شاردا کی آواز بھی گونجی۔ ''پوری قوت سے وار کرنا ہے۔''

فیصل نے ایسا ہی کیا۔ اپنی پوری طاقت سے بیٹ شرجیل کے سر پر مارا۔ یہ اس کا اپنا خیال تھا کہ اس نے پوری قوت استعمال کی تھی لیکن دراصل ایسا نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال اس وقت بھی موجود تھا کہ وہ قتل جیسا سنگین جرم کرنے جارہا ہے۔

تاہم اس وار سے بھی شرجیل کے منہ سے کراہ نکلی اور وہ ایک طرف ڈھلک گیا۔ شاردا بستر سے اٹھ کر جلدی سے فرش پر کھڑی ہوئی۔ ساتھ ہی اپنے کپڑے بھی درست کرنے لگی اور بولی۔ ''ابھی اور مارو فیصل، ابھی یہ بس بے ہوش ہوا ہوگا۔ مرا نہیں ہوگا۔''

''مر گیا ہوگا۔'' فیصل نے کہا۔

شاردا جھک کر اپنا منہ شرجیل کے منہ کے قریب لے گئی۔ پھر سیدھی کھڑی ہو کر بولی۔ ''میں کہہ چکی ہوں کہ یہ ابھی مرا نہیں ہے۔ اس کی سانس چل رہی ہے۔''

فیصل دم بخود کھڑا رہ گیا۔ اب اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔

''تم یوں ہی کھڑے رہو گے۔'' شاردا دانت پیس کر بولی۔ ''لاؤ بیٹ مجھے دو اور دیکھو کہ طاقت کیسے آزمائی جاتی ہے۔'' اس نے بڑھ کر خود ہی فیصل کے ہاتھ سے بیٹ لے لیا اور بستر کے سرہانے چلی گئی۔ اس نے بھی بیٹ اپنے سر پر اٹھایا اور زور سے شرجیل کے سر پر مارا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے ہاتھ جھنجنا گئے۔ وہ باری باری اپنے ہاتھ جھٹکنے لگی۔ پھر اس نے دوبارہ شرجیل کے سر پر وار کیا۔ اس بار بھی اس کے ہاتھ جھنجنا گئے تھے لیکن اس نے ایک بار پھر بیٹ اٹھایا۔

فیصل کے خیال کے مطابق شاردا پر جنون طاری ہو گیا تھا۔

تیسرا وار کرنے کے بعد اس نے بیٹ ایک طرف پھینک دیا۔ وہ بُری طرح ہانپنے لگی۔ وہ ایک گوشے میں لگے ہوئے بڑے صوفے پر جا بیٹھی۔ ذرا دیر فیصل کو گھورتی رہی، پھر یکایک مسکرا کر بولی۔ ''میرے پاس آؤ۔''

فیصل آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ شاردا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے اپنے قریب بٹھا لیا۔

''وہ شاید اب بھی زندہ ہے۔'' فیصل بولا۔ ''اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں خفیف سی حرکت دیکھی تھی میں نے۔''

شاردا نے شرجیل کی طرف دیکھا۔

''میں نے شاید کہا بھی تھا کہ یہ بہت طاقتور ہے۔ دیکھتی ہوں۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔

فیصل صوفے ہی پر بیٹھا رہ گیا۔

شاردا، شرجیل پر جا کر جھکی اور بڑبڑائی۔ ''ہاں..... اس کی سانسیں اُکھڑی اُکھڑی سی چلنے لگی ہیں لیکن اسے اب ذرا دیر بھی زندہ رہنے کا حق نہیں۔'' وہ پاگلوں کی طرح ہنسی۔ پھر شرجیل کے چہرے پر جھک کر بڑبڑائی۔ ''ڈیئر شرجیل..... تم نے مجھے تھپڑ مارا تھا نا..... زندگی میں پہلی بار جانا کہ مجھے کوئی مار بھی سکتا ہے اسی لیے تمہیں چند سانسیں بھی اور لینے کا حق نہیں۔'' اس نے ایک تکیہ اٹھایا اور اس کے منہ پر رکھ دیا۔ وہ خود اس پر بیٹھ گئی تاکہ شرجیل کی ناک پر زیادہ سے زیادہ دباؤ پڑ سکے۔ وہ اب پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی۔ ''تھپڑ مارا تھا مجھے۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''اب مارتے رہو ہاتھ پیر، جلد ہی ساکت ہو جاؤ گے۔''

سانس بند ہونے کی وجہ سے شرجیل کے ہاتھوں نے تھوڑی حرکت کی اور پھر ڈھیلے پڑ گئے۔

''آخر مر ہی گیا کم بخت۔'' اس نے تکیہ شرجیل کے چہرے سے ہٹایا۔ شرجیل کی آنکھیں پھیلی ہوئی ضرور تھیں

لیکن پتھر اسی گئی تھیں۔ اس مرتبہ شاردا نے اچھی طرح اس کا جائزہ لیا۔ نبض دیکھی، دل کی دھڑکن بھی دیکھی۔ ناک پر بھی پندرہ بیس سیکنڈ تک ہاتھ رکھے رہی، پھر اٹھی اور ہنستی ہوئی فیصل کے قریب آبیٹھی۔

☆☆☆

ماسٹر ہمدانی کے چہرے سے کسی قدر فکرمندی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس وقت اس کے ساتھ اس کے صرف دو آدمی تھے۔

''اب شرجیل کا فون بھی بند مل رہا ہے۔'' وہ اپنے آدمیوں کے چہروں پر دکھائی دینے والے سوالیہ نشان کو سمجھ کر بولا۔ ''مجھے دو کروڑ ڈالرز کی کچھ ایسی زیادہ پروا نہیں ہے۔ مجھے اس پارٹی سے شرمندہ ہونا پڑتا جس کو میں دو کروڑ ڈالرز شرجیل کے ذریعے بھجوانا چاہتا تھا۔ اس کو میں نے دو کروڑ ڈالرز کسی اور ذریعے سے بھجوا دیے ہیں۔ میں سوچ تو یہ رہا ہوں کہ شرجیل کے فارم ہاؤس میں آخر کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔''

''میں کچھ کہوں ماسٹر؟'' ایک آدمی بولا۔

''کہو۔''

''ایسا تو نہیں کہ دو کروڑ ڈالرز نے وجاہت اور شرجیل کی نیت میں فتور ڈال دیا ہو۔''

''تم کہنا چاہتے ہو کہ وہ دونوں دو کروڑ لے کر بھاگ نکلے؟''

''جی ہاں ماسٹر۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے ماسٹر۔'' دوسرا آدمی بول پڑا۔

''فی الحال میں اسے قیاس آرائی سمجھوں گا۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا۔ ''میں یقینی صورتِ حال جاننا چاہتا ہوں۔''

''وہ کیسے جانی جاسکتی ہے ماسٹر؟''

''ایک تو یہ کہ شاردا بھی فارم ہاؤس میں ہے یا نہیں۔ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اگر وہ گڑبڑ شرجیل اور وجاہت کی وجہ سے ہوئی ہے تو کیا شاردا بھی ان کے ساتھ ہے؟ دوسرے وجاہت کی بیوی شبنم کو بھی چیک کرنا پڑے گا۔''

ایک آدمی بولا۔ ''شبنم اور وجاہت میں محبت تو بہت تھی۔ وہ چھ سات مہینے میں اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی ہے۔''

''معلوم ہے مجھے۔''

''تو اسے فون کر کے دیکھا جائے کہ وہ کیا کہتی ہے۔ جانتی تو وہ بھی ہے کہ وجاہت ہم لوگوں کا ساتھی ہے۔''

ماسٹر ہمدانی نے کہا۔ ''ہاں شبنم کے گھر تو میں ابھی جانا چاہتا ہوں۔ شاردا کو اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ میں نے سنا ہے کہ اس کے فارم ہاؤس تک کا راستہ چار گھنٹے کا ہے۔''

''ہم میں سے صرف وجاہت ہی کو اس فارم ہاؤس کا علم تھا۔''

''اس لیے بھی میں نے اس کام کے لیے اس کا انتخاب کیا تھا۔ اگر تم لوگوں میں سے کوئی بھی اس کے فارم ہاؤس سے واقف نہیں تو بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اس کا پتا پولیس اسٹیشن سے چل جائے گا۔ ابھی تو میں شبنم کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ میری گاڑی نکلواؤ۔''

پندرہ منٹ بعد ہی وہ تینوں کار میں شبنم کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

کال بیل سن کر شبنم ہی نے دروازہ کھولا۔ اُس کے چہرے سے پریشانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

''اچھا ہوا بابا کہ آپ خود ہی آگئے۔'' وہ ماسٹر ہمدانی کو دیکھتے ہی بولی۔ ''ذرا دیر پہلے ہی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ..... بلکہ سوچا تھا کہ آپ کو فون کروں یا خود آپ سے ملنے کے لیے آؤں۔''

''کیوں، خیریت؟'' ماسٹر ہمدانی نے اس کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

اس کے دونوں ساتھیوں نے بھی گھر میں قدم رکھا۔ شبنم نے دروازہ بند کر لیا۔

''میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں بابا کہ خیریت ہے یا نہیں۔'' شبنم نے ان لوگوں کو ڈرائنگ روم کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

''کوئی ایسی اُلجھی ہوئی بات ہے؟'' ماسٹر ہمدانی نے پوچھا۔

''آپ یہاں آتے کب کب ہیں۔'' شبنم نے کہا۔ ''آپ کے اس وقت آنے سے تو میں سمجھ رہی ہوں کہ خیریت شاید نہیں ہے۔''

''ایسا سمجھنے کی وجہ؟''

''وجاہت کا فون مسلسل بند مل رہا ہے۔'' شبنم نے کہا۔

''ہاں۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا۔ ''میں بھی اسی اُلجھن میں ہوں۔ وجاہت کا موبائل مجھے بھی بند مل رہا ہے۔''

''یہ پریشانی کی بات تو ہے نا بابا؟''

''ہاں۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا۔ ''جب وجاہت گھر سے گیا تھا تو اس نے تم سے کوئی خاص بات کی تھی؟''

pklibrary.com

''خاص بات تو کوئی نہیں کی۔'' شبنم نے کہا۔ ''بس یہ بتایا تھا کہ اس کے پاس آپ کے دیے ہوئے دو کروڑ ڈالرز ہیں جو اسے شرجیل کو پہنچانے ہیں۔''

''اور کوئی بات بھی نہیں؟'' ماسٹر ہمدانی نے زور دے کر پوچھا۔

''مجھے تو کوئی خاص بات نہیں یاد۔''

''وہ بالکل نارمل تھا؟''

''کچھ فکر مند ضرور تھا اور اس کے کہنے کے مطابق اس کے لیے فکر مندی کی بات یہ تھی کہ آپ نے اسے بڑی اہم ذمے داری سونپی ہے۔ دو کروڑ ڈالرز شرجیل کو پہنچانا تھے جس کا فارم ہاؤس بڑی حد تک ویران علاقے میں ہے۔''

''مجھے ایک پریشانی اور بھی ہے۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا۔ ''کافی دیر سے شرجیل کا موبائل بھی بند مل رہا ہے۔ اسی بارے میں چھان بین کرنا ہے مجھے۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا اور صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

''مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے بابا۔'' شبنم نے کہا۔ ''میں کیا کروں؟''

''ہمت سے کام لو۔ میں تھوڑی دیر بعد فارم ہاؤس جا کر سمجھوں گا کہ وہاں کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔''

''مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔'' شبنم نے التجا کی۔ ''آپ کے ساتھ رہوں گی تو میری کچھ ڈھارس بندھی رہے گی۔''

ماسٹر ہمدانی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''اچھا..... تم بھی چلی چلنا۔ ابھی مجھے کچھ تیاری کرنی ہے۔ میرے فون کا انتظار کرنا اور پھر چلنے کے لیے تیار ہو جانا۔''

''آپ کا ساتھ میرے لیے بہت اچھا ہوگا بابا۔''

ماسٹر ہمدانی نے صرف سر ہلا دیا اور اپنے دونوں آدمیوں کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔

واپسی کے سفر میں ایک آدمی بولا۔ ''شبنم تو بالکل معصوم نظر آ رہی ہے۔''

''ہاں۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا۔ ''غالباً اپنے گھر سے روانگی تک وجاہت کے دماغ میں کوئی غلط سلط بات نہیں تھی۔ شبنم ویسے بھی ایک اچھی لڑکی بن گئی ہے۔''

جواب میں دونوں آدمیوں میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ وجاہت کے بعد صرف انہی دونوں کو ماسٹر ہمدانی کا اعتماد حاصل تھا۔

☆☆☆

کیف و سُرور میں کچھ وقت گزارنے کے بعد شاردا اور فیصل چائے پیتے ہوئے اس مسئلے پر بات کر رہے تھے کہ شرجیل کی لاش کا کیا کیا جائے۔

کال بیل کی آواز سن کر شاردا ایک دم اٹھی۔ ''اب تو میرا خیال ہے کہ ٹریول ایجنٹ ہی کو ہونا چاہیے۔''

فیصل کچھ نہیں بولا اور شاردا دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

دروازہ کھلتے ہی اس نے بیگ شانے سے لٹکائے جس آدمی کو دیکھا، وہ چھوٹتے ہی بولا تھا۔ ''میڈم! شرجیل صاحب کو بھیجیں..... انہوں نے دو ٹکٹ منگوائے تھے۔ وہ لے کر آیا ہوں۔''

''اب آئے ہیں آپ؟'' شاردا نے منہ بنایا۔

''میڈم! یہ فاصلہ ہی اتنا ہے۔ پہنچنے میں وقت تو لگے گا۔ شرجیل صاحب نے آرڈر بھی دیر سے دیا تھا۔''

''ٹکٹ کہاں ہیں؟''

''آپ شاید اُن کی.....''

''ہاں۔'' شاردا نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں اُن کی بیوی ہوں۔''

''لیکن ٹکٹ انہی کو دیے جا سکتے ہیں۔''

''وہ اس وقت..... اچھا خیر! میں جا کر انہیں بتاتی ہوں۔''

''میں کھڑا ہوں۔''

شاردا نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے فیصل کے قریب گئی۔ وہ متفکر تھی۔ اس نے فیصل سے کہا۔ ''وہ ٹریول ایجنٹ ہی ہے لیکن ٹکٹ شرجیل ہی کو دینا چاہتا ہے۔''

''اوہ!'' فیصل کے منہ سے نکلا۔

''دیکھو میں دوبارہ جاتی ہوں اس سے ریکویسٹ کرتی ہوں کہ ٹکٹ مجھے ہی دے دے۔'' وہ اٹھی اور دروازے پر آئی۔

''سوری مسٹر ایجنٹ..... وہ اس وقت باہر نہیں آ سکتے، بہت زیادہ پی گئے ہیں۔ نشے میں دھت ہیں۔''

''تو مجھے اندر آنے کی اجازت دیں۔ میں اُن سے مل لوں گا۔''

''لیکن..... اچھا ٹھہریے..... میں پھر کوشش کرتی ہوں۔''

شاردا دروازہ بند کر کے پھر فیصل کے پاس لوٹی۔ ''وہ ٹکٹ مجھے نہیں دے رہا ہے۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ میں ان کی بیوی ہوں لیکن وہ نہیں مان رہا ہے۔ اندر آنے کی اجازت مانگ رہا ہے۔ وہ خود شرجیل سے ملنا چاہتا ہے۔''

pklibrary.com

دونوں نے مل کر شرجیل کو بستر پر لٹا دیا اور اس کا سر اچھی طرح ایک کپڑے سے کور کر دیا تا کہ اس کے سر کا زخم دکھائی نہ دے۔

شاردا پھر گھر سے باہر نکلی اور ایجنٹ سے بولی۔ ''آیئے! دیکھ لیں آپ انہیں..... وہ بات کرنے کے قابل تو نہیں ہیں۔''

فیصل نے دیکھا کہ شاردا ایجنٹ کو اندر لے آئی تھی۔

''دیکھ لیجیے۔'' شاردا نے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ ایجنٹ کو لے کر کمرے میں آئی۔ وہ بستر کے قریب آ گیا اور شرجیل کو غور سے دیکھنے لگا۔

''چلیں اب تو مجبوری ہے۔'' ایجنٹ نے کہا۔ اور شاردا کو ٹکٹ دے کر ایک کاغذ پر اس کے دستخط لے لیے۔

ایجنٹ کو رخصت کر کے اس نے دروازہ بولٹ کیا اور فیصل کی طرف پلٹی جس کے چہرے پر اب بھی غصہ تھا۔

''شکر ہے کہ بلا ٹل گئی۔'' شاردا نے کہا۔

فیصل نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ ''بے وقوف عورت! وہ شرجیل کو دور سے ہی دیکھ کر واپس چلا جاتا لیکن تم نے اسے صوفے کے قریب جانے دیا۔ اگر وہ کچھ بھانپ جاتا تو؟''

شاردا اپنا وہ گال سہلانے لگی جس پر تھپڑ پڑا تھا۔ وہ فیصل کو گھور رہی تھی۔

''اب یوں کیا دیکھ رہی ہو؟'' فیصل بولا۔

''تم نے بھی مجھے تھپڑ مارا؟''

''غصے میں مار بیٹھا تمہاری حماقت پر۔''

''تم نے۔'' شاردا نے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی فیصل کے سینے پر رکھ کر کہا۔ ''تم نے بھی شرجیل کی طرح مجھے تھپڑ مارا۔''

''غصے میں اٹھ گیا ہاتھ۔''

''میں نے آج زندگی میں دوسری بار تھپڑ کھایا ہے۔''

''بھول جاؤ اب اسے۔'' فیصل نے کہا۔ ''یہ منحوس لاش ہماری نظروں کے سامنے سے ہٹنا چاہیے۔ اسے واپس بیڈ روم میں پہنچا دیا جائے۔''

شاردا نے خاموشی سے فیصل کی بات مان لی۔ دونوں پھر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔

''اب تو بتاؤ کہ اس لاش کا کیا کریں؟'' فیصل بولا۔ ''مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ لاش دفن کرنے کے لیے گڑھا کھودوں۔ کوئی اور ترکیب سوچنا پڑے گی۔''

شاردا کچھ نہیں بولی۔ اس کا منہ اب بھی پھولا ہوا تھا۔

''تمہاری ناراضگی آخر کیسے ختم ہو گی؟'' فیصل نے پوچھا۔

شاردا اسے گھورنے لگی۔

فیصل پھر بولا۔ ''شادی کر کے زندگی اس طرح کیسے گزرے گی میری جان..... بس اب مسکرا دو۔''

فیصل نے اس کے گدگدی کی تو وہ ہنس پڑی۔

''یہ ہوئی نا بات۔'' فیصل نے خوش ہو کر کہا۔ ''کتنی اچھی لگیں تم ہنستے ہوئے۔''

''میں تمہارا تھپڑ کبھی نہیں بھول سکتی۔''

''وقت گزرنے کے ساتھ انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔''

''میں نہیں بھول سکوں گی۔'' شاردا مسکرائی۔

''چلو میں تمہاری بات مانے لیتا ہوں تم کچھ بھی کہو، بس مسکرا کر بات کرتی رہو۔''

''اس وقت کے کشیدہ حالات میں مسکراتے رہنا ممکن نہیں۔''

''اسی لیے تو بات ہو رہی ہے کہ شرجیل کی لاش سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اس کے بعد ہی کشیدگی ختم ہو سکے گی۔''

کال بیل کی آواز نے فیصل کو چونکا دیا — وہ بولا۔

''اب کون ہو سکتا ہے؟''

''کہیں ماسٹر ہمدانی تو نہیں آ گیا۔'' شاردا بولی۔

''مائی گاڈ!'' فیصل پریشان ہو گیا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ وہ یہاں نہیں پہنچ سکتا۔''

''ڈر گئے۔'' شاردا ہنس پڑی۔ ''گھبراؤ نہیں، دیکھو جا کر ماسٹر بھی ہوا تو میں کسی بھی طرح صورت حال سنبھال لوں گی۔''

''تم ہی جا کر دیکھو۔''

''ڈرے جا رہے ہو۔'' شاردا کھڑی ہو گئی۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' فیصل کھڑا ہو گیا۔ ''میں ہی دیکھتا ہوں۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازہ کھولنے پر وہی انسپکٹر اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ بے دھڑک اندر آ گیا۔

''آپ نے ساری رات یہیں گزار دی؟'' وہ بولا۔

''..... ایسا تو ہوتا ہے آفیسر۔'' فیصل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''برسوں بعد دو دوستوں کی ملاقات ہو تو باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔''

''مسٹر شرجیل نظر نہیں آ رہے ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔

pklibrary.com

''سو گیا ہوگا۔'' فیصل کا جواب تھا۔

''بیوی اپنے دوست سے گپ شپ کر رہی ہے اور وہ سو گیا۔''

''اپنی بیوی پر اعتماد ہے اُسے۔''

''مجھے تو لگ رہا ہے کہ اس گھر میں کچھ گڑبڑ چل رہی ہے۔''

اس بات پر فیصل پریشان تو ہوا لیکن سنبھل کر بولا۔ ''یہاں کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے آفیسر۔''

''یہی تو اب میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ایوب نے کہا۔ ''میں سارے گھر کی تلاشی لوں گا۔'' اس نے شاردا کی طرف دیکھا جو بالکل چپ اور سنجیدہ بیٹھی تھی۔

''تلاشی کیسے لے سکتے ہیں آپ؟'' فیصل بولا۔ ''سرچ وارنٹ ہے آپ کے پاس؟''

''قانون کے دیوتا نہ بنو۔'' ایوب نے بگڑ کر کہا۔ پھر اپنے آدمیوں سے بولا۔ ''تلاشی لو یہاں کی..... شرجیل صاحب کو بھی جگا کر لاؤ۔''

''آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔'' فیصل اکڑ گیا۔

''چپ چاپ رہنا بہتر ہوتا ہے۔'' ایوب نے کہا۔ ''قانون کے راستے میں رکاوٹ بننا بھی ایک جرم ہے۔'' پھر وہ اپنے تینوں آدمیوں سے بولا۔ ''کھڑے منہ کیا تک رہے ہو، جاؤ تلاشی لو۔ تم اُدھر جاؤ..... تم اِدھر جاؤ..... تم اُدھر جاؤ۔'' اس نے تینوں کو ہدایت دی۔

''تم کو اس زیادتی کے لیے جواب دینا پڑے گا۔'' فیصل نے تیز لہجے میں کہا۔

''وہ میں دے لوں گا۔'' ایوب نے سکون سے کہا۔

اس کے تینوں آدمی گھر میں پھیل چکے تھے۔

فیصل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ اس نے شاردا کی طرف دیکھا۔ وہ دم بہ خود سی بیٹھی تھی۔ فیصل کے خیال میں وہ بہت زیادہ خائف ہوئی تھی۔

کسی جانب سے ایوب کے آدمی کی آواز آئی۔ ''سر! یہاں ایک بیگ رکھا ہے۔ میں نے ابھی کھولا ہے۔ اس میں ڈالرز بھرے ہوئے ہیں۔''

فوراً ہی دوسرے آدمی کی آواز آئی۔ ''سر! میں ایک خواب گاہ میں ہوں کہ یہاں مسٹر شرجیل ہوں گے لیکن یہاں ان کی لاش پڑی ہے۔''

ایوب نے چونکے ہوئے انداز میں اپنا ریوالور نکال لیا۔

''تم دونوں اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔'' اس نے فیصل اور شاردا سے کہا۔ ''اور شرجیل کے کمرے کی طرف چلو۔''

اب فیصل کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ایوب ریوالور کے زور پر ان دونوں کو شرجیل کے بیڈ روم میں لے گیا۔ اسی وقت اس کا آدمی بیگ اٹھائے وہاں آیا اور بولا۔ ''سر! اس میں تو بہت ڈالرز بھرے ہوئے ہیں۔ شاید لاکھوں ہوں۔''

''کیوں؟'' ایوب نے شاردا اور فیصل سے کہا۔ ''یہ ڈالرز ضرور شرجیل کے ہوں گے۔ تم دونوں اسے قتل کرنے کے بعد یہ ڈالرز لے کر یہاں سے فرار ہونے کی منصوبہ بندی کر رہے ہو گے۔ اتنا وقت گزار کر بھی تم دونوں کوئی منصوبہ نہیں بنا سکے۔ اب میں تم دونوں کو ہتھکڑیاں لگانے پر مجبور ہوں۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' یکا یک شاردا چیخ پڑی۔ ''میرے شوہر کو اس نے قتل کیا ہے۔'' اس کا اشارہ فیصل کی طرف تھا۔

''کیا بک رہی ہو؟'' فیصل اس کی طرف جھپٹا۔

''بس رک جاؤ۔'' ایوب گرجا۔ ''ورنہ گولی مار دوں گا۔''

فیصل کو ٹھٹک کر رکنا پڑا۔

شاردا کی آنکھوں میں اب آنسو تھے۔ وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ''اس کا ارادہ تھا کہ دن اچھی طرح نکل آئے تو یہ یہاں سے روانہ ہو۔ یہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا تاکہ میں پولیس کو فون نہ کر سکوں۔ کہیں لے جا کر یہ مجھے بھی مار ڈالتا، یہاں بھی اس نے ایک مرتبہ میرا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔''

شاردا کی اس قلابازی پر فیصل ششدر رہ گیا تھا۔ پھر بھی وہ چیخا۔ ''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ دراصل یہ اسی کا منصوبہ تھا کہ مجھے اپنا ساتھی بنا لے اور ہم ڈالرز لے کر یہاں سے فرار ہو جائیں۔ اسی نے مارا ہے اپنے شوہر کو۔''

میں اسے کیسے مار دیتی۔'' شاردا چیخی۔ ''وہ اور میں تو ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔''

''یہ چڑیل سراسر جھوٹ بول رہی ہے۔'' فیصل نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''میں ابھی اس سے سب کچھ تفصیل سے معلوم کر لوں گا لیکن تم دخل اندازی کر رہے ہو۔'' پھر اس نے اپنے تینوں آدمیوں سے کہا۔ ''اسے تو لے جا کر گاڑی میں ڈالو۔''

ان تینوں نے جھپٹ کر فیصل کو جکڑ لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے دروازے کی طرف لے جانے لگے۔

pklibrary.com

''بتاؤ!'' ایوب نے شاردا کے منہ پر چانٹا مارا۔ ''سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔''

شاردا نے غصے سے ایوب کی طرف دیکھا۔

تینوں آدمی اب فیصل کو گھسیٹ کر باہر لے جا چکے تھے۔

''سوری!'' ایوب نے شاردا سے کہا۔ ''صرف فیصل کو دکھانے کے لیے چانٹا مارا ہے میں نے تمہیں..... اسے یقین دلانا تھا کہ میں پولیس آفیسر ہوں۔''

''میں نے آج تیسرا تھپڑ کھایا ہے۔'' شاردا بولی۔

''میں نے کہا نا کہ یہ مجبوری تھی۔ اب جلدی سے یہ بتاؤ کہ کرنا کیا ہے۔''

''تم نے میری ٹیلی فونک ہدایت پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا ہے۔'' شاردا نے کہا۔ ''کیا تمہارے پاس عقل نہیں ہے.....؟ سب سے پہلے کسی طرح شرجیل کی لاش ٹھکانے لگانا ہوگی۔ اس کے بعد ہی ڈالرز کا بیگ لے کر یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''تم نے فون پر بتایا تھا کہ وجاہت کی لاش شرجیل نے کوئی گڑھا کھود کر دبائی ہے۔''

''اب دن نکل آیا ہے۔ اس وقت گڑھا کھودنا مناسب نہیں ہوگا۔ سڑک پر اِکّا دُکّا گاڑیاں چلنا شروع ہو چکی ہوں گی۔''

''تو پھر.....'' ایوب سوچتے ہوئے ذرا سا ٹہلا، پھر چٹکی بجا کر بولا۔ ''ہاں! اس طرح کام ہو سکتا ہے۔''

''کس طرح؟'' شاردا نے جلدی سے پوچھا۔

''نیلے پُل پر جا کر لاش سمندر میں پھینک دی جائے۔''

''بے وقوفی کی بات سوچی ہے تم نے..... کئی دن سے وہ پُل ٹریفک کے لیے بند ہے۔ اسے مخدوش قرار دیا جا چکا ہے۔ بڑا سا بورڈ لگا ہوا ہے وہاں کہ پل مخدوش ہے۔ سب گاڑی والے جان چکے ہیں کوئی اس پل پر سے نہیں گزرتا۔''

ایوب مسکراتا ہوا اس کی ساری بات سنتا رہا۔

''اور.....'' وہ بولا۔ ''یہاں کی حکومت نے کئی دن میں بھی اسے ٹھیک کرنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔''

''تم یہ سب کچھ جانتے ہو، پھر بھی تم نے کہا کہ لاش وہاں سے سمندر میں پھینکی جائے۔''

''ہاں۔'' ایوب نے کہا۔ ''مخدوش بھی اس قدر ہے کہ ٹریفک کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ ایک کار تو وہاں سے بہ آسانی گزر سکتی ہے۔ کل ہی ایک سرکاری گاڑی پل پر گئی تھی۔ پُل کا

بھولنے کی بیماری

سائیکا ٹرسٹ اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ اچانک ایک مریض بغیر اجازت کے اس کے کمرے میں داخل ہوا اور آرام دہ صوفے پر لیٹ گیا جہاں ڈاکٹر اپنے مریضوں سے سوال جواب کرتا تھا۔

''ڈاکٹر آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔ میں بڑی مشکلوں میں پھنس گیا ہوں۔ میں بہت اچھا کاروبار کرتا تھا۔ خوب صورت بیوی بچے بڑا مکان اور دوسری فیملی کے لوگ تھے میں اپنے حلقۂ احباب میں اچھی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ ساری چیزیں ختم ہو گئیں۔ اس کی وجہ میری میموری حافظہ کا ختم ہونا ہے۔ میں کاروبار Lose کر چکا ہوں کیونکہ میں اپنے کلائنٹ کے نام اور پتا بھول گیا۔ ساتھ یہی ساتھ میری بیوی اور بچے بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے اور اس میں ان کی کوئی غلطی میں محسوس نہیں کرتا۔ اکثر راتوں کو میں گھر نہیں جاتا مجھے اپنے گھر کا پتا بھی یاد نہیں رہتا اور میں صبح تک اِدھر سے اُدھر گھومتا رہتا ہوں۔ مجھے یاد ہی نہیں رہتا کہ کہاں رہتا ہوں میری حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ برائے مہربانی میری مدد کریں۔''

اس پر ڈاکٹر نے سوال کیا۔

''یہ عام سی بات ہے بھولنے کی اکثر لوگ (بھولنے کی بیماری) میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اب آپ مجھے بتائیں کہ اس مرض یعنی بھولنے کی عادت آپ نے کب سے محسوس کرنا شروع کیا؟''

مریض اچانک صوفے سے اٹھا اور بولا۔ ''کون سی حالت کیسی حالات کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔'' اور یہ کہہ کر مریض کمرے سے نکل گیا۔

امریکا سے جاوید کاظمی کا تجزیہ

pklibrary.com

حتمی مشاہدہ کرنے۔ اب غالباً جلد ہی وہاں کام شروع ہونے والا ہے۔"

"تم نے خود دیکھی ہے وہ سرکاری گاڑی اس پُل پر جاتے ہوئے؟"

"میں نے تو نہیں دیکھی اور تم نے شاید رات سے اب تک ٹی وی کی خبریں نہیں سنیں۔ دس بجے یہ خبر میں نے سرکاری ٹی وی ہی سے سنی ہے۔"

"خبر غلط بھی ہو سکتی ہے۔"

"کسی پرائیویٹ چینل سے بھی اتنی غلط خبر نشر نہیں ہو سکتی۔ میں نے سرکاری ٹی وی سے سنی ہے۔"

"تو ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

"قطعی نہیں ہونا چاہیے۔"

"تو پھر ایسا ہی کیا جائے۔"

"لاش کسی چیز میں لپیٹ کر لے جانا ہوگی ورنہ کار کی ڈکی میں خون کے دھبے آسکتے ہیں۔"

"وجاہت کی لاش کمبل میں لپیٹ کر گڑھے تک لے جاتی گئی تھی اور پھر اسے کمبل سمیت ہی گڑھے میں پھینک کر گڑھا بھر دیا گیا تھا۔"

"تو کوئی اور کمبل ہے؟"

"یقیناً ہے۔"

"تو بس..... اسی کمبل میں لپیٹ کر لے چلتے ہیں۔ میری گاڑی تو فیصل کو لے کر گئی ہے۔"

"اسے تم نے کہاں بھیجا ہے؟"

"اسے بہت دور لے جا کر میرے آدمیوں میں سے کوئی مجھ سے فون پر پوچھے گا کہ اس کا کیا کیا جائے۔"

"اسے بھی مروا ہی دینا چاہیے۔"

"یہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن ابھی تو تم کمبل....."

"آؤ۔" شاردا نے ایک طرف قدم بڑھائے، پھر پوچھا۔ "تمہارے وہ تینوں آدمی ہیں کون؟"

"کرائے کے ٹٹو ہیں۔"

"ان سے کسی گڑبڑ کا اندیشہ تو نہیں؟"

"کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے ان میں سے ہر ایک کو بیس ہزار ایڈوانس دیے ہیں اور وعدہ کیا ہے کہ کام مکمل ہونے کے بعد بیس بیس ہزار اور دوں گا۔"

"تب ٹھیک ہے۔"

شاردا نے ایک کمرے سے ایک پرانا کمبل نکالا اور ایوب کو لے کر شرجیل کے بیڈروم میں پہنچی۔

ٹکٹ لانے والے ایجنٹ کو دکھانے کے لیے لاش ڈرائنگ روم کے صوفے تک پہنچائی گئی تھی۔ بعد میں اسے پھر بیڈروم میں پہنچا دیا گیا تھا۔

لاش کمبل میں لپیٹ کر دونوں ہی نے اسے باہر کار تک پہنچایا۔

"فیصل کی کار کا کیا کرنا ہے؟" شاردا نے کار کی طرف اشارہ بھی کیا۔

"اسے بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے یہ اہم ترین کام تو کر لیں۔"

ان دونوں نے لاش ڈکی میں رکھی اور کار میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ ڈرائیونگ شاردا ہی کر رہی تھی۔

نیلے پُل تک کا فاصلہ جلد ہی طے ہو گیا۔ پُل تقریباً چار میل لمبا تھا۔ ایوب کے اشارے پر شاردا نے کار پُل کے درمیانی حصے میں روکی۔

دونوں جانب دور تک سناٹا تھا۔ بڑے اطمینان سے کمبل میں لپٹی لاش ڈکی سے نکالی گئی۔ پُل کی چار فٹ اونچی دیوار پر اسے پہنچانے میں دونوں ہی کو ہاتھ بٹانا پڑا۔

شاردا اس محنت سے ہانپنے لگی تھی۔ اس نے کہا۔

"اب اسے تم ہی گراؤ سمندر میں۔"

"دو فٹ چوڑی دیوار ہے۔ اسے دھکیلنے میں مجھے محنت کرنا پڑے گی۔"

"جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو۔"

ایوب لاش کو سمندر کی طرف دھکیلنے میں زور لگانے لگا۔ شاردا اس کے پیچھے کھڑی رہی۔

ایک منٹ کی جدوجہد میں ایوب نے لاش دھکیل کر سمندر میں گرا دی۔ خاصا زوردار دھماکا ہوا۔ ایوب ہاتھ جھاڑتا ہوا مڑا تو چونک گیا۔ شاردا کے ہاتھ میں لمبا چاقو تھا۔

"یہ کس لیے؟" وہ حیرت سے بولا۔

"یہ تمہارے لیے ہے۔" شاردا نے تیزی سے آگے بڑھ کر چاقو ایوب کے پیٹ میں اتار دیا۔ ایوب ہلکی سی کراہ کے ساتھ آگے جھکا لیکن شاردا نے اس کے شانے پر دباؤ ڈال کر اسے گرنے نہیں دیا اور بولی۔ "بے وقوف! تم سمجھ رہے تھے کہ میں دو کروڑ ڈالرز میں سے آدھے تم کو دوں گی۔"

"یہ..... یہ دغابازی..... تم میری بہن ہو۔" ایوب بمشکل بول سکا۔

"سوتیلی بہن۔" شاردا نے سرد لہجے میں کہا۔ "سوتیلے بھائی ہو تم میرے۔ زندگی بھر تم نے مجھ سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔" شاردا نے چاقو کھینچ کر اس کے پیٹ سے

نکالا اور دوبارہ اس کے دل کے مقام پر گھسیڑ دیا۔ پہلا وار اس نے جلدی میں اس کے پیٹ پر کیا تھا۔

اس مرتبہ ایوب گر پڑا۔

شاردا نے چاقو پھر کھینچ کر نکالا اور تیسری بار وہ اس کی گردن میں اتار دیا۔ اس نے یہ احتیاط برتی تھی کہ ایوب کا خون اس کے اپنے کپڑوں پر نہ لگ پائے لیکن اس کا ہاتھ خون سے رنگین ہو چکا تھا۔

ایوب منٹ بھر بھی نہیں تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

شاردا نے چاقو اور اپنے ہاتھ ایوب ہی کے لباس سے پونچھے۔ اس طرح وہ پوری طرح صاف نہیں ہوئے۔ شاردا نے پروا نہیں کی اور تیزی سے مڑ کر اپنی کار میں پہنچی۔

جب اس نے انجن اسٹارٹ کیا تو اس کے دماغ میں دو کروڑ ڈالرز جیسے اُڑ رہے تھے۔

☆☆☆

فیصل کو جس گاڑی میں لے جایا گیا تھا، وہ اس کی پچھلی نشست پر دو آدمیوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ تیسرا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

''ہم بہت دور نکل آئے ہیں۔'' فیصل بولا۔ ''تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''خاموش بیٹھو۔'' اسے ڈانٹ دیا گیا۔

''میرا اندازہ ہے کہ تم تینوں کانسٹیبل ہو گے۔''

''تم چپ نہیں بیٹھ سکتے۔'' غرا کر کہا گیا۔

لیکن فیصل چپ نہیں ہوا۔ ''میں تم تینوں سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ پولیس کی ملازمت میں تمہیں لگی بندھی تنخواہ ملتی ہو گی۔ کچھ رشوت سے کما لیتے ہو گے۔ اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں تم تینوں کو ایک ایک لاکھ روپیا دے سکتا ہوں۔''

''وہ تم کہاں سے لاؤ گے؟'' طنزاً ہنسا گیا۔

''تم لوگ یہ سودا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ تو بتا دوں گا۔'' فیصل نے کہا۔

وہ تینوں سوچ میں پڑ گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف بھی دیکھا۔ ڈرائیونگ کرنے والے نے آئینے میں پیچھے دیکھا تھا۔

''سوچنے میں وقت ضائع نہ کرو۔'' فیصل بولا۔

''رقم تم کہاں سے دو گے؟'' سوال کیا گیا۔

''ہمیں وہیں واپس جانا ہو گا جہاں سے چلے تھے۔''

''کیوں؟''

''میری کار میں ایک خفیہ خانہ ہے جسے کوئی اور نہیں کھول سکتا۔ رقم اسی میں ہیں۔''

''وہاں جانا تو.....'' ڈرائیونگ کرنے والا کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''باس کا خیال آ گیا تمہیں شاید۔'' پیچھے بیٹھا ہوا ایک آدمی بولا۔

''یہی سوچ رہا تھا۔''

''کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ اب بھی وہیں ہوں گے۔''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ انہوں نے اپنا پروگرام نہیں بتایا تھا۔''

ان باتوں نے فیصل کو چونکایا، وہ بولا۔ ''کیا وہ اس لڑکی سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد اسے پولیس اسٹیشن نہیں لے گیا ہو گا؟ اور تم اسے باس کیوں کہہ رہے ہو؟''

وہ تینوں ہنس پڑے پھر ڈرائیونگ کرنے والا ہی بولا۔ ''نہ تو ہم پولیس والے ہیں، نہ وہ۔''

''ہوں۔'' فیصل نے سر ہلایا۔ ''تمہاری باتوں سے مجھے کچھ شبہ ہوا تھا، پھر تم لوگ کون ہو؟''

''اس نے ہمیں اپنے ساتھ رکھنے کے لیے بیس بیس ہزار دیے ہیں اور وعدہ کیا ہے کہ کام مکمل ہونے کے بعد بیس بیس ہزار ہمیں اور ملیں گے۔''

فیصل سمجھ گیا کہ یہ تینوں کرائے کے آدمی تھے۔

''تو بھول جاؤ کہ تمہیں بیس بیس ہزار اور ملیں گے۔ میں تو تمہیں ایک ایک لاکھ دے رہا ہوں۔ کام مکمل کرنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''تمہیں بہت دور لے جانے کے بعد ہم اُسے فون کریں گے۔ اسی وقت وہ ہمیں بتائے گا کہ ہمیں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔''

''یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ تم گاڑی تو واپس موڑو۔'' فیصل نے کہا۔

ان تینوں نے آپس میں کچھ باتیں کرتے ہوئے گاڑی واپسی کے لیے موڑ دی۔ انہیں یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اگر ان کا باس اب بھی وہاں ہو گا تو ان کے لیے کیا صورتِ حال بنے گی، تاہم تینوں نے فی الحال سر جھٹک دیا۔ بعد کی بعد میں سوچیں گے۔

''اب تمہیں کرنا یہ ہو گا کہ جب ہم واپس پہنچ جائیں تو کچھ فاصلے سے اس کو فون کر کے پوچھ لینا کہ تم لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرو۔ تمہیں اس سے اور پیسے بھی لینے ہیں اس لیے پوچھا جا سکتا ہے کہ اب وہ تمہیں کہاں ملے گا۔''

''ہمیں اس کا پروگرام نہیں معلوم، ہو سکتا ہے وہ اب

pklibrary.com

بھی وہیں ہو۔"

"اس کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔" فیصل انہیں ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "گاڑی کچھ فاصلے پر روک دینا۔ تم میں سے کوئی ایک میرے ساتھ چھپتا چھپاتا کار تک چلے۔ مجھے ریوالور کی زد پر بھی رکھے۔ مجھ سے رقم لے کر وہ تم لوگوں کے پاس لوٹ جائے۔ اس کے بعد تم کچھ دور جانے کے بعد اسے فون پر بتا دینا کہ میں تم لوگوں سے بچ کر کسی طرح بھاگ نکلا ہوں۔ تمہاری اس بات کی وجہ سے وہ تم لوگوں کو مزید رقم نہیں دے گا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بیس بیس ہزار کے بجائے تم لوگوں کو مجھ سے ایک ایک لاکھ مل جائیں گے۔"

"بات تو ٹھیک ہے استاد۔" ڈرائیونگ کرنے والے نے کہا۔ "رفتار ذرا تیز کرو۔"

فیصل دل ہی دل میں خوش ہوا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔ اس کی خواہش یہ بھی تھی کہ شاردا اور وہ جعلی انسپکٹر وہیں ہوں۔ اسے شاردا سے تو نفرت ہو ہی چکی تھی۔ وہ ان دونوں کو ہلاک کر کے وہاں سے دو کروڑ لے کر اُڑن چھو ہو سکتا تھا۔ وہ زرینہ کے لیے چار لاکھ لے کر چلا تھا۔ اس وقت اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ رقم کسی اور کام آئے گی۔

گاڑی شرجیل کے فارم ہاؤس سے کچھ فاصلے پر روک دی گئی۔

"تمہارے ساتھ میں چلوں گا۔" ڈرائیونگ کرنے والا بولا۔

"کوئی بھی چلے۔" فیصل نے کہا۔ "مجھے اس سے کیا غرض!"

"بہت ہوشیار رہنا استاد!" ایک بولا۔

"مجھے سمجھاؤ گے تم؟" ڈرائیونگ کرنے والے نے منہ بنایا۔

فیصل کو کار سے اتارا جا چکا تھا۔ ڈرائیور بھی اتر آیا تھا۔ وہ دونوں شرجیل کے فارم ہاؤس کی طرف چلے۔ اب وہاں ٹریفک رواں دواں ہو چکا تھا لیکن بہت کم کم..... اس ویرانے سے لوگوں کی گزر کم ہی ہوتی تھی۔

"ریوالور میری جیب میں ہے۔" ڈرائیور نے فیصل سے کہا۔ "اور دستے پر میری گرفت ہے۔ میں ریوالور جیب سے نکالے بغیر بھی تم پر گولی چلا سکتا ہوں۔"

"بھاگنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" فیصل نے کہا۔ "جب تین لاکھ میں میری جان چھوٹ رہی ہے تو میں اپنی زندگی داؤ پر کیوں لگاؤں گا؟"

"ہاں۔" ڈرائیور نے کہا۔ "سمجھداری تو یہی ہے۔"

جب وہ فارم ہاؤس کے قریب ہونے لگے تو زیادہ احتیاط سے آگے بڑھنے لگے اور آخر وہاں پہنچ گئے۔ جہاں انہیں پہنچنا تھا۔

فیصل کی کار وہاں موجود تھی لیکن یہ دیکھ کر فیصل کا دل بیٹھ گیا کہ شاردا کی کار نہیں تھی۔ فوری طور پر فیصل کو یہی خیال آیا کہ وہ جعلی انسپکٹر ڈالرز کا بیگ لے کر شاردا کی کار میں وہاں سے فرار ہو چکا ہے۔

عمارت سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

شاردا ان ڈالرز کا ماتم کر رہی ہوگی۔

کار میں بیٹھ کر فیصل نے تین لاکھ خفیہ خانے کے ایک چھوٹے سے بیگ سے نکالے اور ڈرائیور کو دے دیے۔

"تمہارے پاس ریوالور ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"میں تمہاری تلاشی لے کر اطمینان کرنا چاہوں گا۔"

"تم مجھے جھوٹا کیوں سمجھ رہے ہو؟"

"احتیاط ضروری ہے۔ تم یہ حرکت کر سکتے ہو کہ جب میں جانے لگوں تو تم پیچھے سے مجھ پر گولی چلا دو۔"

"اچھا!" فیصل نے طویل سانس لی۔ "تم اپنا اطمینان کر لو۔"

ڈرائیور نے اچھی طرح اس کی تلاشی لی اور مطمئن ہو گیا۔ فیصل کے پاس کسی قسم کا ہتھیار تھا ہی نہیں۔

رقم لے کر ڈرائیور تیزی سے واپس چلا گیا۔

اس دوران میں فیصل سوچ چکا تھا کہ ڈالرز تو ہاتھ سے نکل گئے لیکن شاردا کو وہ زندہ چھوڑ کر یہاں سے نہیں جائے گا۔ اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالے گا۔

فیصل کے ذہن میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ جعلی انسپکٹر نے شرجیل کی لاش کے سلسلے میں کیا کیا ہوگا۔ اسے لاش سے کوئی دلچسپی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ لاش اب بھی وہیں ہوگی اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا شاردا کے لیے امتحان بنا ہوا ہوگا۔ ڈالرز تو یقیناً اس کے ہاتھ سے نکل چکے ہوں گے۔ اب اسے بس اپنی جان بچانے کی فکر لاحق ہوگی۔

فیصل بہت احتیاط سے دبے قدموں سے فارم ہاؤس میں داخل ہوا۔ ڈرائنگ روم خالی تھا۔

وہ بیڈ روم میں شرجیل کی لاش کے پاس ہی پریشان بیٹھی ہوگی کہ اس لاش سے چھٹکارا کیسے حاصل کرے۔

فیصل آہستگی سے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل

pklibrary.com

ہوا۔ یہ دیکھ کر اسے ذہنی جھٹکا لگا کہ وہاں نہ شاردا تھی، نہ شرجیل کی لاش!

پھر یہ دیکھ کر اسے ایک اور ذہنی جھٹکا لگا کہ ڈالرز کا بیگ فریج کے پیچھے موجود تھا۔ اس نے جلدی سے قریب جا کر بیگ کھولا۔ ڈالرز اس میں بہ دستور موجود تھے۔

یہ کیا ہوا؟ فیصل کے دماغ میں سوال ابھرا۔

جعلی انسپکٹر بھی غائب تھا، شاردا بھی نہیں تھی، لاش کا بھی پتا نہیں تھا لیکن ڈالرز موجود تھے۔

''جہنم میں جھونکو ان خیالات کو۔'' فیصل نے دل ہی دل میں کہا۔ ''ڈالرز تو مل گئے ہیں۔ بس یہ بیگ لے کر بھاگ نکلو یہاں سے۔''

اس نے بیگ اٹھایا ہی تھا کہ کسی کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔

فیصل تیزی سے عقبی دروازے کی طرف گیا۔ وہ دروازہ اس کے علم میں آچکا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

فیصل نے جو آہٹ سنی تھی، وہ شاردا کے قدموں کی تھی۔ وہ واپس آکر تیزی سے فارم ہاؤس میں داخل ہوئی تھی۔ وہ ڈالرز کا بیگ اٹھانے سے پہلے اپنے ہاتھوں اور چھری سے خون کے دھبے چھڑانا چاہتی تھی۔ اس نے بیڈ روم میں داخل ہو کر باتھ روم کا رخ کرنا چاہا تھا کہ اسے کسی کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ حیرت سے کھڑکی کی طرف جھپٹی۔ وہاں سے نیچے دیکھا جا سکتا تھا۔

یہ دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئی کہ فیصل کی کار حرکت میں آچکی تھی۔ اسے ڈرائیونگ سیٹ پر فیصل کی جھلک بھی نظر آگئی تھی۔

''یہ کیسے ہو گیا؟'' اس کے دماغ میں سوال اُبھرا۔ ''ان تینوں آدمیوں نے اسے چھوڑ کیسے دیا؟ اسے تو اس معاملے میں ہدایت کا انتظار کرنا تھا جو انہیں اب نہیں مل سکتی تھی۔ وہ مر چکا تھا جس سے انہیں کوئی ہدایت ملتی۔''

یکایک شاردا کے دماغ میں ڈالرز کا خیال آیا۔ وہ ایک دم مڑ کر فریج کی طرف گئی جس کی آڑ میں ڈالرز کا بیگ رکھا تھا۔ وہ بیگ اب وہاں نہیں تھا۔

وہ بیگ لے گیا، شاردا کو خیال آیا۔ وہ تیزی سے مڑی، باہر نکلی، اپنی کار میں بیٹھی، اسے اسٹارٹ کیا اور تیزی سے اس طرف چل پڑی جہاں اس نے فیصل کی کار جاتے دیکھی تھی۔ اب دور دور تک اس کا پتا نہیں تھا۔ شاردا وحشیانہ انداز میں رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ وہ کسی بھی صورت فیصل سے وہ بیگ واپس لینا چاہتی تھی۔

لیکن اس کی خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ خاصی بھاگ دوڑ کے باوجود وہ فیصل کی کار تک نہیں پہنچ پائی۔ اسے ڈوبتے دل کے ساتھ واپس لوٹنا پڑا۔ گھر میں داخل ہو کر وہ فریج کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اس کی گھورتی ہوئی نگاہیں اس جگہ پر گڑ گئیں جہاں بیگ رکھا تھا۔ یکایک وہ پاگلوں کی طرح ہنس پڑی۔ اس کی ساری محنت اور منصوبہ بندی پر پانی پھر چکا تھا۔ اس کی ہنسی قہقہوں میں بدل گئی۔ اس نے اپنے بال بھی نوچے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے صدمے سے اس کا دماغ الٹ گیا ہو۔

وہ چونکی اُس وقت جب اس نے کئی قدموں کی آوازیں سنیں جو ڈرائنگ روم سے آئی تھیں۔ اسے خیال آیا کہ واپس گھر آنے پر بھی وہ دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ وہ تیز قدموں سے باہر نکلی۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں ماسٹر ہمدانی تین آدمیوں اور ایک لڑکی کے ساتھ موجود تھا۔ انہیں دیکھ کر شاردا گم صم سی ہو گئی۔

''شرجیل کہاں ہے شاردا؟'' ماسٹر ہمدانی نے پوچھا۔

''شاردا کوئی جواب نہیں دے سکی۔ اس کا دماغ چکرانے لگا تھا۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ ماسٹر ہمدانی کے اشارے پر اس کے دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر اسے گرنے سے بچایا۔ شاردا کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔

''اسے صوفے پر بٹھاؤ۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا۔ ''کوئی اسے پانی پلائے۔ یہ بھی دیکھو کہ شرجیل کہیں ہے یا نہیں۔''

شاردا صوفے پر بیٹھی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اسے پانی پلایا گیا۔ اسے اپنے آدمیوں سے اطلاع بھی ملی کہ شرجیل تو کیا، گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔

''تم مجھے دیکھ کر اتنا گھبرا کیوں گئیں؟'' ماسٹر ہمدانی نے شاردا سے پوچھا اور اسے غور سے دیکھتا رہا۔

شاردا اس کا منہ تکتی رہی۔

ماسٹر ہمدانی پھر بولا۔ ''بتاؤ شاردا یہاں کیا کھیل ہوا ہے۔ مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس کی تفصیل مجھے تم ہی بتا سکتی ہو۔ سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں لیکن اگر جھوٹ بولو گی تو میری پسند بدل بھی سکتی ہے۔''

شاردا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''دو کروڑ ڈالرز کا تماشا بن گیا۔''

pklibrary.com

''اس کا مطلب ہے کہ وجاہت یہاں آیا تھا ورنہ تم ڈالرز کی بات نہیں کرتیں۔ مجھے صاف صاف بتاؤ، کیا گڑبڑ ہوئی ہے؟''

''یہاں ایک اور آدمی بھی آیا تھا۔'' شاردا نے کہا۔

''وہ اور شرجیل پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے..... شرجیل نے اسے بتایا کہ آپ نے وجاہت کے ذریعے وہ ڈالرز بھجوائے ہیں۔'' وہ خاموش ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

''اسے پانی اور پلاؤ۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا۔

اس مرتبہ شاردا نے صرف دو گھونٹ پیے۔

''خود کو سنبھالے رکھو۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا۔ ''میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔''

''مجھے ان دونوں کی ساری باتیں ٹھیک سے یاد نہیں۔'' شاردا نے خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ ''بس اتنا بتا سکتی ہوں کہ ان ڈالرز کے لیے ان کی نیت خراب ہو گئی تھی۔''

''دوسرا آدمی تھا کون؟'' ماسٹر ہمدانی نے سکون سے پوچھا۔

''ان دونوں کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ اس آدمی کا نام فیصل تھا اور وہ بھی آپ کی کمپنی میں کوئی کام کرتا تھا۔''

''اوہو۔''

''میں بتا رہی تھی کہ ان دونوں کی نیت خراب ہو گئی تھی۔''

''وجاہت ڈالرز دے کر واپس چلا گیا تھا؟''

''نہیں۔'' شاردا نے جواب دیا۔ ''وہ بہت تھکا ہوا تھا اور کافی پی کر کچھ دیر یہیں بیٹھ کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ہی اس کے لیے کافی بنائی تھی اور پھر بیڈروم میں گئی تھی۔''

''شرجیل اور فیصل.....'' ماسٹر ہمدانی نے کہنا چاہا۔

''وہ دونوں بیڈروم ہی میں بیٹھ کر منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ انہوں نے سوچا یہ تھا کہ وجاہت کو قتل کر کے گھر کے پچھلے حصے کی زمین کھود کر لاش اس میں دفن کر دیں۔''

لڑکی چیخ پڑی۔ ''تو کیا مار ڈالا انہوں نے میرے وجاہت کو؟''

''تم ابھی خاموش رہو شبنم!'' ماسٹر ہمدانی نے اسے ٹوکا۔

''ہاں۔'' ماسٹر ہمدانی شاردا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آگے بولو۔''

''میں نے اس کی سختی سے مخالفت کی تو انہوں نے مجھے زبردستی لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ میں بہت چیخی چلائی لیکن.....''

''کیا وجاہت نے تمہاری چیخ پکار نہیں سنی؟''

''یہ میں نہیں جانتی۔ مجھے کمرے میں بند کرنے شرجیل لے گیا تھا۔ فیصل ڈرائنگ روم میں چلا گیا تھا۔ ہاں اس نے وجاہت کو قتل کیا تھا۔''

شبنم کانپنے لگی اور کچھ بولتے بولتے رک گئی۔

شاردا بولی۔ ''مجھے جس کمرے میں بند کیا گیا تھا، اس کی ایک کھڑکی سے پیچھے دیکھا جا سکتا ہے۔ شرجیل اور فیصل گڑھا کھود رہے تھے۔ میں بالکل بے بس تھی۔ میرے سامنے ہی انہوں نے وجاہت کو اس گڑھے میں دفن کر دیا۔''

''نہیں۔'' شبنم پھر چیخ پڑی۔

ماسٹر کے ایک آدمی نے اُسے سنبھالا ورنہ وہ چکرا کر گر پڑتی۔

''پھر شرجیل ہی نے تمہیں اس کمرے سے نکالا؟'' ماسٹر ہمدانی نے شاردا سے پوچھا۔

''نہیں۔'' شاردا نے کہا۔ ''میں نے ہی بڑی کوششوں سے دروازہ کھولا تھا۔ باہر نکل کر میں نے ان دونوں کو غائب پایا۔ میں دوڑتی ہوئی باہر نکلی۔ شرجیل اور فیصل کی کاریں موجود نہیں تھیں۔ میں پاگل سی ہو گئی۔ دوڑتی ہوئی واپس لوٹی۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈالرز کا بیگ کہاں رکھا تھا۔ وہ مجھے وہاں نظر نہیں آیا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں ڈالرز کا بیگ لے کر فرار ہو گئے؟''

شاردا کچھ نہیں بولی۔

''باہر چلو..... دیکھتے ہیں کہ گڑھا کہاں کھودا گیا ہے۔ اگر تمہارا بیان غلط ثابت ہوا تو..... سمجھ لو..... ہمدانی ہوں میں۔''

''میں ایسا جھوٹ کیسے بول سکتی ہوں۔ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔''

''ابھی چل کر ہم بھی دیکھ لیتے ہیں۔''

وہ سب باہر نکل آئے۔ شاردا بھی ساتھ تھی۔ شبنم کو اب بھی ایک آدمی سنبھالے ہوئے تھا۔

☆☆☆

ماسٹر ہمدانی کے دو آدمیوں نے گڑھا کھود ڈالا۔ اس جگہ کی نشاندہی شاردا ہی نے کی تھی۔

خاصا گڑھا کھودنے کے بعد گڑھے میں موجود ایک آدمی نے زور سے کہا۔ ''یہاں کوئی کمبل میں لپٹا پڑا ہے۔''

''کمبل کھولو۔''

شبنم اس وقت بھی روئے جا رہی تھی۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ جیسے ہی کمبل کھولا گیا، شبنم زور سے چیخ پڑی۔ ''وجاہت!'' کمبل میں لپٹی ہوئی لاش وجاہت ہی کی تھی۔

شبنم بے ہوش ہوگئی۔ اگر ایک آدمی اسے سنبھالے ہوئے نہ ہوتا تو وہ زمین پر گر پڑتی۔

''اسے گھر میں لے چلو۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا اور گڑھے میں اترے ہوئے آدمیوں سے بولا۔ ''گڑھا بند کر دو۔''

شاردا اس دوران میں اس طرح کھڑی ہوئی تھی جیسے پتھرا گئی ہو۔

گڑھا پاٹنے والوں کے علاوہ سب گھر میں لوٹے۔ شبنم کو ایک صوفے پر لٹا دیا گیا تھا۔

''اس کے منہ پر پانی چھڑکو۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا۔ ''اگر یہ اس طرح ہوش میں نہ آئی تو اسپتال لے جانا پڑے گا۔''

''یہ کون ہے ماسٹر؟'' شاردا نے پوچھا۔ ''وجاہت سے اس کا کوئی رشتہ تھا؟''

''یہ بیوی ہے اُس کی اور چند مہینے میں ماں بھی بننے والی ہے۔''

''بہت بڑے صدمے سے دوچار ہوئی ہے یہ۔''

''ہوں۔'' ماسٹر ہمدانی کی نظریں شبنم پر جمی ہوئی تھیں جس کے منہ پر پانی چھڑکا جا رہا تھا۔

شاردا نے ماسٹر سے کہا۔ ''آپ کو دو کروڑ ڈالرز ضائع ہونے کی فکر نہیں ہے شاید..... ان کا ذکر نہیں کیا آپ نے؟''

''مجھے بس فیصل اور شرجیل کو تلاش کرنے کی فکر ہے، ان کی بوٹیاں اُڑانا ہیں مجھے..... عبرت ناک موت۔''

''وہ مل جائیں گے تو ڈالرز بھی مل جائیں گے۔''

''وہ تو دو ایک دن میں ہی مل جائیں گے اور انہی کے ساتھ وہ دونوں بھی ہاتھ آجائیں گے۔''

''وہ کیسے ماسٹر!'' شاردا نے حیرت سے کہا۔

اس کی وضاحت ماسٹر نے نہیں کی۔ وہ شبنم کی طرف متوجہ تھا جو اب ہوش میں آگئی تھی۔ ماسٹر جلدی سے اس کے قریب جا بیٹھا۔ شبنم روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

''شکر ہے کہ تمہیں ہوش آگیا۔'' ماسٹر نے کہا۔

شبنم روتی رہی۔ ماسٹر ہمدانی نے اُس کا شانہ تھپکا۔

''جو ہونا تھا، وہ ہوگیا۔ اب خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ میں تمہیں ابھی اپنے ... گھر لے جاؤں گا۔ اپنے گھر جاؤ گی تو تمہاری حالت اور خراب ہوجائے گی۔''

''آپ کے علاوہ اب میرا ہے ہی کون؟'' شبنم نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''اپنے آنسو پونچھو۔ اب ہمیں یہاں سے چلنا ہے۔'' ماسٹر ہمدانی نے کہا پھر شاردا سے بولا۔ ''تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟''

''ابھی کچھ سوچنے کی مہلت کہاں ملی ہے۔ فی الحال میں یہیں رہوں گی۔''

''اگر خود کوئی فیصلہ نہ کرسکو تو مجھ سے بات کرلینا۔''

''جی۔''

لوگ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ اپنے لوگوں کے لیے ماسٹر ہمدانی کے سینے میں ایک ہمدرد دل ہے۔

ماسٹر بولا۔ ''تم بھی انتقام لینے کے لیے شرجیل کو ڈھونڈو گی؟''

شاردا کچھ نہیں بولی۔ وہ لوگ رخصت ہوگئے۔

☆☆☆

دو دن گزر گئے۔ ماسٹر ہمدانی کو اس کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ شاردا کو پاگل خانے بھیج دیا گیا ہے۔

''کیوں؟'' ماسٹر نے چونک کر پوچھا۔

''اس کے دماغ پر نہ جانے کیا چھا گیا تھا کہ وہ سڑک سے گزرنے والی ہر گاڑی پر کچھ نہ کچھ پھینک کر مارنے لگی تھی۔ کبھی ایش ٹرے، کبھی پیپر ویٹ، کبھی گلدان اور چیختی رہتی تھی کہ مجھے بھی میرا حصہ دو۔''

ماسٹر ہمدانی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ''اس کا مطلب شاید یہ ہے کہ اس نے ہم سے مکمل سچ نہیں بولا۔ اسے کمرے میں اس لیے بند نہیں کیا گیا ہوگا کہ وہ ان دونوں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ دراصل یہ چاہتی ہوگی کہ دو کروڑ ڈالرز میں اسے بھی اپنا حصہ ملنا چاہیے۔ شرجیل اور فیصل اس کے لیے تیار نہیں ہوئے ہوں گے۔ اسی لیے اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔''

''ہم لوگ جب وہاں سے آئے تھے تو وہ نارمل نظر آرہی تھی۔''

''انسان کا دماغ کسی وقت بھی پلٹ سکتا ہے۔ اس نے گاڑیوں پر حملے یوں شروع کیے ہوں گے کہ اس کے

pklibrary.com

خیال میں شرجیل اور فیصل ان گاڑیوں میں ہوں گے۔ اس کا یہ چلانا معنی خیز ہے کہ اسے اس کا حصہ دیا جائے۔"

اطلاع دینے والا سر ہلا کر رہ گیا۔

"اب تم جاؤ۔ میں شبنم سے کچھ بات کر رہا ہوں۔" ماسٹر نے کہا۔

شبنم اس وقت وہیں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے رونے دھونے پر قابو پالیا تھا لیکن حالت ایسی تھی جیسے پتھرا گئی ہو۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ اس لیے لایا ہوں کہ وہاں تمہیں یادیں بہت تڑپائیں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔"

"وہ یادیں ہی اب میری زندگی کی ضامن ہیں۔"

"مجھے ڈر ہے کہ وہ یادیں تمہیں بھی پاگل کر دیں گی۔"

"میں گھر جانا چاہتی ہوں۔" شبنم اپنی بات پر اڑی رہی۔

"اچھا!" ماسٹر ہمدانی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تمہاری مرضی..... تم کب جانا چاہتی ہو؟"

"ابھی۔"

ماسٹر ہمدانی نے کچھ سوچا، پھر بولا۔ "میں ابھی اپنے ایک آدمی سے کہتا ہوں۔ وہ تمہیں کار میں تمہارے گھر چھوڑ آئے گا۔"

"شکریہ بابا!"

"بعد میں جب بھی چاہو، میرے پاس آسکتی ہو۔ فون بھی کر سکتی ہو۔"

"جی۔"

ماسٹر ہمدانی نے ایک آدمی کو بلایا۔ اسے ہدایت دی۔ شبنم اس کے ساتھ کار میں اپنے گھر چلی آئی۔

گھر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے ایک دراز کھولی اور اس میں سے ایک ریوالور نکالا۔ وہ ریوالور اسے وجاہت نے یہ کہہ کر دیا تھا کہ وہ کبھی کبھی زیادہ دن کے لیے کہیں جاتا ہے تو وہ اکیلی رہتی ہے لہٰذا اسے اپنی حفاظت کے لیے ریوالور اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیے۔

لیکن اس وقت اس نے ریوالور اس لیے نہیں نکالا تھا کہ اسے اپنی حفاظت کرنا تھی۔ وہ ذرا دیر ریوالور کو تکتی رہی، پھر اپنے پرس میں رکھ کر بستر پر جا لیٹی۔

سرہانے اس کی تصویر کے ساتھ وجاہت کی تصویر بھی تھی جسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ "کاش تمہارا قاتل ماسٹر سے پہلے مجھے مل جائے۔ میں ہی اس سے تمہارا انتقام لوں گی۔ ریوالور کی ساری گولیاں اس کے جسم میں اتاروں گی۔"

شاردا کے بیان کے مطابق اس کے شوہر کا قاتل فیصل تھا۔

☆☆☆

اسی شام کو پولیس نے فیصل کو گرفتار کر لیا۔ اس کو اپنے سامنے بٹھائے انسپکٹر اس سے کہہ رہا تھا۔ "تم پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

فیصل نے اپنی ڈگری بتائی۔

"اس کے باوجود تم نے کچھ نہیں سوچا اور اتنا بڑا جرم کر بیٹھے؟"

"یہ اگر میرا جرم ہے تو اس کی سزا اسے ملنا چاہیے جس نے یہ ڈالرز کہیں سے لوٹے ہیں۔ مجھے تو چند ڈالرز کہیں سے ملے تھے جنہیں میں مقامی کرنسی سے کیش کروانا چاہتا تھا۔"

"تم اس لیے پکڑے گئے ہو کہ ان ڈالرز کے نمبر ہمارے پاس نوٹ کروا دیے گئے تھے۔ یہ ماسٹر ہمدانی کی جائز کمائی کے نوٹ ہیں۔"

"لیکن مجھے تو بس یہ چند ڈالرز....."

"بکواس مت کرو۔" انسپکٹر نے اسے ڈانٹا۔ "تم جہاں مقیم ہو، وہاں کی تلاشی لی جا چکی ہے۔ تم جن ڈالرز کی وجہ سے پکڑے گئے ہو، انہیں ملا لیا جائے تو ایک کروڑ ڈالرز بنتے ہیں۔ اب تمہیں یہ بتانا ہے کہ باقی ایک کروڑ ڈالرز کہاں ہیں؟"

"یقین کیجیے۔" فیصل گڑگڑایا۔ "کسی نے وہ نوٹ میری قیام گاہ پر رکھ کر مجھے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔"

"ایسی کوئی بات ہوگی تو اب ہم اس کا پتا بھی لگا لیں گے۔" انسپکٹر نے کہا، پھر ایک کانسٹیبل سے بولا۔ "اسے لے جا کر حوالات میں بند کر دو۔"

فیصل بے بسی کا شکار ہو چکا تھا۔ اس نے ایک کروڑ ڈالرز اپنے پاس رکھے تھے اور ایک کروڑ ڈالرز ایک بینک کے لاکر میں رکھ دیے تھے اور وہاں سے فرار ہونے کا کوئی طریقہ سوچ رہا تھا۔

فیصل کو حوالات میں بھیجنے کے بعد انسپکٹر نے ٹیلی فون پر ماسٹر ہمدانی کا نمبر ملایا۔

ہمدانی ایک بہت بڑی کمپنی کا مالک بھی تھا۔ اس کا شمار شہر کے معززین میں ہوتا تھا۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہو سکی تھی کہ ماسٹر ہمدانی کا ایک گروپ ایسا بھی تھا جس سے ہمدانی ناجائز کام کرواتا تھا۔

''آپ کے ڈالرز لوٹنے والا ایک آدمی تو پکڑا گیا ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''کون ہے؟'' ماسٹر ہمدانی نے جلدی سے پوچھا۔

''اس نے اپنا نام فیصل بتایا ہے۔ اس کے شناختی کارڈ پر بھی اس کا یہی نام ہے۔''

''سب مل گیا اُس کے پاس سے؟'' ماسٹر ہمدانی نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''اس کے پاس سے ایک کروڑ ڈالرز ملے ہیں۔ آپ نے رپورٹ کرائی تھی کہ آپ نے کسی مقصد کے تحت دو کروڑ ڈالرز کی رقم اپنی کمپنی کے کسی آدمی شرجیل کو بھجوائی تھی۔ میں اس امکان پر غور کر رہا ہوں کہ ان دونوں ہی کی نیت خراب تھی۔ شرجیل اور فیصل ایک دوسرے کے دوست ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے وہ رقم آدھی آدھی بانٹ لی ہوگی۔ دوسرا کروڑ شرجیل کے پاس سے ملنا چاہیے۔ جلد ہی فیصل جیسی غلطی وہ بھی کرے گا اور ہم اسے بھی پکڑ لیں گے۔''

''فوری طور پر فیصل کے ساتھ کیا کیا جائے گا؟''

''ابھی تو اسے لاک اَپ میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس پر تھرڈ ڈگری آزمائی جائے گی۔ اگر اس نے زبان نہ کھولی تو بھی دو دن بعد اسے عدالت میں تو پیش کرنا ہی ہے۔ یہ ایک کروڑ ڈالرز آپ کو عدالت کے ذریعے مل جائیں گے۔''

''اچھا میں اس سلسلے میں پھر بات کروں گا۔ ابھی کچھ مصروف ہوں۔''

ماسٹر ہمدانی نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ یقیناً سوچ میں پڑ گیا ہوگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ تو اپنے ہاتھوں سے فیصل کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن اب بظاہر یہ ناممکن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شام کے وقت اچانک شبنم کو شاردا کا خیال آیا۔ وہ جس دیوانگی کے باعث پاگل خانے بھیجی گئی تھی، اس کو بھی تو وجاہت کے قتل کی پروا نہیں ہوگی۔ اس کی دیوانگی کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ بس کروڑوں ڈالرز میں اپنا حصہ چاہتی تھی۔ یعنی اسے وجاہت کے قتل پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

تو پھر، شبنم نے سوچا، واجب القتل تو وہ بھی ہے۔ انتقام اس سے بھی لیا جانا چاہیے لیکن اب وہ پاگل خانے میں تھی۔

شبنم پر ایسا جنون طاری ہو گیا تھا کہ وہ کسی طرح پاگل خانے میں جا کر اسے قتل کر دے۔

وہ اسی سوچ بچار میں کھوئی ہوئی تھی کہ اس کے موبائل پر ماسٹر ہمدانی کی کال آئی۔ وہ شبنم کے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ اس کے خیال میں امکان یہی تھا کہ ماسٹر ہمدانی اس کی حالت سے باخبر ہونا چاہتا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اس پر مہربان رہا تھا۔

اس نے کال ریسیو کی۔ ''جی بابا!''

''گھر جا کے تمہیں وہاں کے در و دیوار سے وحشت تو نہیں ہوئی؟''

''وحشت تو نہیں بابا..... بس وجاہت کی تصویر میری آنکھوں میں آنسو لاتی رہی۔''

''اسی لیے میں چاہتا تھا کہ تم اپنے گھر نہ جاؤ۔''

''اب اُس کی یادیں ہی تو میری طاقت ہیں بابا..... شاید میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ اس کی یادیں ہی مجھے زندہ رکھ سکتی ہیں ورنہ میں مر جاؤں گی۔''

ماسٹر ہمدانی نے ایک ٹھنڈی سانس لی پھر بولا۔ ''اس وقت میں نے تمہیں ایک اچھی خبر سنانے کے لیے فون کیا ہے تاکہ تمہیں کچھ تو سکون ملے۔''

''میرے لیے اچھی خبر یہ ہو سکتی ہے کہ آپ نے وجاہت کے قاتلوں کو پکڑ کر انہیں کوئی عبرت ناک سزا دی ہے۔''

''شرجیل کا تو ابھی کوئی سراغ نہیں ملا ہے لیکن فیصل موت کے دہانے پر پہنچ گیا ہے۔''

''وہ کیسے بابا؟''

''پولیس نے اُسے گرفتار کر لیا ہے۔ میں کوئی ایسی تدبیر سوچنے میں لگا ہوا ہوں کہ پولیس وجاہت کی لاش تک پہنچ جائے اور اسے ثبوت مل جائے کہ اسے فیصل نے قتل کیا ہے۔ اس صورت میں اسے پھانسی ہو سکتی ہے۔''

''اس خبر کا ایک اچھا پہلو یہ ہے کہ وہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اسے جیل بھیج دیا گیا ہوگا۔''

''نہیں۔'' ماسٹر ہمدانی نے جواب دیا۔ ''ابھی تو وہ دو تین روز نوشکی تھانے کی حوالات میں ہے۔ اس سے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ دوسرا کروڑ کہاں گیا۔''

''دوسرا کروڑ؟''

''ہاں، فیصل کے پاس سے صرف ایک کروڑ ڈالرز ملے ہیں۔ دوسرا کروڑ یقیناً شرجیل لے گیا ہوگا۔''

''مرنا تو اسے بھی چاہیے۔''

''مرے گا وہ، اطمینان رکھو۔ وہ بچ نہیں سکے گا۔ فی الحال تمہیں اتنا اطمینان تو ہو جانا چاہیے کہ وجاہت کا ایک قاتل پکڑا جا چکا ہے۔''

pklibrary.com

''اس اطلاع کا شکریہ بابا!'' جواب دیتے ہوئے اس کے دماغ میں کچھ اور خیالات تیزی سے اُبھرے تھے۔

''کوشش کرو کہ زیادہ وقت آرام کرنے میں گزارو۔''

''میں کوشش کروں گی بابا!''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

شبنم بڑی تیزی سے کمپیوٹر پر جا بیٹھی۔ وجاہت کی عدم موجودگی میں وہ اپنا زیادہ وقت کمپیوٹر پر ہی گزارتی تھی اور اب اس میں خاصی ماہر ہو چکی تھی۔ اتفاق تھا کہ چند دن قبل اس کو ایک ایسی ویب سائٹ مل گئی تھی جو کسی دہشت گرد تنظیم کی تھی۔ عام طور پر اس ویب سائٹ پر کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ شبنم کے ساتھ تو محض اتفاق ہوا تھا۔ اس ویب سائٹ پر مختلف تھانوں کے اندرونی نقشے تھے۔ وہ کسی طرح اس لیے بنائے گئے ہوں گے کہ اگر تنظیم کے کچھ لوگ گرفتار ہو جائیں تو انہیں چھڑانے کے لیے وہ کیا طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔

اس دریافت کے بعد شبنم اس اُلجھن میں رہی تھی کہ اس ویب سائٹ کے بارے میں پولیس کو بتائے یا ماسٹر ہمدانی کو بتا کر اس سے مشورہ کرے کہ اس ویب سائٹ سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

لیکن وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی کہ وجاہت کو شرجیل کے گھر جانا پڑ گیا۔

اب ماسٹر ہمدانی سے سن کر اسے یاد آ گیا تھا کہ مختلف تھانوں کے ان نقشوں میں نوشکی کا اندرونی نقشہ بھی تھا۔

شبنم نے اس ویب سائٹ میں پہنچ کر نوشکی تھانے کا نقشہ تلاش کر لیا اور پھر اسے اسکرین پر بڑا کر لیا تاکہ اس میں جو کچھ لکھا تھا، اسے آسانی سے پڑھ سکے۔

یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس نے نقشے میں دیکھ لیا کہ وہاں کس کس جگہ پولیس کا کون ذمے دار بیٹھتا ہے۔ نقشے میں حوالات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ دیگر سب باتیں بھی لکھی گئی تھیں۔ شبنم نے اس نقشے کا ایک پرنٹ نکال کر کمپیوٹر بند کر دیا اور بستر پر لیٹ کر اس نقشے کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے لگی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال جم گیا تھا تاکہ وہ پولیس اسٹیشن کی حوالات تک پہنچ کر اپنے ہاتھوں سے فیصل کے سینے میں گولیاں اتارے۔ وہ وجاہت کا انتقام خود لینا چاہتی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے ٹیلی فون انکوائری سے نوشکی تھانے کا فون نمبر معلوم کیا پھر نوشکی تھانے فون کیا۔

دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی تو شبنم نے پوچھا۔

''ایس ایچ او صاحب ہیں؟''

''جی نہیں، وہ ابھی ابھی گشت پر نکلے ہیں۔'' جواب ملا۔

اس وقت رات کے نو بج چکے تھے۔

''آپ کون ہیں؟'' جواب دینے والے نے سوال کیا۔

شبنم نے جواب دیے بغیر لائن ڈس کنکٹ کی اور ٹہلتے ہوئے سوچنے لگی کہ کسی طرح آج رات ہی فیصل کا قصہ تمام کر دینا چاہیے۔

اس نے اس سوچ بچار میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور اپنا سب سے زیادہ قیمتی اور فیشن کے مطابق لباس پہنا۔ میک اَپ کرنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس وقت اس نے میک اَپ پر بہت زیادہ توجہ دی۔ وہ لباس اور میک اَپ سے پولیس اسٹیشن کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرنا چاہتی تھی۔

تیاری کے بعد وہ گھر سے نکلی۔ وجاہت نے ایک کار اسے بھی خرید دی تھی۔ وہ اسی کار میں بیٹھ کر نوشکی تھانے روانہ ہوئی۔ گولیوں سے بھرا ہوا ریوالور اس نے اپنے پاس چھپا رکھا تھا۔

نوشکی تھانے پہنچ کر اس نے کار ایک طرف کھڑی کی اور اتر کر بڑے پُروقار انداز میں چلتی ہوئی پولیس اسٹیشن کے دروازے کی طرف بڑھی۔

پولیس اسٹیشن کے باہر بھی کچھ پولیس والے کھڑے آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی شبنم کو دیکھا۔ اب ان کی باتوں کا موضوع یہ ہو سکتا تھا کہ اتنی فیشن ایبل اور خوب صورت لڑکی رات کے دس بجے پولیس اسٹیشن کیوں آئی تھی۔

شبنم ان کی طرف دھیان دیے بغیر پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔

سب سے پہلے اس کی نظر جس میز پر پڑی، اس پر ایک ہیڈ کانسٹیبل بیٹھا ہوا تھا۔ شبنم اسی کے پاس رکی۔

''مجھے ایس ایچ او صاحب سے ملنا ہے۔'' شبنم نے اس سے کہا۔

''تھوڑی دیر پہلے آپ ہی نے فون کر کے ان کے بارے میں پوچھا تھا میڈم؟''

''ہاں۔'' شبنم نے جواب دیا۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ گشت پر نکل گئے

ہیں۔"

"لیکن انہوں نے ملاقات کے لیے مجھے یہی وقت دیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ اگر وہ گشت پر ہوئے تو مجھ سے ملنے کے لیے اسی وقت واپس تھانے آجائیں گے۔ خیر مجھے جو کام ہے، وہ کسی اور کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے۔"

"شاید انسپکٹر اشرف آپ کے کام آجائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی تو انہی سے مل لیتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں بیٹھتے ہیں۔"

"جیسا آپ چاہیں۔" ہیڈ کانسٹیبل شبنم کی خوب صورت شخصیت سے مرعوب ہو چکا تھا۔ شبنم جانتی تھی کہ عام لوگوں سے ان کی بات چیت کا انداز بڑا "ہٹلرانہ" ہوتا تھا خواہ وہ صرف کانسٹیبل ہی کیوں نہ ہو۔

شبنم آگے بڑھ گئی۔ وہ نقشے میں دیکھ چکی تھی کہ انسپکٹر کہاں بیٹھتا ہے۔ اسے بس وہ نام نہیں معلوم تھا جو اس وقت کے ڈیوٹی انسپکٹر کا تھا اور شبنم کو اس کے نام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو اس جگہ تک جانا تھا اس کے قریب ہی وہ چھوٹی سی راہداری تھی جس میں حوالات بنی ہوئی تھی۔

یہ تھانہ عام تھانوں سے زیادہ بڑا تھا۔ بہت سے پولیس والوں نے اسے دیکھا لیکن اس کی شخصیت کی وجہ سے کسی میں ہمت نہیں ہوئی کہ اسے روکتا یا اس سے کوئی سوال کرتا۔

نقشہ شبنم نے بہت اچھی طرح ذہن نشین کیا تھا اس لیے حوالات تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ کسی جھجک کے بغیر حوالات کے سامنے پہنچ گئی۔ وہ تیزی سے سوچ رہی تھی کہ حوالات میں زیادہ قیدی ہوئے تو وہ فیصل کو کیسے پہچانے گی۔ اس نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ شرجیل ہوتا تو وہ اسے جانتی ہی تھی۔ بہرحال اس کے ذہن میں یہ خیال آگیا کہ وہ نام لے کر پکارے گی تو فیصل ہی اس کی طرف متوجہ ہوگا۔

لیکن اُسے اس سچویشن کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ حوالات میں اس وقت صرف ایک ہی قیدی تھا جو بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے چونک کر شبنم کی طرف دیکھا۔ اسے تعجب ہوا ہوگا کہ ایک اجنبی فیشن ایبل لڑکی اس کی حوالات کے سامنے کیوں آرکی تھی اور کون تھی۔

"میں ایک اخبار کی ایڈیٹر ہوں۔" شبنم نے اپنی شخصیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے خود کو "ایڈیٹر" ہی کہنا مناسب سمجھا۔

"تم فیصل ہو نا؟" وہ پھر بولی۔

"ہاں۔" فیصل اسے گھورتا ہوا سلاخوں کے قریب آگیا۔

"یعنی قاتل ہو۔"

فیصل بولا۔ "ابھی تک تو مجھ پر ایسا کوئی الزام نہیں لگا۔"

"میں تو جانتی ہوں کہ تم وجاہت کے قاتل ہو۔"

اس مرتبہ فیصل بُری طرح چونکا۔

"اور میں....." شبنم نے سفاکی سے کہا۔ "میں وجاہت کی بیوی ہوں اور تم سے اپنے شوہر کا انتقام لینے آئی ہوں۔" اس نے ریوالور نکال لیا۔ فیصل نے زور سے چلانا شروع کر دیا۔ وہ پولیس والوں کو متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سلاخوں کے پاس سے ہٹنا بھی چاہا لیکن ہٹ نہیں سکا۔ شبنم نے اس پر گولی چلا دی تھی۔

فیصل جھٹکا کھا کر گرنے لگا۔

دو کانسٹیبل بھاگتے ہوئے راہداری میں آئے تھے لیکن شبنم نے پے در پے گولیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔ تیسری گولی کھا کر ہی فیصل گر پڑا تھا لیکن ٹریگر پر شبنم کی انگلی دبتی ہی چلی گئی۔ اس نے فرش پر گرے ہوئے فیصل کا سارا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ ریوالور خالی ہوگیا۔

"آؤ!" شبنم نے خالی ریوالور کانسٹیبلوں کی طرف پھینکا۔ "ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس کوئی اور ریوالور نہیں ہے۔ آؤ، گرفتار کرلو مجھے..... فرار ہونے کا ارادہ نہیں ہے میرا۔"

فائرنگ کی آوازوں نے تھانے میں ہنگامہ کر دیا تھا۔ بہت سے پولیس والے دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے۔

شبنم نے دیکھا کہ حوالات میں فرش پر پڑا ہوا فیصل بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ وہ یقیناً اتنی گولیاں کھانے کے بعد ٹھنڈا ہوگیا ہوگا۔

شبنم کو پکڑ لیا گیا۔ پکڑنے والوں میں ایک لیڈی کانسٹیبل بھی تھی۔

"چڑھا دو مجھے پھانسی پر۔" شبنم نے وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ "مجھے اب اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں، میں انتقام لے چکی۔"

☆☆☆

ماسٹر ہمدانی تک یہ خبر پہنچی تو وہ حیران رہ گیا۔ اُس نے فوراً پولیس اسٹیشن فون کیا۔ اس وقت گیارہ بج چکے تھے۔ ڈیوٹی آفیسر بدل چکا تھا لیکن ہمدانی کو بھی جانتے تھے۔

"میں نے ابھی ٹی وی پر ایک خبر سنی ہے۔" ہمدانی نے

pklibrary.com

کہا۔ ”تمہارے تھانے میں.....“

”جی ہاں سر!“ جواب دیا گیا۔ ”ایک لڑکی نے حوالات میں بند ایک قیدی کو بے دریغ گولیاں مار کر ہلاک کر دیا ہے۔“

”ایک اجنبی لڑکی وہاں پہنچی کیسے؟“ ہمدانی نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے حوالات تک۔“

ڈیوٹی آفیسر کو جو کچھ معلوم تھا، وہ اس نے بتا دیا اور بولا۔ ”لڑکی پاگل معلوم ہوتی ہے۔ کبھی ہنستی ہے، کبھی قہقہے لگاتی ہے۔ بار بار کہے جا رہی ہے کہ اس نے اپنا انتقام لے لیا۔ اپنا نام وہ شبنم بتا رہی ہے۔“

”یہ تو ٹی وی کی خبروں میں بھی بتایا جا چکا ہے۔“ ہمدانی نے کہا اور مزید بات چیت کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

جب شبنم نے اس سے ریوالور لیا تھا تو اس کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ فیصل کو مار کر اپنا انتقام.... لے گی۔ تھانے کا نام تو اسے ہمدانی ہی سے معلوم ہو گیا تھا لیکن معمہ یہ تھا کہ وہ حوالات تک پہنچی کیسے؟ اگر وہ پولیس کو یہ بھی بتا دیتی کہ قیدی اس کے شوہر وجاہت کا قاتل ہے تو بات یہاں تک بھی پہنچتی کہ وجاہت کی لاش کہاں دفن تھی۔ ہمدانی کا نام بھی پولیس کے علم میں آ سکتا تھا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ شبنم ہنستی، قہقہے لگاتی اور انتقام کی بات کرتی رہی۔ پولیس کافی کوششوں کے باوجود اس کی زبان سے کچھ اور نہیں سن سکی۔ نہ اس نے وجاہت کا نام لیا تھا، نہ ماسٹر ہمدانی کا۔

پولیس نے یہی سمجھا کہ قتل کرنے کے بعد وہ پاگل ہو گئی تھی۔

کئی اخباروں میں اس کی تصویر دی گئی اور کہا گیا کہ اگر کسی کو اس لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو پولیس کو اطلاع دے۔

وجاہت کی بلڈنگ کے کئی آدمیوں نے پولیس سے رابطہ کیا اور انہیں وجاہت کا نام بتانے کے ساتھ اس کے گھر کا پتا بھی دے دیا۔

پولیس نے فلیٹ کی تلاشی لی۔ انہیں کام کی صرف دو چیزیں ملیں۔ ایک تو تھانے کا اندرونی نقشہ تھا اور دوسری ایک دفتری فائل جس سے انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ ہمدانی کی کمپنی میں ملازم تھا۔

پولیس نے ہمدانی سے اس کے دفتر میں ملاقات کی۔ ہمدانی نے ان کو نہیں بتایا کہ شبنم نے فیصل کو وجاہت کا قاتل کیوں سمجھا۔ ہر بات سے ہی لاعلمی ظاہر کی۔ دراصل اسے یقین ہو چکا تھا کہ انتقام لینے پر کامیابی کے باعث شبنم پاگل ہو گئی تھی۔ اسے اس کے سوا کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وجاہت کو کہاں اور کیوں قتل کیا گیا۔

فیصل مر چکا تھا لہٰذا اس سے تو پولیس کو کوئی بات معلوم ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ پولیس کچھ بھی اور معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

قتل کے جرم میں شبنم کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ کٹہرے میں کھڑے ہو کر بھی شبنم ہنستی، قہقہے لگاتی اور انتقام کی بات کرتی رہی۔ اس نے سرکاری وکیل یا عدالت کی کسی بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

دو ہی سماعتوں کے بعد عدالت نے فیصلہ سنایا کہ شبنم کو پاگل خانے بھیج کر اس کا علاج کرایا جائے اور جب وہ ٹھیک ہو جائے تو اسے دوبارہ عدالت میں پیش کیا جائے۔

☆☆☆

وہ ایک ہی پاگل خانہ تھا جہاں شاردا کے بعد شبنم کو بھی بھیجا گیا اور دو ہی دن بعد یہ خبر بھی سننے میں آئی کہ شبنم نے تکیے سے شاردا کا منہ دبا کر مار ڈالا تھا۔

اس خبر نے ماسٹر ہمدانی کے خیالات میں تبدیلی کی۔ اس نے سمجھ لیا کہ شبنم دراصل پاگل نہیں ہوئی تھی۔ اس نے خود کو پاگل اس لیے ظاہر کیا تھا کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے تاکہ وہاں وہ شاردا کو بھی ختم کر سکے۔

ماسٹر نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ شاردا کو کمرے میں اس لیے بند نہیں کیا گیا تھا کہ وہ وجاہت کے قتل کے خلاف تھی۔ بلکہ اسے اس لیے بند کیا گیا تھا کہ وہ ڈالرز میں اپنا حصہ چاہتی تھی۔ یہی نتیجہ شبنم نے بھی اخذ کیا ہوگا اور سوچ چکی ہوگی کہ وجاہت کے قتل میں وہ براہِ راست ملوث نہ سہی لیکن اس معاملے میں ملوث ضرور تھی۔ اس لیے شبنم نے اس سے بھی انتقام لیا تھا۔

ماسٹر ہمدانی سے اس نے وفاداری نبھائی تھی کہ اس کا نام اپنی زبان پر آخر تک نہیں لائی تھی۔

بعد میں ڈاکٹروں نے فیصلہ دے دیا کہ وہ بنی ہوئی پاگل تھی۔ اسے دوبارہ عدالت میں پیش کیا گیا لیکن اس نے پاگل پن کی اداکاری جاری رکھی۔ عدالت نے آخر کار اسے عمر قید کی سزا سنا دی جہاں ایک دن وہ اپنا سر پھاڑ کر مر گئی۔ جن ڈالرز کو حاصل کرنے کے لیے ایک کے بعد ایک نے اپنی جان گنوائی..... وہ کسی کی دسترس میں نہ آ سکے..... اور سودائے زر کی نذر ہو گئے۔

❖❖❖